ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
فروری 2020

سرگزشت

قابل قدر ہستی — 07

ادارہ

ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

گفت و شنید

شہرِ خیال — 08

قارئین

آپ کی باتیں، آپ کے
مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت

اوجِ انساں — 16

ضیا تسنیم بلگرامی

انسان کو تقویٰ ہی
معراج دیتا ہے

تحقیق

نغماتِ کشمیر — 31

ابصار احمد

تحقیق کے نئے
در کھولتی تحریر

عکسِ زندگی

شاعرِ بنگالہ — 43

الف ب

ایک اہم شاعر
کا عکسِ زندگی

زندگی نامہ

ساحرِ قلم — 49

زین مہدی

پوٹھوہاری و پنجابی
شاعری کا ستون

نظم نگری

یادگار — 61

انور فرہاد

فلمی دنیا کے
سنہرے ایام کی جھلک

سوغات

دیوانگی — 93

ارشد ابرار ارش

بے مثل محبت
کی داستان

سفر کہانی

سفر پہلا پہلا — 117

ندیم اقبال

الفاظ کی جادو بیانی کا شہکار
ایک الگ انداز کی سفر کہانی

دلچسپ و عجیب

انوکھے پیشے — 145

کشمالہ حسن

رنگا رنگ پیشوں
کا ذکرِ خاص

معاشرت
روسیاہ 152
عاطر شاہین
ایک شوریدہ سر نوجوان کی جنوں خیزی

پہلی سچ بیانی
کیکٹس 182
روشن سبطین
ڈاکٹر زندگی لیتے نہیں پھر اس نے ایسا قدم کیوں اٹھایا

دوسری سچ بیانی
اپنا گھر 191
احمد
اپنے گھر کی چاہت نے کیا گل کھلایا

تیسری سچ بیانی
سفید خون 205
سلمان بشیر
کیا اس دنیا میں باپ ایسے بھی ہوتے ہیں؟

چوتھی سچ بیانی
گناہ 211
اعزاز سلیم وصلی
اس کا گناہ بھی کتنا نرالا، کیا انوکھا تھا

پانچویں سچ بیانی
جھوٹی 221
مونا شہزاد
وہ جھوٹی نہ ہو کر بھی خود کو جھوٹی سمجھتی ہے

چھٹی سچ بیانی
سرپرائز 225
فہمی فردوس
اس نے کیسا انوکھا سرپرائز دیا

ساتویں سچ بیانی
جہنم 243
محمد سلیم اختر
ہمارے سیاست دانوں کا تیار کردہ جہنم

آٹھویں سچ بیانی
بکھرا پیار 247
شہرام ساگی
خون کی کشش کس طرح اور کیسے کھینچتی ہے

نویں سچ بیانی
بھرم 255
فرح انیس
اس نے بھرم کی خاطر عجیب ڈراما کیا

دسویں سچ بیانی
نرالی 264
شوکت حیات
وہ حد درجہ کی نرالی لڑکی تھی

شہر خیال

مدیرہ اعلیٰ

☆ رانا محمد شاہد کا تبصرہ بولنے والا ہے۔ "اداریہ بھی ایک اہم موضوع پر تھا۔ بھارت اپنے ملک میں موجود مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کر رہا ہے یہ سب قائد اعظم اور ان کے اکابر ساتھیوں کے دو قومی نظریہ کو حرف بہ حرف سچ ثابت کر رہا ہے۔ آج کی خبر ہے کہ لکھنؤ میں مسلمانوں نے اپنے خلاف متنازعہ قوانین کے احتجاج کے دوران پاکستان زندہ باد۔ اور بھارت مردہ باد کے نعرے لگا دیے۔ تاریخ نے ثابت کر دکھایا کہ مسلمان علیحدہ وطن کے حصول کے لیے اپنے نظریات میں سچے تھے۔ "شہر خیال" میں کرسی صدارت پر منشی محمد عزیز سجے تھے۔ منشی صاحب کو اس کوشش پر مبارک باد۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرے خطوط 2019ء کے تمام شماروں میں لگے۔ نزاہت اقبال نے ذکر کیا تھا اور اب منشی عزیز نے بتایا ہے تو کنفرم ہو گیا۔ آفتاب احمد نسیم اشرفی نے بھی سال بھر کی اہم تحریروں پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ کرکٹر حسن علی کے حوالے سے ان کی بات سے مکمل اتفاق ہے۔ کسی کھلاڑی کی محنت کا اعتراف اس کی تسلسل کے ساتھ اچھی کارکردگی سے لگایا جاتا ہے۔ قمر زمان کی کارکردگی کو لے لیجیے۔ مجیبکو زلانی کے واقعہ کے بعد سے ان کی قابل ذکر کارکردگی بتا دیجیے؟ اعجاز حسین سحاب اور سید امتیاز حسین بخاری کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ زویا اعجاز بھی اس دفعہ "شہر خیال" کا حصہ تھیں۔ ملک میں تبدیلی کے آثار تو ہمیں نظر نہیں آ رہے البتہ "شہر خیال" میں زویا اعجاز کی صورت میں تبدیلی اچھی لگی۔ یہ پڑھ کر اچھا لگا کہ نوجوان نسل کتاب و رسائل سے جڑی ہوئی ہے ورنہ موبائل اور انٹرنیٹ نے اس نسل کو مطالعہ تو کیا ہر چیز سے دور کر دیا ہے۔ ان کے خط میں موجود ہائیکو بہت پسند آئی۔ گزرے وقت کے حوالے سے عدیم اقبال کی باتیں اچھی لگیں۔ وقت کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ یہ جیسا بھی ہو گزر جاتا ہے۔ ڈاکٹر روبینہ شمس انصاری! کشمیر پر بھارت نے اس لیے اتنی آسانی سے قبضہ کیا ہوا ہے کہ عمومی طور پر تمام مسلمان ممالک تقسیم ہیں اور خصوصی طور پر ہم خود منافقت اور لوٹ کھسوٹ کا شکار ہیں اور روبینہ صاحبہ! معاشرے کی سب سے بڑی خوب صورتی یہی ہے کہ ہر شخص اپنی سوچ اور رائے دینے کا حق رکھتا ہے اور رائے اگر غیر جانبدارانہ ہو تو لوگوں کے دلوں پر دستک ضرور دیتی ہے۔ عبدالجبار رومی نے اپنے خط میں ملکی صورت حال بالخصوص اپنے شہر کراچی کا ذکر کیا۔ کراچی کی صورت حال میں زیادہ قصور وہاں کے حکمرانوں کا ہے۔ غذا کی بنیاد زندگی کی وہ بنیادی ضروریات صحت اور ٹرانسپورٹ کی جو صورت حال کراچی میں ہے وہ دیکھ کر یقین آ جاتا ہے کہ حکمرانوں نے دونوں ہاتھوں سے اس شہر کو لوٹا ہے۔ تیس سال پہلے کراچی گیا تھا۔ ٹی وی پر کراچی کی ٹرانسپورٹ دیکھتا ہوں تو تیس سال پہلے کا وقت یاد آ جاتا ہے۔ وہی بسیں کراچی کی عوام کا منہ چڑا رہی ہیں۔ کرپٹ حکمرانوں نے عوام کو ان کی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم کر دیا ہے۔ ظفر ندیم وہرہ، عبدالجبار رومی، عطاء اللہ شاہ، قیصر خان اور نزاہت اقبال بھی "شہر خیال" کا حصہ تھے۔ زویا اعجاز نے اس بار اردو کے مشہور افسانہ نگار غلام عباس کی زندگی کی کہانی دلچسپ انداز میں لکھی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اگر سعادت حسن منٹو اردو ادب کے بڑے افسانہ نگار تھے تو غلام عباس بھی کم نہ تھے اس لیے کہ انہیں زندگی کے مسائل و مجبوریوں کا بخوبی ادراک تھا۔ عائشہ انور اور ابصار احمد کی مختصر مگر موثر تحریریں تھیں۔ شکاریات بہت سے لوگوں کے لیے دلچسپ موضوع ہے اور شکاریات کے شوقینوں کی تشنگی سرگزشت کرتا رہتا ہے۔ اس دفعہ سید احتشام ایک دلچسپ کہانی کے ساتھ موجود تھے۔ انور فرہاد اس دفعہ وہ بڑے ہدایت کاروں کی زندگی کے بارے میں لکھ رہے تھے۔ ضیا ظلم انڈسٹری کو پروان چڑھانے اور اس کی کامیابی میں ان تمام گمنام ہنرمندوں کا بھی ہاتھ ہے جنہیں بہت کم یاد کیا جاتا ہے۔ فرزانہ نگہت کی "ملکہ" اور شکیل صدیقی کی "یاجوج ماجوج" دلچسپ تحریریں تھیں۔ زمانہ قدیم میں انسان کو چھپائی کے لیے کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا اس حوالے سے ظفر عادل نے چھاپہ خانہ کی تاریخ پر ایک مفصل اور معلوماتی مضمون تحریر کیا۔"

☆ ظفر ندیم وہرہ کا فلاحی دعا آباد سے۔ ''سال نو کا پہلا شمارہ خلاف توقع جلد ہی مل گیا۔ آدمی کے ظاہر و باطن کی طرح جریدے کے ظاہر و باطن میں کوئی بے ربطی نظر نہ آئے تو دل خوش ہوتا ہے۔ میں آپ کو اس کے ظاہری حسن، اہتمام اور حسن ترتیب دونوں پر دلی مبارک باد دیتا ہوں۔ ''سفر پہلا پہلا'' ایک پُر لطف تحریر ہے جو پوری قوت سے مقابل پر طنز کا وار کرتی ہے لیکن لطافت سے دل کو تر و تازہ بھی رکھتی ہے۔ پورا سفرنامہ ایک حسین غزل کی طرح ہے جسے پڑھنے والا بے اختیار داد دیے جاتا ہے مگر ہر بار جب ابھرتا ہے تو لکھنے والے کے لیے جذبہ تشکر اور احترام کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سرورق کی کہانی ''درد آشنا'' اچھی تھی۔ تینوں اس لحاظ سے خوش قسمت نکلیں کہ وہ جس عورت زادے سے خوفزدہ تھیں مصیبت میں وہی ان کے کام آئی۔ گویا منفی سوچیں دم توڑ گئیں اور مثبت سوچیں غالب آ گئیں۔ ''سفر آخرت'' کے ہاشمی صاحب کی ناگہانی رحلت قابل افسوس تھی۔ بے چارے غیر ملکی سفر پر جاتے جاتے ملک عدم روانہ ہو گئے۔ سچ ہے موت کا ایک دن معین ہے۔ ''خدا الحواس'' کی محترمہ عشرت نے دختر نیک اختر کی شادی کے لیے جس راستے کا انتخاب کیا، وہ سراسر غلط اور ناقابل قبول تھا۔ غصہ انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کر لیتا ہے۔ جب بات بیٹی کی خودکشی تک پہنچی تو جناب کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ ہائے اس زود پشیمان کا پشیماں ہونا۔ ''بھوک، روٹی، دوستی'' کے سومرو میاں نے دوستی کا حق ادا کر دیا اگر ہر انسان کا دل دریا جیسا گہرا، سورج جیسا شفیق اور زمین جیسا نرم اور وسیع ہو جائے تو یہ دنیا ارضی جنت کا نمونہ بن جائے۔ ''انتخاب'' کے فرزانہ سلیم نے جس پُر خطر راستے کا انتخاب کیا، اس کا اختتام جیل کے دروازے پر ہوا۔ سچ ہے لالچ بری بلا ہے۔ ''ہم سفری'' نے ثابت کر دیا کہ بڑھاپے میں اکیلا پن کسی سزا سے کم نہیں ہوتا۔ ایسے وقتوں میں اگر کوئی ہمدرد، بے لوث اور مہربان مل جائے تو زندگی کی جوت جگانے والا مل جاتا ہے تو بجھنے کی آرزو جاگ اٹھتی ہے۔ ''لاٹری'' ایک دلچسپ اور تجسس خیز کہانی ثابت ہوئی جس میں مختلف کردار ہم کلام نظر آئے۔ ناہید کو منزل مراد مل گئی۔ ''مظلوم'' کی آمنہ بیگم کو کسی بھی صورت میں مظلوم نہیں کہا جا سکتا۔ اس نے سلیمان کے ساتھ مل کر جو چاہا وہ چھپایا، اس کی اجازت مذہب دیتا ہے نہ معاشرہ اس کی تائید کرتا ہے۔ ہماری نوجوان نسل میں جتنی بھی برائیاں پائی جاتی ہیں، وہ مغربی تہذیب سے مستعار ہیں۔ وہی کسر موبائل فون پوری کر رہا ہے۔ ''رانگ نمبر'' کی نیلم کے ساتھ جو ہوا سو ہوا لیکن یہ بات ثابت ہو گئی کہ انسان کا اصل روپ اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب عملی زندگی میں اس سے سابقہ پڑتا ہے۔ جہاں تک کشمیر کے مسئلے کا تعلق ہے تو یہ زبانی جمع خرچ سے حل نہیں ہو گا۔ اسلام ایمان کی قوت اور حق کی تلوار سے پھیلا۔ یہ مسئلہ بھی اسی طرح سے حل ہو گا۔''

☆ اعجاز حسین سٹھار، نور پور تھل سے لکھتے ہیں۔ ''پرچا بروقت مل گیا ہے لیکن سردی اور میدانی علاقوں میں دھند کی زیادتی نے سارے کام خراب کر دیے ہیں، کپکپاتے ہاتھوں سے لکھنا شروع کیا ہے۔ ''نوائے جنگ'' کے تمام عوامل کو اسکول کے زمانے میں کورس کی کتابوں میں پڑھا تھا اب ساری یادداشتیں آپس میں گڈمڈ ہو گئی ہیں، کون سا افسانہ کس لکھاری کا ہے کچھ یاد نہیں پڑتا لیکن ''اوور کوٹ'' اور ''گونگی دلہنیا'' کا خلاصہ ابھی تک ذہن کے کسی خانے میں محفوظ ہے۔ اس ناشتے کے بے فکرے دن، معصوم شرارتیں اور دوست، پتنگ کھیل تماشے یاد کریں تو آنکھ بھر جاتی ہے۔ آج کے نوعمر لڑکوں کے کارنامے ٹی وی پر دیکھتے ہیں تو سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ میڈیا ایسے واقعات کو مکمل تفصیلات کے ساتھ نشر کرتا ہے، مجرم کو تحویل میں رکھنے والا پولیس میں اعترافی بیان سناتا ہے تو ہر بچے کے ذہن میں تجسس پیدا ہوتا ہے، اس لیے کم ہونے کی بجائے روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ہم سب کو اس نازک صورت حال پر نظر رکھنے اور سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ اپنے ادارے میں اس موضوع پر مکمل کر لکھیں، یہ پوری انسانیت پر احسان ہو گا۔ ''جنگل میں منگل'' نے خون گرما دیا ہے، کئی ماہ کے وقفے کے بعد شکار کی کہانی پڑھی تو مزہ آ گیا۔ انداز تحریر دلچسپ تھا، یوں لگا جیسے ہم بھی شکاری پارٹی کے ہمراہ جنگل کے اونچے نیچے اور ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چوکنے انداز میں گھوم رہے ہیں۔ ''روسیاہ'' ہمارے تجسس کو آزمانے وہ روایت بھرا انتقام لینے اور دشمنیاں نبھانے والا سلسلہ ہے۔ علی حسن نے شروع سے ہی بحث میں سرو دیا ہے کہ ساری طاقت اور اختیارات اللہ کے پاس ہیں لیکن کچھ انسان وقتی طاقت کے بل بوتے پر اوچھی اڑان بھرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں لیکن آخر منہ کے بل گر کر عبرت کا نشان بن جاتے ہیں لیکن اس عرصے میں وہ کتنے دلوں کو خون آلودہ کرتے ہیں اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے نہ ازالہ ہو سکتا ہے۔ چوہدری اسد اور اس کا بیٹا شانی اسی قبیل سے تعلق رکھنے والے شیطان ہیں۔ ماہر شاہین کی حوصلہ افزائی کے لیے ہمت بندھائے رکھنی ہو گی۔ سچ بیانیاں کسی بھی پرچے میں ریڑھ کی ہڈی جیسی حیثیت رکھتی ہیں اور زندگی بھر کے تجربات سے روشناس کرا کر سوچ اور غور کرنے کی راہیں دکھاتی ہیں۔ ''درد آشنا'' کی تینوں خوش قسمت ہیں کہ دوبارہ گھر آباد ہو گیا اور قدر کرنے والے سسرال اور محرومیوں کا ازالہ کرنے والی ساس مل گئی۔ ''سفر آخرت'' میں ہاشمی صاحب کی چالبازیوں، منصوبہ بندی اور چالاکی کو مزاح کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے حالانکہ ان کا کردار بے ضرر لیکن نتائج خالصانہ تھے۔ ''رانگ نمبر'' موجودہ دور کی نوجوان نسل کی مکمل اور بھیانک تصویر ہے لگتا ہے دور وصل کا پانچواں ٹائم ہے۔ یہاں نیلم کا اتنا قصور ہے کہ حالات، تنہائی اور پیار سے محرومی نے اتنا کہ ایک مرد کی کمزوری کا سہارا دیا لیکن وہ خود دشمنوں اور لالچ کے داریوں کا اڈا سا ہوا تھا۔ الٹا گلے کا عذاب بن گیا، یوں یہ سارا حل برتی کر بھی بھٹکتے بھٹکتے آخر سماجی الجھنوں نے بھٹکے اور پاؤں لگے کتے کی طرح اس کو تمام آسائشات سے دور کر دیا۔ نائلہ بدقسمت تھی اسے حالات کو زمیں زمانے کو بھرتے اور حقیقت کی نظر سے دیکھنے والی عورت مل جاتی تو آج گھر میں خوشیوں کا راج ہوتا، سکھ

سنبھالے نہ جاتے اور کسی مضبوط اعصاب کے مالک مرد کا سائبان سر پر ہوتا لیکن اسے دوسروں کے لیے آئینہ بننا تھا اگر اس کے انجام سے کسی نے سبق حاصل کر لیا تو اس کی تکلیفوں کا ازالہ ہو گیا اور اس نیک مقصد پر عائشہ چوہدری بھی دعاؤں کے حصار میں آ گئی ہیں۔ "نیا الجھاؤ" میں عشرت بیگم عجیب بلکہ ظالمانہ مزاج رکھنے والی ماں تھی۔ اپنی ضد، ہٹ دھرمی اور بے بنیاد خدشات کی وجہ سے بیٹی اور خاوند کو ذہنی اذیت سے دوچار کیے رکھا۔ گھر میں اجالا پھیلانے اور زندگی بدل دینے والی خوشیوں کے آگے دیوار بنی رہی۔ اس کی شرائط سن کر کتنی جگ ہنسائی ہوتی ہوگی۔ بیٹی پر انگلیاں اٹھتی ہوں گی۔ اسے اللہ کی نعمتوں اور رحمتوں کا یقین نہ تھا۔ جب عقل ٹھکانے آئی تو بگڑی بن گئی اور رحمتیں ساون کے بادل کی طرح برس کر سب کو نہال کر گئیں۔ ایک لمحے کے سکون اور طمانیت کی قیمت نہیں دی جا سکتی۔"

☆ قیصر خان بھکر سے رقمطراز ہیں۔ "اداریہ بہت بڑی حقیقت پر مبنی تھا۔ یہ ہمارے اکابرین کی دور اندیشی تھی کہ ملک پاکستان معرض وجود میں آیا۔ مسلمانوں کے ساتھ جو آج کل بھارت میں ہو رہا ہے وہ انسانیت کے منہ پر طمانچہ ہے۔ یک ٹی میں بہت عظیم لیڈر کے بارے میں لکھا تھا، واقعی ڈاکٹر مہاتیر محمد ایک عظیم پالیسی ساز شخصیت ہیں۔ اللہ تعالیٰ ملک پاکستان کو بھی ایسے حکمران دے۔ "عکس خیال" میں کرسی صدارت پر بہت شاندار تبصرے کے ساتھ منشی عزیز صاحب معلومات کا خزانہ لے کر آئے، پڑھ کر محسوس ہوا کہ حکومتی ریکارڈ اور گمشدہ مال کا ریکارڈ ابھی ان سے منوایا جانا چاہیے تاکہ عدالتوں میں کیسز کم ہوں۔ بہت اعلیٰ صاحب۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی پسند آئے۔ سب پرانے تھے، نئے سال میں کوئی نیا دوست نہیں تھا۔ غلام عباس جیسے بڑے ادیب کو بہت خوب صورتی سے لکھا گیا ہے، پڑھ کر محسوس ہوا کہ اتنے بڑے ادیب کی زندگی نامہ لکھنا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ ان کے ساتھ عائشہ انور، ابصار احمد، انور فرہاد، فرزانہ نگہت، شکیل صدیقی، ظہیر عابدی بہترین مضامین لے کر آئے تھے، بہت پسند آئے۔ سید احتشام صاحب نے نئے سال کا لطف دوبالا کر دیا۔ ندیم اقبال نے تو سفرنامہ اور تبصرہ میں دلوں کو فتح کر لیا ہے۔ پاکستان آنے پر دوستوں کو ملنے کی خواہش بھی ہے تو ڈی آئی خان میں ہم کو بھی موقع ملنا چاہیے، بہت خوشی ہوگی۔ عامر شاہین کی کہانی نہیں پڑھ سکا، اچھا لکھاری ہوگا۔ "رنگ تبسم" بہت دردناک کہانی تھی، واقعی عورت بہت سی زندگیوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس کے ایک غلط فیصلے کی وجہ سے اپنے ساتھ پورے خاندان کو تباہ کر دیتی ہے۔ محبت عشق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہو۔ "ہم سفر" اس میں حقیقی میاں بیوی کی کہانی پڑھنے کو ملی ہے۔ عورت وفا کی دیوی ہوتی ہے اس نے یہ بات دل سے ثابت کی ہے۔ "کالازی" سمراد خان کی مراد پوری تو آئی لیکن وہ صورت پر مرنے والا تھا۔ اللہ کے فضل سے اس کو جو بیوی ملی تو وہ سمجھداری سے فیصلے کرنے نصیب بنانے والی ہے۔ بیوی اچھی ہو تو زندگی بہت خوشگوار رہتی ہے۔"

☆ رخسانہ انجم عظمیٰ کی خیال آفرینی کراچی سے۔ لیکن درج بہ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ کافی تاخیر سے پہنچا ہے۔ "میری زندگی میں سرگزشت اس وقت سے شامل ہے جب میں آٹھویں میں تھی اور اس کا پہلا شمارہ بازار میں آیا تھا۔ کافی سال پہلے تبصرے شامل ہوتے تھے پھر زندگی نے وہ دکھ دیے کہ لکھنا تو بھول ہی گئی لیکن پڑھنا نہیں چھوڑا۔ پچھلے دنوں لاہور شادی میں جانا ہوا، واپسی پر اسٹیشن پر سرگزشت خریدا۔ ٹرین میں تقریباً آدھا پڑھ لیا تو دل نے کہا کیوں نہ اس محفل میں پھر شریک ہوا جائے۔ اداریہ لاجواب تھا۔ ظلم جب حد سے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے، یہی بھارت کے ساتھ ہوگا ان شاء اللہ۔ اب بھارت نے قرارداد پاس کی ہے کہ "دنیا کے تمام مذاہب کے لوگوں کو بھارت کی شہریت دی جا سکتی ہے سوائے مسلمانوں کے۔" "مختصر سوانح حیات" پسند آئی۔ "عکس خیال" کے سب لکھنے والے باذوق، مراسلات بہت اعلیٰ اور معلومات سے بھرپور تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ساجد امجد کے قلم میں وہ تاثیر رکھی ہے کہ مشکل سے مشکل تحریر بھی اچھی لگتی ہے۔ مولانا اصلاحی نے جس طرح 18 سال کی عمر سے اپنی قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا وہ صرف قابل تعریف ہے بلکہ آج کی نوجوان نسل کے لیے سبق بھی جو چیٹنگ اور موبائل میں دن رات مصروف ہے یا تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں تو اچھی جاب اور مال و دولت کمانے کے لیے۔ "عکس زندگی" میں ذرین قمر کے قلم سے "بانجھ احتمال" اچھی تحریر تھی، سراب آتے ہیں۔ "سفر پہلا پہلا" کی طرف ندیم اقبال الفاظ کے جادوگر ہیں اور ان کے سفرنامے جب تک مکمل نہ پڑھ لو اپنے سحر میں جکڑے رکھتے ہیں۔ "ناقابل برداشت کا عذاب" ہو "شمال سے فورٹ ہو" اور اب "سفر پہلا پہلا" جوانی کی نوجوانی کی معصومانہ محبت کا بیان ہے، کمال تحریر ہے۔ یہ جملے تو دل میں کھب گئے ہیں جو خوب صورت لڑکی کے بارے میں کہے ہیں کہ خوب صورت لڑکی چہرے سے نہیں انداز و اطوار سے پہچانی جاتی ہے۔ بیٹھنے، بات کرنے اور کھانے پینے میں جو توازن رکھے وہی خوب صورت ہے جو پیار کی کلی میں بند رکھتی ہے جو کھلنے سے پہلے توڑ لیتی ہے۔" "اس دفعہ جو پیار اور واقعات سائیں کے ساتھ سب دوستوں نے بیان کیے کیا ان میں کچھ حقیقت تھی، اختر امام کا "محبت کا جادو" ایک سپاہی اور سری لنکا کی لڑکی کی ناشوکی عشق کی لازوال داستان تھی۔ ہمارے جانباز لڑائی ہی میں اس میدان محبت کے بھی شہسوار ہیں۔ یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کیونکہ الحمدللہ میرے دو بیٹے تیمور اور محسن بھی پاک آرمی وانجینئرنگ کور میں پاک وطن کے لیے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ زرین مہدی کی کاوش ولی محمد طوفان کی دوام "پشاوری طوفان" سے معلوم ہوا کہ وہ سیاست دان ہی نہیں نظم و غزل میں بھی پشتو شاعری میں آگے نظر آتے تھے۔ "نگاہ" میں [illegible] کا سفر شاعر اور ادیب ڈپٹی ڈائریکٹر سجاد سرور نیازی کے بارے میں تو سیم رضا نے ان کی مختلف پہلو شخصیت سے روشناس کرایا۔"

٭ عبدالمجید قمر کوثر کراچی سے: "جناب معراج رسول کو ہم سے بچھڑے سال گزر گیا۔ ہم ان کی مغفرت کی دعا تہہ دل سے مانگتے رہتے ہیں۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا کرے (آمین)۔ فروری میں اب ہر سال ان کی غیر موجودگی کا احساس دلا کر ہماری آنکھیں نم کر جائے گا لیکن ان کے خون جگر سے سینچا ہوا JDP ہر ماہ ان کی موجودگی کا احساس دلاتا ہے اور ہمارے ہاتھ بے اختیار دعا کو اٹھ جاتے ہیں۔ دلچسپ اور معلوماتی تحریروں کا مجموعہ سرگزشت کا پہلا شمارہ پیش بہا تحفہ ہے۔ ہم خوش ہیں ہمارے ذوق مطالعہ کی تسکین کے لیے سرگزشت کو بیشتر نامور قلم کاروں کا تعاون حاصل ہے جن کی تخلیقات پر کیوں اور کیسے کی گنجائش نہیں صرف یہی کہا جا سکتا ہے "نام ہی کافی ہے"۔ زیر نظر شمارے میں میری پسند کی تحریریں یہ رہیں۔ نوائے برگ (زویا اعجاز)، سرور ادب (عائشہ انور)، تخلقات اقبال (ابصار احمد)، خلیج (ظفر جاوید)، ریجنگ میں جگل (سید احتشام)، اور انور فرہاد صاحب کا سوانح ظہار "اعظم گمری" "محمد نور اسلام کی مشہور نعت "شاہ مدینہ" کو انور فرہاد نے بھی تنویر نقوی کا قرار دیا ہے جب کہ اکثریت کا ماننا ہے کہ یہ نعت ادا کار نعیم ہاشمی کی ہے۔ کیا فرہاد صاحب اصل نعت گو کی نشاندہی کریں گے؟ شکیل صدیقی صاحب کے "یاجوج ماجوج" کے حوالے سے پیر علی راشدی کو دیکھ کر میری برسوں پرانی بھولی بسری یادیں یکدم جاگ اٹھیں۔ یادیں ان دنوں کی ہیں جب روزنامہ جنگ کراچی میں پیر علی راشدی کا حالات حاضرہ پر مشتمل مشہور زمانہ ہفتہ وار کالم "مشرق و مغرب" شائع ہوتا تھا جو میرا پسندیدہ تھا۔ عاطر شاہین کی "روسیاہ" کا انتظار ختم ہوا ہے۔ ندیم اقبال صاحب کا "سفر پہلا پہلا" کی یہ قسط ایسی لگی جیسے اس کے اسناک کیریکٹروں کو کم کر دیا گیا ہے بھئی "کم ہونے خوشگوار سفر"۔ ویسے پیر سائیں کی غیر حاضری نے آ جانے کی رونق ماند کر دی مگر ہم بھی ان کو بھولے نہیں ان کی تخیلاتی طاقت کا تصور کر کے ان کی روحانی آنکھوں سے دیکھا۔ ندیم اور شکیل "رام اور شیام" کی جوڑی تو مین نہیں پائی البتہ بوکھلاہٹ میں جھوٹ بول کر شکیل کو سامنے کر دیا پھر تو بوکھلاہٹ کی یہ جھوٹ کی تکرار ان کی لو زاتیہ و محبت کے سر پہ لگ گئی اور قارئین یہ جھوٹ کیا گل کھلاتی ہے کہ سسپنس میں اٹک گئے۔ بھلا ہو جاتی کی یادہ سری کی جس نے ایک ہی جھٹکے میں جھوٹ کی اس لنگی تلوار کو دھول چٹا دی مگر گرتی ہوئی تلوار نے ایک ہی وار میں محبت کو رشتے سے الگ کر دیا۔ ساتھ ہی یہ انکشاف کہ "وہ شکیل نہیں میں تھا" تحمینہ کو گنگ کر دیا۔ اس کی نیلی سمندری آنکھوں میں جھٹ جھٹ کا اٹھے۔ فوزیہ کی اعلیٰ ظرفی نے اپنی محبت رشتے پر قربان کر کے بہن کو تسکین جیت دے دی۔ اب باری تحمینہ کی تھی اس نے بھی اپنی بہن کی دل آزاری قبول نہیں کی اور اپنی محبت کی بلی چڑھا دی۔ اس پیغام کے ساتھ "اے میری محبت تم میں یہ مشورہ دوں گا تم مجھے بھلا دینا میں تمہیں بھلا دوں گا" ٹھکرائی ہوئی محبتوں کے درمیان پس کر بے چارہ عاشق کا پیار دلیلا انداز "مل خاک میں محبت جلا دل کا آشیانہ جو تھی آج تک حقیقت وہی بن گیا فسانہ"۔ اب آتے ہیں "ضمیر خیال" کی طرف۔ سال نو کے پہلے چیف ایگزیکٹو آف "ضمیر خیال" کا چارج سنبھالتے ہی جناب منتی احمد عزیز صاحب نے سرگزشت کے نکھاریوں اور "ضمیر خیال" کے پاسبانوں کے احتساب کے نتائج کا اعلان شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ان کی سال بھر کی کارگزاریوں کا خلاصہ بھی پیش کر کے قارئین کو انگشت بدنداں کر دیا۔ ان کی اس کاوش کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے میں الفاظ ڈھونڈتا ہی رہ گیا۔ انہیں ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری کی طرف سے بہترین کارکردگی کے لیے تحفہ مبارک ہو۔ ڈاکٹر صاحبہ بھی مبارکباد کی مستحق ہیں (یہ ایک اچھا قدم ہے کہ کسی کو تحفہ دیا جائے تو سرگزشت کا خریدار بنا کر)۔ انہوں نے قلم کی حشمت کو عزت دے کر سرگزشت میں ایک نئی ریت ڈالی ہے یعنی اپنی جانب سے انہیں سالانہ خریدار بنا دیا ہے۔ محترمہ زویا اعجاز کو "ضمیر خیال" میں خوشی اور حیرت کے ساتھ دیکھا۔ حیرت اس لیے کہ میں مطمئن تھا کہ ان کو "ضمیر خیال" کا راستہ یاد نہیں اس لیے وہ خطوط کی اس محفل میں دکھائی نہیں دیتی ہیں کیونکہ علمی ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں ہی ان کا مسکن ہے۔ یہ تو ٹکٹکی لوکیشن کا اعجاز ہے کہ ہمارے درمیان پہنچ گئی ہیں۔ خوش آمدید دیر سے سہی پر آ تو گئیں بقول شخصے "دیر آید درست آید"۔ امید ہے اب آتی جاتی رہیں گی۔ ہم آپ کی شناسائی سے بیگانہ آپ کی تحریروں سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں جب کہ ہر قاری اپنے پسندیدہ رائٹر کو پوری طرح جاننا چاہتا ہے۔ آپ کا اظہار خیال، آپ کی باتیں اور مشورے بے حد متاثر کن تھے۔ سب سے اہم یہ کہ آپ نے اپنی جانکاری اور ضروری ہی سہی دے کر ہماری معلومات میں اضافہ کیا۔ ندیم صاحب فلسفہ زندگی کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ زندگی کی خوب صورتی اور اس کی افادیت کی انہوں نے بہترین تشریح کی ہے۔ اپنے تجربوں اور مشاہدوں کی بنیاد پر انہوں نے زندگی کو جیسا پایا اور جس طرح محسوس کیا اسے اپنے پیرائے میں خوش اسلوبی سے بیان کر دیا یہ ان کا ویژن تھا لیکن میرا تجربہ میرا مشاہدہ اور میری سوچ ان کے برعکس ہے۔ میں سمجھتا ہوں جس طرح ہر چمکتی چیز سونا نہیں زندگی بھی ویسی چمکدار رہتی ہے۔ ہمارے احساسات میں یہ تضاد کیوں آجاتا ہے یہ دیکھنے کا زاویہ ہے۔ جس طرح ایک ہی گلاس کسی کو آدھا خالی نظر آتا ہے اور کسی کو آدھا بھرا ہوا۔ زندگی مجھے ہمیشہ آدھا خالی گلاس ہی نظر آئی۔ زندگی لاکھ حسین سہی لیکن اس کی سرشت میں بے وفائی شامل ہے جب چاہا جہاں چاہا دغا دے گئی۔ میں تو پوچھتا ہوں بتا زندگی اے زندگی اپنا تیرے کتنے روپ؟ کبھی شعلہ کبھی شبنم کبھی ایک شریر بچہ جو کسی کی تخلیق پر مہکتا ہوا پھول دکھتا ہے تو کسی کی ہتھیلی پر چبھتا انگارہ۔ اور کوئی تیقن اور ہوتا ہے کہیں شعر ہے "زندگی زندہ دلی کا نام ہے" تو کہیں نعرہ ہے "زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا"۔ کسی کو حیرت ہے "زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے" کوئی بے چارہ مجبور ہے "دنیا میں آئے ہیں تو جینا ہی پڑے گا جیون ہے اگر زہر تو پینا ہی پڑے گا"۔ زندگی کے طمانچوں سے میرا چہرہ آج بھی سرخ ہے اور ٹیس آہ و تھو اب بھی اٹھتا ہے۔ سید امتیاز حسین بخاری، آفتاب احمد نصیر اشرفی، اعجاز حسین سٹھارہ، ذابت الشال، رانا محمد شاہد، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری اور

عبدالجبار رومی انصاری صاحبان کی خیال آرائی پسند آئی۔"

☆ آفتاب احمد نسیم اشرفی کراچی سے لکھتے ہیں۔ "انہی دنوں میں سراج رسول صاحب کی برسی پر ایصال ثواب کے لیے اپنی اپنی سی کوششوں میں مصروف JDP کی انتظامیہ اور ساتھیوں کو ہماری بھی نیک خواہشات و دعائیں۔ سال نامے پر سال نو کی مبارک بھی قبول۔ اس ماہ کا سرورق دلچسپ اور اداریہ خوفناک مستقبل کی نشاندہی کر رہا تھا۔ بھارت کی حکومت نے مسلمانوں کے متعلق جو قوانین بنائے ہیں وہ دنیا کی سب سے بڑی ہجرت کا سبب بنیں گے۔ اگر ہمارے مسلمان حکمرانوں نے وقتی اپنے مالی فائدے کو نظرانداز کر کے بھارت کو لگام نہ دی تو اس کی حماقت قیام پاکستان کی طرح لاکھوں جانوں کے ضیاع کا سبب بنے گی اور قتل مقاتلی بھی ہو کے رہے گی۔ یک گل سرگزشت میں طاہر جنیجا کے مہاتیر محمد کو خراج تحسین کے وہ حق دار تھے۔ رویا اعجاز نے "نوائے برگ" کے ذریعے اپنی اہمیت و محبت میں اضافہ کیا۔ "شعورِ خیال" کے اوراق میں آج بھی ان کی موجودگی ہماری ادبیت میں بھی اضافہ کرتی ہے کہ وہ ہم میں سے ہیں۔ برصغیر کا اردو ادب جناب غلام عباس کے بغیر ادھورا ہے۔ انہوں نے بھی مالی مشکلات اور نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے خود کو منوایا اور ادبی کہکشاں کا نمایاں ستارہ رہے۔ سرور ادب بھی انہی میں سے ایک تھے۔ ان کے آخری سفر کی تفصیل نے رنجیدہ کر دیا۔ عائشہ انور کا شکریہ۔ قیام پاکستان کے وقت ستو خان قوال صاحب نے کلام اقبال پڑھا تھا ہماری معلومات میں اضافہ تھا۔ نغمات اقبال ہمیشہ کانوں کو بھلا لگتا ہے۔ ابصار احمد کی یہ تحریر پڑھ کر اب ہمارے باذوق ہونے میں کوئی شائبہ نہیں رہا کیونکہ یہ تھی ہی باذوق خواتین و حضرات کے لیے۔ شکاریات کو بچپن سے اب تک ہم نے اتنا پڑھا ہے کہ سید احتشام کی "جنگل میں ہلچل" نے ہمارے دل میں کوئی ہلچل نہیں مچائی۔ ہم نے انجم فاروق ساحلی صاحب سے بھی کہا تھا کہ اور بھی موضوعات ہیں ادب میں شکاریات کے سوا۔ انور فرہاد صاحب برصغیر پاک و ہند کی فلم انڈسٹری کے معماروں سے ملوا رہے تھے۔ محمد نقشی و نذیر اور نعمان احمد کی فلمی خدمات انہیں فلمی تاریخ میں زندہ رکھیں گی۔ فلمی معماروں کی اس فہرست میں ابھی بہت سے نام اور لکھے جا سکتے ہیں۔ لرزاں نگہت برطانیہ کی شہزادی کو ملکہ الزبتھ بنا رہی تھیں جب کہ ام شکیل صدیقی کے "یاجوج ماجوج" کی حرکتوں پر مسکرا رہے تھے کہ اس شہزادی سے شادی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ مدیم اقبال "سفر پیلا پیلا" یا پیلا پیلا پیلا جو بھی ہو وہ اپنے منفرد اسلوب اور انداز بیاں سے وکٹری نامے کی داستان کو بنتے جا رہے ہیں۔ تحسینہ اور غزالہ دونوں بہنوں سے ایک وقت عشق اور دشمنداری کی تفصیل بہت متاثر اور سوچ میں ڈالنے والی تھی۔ ظفر عابدی کا "مطبخ" پڑھ کر آج کی انٹرنیٹ اور کمپیوٹر سے آشنا جنریشن نے یہ ضرور جانا ہوگا کہ چند صفحات کی کتابت کاتب کو کرتے دیکھا۔ کتنا دشوار کام تھا جب کہ آج سینکڑوں صفحات چند منٹ میں پرنٹ ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔ جادو سا لگتا ہے۔ عاطر شاہین "روسیاہ" کو ہم مافوق الفطرت نہیں بلکہ فطرت سے ہم آہنگ انسان دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کی وکیل قسط وقت اور حالات کے مطابق ہی تھی۔ اس مرتبہ تمام کہانیاں مقررہ وقت کے اندر ہی پڑھنے کا وقت مل گیا۔ "دوراشنا" کی دوراشنائی نے بےچین و دوراشنائی سے بچا لیا۔ ہاشمی صاحب کا "سفرِ آخرت" عبرت انگیز تھا۔ "راکھ کیر" نے بشیر کی زندگی بھی عبرت کا نمونہ بنا دی۔ گھر سے بھاگ کر شادی کرنے والی لڑکیوں کو کسی اور کی زندگی سے عبرت حاصل نہیں ہوتی یہی غلطی مظلوم کی آمنہ سے بھی ہوئی۔ وہ وہ نے اپنی ماں کی خبط الحواسی خودکشی کی کوشش کر کے دور کر دی ورنہ اس کے لیے بھی حالات گھر سے بھاگنے والے ہی ہو گئے تھے۔ بعض اوقات والدین خود بھی اولاد کے لیے ایسے حالات پیدا کرنے کے ذمہ دار بن جاتے ہیں۔ "بھوک، روٹی اور دوستی" میں دوستی کا بھرم بہت نمایاں تھا۔ مراد خان کی "لاٹری" بھی اچھی لگی۔ راتوں رات دولت کے حصول کو خواب راستے کے انتخاب میں غلطی کر دی ہے۔ سلیم نے بھی یہی غلطی کی اور عمر قید کی سزا پائی۔ سلمیٰ جیسی عورت کی "ہمسفری" شوہر کے لیے کسی لعنت سے کم نہیں ہوتی۔ کھیل قسمت کا شاندار کہانی تھی۔ مارکیٹنگ اور بزنس کے حوالے سے ترقی کو قسمت کا کھیل ہی کہا جا سکتا ہے۔ "شعور خیال" میں خلیق محمد عزیز ممتاز صاحب نے پتہ کر کمال ہی کر دیا کہ وہ گزشتہ سال جنوری میں تینوں شماروں میں مسند صدارت پر بیٹھے تھے جب کہ ہمارا یقین ہے کہ وہ اس مرتبہ بھی اس اعزاز کے مالک بنیں گے کیونکہ ابھی جنوری کا جاسوسی ہم نے پڑھا نہیں ہے۔ جناب رانا محمد شاہد کو بھی جو مسلسل پر مبارک اور اس کے بعد کی حاصل پر زرابت انتقال جناب سید امتیاز حسین بخاری اور جناب اعجاز حسین سٹھار کو بھی مبارک اور ہمیں خود کو حاصلی پر صرف شکلی جناب رانا محمد شاہد صاحب اور ہم ممتاز صاحب سے دست بستہ عرض کر رہے ہیں کہ جناب اعجاز حسین سٹھار کی طرح ہمارے خطوط کا ریکارڈ بھی درست کر دیں شکریہ۔ مدیم اقبال جب پاکستان آ کر نیا سلسلہ رکھیں تو مہمان نوازی کا کچھ موقع ہمیں بھی عنایت کر دیجیے گا۔ روبینہ نفیس انصاری ہماری دعائیں آپ کا حق ہیں ہم بھی کسی کی حق تلفی نہیں کرتے۔ رویا اعجاز کو اپنے درمیان پا کر از حد خوشی ہوئی۔ عبدالحلیم ثمر، ظفر عدیم، جبار رومی، عطاء اللہ شاہ، قیصر خان کو بھی سلام محبت۔ آخر میں اراکین ادارہ کو بھی سلام۔"

☆ سید امتیاز حسین بخاری کا نامہ سرگودھا سے۔ "ماہ جنوری 2020ء کا خوبصورت شمارہ سال گزشتہ 30 دسمبر کو ملا۔ شمارہ دیکھ کر دل فرحت و مسرت سے لبریز ہو گیا ہے۔ سب سے پہلے آپ کا فکر انگیز اداریہ پڑھا۔ قیام پاکستان کی اہمیت کیوں تھی اس کو بہترین انداز میں اجاگر کیا گیا تھا۔ بھارت اور مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کیا گیا۔ ان کی زندگی اجیرن بنا دی گئی ہے۔ قتل و نسل کشی جاری ہے ان

حالات نے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا کہ دو قومی نظریہ اور قیام پاکستان کے لیے سر سید احمد خان، علامہ محمد اقبال کی فراست، تدبر و دانش اور بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کی بصیرت افروز جدوجہد درست تھی۔ ورنہ خیبر سے کراچی تک بھی کچھ اور ہوا ہوتا۔ دوست و دشمن کو قائد اعظم کا شکر ادا کرنا چاہیے اور ان کی عظمت کو سلام کرنا چاہیے۔ قادر مطلق کا خصوصی انعام و احسان فضل و کرم ماننا چاہیے۔ ''عہد شکن'' میں جہانگیر محمد کے بارے میں کمال آگاہی ہوئی جس نے اپنے ملک کی تقدیر بدل دی معاشی اور دفاعی طور پر مستحکم ملک بنا دیا۔ ''معمر خیال'' میں داخل ہوا تو منشی محمد عزیز نئے سالانہ تحریر لیے ہوئے کرسی صدارت پر رونق افروز تھے۔ عمدہ تبصرہ تھا۔ اعجاز حسین ستار بہترین تبصرہ کے ساتھ رونق بزم ''معمر خیال'' تھے۔ شعراء ملک آغا خان الطاف بابا نے فضل فاروق رو کھڑی سید خورشید عباس شاہ، افضل عاجز ملک سمیت خان، مجبور عیسیٰ خیلوی، محمود احمد ہاشمی، عاشق عیسیٰ خیلوی، ایس ایم صادق ناز خیالوی، ولی الرحمٰن ناصر یونس خان نشتر منظور حسین، سید محمد انور شاہ، اظہر نیازی راقم الحروف سید امتیاز حسین بخاری سمیت بہت سارے شعراء کو لیجنڈ گلوکار عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی نے اوج ثریا پر پہنچایا دیا۔ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی ہم عصر ہے۔ میرا انتہائی قریبی دوست ہے۔ ثناء اللہ خان نیازی ہم سے چھوٹا ہے جو امریکا میں مقیم ہے۔ متعدد بار انتہائی قریب سے عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کو اب تک سن چکا ہوں۔ لطف اندوز ہو چکا ہوں ..... اس بار انور فرہاد صاحب معمار لے کر داخل سرگزشت ہوئے۔ پاکستان کے شاندار سنہرے دور کا ذکر خوب تر کیا۔ ہدایت کار، فلم ساز، ڈائریکٹر سید نجم الحسن نقوی امروہوی المعروف سید نجم نقوی ہدایت کار، فلم ساز تھے۔ فلم ساز نعمان احمد کے بارے میں بیش بہا انمول معلومات سے نوازا۔ شعر و نغمہ، سرود موسیقی کا ایک خوب صورت امتزاج پیش کیا اور بے شمار شعراء، فلم کاروں اداکاروں سے بھی ساتھ متعارف کرایا جو ایک عظیم کارنامہ تھا۔ ہر لفظ ہر سطر سے لطف اٹھاتا اور مسرت سے جھومتا رہا۔ ہر بول ہر نغمہ پر رقص کناں ہوتا رہا۔ عظیم الشان فلمی کارناموں سے آگاہ ہوا۔ واقعی عظیم انسان معمار تھے فلمی ستون تھے۔ دنیا کو اوج ثریا تک لے گئے۔ ناقدری کا بھی شکار ہوئے لیکن ہمت و عزم کا پرچم بلند رکھا۔ باقی عبدالحلیم ثمر سے بصد ادب گزارش ہے کہ میں نے آپ کے افسانہ کا تو ذکر نہیں کیا تھا، خطوط کا ذکر کیا تھا۔ راجہ محمد شاہد کا خط بھی متاثر کن ہوتا ہے شکر گزار ہوں۔ میری تحریر سے اگر کوئی اثر لے تو سبحان اللہ۔ میں قاری اور لکھاری ہوں میں جو بھی تحریر لکھتا ہوں اپنے ہر لفظ کا ذمہ دار ہوں۔ عبدالجبار رومی انصاری نے کمال تبصرہ کیا ہے اور دل خوش کر دیا ہے۔ غلام عباس میرے پسندیدہ لکھاری ہیں میں ان کے بارے میں کافی معلومات رکھتا ہوں۔ ان کے کافی افسانے اور ناول پڑھ چکا ہوں۔ ''آنندی'' میرا محبوب افسانہ ہے جو ناقابل فراموش تحریر ہے۔ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کی زندگی کے بارے میں ایک اور کہانی بھی مشہور ہے۔ اقتباس واقعی حقیقت پر مبنی تھے۔ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کو جب والد نے گھر سے نکال دیا تو کراچی، فیصل آباد، اٹک، اسلام آباد میں ٹرک چلاتے رہے۔ سخت مزدوری کرتے رہے۔ رکشا چلاتے رہے تب جا کر کندن بنے تو پروفیشنل گلوکاری کا آغاز کیا اور عالمی شہرت حاصل کی اور مقبول و ہر دلعزیز ہوئے۔ ''سفر پہلا پہلا'' ندیم اقبال نے اس بار کمال کر دیا ہے۔ اتنا طویل ترین لکھا کہ پڑھتے ہوئے تھکاوٹ کا احساس ہوتے ہوتے تھم گیا لیکن رومانی ماحول اور سحر انگیزی نے لطف دوبالا کر دیا۔ یہ ضروری نہیں کہ جس سے محبت ہو اس سے شادی بھی ہو جائے۔ ''یاجوج ماجوج'' نے متاثر نہیں کیا۔ ''رو سیاہ'' کی قسط نمبر ۱ بھی عالم شاہین نے سپرد قلم کیا ہے اتنی طویل ترین تھی کہ دو نشستوں میں اختتام پذیر ہوئی۔ واقعی یہ ایک شوہر پرور نوجوان کی جنون خیزی کی لطف اندوز داستان ہے اور لمحہ بہ لمحہ پیچیدہ بدلنے کی طویل ترین سرگزشت ہے۔ باقی مضامین اور کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ جناب سراج رسول کی وفات کی خبر پڑھی ہے آپ سب سے اظہار تعزیت کرتا ہوں اور مرحوم کے لیے دعائے مغفرت۔ سراج رسول مرحوم کی طباعتی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔''

٭ رضا احمد اعوان کا مختصر نامہ دریا خان بھکر سے۔ ''نئے سال کا پہلا شمارہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ زویا اعجاز کی تحریر ''نوائے برگ'' خاصے کی چیز تھی۔ عائشہ انور نے ''سرور ادب'' خوب لکھا لیکن یہ نہیں بتایا کہ سرور بارہ بنکوی کراچی کے کس قبرستان میں دفن ہیں۔ کچھ عرصہ سرور صاحب اداکارہ شبنم کے استاد بھی رہے اور ان کو اردو زبان کے تلفظ درست کرواتے رہے۔ ''آخری اسٹیشن'' ان کی بہترین فلم تھی اور ہیروئن شاید شبنم ہی تھیں۔ فلم نگری میں ہدایت کار نعمان اور نجم نقوی کے متعلق پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ ''کل'' نعمان صاحب کی بہترین فلموں میں شمار ہوتی ہے۔ ''سفر پہلا پہلا'' میں ندیم اقبال اس مرتبہ اول سے آخر تک عشق و محبت میں ڈوبے رہے۔ ہمیں دریا خان، بھکر اور ڈیرہ اسماعیل خان کی سیر بھی کروا دیجیے۔ ''رو سیاہ'' کی پہلی قسط پڑھی۔ اٹھان اچھی ہے۔ اُمید ہے آگے چل کر بہترین کہانی ثابت ہوگی۔ سچ بیانیوں میں ''رانگ نمبر'' اچھی اور عبرت ناک کہانی تھی۔ ''رانگ نمبر'' نے کئی بستے بستے گھر برباد کیے ہیں۔ ''قبلہ الخواص'' میں مرزا صاحب جیسے مرد جو بیویوں سے دب کے رہتے ہیں۔ مجھے ایسے مردوں سے نفرت ہے۔ مرد گھر کا سربراہ ہوتا ہے اس کے باوجود عشرت بیگم جیسی عورتیں سیاہ سفید کی مالک ہوں اور اپنی مرضی کریں تو اس گھر کا انجام عبرت ناک ہی ہوا کرتا ہے۔ ''معمر خیال'' میں راجہ محمد اس بار بھی حاضر تھیں۔ ڈاکٹر روبینہ انصاری کو ''معمر خیال'' میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ عبدالحلیم ثمر کا تبصرہ خوب تھا۔ سید امتیاز بخاری کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔''

☆ فاروق بخش زکی آسیر نے جلال پور پیر والا ملتان سے لکھا ہے۔ ''عہدِ حسن'' میں ڈاکٹر جہانگیر جما اور ''ملکہ'' میں ملک الزجہ کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں۔ ''یاجوج ماجوج'' کے دونوں بھائی عجیب و غریب تھے۔ ندیم اقبال کا ''ستر پیلا پیلا'' خوب صورت اور پُرلطف جا رہا ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ ''ناسور'' اچھے انجام کے ساتھ ختم ہوئی اس کی جگہ ''رو سیاہ'' نے لے لی۔ پہلا حصہ جوں جوں پڑھتا گیا حیرت بڑھتی گئی۔ دل ڈوبتا گیا کہ آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا یہ سوچتے سوچتے پہلا حصہ ختم ہو گیا۔ ''درد آشنا'' کی تبسم نے اپنی آپ بیتی کو خوب صورت انداز و الفاظ میں سجایا۔ افسوس ہے اس کے خاوند رضوان پر جس نے سیرت کی قدر نہ کی۔ صورت سے آجاتو فائدہ وہ ترقی لینا چاہتا تھا اس سے بیٹھے گی ٹھیک ہوئی تبسم کی دوسری ساس نے اسے کہا تھا کہ جیسا اس نے بتایا کہ جیسے گزری تم پہ ویسے مجھ پر گزری میں جانتی ہوں کہ تم بھی کل کو میری طرح درد آشنا ہو۔ ''رانگ نمبر'' کی نائلہ نے رانگ قدم ہی اٹھائے جس سے سب کچھ برباد ہو گیا۔ ''بھوک، روٹی، دولت'' کے سومرہ اور گلنار کی دولت متاثر کر گئی۔ مزہ آیا جب دوست دوست کے کام آیا دولت کا بہترین حق ادا ہوا۔ ''کالا زری'' کے سرداد خان کو بیوی خوب صورت تو نہ ملی لیکن دولت اور اچھی ملازمت کے ساتھ ساتھ نیک سیرت بیوی ملی یا زری ہی تو ہے۔ انتخاب کے سلیم نے زیادہ کمائی کے لیے برا کام چنا تو انجام بھی برا ہوا۔ زندگی گزارنے کے لیے کمائی تھوڑی ہو جو خطرے سے خالی ہو وہ دولت سے بہتر عزت ہوتی ہے۔ ''ہم سفری'' کے میاں نصیر کی بیوی فوت ہوئی اور بچے بڑے ہو کر اپنے اپنے گھروں کے ہو گئے اور میاں نصیر تنہا رہ گیا۔ مولوی صاحب نے اسے دوسری شادی کا مشورہ دیا تو اس نے ''تنہائی کی موت'' کے ڈر سے مشورہ مانا۔ مولوی صاحب نے ایسی کو میاں نصیر کی ہم سفری بنوائی، جو اس کے سفرِ آخرت میں بھی ایک ہی دن کو ہم سفری بنی جسے مرنے کے بعد بھی شوہر کے ساتھ مگر تعجب ہوا دونوں کی قسمت اور نصیب۔ ''کھیل اور قسمت کا'' بہت ہی دلچسپ اور اس کی ذہیرہ تو قابلِ تعریف ہے۔ اگلے شمارے کا انتظار رہے گا۔''

☆ امجد علی نے سیالکوٹ سے لکھا ہے۔ ''اس بار کا سرگزشت استاد محترم غلام عباس کی سوانح حیات کا سن کر خرید لیا۔ میرے لیے یہ ڈائجسٹ بالکل نیا ہے۔ اب پڑھ کر احساسِ محرومی نے گھیر لیا کہ پہلے کیوں نہیں پڑھا۔ ادبی جریدوں پر اکتفا کر کے ڈائجسٹوں کو ادب دشمن سمجھتا تھا لیکن سرگزشت نے خیالات کا رخ بدل دیا۔ یہ تو عظیم ادبی شہکار ہے۔ ''نوائے برگ'' اور ''سرورِ ادب'' کے بعد نغماتِ اقبال نے بھی متاثر کیا۔ خوب تحریر ہے۔ تحقیق پر مبارک باد۔ ''معمار'' پڑھ کر احساس ہوا کہ علمی تحریر اس دلچسپ انداز میں بھی لکھی جاتی ہے ورنہ تو یہی دیکھا ہے کہ لکھی بے چاروں میں گھر زبان، جغرافیے کی خاطر تہذیب کو بگاڑنے والی خبریں ہی نظر آتی ہیں۔ مختصر کی تحریر ''یاجوج ماجوج'' اور [illegible] نے بھی متاثر کیا۔ کہاں کہاں سے دبی ہوئی باتوں کو سامنے لایا گیا ہے۔ ''ستر پیلا پیلا'' کی روانی، تسلسل اور جکڑ لینے والے انداز نے مسحور کر دیا۔ ایک نشست میں یہ سب پڑھا پھر وقت گزاری کے لیے سچ بیانیاں بھی پڑھیں مجھے سفرِ آخرت اور بھوک روٹی دولت بہت پسند آئی۔ احمد اقبال خان کی سچ بیانی مظلوم پڑھ کر حیرت ہوئی کہ اتنے اچھے ڈائجسٹ میں ایسی تحریر شاملِ اشاعت کیسے ہو گئی۔ ابتدا میں لکھا گیا کہ سلطان اور آمنہ کی محبت موبائل فون کے ذریعے پروان چڑھی لیکن اختتام میں جو منظر ہے کہ آمنہ کی موت کے وقت اس کے جوان بچے اسے گھیرے بیٹھے ہیں یعنی آمنہ 65-60 کی ہو گی۔ اب سوال ہے کہ اس کی جوانی میں موبائل کہاں سے آ گیا (بہت شکریہ غلطی کی نشاندہی کے لیے۔ ہم سب انسان ہیں دوسروں کے کام میں غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ ہوا یہ کہ اس کہانی کا اختتامی ٹکڑا دوسری کہانی میں لگ گیا اور اس کہانی کا ٹکڑا اس میں کیونکہ دونوں کے کردار کا نام نوا ارتھا۔ شاید اسی وجہ سے اس ٹکڑے کو اس کہانی کا ٹکڑا سمجھ کر پیسٹ کر دیا گیا۔ چیکنگ کے وقت آخری ٹکڑے میں غلطی تسلیم کرنے کے خیال سے نواز کے ساتھ فیضی کا اضافہ کر کے اس سچ بیانی کا حصہ بنا دیا گیا) ایسی غلطیوں سے اجتناب ضروری ہے۔ سال کے آخر میں کراچی آ رہا ہوں کیونکہ مجھے پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کرنے کے لیے لیاقت لائبریری اور بیدل لائبریری سے استفادہ کرنا ہے آپ کے دفتر میں بھی حاضری لگاؤں گا۔''

☆ ڈاکٹر روبینہ نجمیں انصاری جھنگ سے رقمطراز ہیں۔ ''مختصر لکھ رہی ہوں، وقت نہیں ملا۔ مکمل شمارہ پڑھ نہ سکی۔ زویا اعجاز کی ''نوائے برگ'' اور ''ستر پیلا پیلا'' پڑھا۔ زویا اعجاز خوب لکھ رہی ہیں۔ ندیم اقبال کے قلم کا کیا کہنا، جادو ہے جو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ الگ چمکتا رہا ہے۔ بھائی شمس محمد عزیز صاحب کا شکریہ کہ انہوں نے میرے تحفے کو قبول کیا۔ اس بار ثروت اقبال کو ان کے بہترین خطوط پر میں ادارے کو تین ماہ کی خریداری رقم بھجوا رہی ہوں۔ ادارہ انہیں مارچ سے شمارہ بھیجنا شروع کر دے گا۔ ''محفلِ خیال'' میں شمس عزیز بھائی کے علاوہ آفتاب نسیم اشرفی، اعجاز حسین سخارہ، امتیاز بخاری، عبدالحکیم قمر کے خطوط بہت زیادہ پسند آئے۔ ویسے عبدالجبار رومی، راشد شاہد، قیصر خان وغیرہ کے خطوط بھی کم نہ تھے۔''

☆ عطاء اللہ شاہ، وادی آبادیاں والی میاں والی سے رقمطراز ہیں۔ ''جنوری کا سرگزشت لے لیا۔ دل کی بے قراری کو قرار آ گیا۔ جنوری اور فروری کے مہینے علی سفیان آفاقی صاحب اور بانی سرگزشت معراج رسول صاحب کی یاد ساتھ لے کر آتے ہیں۔ حق مغفرت کرے دونوں نیک دل انسان تھے۔ اداریے کالم میں آپ نے قیامِ پاکستان کی اہمیت بیان کی ہے۔ مجھے آپ سے سو فیصد اتفاق ہے۔ مودی نے ہندوستان کو حیوانستان میں تبدیل کر دیا ہے۔ ہندوستان کے اندر سے بھڑکنے والی آگ ایک دن ہندوستان کو راکھ کر دے

گی۔ نفرت کا انجام ہمیشہ تباہی و بربادی ہوتا ہے۔ اس مرتبہ ایک عظیم سرگزشت ملائیشیا کے ڈاکٹر مہاتیر محمد کے بارے میں ہے جنہوں نے ملائیشیا کو ترقی اور خوش حالی کی راہ پر گامزن کیا۔ وہ مسلمانوں کی تاریخ سے آگاہ ہیں اور ایک نظریاتی شخصیت ہیں۔ اس لیے اغیار کی سازشوں سے اپنے ملک کو بچالیا ہے۔ امت مسلمہ کو ایسے ہی دور اندیش قائدین کی ضرورت ہے۔ ”شہر خیال“ پر نگاہ ڈالی۔ منشی محمد عزیز نے پہلے نمبر پر ہیں وہ تاحیات پہلے نمبر کے حق دار ہیں جس محنت اور ہمت سے وہ اعداد و شمار مرتب کرتے ہیں یہ ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ میری استدعا ہے کہ آخری نمبر پر پہنچنے والے کو ”شہر خیال“ کا میزبان کہا جائے۔ میزبان ہمیشہ سب سے آخر میں کھانا کھاتا ہے۔ اس مرتبہ میزبان کے فرائض جناب نزاہت افتخار نے انجام دیے ہیں۔ زوبیا بہن کا تہہ دل سے شکریہ انہوں نے یاد کیا۔ جس معاشرے میں ماؤں کی دعائیں، بہنوں کی وفائیں اور بیٹیوں کی ادائیں نہ رہیں وہاں زندگی اپنا کفن تلاش کرتی ہے۔ سرگزشت سے وابستہ تمام خواتین ہمارا سرمایہ افتخار ہیں دعا ہے ان پر اللہ کی رحمت کا سایہ ہے۔ ”شہر خیال“ میں شمع کی کمی امریکا سے آئے ندیم اقبال کو دیکھا تو بہت خوشی ہوئی۔ قارئین کرام ندیم اقبال اچھے سادہ نہیں جیتے نظر آتے ہیں۔ وہ قارئین کی ڈیمانڈ کو خوب سمجھتے ہیں۔ ان کا سفر نامہ کیوں نہ کامیاب ہوتا۔ وہ ایسا آفتاب ہیں جو مغرب میں ڈوب کر ہمیشہ مشرق سے ابھرتا ہے۔ دھنک اپنا رنگ نہیں بدلتی۔ وہ جہاں رہیں شاد و آباد رہیں۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی، عبدالحکیم قمر، رانا محمد شاہد، عبدالجبار رومی انصاری، قیصر خان کی یادآوری کا شکریہ تمام احباب شہر خیال کو سلام۔ پہلی تحریر ”نوائے برگ“ کے زیر عنوان ہے۔ نامور افسانہ نگار غلام عباس کی زندگی کی داستان اور دلچسپ پیرائے میں سپرد قلم کیا گیا ہے۔ تحریر میں فطری بہاؤ نظر آتا ہے۔ پڑھتے ہوئے کہیں طبیعت بوجھل نہیں ہوئی۔ فاضل قلم کار و نے معیار و اعتبار برقرار رکھا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ مضمون کی اٹھان دیکھ کر ڈاکٹر ساجد امجد بھی یاد آگئے۔ ”سرو ادب“ میں عائشہ انور صاحبہ نے مشرقی پاکستان کے ایک نامور شاعر سرور بارہ بنکوی کا مختصر احوال زیست بیان کیا ہے جس میں شاعر موصوف کی زندگی کے نشیب و فراز اور عروج و زوال سمو دیے ہیں۔ ان کی موت ایک المیہ ہے۔ دور دراز میں صدمے جھیلے، یہ حرکت انسان کی بے بسی اور بے کسی سامنے آتی ہے۔ ”انتخاب اقبال“ میں اعجاز احمد نے اقبال کی ان نظموں اور غزلوں کی داستان مختصراً بیان کی ہے جو ریڈیو پاکستان اور پی ٹی وی پر نغمات کی شکل میں وقتاً فوقتاً پیش کی گئیں۔ ”معمار“ میں انور فرہاد نے قلم ساز وجاہت کا تذکرہ اور نقصان کا احوال دلچسپ انداز میں لکھا ہے جو معلومات افزا ہے اور خاصہ دلچسپ ہے ہمیں مذکورہ شخصیات کے بارے میں بہت کچھ پڑھنے کو ملا ہے جو ہم پہلے اتنی تفصیل سے نہیں جانتے تھے۔ ”سفر پہلا پہلا“ میں ندیم اقبال نے حسب روایت رومانی مناظر کی بھرپور تصویر کشی کی ہے۔ اختتام پر قدرے ٹھہراؤ نظر آتا ہے اور ماحول میں سنجیدگی پر چھائیں دکھائی دینے لگی ہیں مانو کہ طوفان تھمنے کو ہے۔ ”مطبع“ کے زیر عنوان جناب ظفر عابدی نے پرنٹنگ پریس کی ایجاد اور عہد بہ عہد اس میں جدت کی کہانی لکھی ہے۔ اردو نستعلیق رسم الخط کی کمپیوٹر کے ذریعے تیز رفتار کمپوزنگ بلاشبہ کراچی کے دو خوش نویسوں کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یہ کام لندن کی سولو ”ٹاپ کارپوریشن“ کے تعاون سے تکمیل کو پہنچا۔ دونوں خطاطوں نے چھبیس ہزار الفاظ کے جوڑ پون انچ چوڑے قلم سے تحریر کیے۔ ان کا عکس کمپیوٹر میں قید کیا گیا۔ یہ تجربہ کامیاب رہا۔ پاکستان میں اس کا اولین استعمال روزنامہ جنگ میں اس کے لاہور سے اجرا کے دوران ہوا۔ اسے نوری نستعلیق کا نام دیا گیا۔ سرگودھا میں مخصوص طرز کا شائع برقی پریس (ویژن مجرکا) واحد پرنٹنگ پریس تھا۔ خوشاب کا پہلا مطبع جوہر پرنٹنگ پریس میانوالی کا میانوالی پرنٹنگ پریس اور بھکر کا بھکر پرنٹنگ پریس قرار دیا جاتا ہے۔ میانوالی میں وارث پرنٹنگ پریس کے نام سے ایک ٹریڈل مشین بھی دیکھی گئی تھی۔“

٭ نزاہت افتخار کا ڈاؤن صدور ضلع اٹک سے لکھتے ہیں۔ ”مسلسل تبصرے سے گریزاں ہوں۔ غم روزگار کی بھی نے ہوش حواس کو بیدار رکھا ہے لیکن اس محفل کے شیدائیوں کی محبت میں اتنی کشش ہے کہ تمام مصروفیات کے باوجود قلم اٹھالیتا ہوں۔ منشی محمد عزیز صاحب، آفتاب نصیر اشرفی، عبدالحکیم قمر، عبدالجبار رومی انصاری، رانا محمد شاہد اور سید امتیاز حسین بخاری جیسے عظیم لوگوں کا شکریہ جو مجھ خاکسار کو یاد رکھتے ہیں اور سراہتے ہیں۔ زوبیا اعجاز جی آپ جیسی ہستی کا میرا مداح ہونا میرے لیے ایک اعزاز ہے آپ نے خوب صورت الفاظ میں یاد کیا بہت بہت شکریہ۔ ڈاکٹر روبینہ شمس انصاری ادب بہا آپ بھی مجھے لڑکی سمجھتی رہیں؟ حیرت کی بات ہے ویسے میرا نام تو لڑکیوں والا نہیں ہے اور اس 7 فروری کو میری 26 ویں سالگرہ ہوگی۔ ندیم اقبال صاحب آپ جب بھی پاکستان آئیں تو ضرور ملاقات کریں۔ ہم آپ کو اپنے علاقے کی سیر و سیاحت ضرور کرائیں گے۔ ”نوائے برگ“ معروف ادیب غلام عباس کی سوانح عمری زبردست تھی۔ اوورکوٹ اور یہ ”[illegible]“ جیسے معروف افسانوں کے خالق عظیم انسان تھے۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ غلام عباس منٹو سے کہیں بڑے درجے کا تخلیق کار تھا لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر منٹو کو اوپر اٹھایا گیا۔ ”سرو ادب“ مختصر مگر اچھی تحریر تھی۔ ”مطبع“ ایک معلوماتی تحریر تھی۔ ”سفر پہلا پہلا“ ندیم صاحب کے سنگ لطف دے رہا ہے۔ ”ورد آشنا“ سبق آموز تحریر تھی۔ ”رانگ نمبر“ یہ ثابت کر رہی تھی کہ مرد حضرات شیطان کے بھائی ہوتے ہیں اور ان کے وعدے وقتی ہوتے ہیں اور نیلو جیسی لڑکیوں کو پہلے جھوٹی محبت میں پھنساتے ہیں اور پھر بہتان تراشی کرتے ہیں۔ ”انتخاب“ اور ”کھیل قسمت کا“ بہترین تحریریں تھیں۔ تمام دوست احباب کا بہت شکریہ جو مجھے یاد رکھتے ہیں اور ”شہر خیال“ کی رونق سدرہ بانو، گوندل اور بشریٰ افضل میری دونوں بہنیں کہاں ہیں؟ تمام احباب کو سلام عقیدت۔“

اوجِ انساں

ضیاء تسنیم بلگرامی

انسانی عظمت کے راز کو سمجھنے کے لیے عظیم انسانوں کو پڑھنا، انہیں سمجھنا ضروری ہے کیونکہ ان کی زندگی اور شخصیت عظمت کے نور سے منور ہوتی ہے جو دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے۔ یہ لوگ کچھ نہ ہو کر بھی بہت کچھ ہوتے ہیں۔ وہ بھی ایک عام سی شخصیت تھی، عام سے انسان تھے دنیا کی چمک دمک اور جاہ و ثروت کے اسیر مگر تقویٰ نے خواب گراں سے بیدار کیا اور انہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ وہی شخص جو عضو معطل سمجھا جاتا تھا وہ کس اوج پر نظر آیا! توکل اور استغنا کا پیکر، علم کا پہاڑ۔ اسی لیے بزرگوں نے کہا ہے کہ انسان کی پہچان آسان نہیں، گتھیوں میں لپٹی ڈور ہے۔ جس کا سرا ڈھونڈنا مشکل ترین امر ہے۔

ایک عامل شخص کی زندگی کا عکس، اسے اوجِ ثریا مل گیا تھا

کوئی گویا بازار میں گا گا کر لوگوں کو محظوظ کر رہا تھا اسے لوگوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ان میں نوجوان داؤد طائی بھی موجود تھے۔ گویے نے یہ شعر پڑھا (ترجمہ)

کون سا چہرہ خاک میں نہیں ملا
اور کون سی آنکھ زمین پر نہیں بہی

اس شعر میں معلوم نہیں کیا جادو تھا یا کون سی کہربائی قوت تھی کہ داؤد طائی کی حالت غیر ہو گئی وہ بے ہوش ہو کر گر گئے لوگوں میں ہلچل مچ گئی اور داؤد طائی کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے جانے لگے۔ بمشکل جب انہیں ہوش آیا تو ان میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اپنے آپ سے چل سکتے لوگوں نے پوچھا۔ "تم کون ہو اور کہاں رہتے ہو؟"

داؤد طائی نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ "میرا نام داؤد ہے اور قبیلہ بنی طے سے تعلق رکھتا ہوں۔"

ایک تماشائی نے پوچھا۔ "یہ تمہیں ہو کیا گیا؟ تم بے ہوش کیوں ہو گئے تھے؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "لوگو! یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جب تک میں بے ہوش تھا لوگ مجھے ہوش مند سمجھتے رہے اور اب جب کہ میں ہوش میں آچکا ہوں تو لوگ مجھے بے ہوش کہہ رہے ہیں۔"

لوگوں نے آپس میں چہ میگوئیاں شروع کر دیں ایک نے کہا۔ "ذہن پر بے اختیار گرنے سے دماغ پر چوٹ آ گئی ہے جس سے اس کا دماغی توازن جاتا رہا ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "نہیں جناب یہ صرع (مرگی) کا مریض معلوم ہوتا ہے اور شاید کچھ کچھ دماغی حالت بھی خراب ہے۔"

آپ نے آہستہ سے کہا۔ "لوگو! نہ تو میں مرگی کا مریض ہوں اور نہ ہی میرا دماغی توازن بگڑا ہے، میں اچھا بھلا ہوں۔ ہاں تم لوگ یہ ضرور کہہ سکتے ہو کہ اب میں دنیا کے کام کا نہیں رہا۔"

ایک نے پوچھا۔ "جناب! آپ کی حالت اس لائق نہیں ہے کہ اپنے پیروں سے چل کر گھر تک جا سکیں اس لیے ہمیں اپنے گھر کا پتا بتا دیجیے تاکہ ہم پہنچا دیں۔"

داؤد طائی نے پوچھا۔ "کیا تمہیں امام ابو حنیفہ کا پتا معلوم ہے؟"

کئی نے ایک ساتھ جواب دیا۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں ان کا پتا کون نہیں جانتا۔"

آپ نے کہا۔ "مجھے ان کے پاس پہنچا دو یہی میرا پتا ہے۔"

لوگوں نے سوال جواب تو بہت کیے لیکن آپ نے پھر کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ انہی لوگوں نے اسے سواری پہ بٹھا کر امام ابو حنیفہ کے گھر پہنچا دیا۔ امام صاحب نے داؤد طائی کو غور سے دیکھا اور دریافت کیا۔ "نوجوان! میں نے تمہیں پہچانا نہیں؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "ہاں، آپ مجھے نہیں جانتے

لیکن میرے لیے یہی کافی ہے کہ میں آپ کو جانتا ہوں اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

امام صاحب نے پوچھا۔ "مجھ سے کوئی کام؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "ابھی ابھی بازار میں، میں نے ایک گویے سے یہ شعر سنا، کون سا چہرہ خاک میں نہیں ملا اور کون سی آنکھ زمین پر نہیں بہی۔ بس اس شعر نے میری حالت ہی تغیر کر دی، میں بے ہوش ہو گیا تھا لیکن اب میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں اپنے ہوش میں آچکا ہوں اور میں پہلے واقعی بے ہوش تھا۔"

امام صاحب نے کہا۔ "گویا اب تجھے عرفان ذات ہوا ہے۔"

داؤد نے جواب دیا۔ "شاید۔"

امام صاحب نے پوچھا۔ "تو میرے پاس کیوں آیا ہے؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "یہ معلوم کرنے کہ اب میں کیا کروں؟"

امام صاحب نے حیرت اور سوالیہ نظروں سے داؤد کی طرف دیکھا، کہا۔ "اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں، ہاں میں یہ مشورہ دوں گا کہ تم گوشہ نشینی اختیار کر لو، فقر کی پہلی منزل ترک دنیا ہے جب تم اس میں کامیاب ہو جاؤ گے تو میں کچھ اور بتاؤں گا۔"

داؤد طائی نے درخواست کی۔ "حضرت! آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر لیکن ایک درخواست کروں گا۔"

امام صاحب نے جواب دیا۔ "کرو درخواست۔"

داؤد نے عرض کیا۔ "میں آپ کا کمند چاہتا ہوں آپ مجھے اپنی شاگردی میں لے لیجیے۔"

امام صاحب نے جواب دیا۔ "میں نے تجھے اپنی شاگردی میں لے لیا تو میری ہم نشینی اختیار کر سکتا ہے۔"

داؤد طائی سراپا تشکر و امتنان بن گئے، بولے۔ "حضرت! آپ نے میری ہر درخواست بے چوں و چرا مان لی، آخر کیوں؟"

امام صاحب نے جواب دیا۔ "تو حاتم طئی کا ہم نسب ہے اور عدی میرے ہی خاندان کا ایک بزرگ فرد تھا، میں قبیلہ بنی طے کی عزت کرتا ہوں کیونکہ حاتم اور عدی بن حاتم بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔"

داؤد طائی نے دنیا چھوڑ دی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی یہ بیس سال تک امام ابوحنیفہ کے شاگرد رہے۔

☆—☆

ایک عرصہ تک گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر کے انہوں نے امام صاحب سے دریافت کیا۔ "حضرت! ابھی کتنے عرصے اور گوشہ نشینی میں رہنا ہے۔"

امام صاحب نے جواب دیا۔ "تم گوشہ نشینی ختم کر دو اور لوگوں سے رابطہ قائم کرو لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ خود میں ضبط و تحمل پیدا کر لو۔"

داؤد طائی نے نرمی سے عرض کیا۔ "حضرت میں نے ایک عرصے کی گوشہ نشینی میں اپنے نفس کو اذیتیں پہنچائی ہیں اس لیے اب مجھ میں اتنا زیادہ ضبط و تحمل پیدا ہو چکا ہے کہ لوگ مجھے پریشان نہیں کر سکتے۔"

امام صاحب نے فرمایا۔ "اگر تم یہ سمجھتے ہو تو لوگوں سے ربط و ضبط بڑھاؤ۔"

داؤد نے لوگوں سے ربط و ضبط بڑھانا شروع کر دیا۔ اس عالم میں امام ابوحنیفہ نے آپ کو مشورہ دیا کہ مشہور صوفی حبیب راعی سے بیعت کر لو چنانچہ یہ حبیب راعی کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے اب آپ کا یہ حال تھا کہ لوگوں کی سن تو ضرور لیتے تھے لیکن خود بہت کم بولتے تھے۔

آپ کو ورثے میں بیس دینار ملے آپ نے انہیں احتیاط سے... رکھ لیا کچھ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا اور طنزاً کہا۔ "جناب آپ نے دینار محفوظ کر لیے ہیں حالانکہ فقر کی شان یہ ہے کہ انہیں خرچ کر کے بے نیازی اختیار کی جائے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "لیکن میں انہیں نہیں خرچ کروں گا کیونکہ میں نے حساب لگا کر جو دیکھا تو معلوم ہوا یہ بیس دینار مجھے زندگی بھر کے لیے کافی ہیں اور پھر ان دینار کی موجودگی سے میں ایک قسم کی طمانیت محسوس کرتا رہتا ہوں اس لیے میں انہیں زندگی بھر خرچ نہیں کروں گا۔"

معترض خاموش ہو گئے۔

آپ کی قناعت اور استغنا کا یہ حال تھا کہ آپ ہمیشہ روٹی کو پانی میں بھگو کر کھاتے تھے۔

ایک دن دوسرے ہم عصر صوفی ابوبکر آپ سے ملنے پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ داؤد طائی اپنے ایک ہاتھ سے روٹی پکڑے زار و قطار رو رہے ہیں۔

ابوبکر نے پوچھا۔ "حضرت! کیا بات ہوئی؟ یہ روٹی پکڑے آپ رو کیوں رہے ہیں؟"

آپ نے بدستور روتے ہوئے جواب دیا۔ "ابوبکر!

میں اس لیے رو رہا ہوں کہ اگر روٹیاں کھانے کا مسئلہ نہ ہوتا تو یہ وقت بھی عبادت ہی میں صرف ہوتا۔ مجھے یہ سوچ سوچ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ اے کاش میرے اور خدا کے درمیان پیٹ نہ ہوتا۔"

ابوبکر نے دیکھا۔ "داؤد کے پانی کا گھڑا دھوپ میں رکھا ہوا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"داؤد! یہ گھڑا دھوپ میں کیوں رکھ چھوڑا ہے؟"

داؤد نے جواب دیا۔ "جب میں نے یہ گھڑا یہاں رکھا تھا، دھوپ نہیں تھی، اب دھوپ آ گئی ہے میں نے سوچا اگر میں اسے دھوپ سے سایہ میں رکھوں گا تو محض اپنی ذات کے لیے کچھ وقت ضائع کروں گا اس لیے میں خاموش بیٹھا اللہ اللہ کرتا رہا۔"

ابوبکر نے کہا۔ "سبحان اللہ! اور ایک میں ہوں کہ ادھر اُدھر ملاقاتوں میں اپنا وقت ضائع کرتا پھرتا ہوں۔"

آپ نے امام صاحب کی اجازت کے باوجود لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی تھی آپ کو لوگ مختلف مجلسوں میں لے جانا چاہتے مگر آپ ان سے عذر کرتے۔ آپ کی یہ بات لوگوں کو گراں گزرتی۔ آپ کی اس عادت کا سبھی کو علم تھا۔

ایک دن آپ کے پاس چند آدمی آئے بولے۔ "حضرت! کیا بات ہے؟ آپ خدا سے تو محبت کرتے ہیں مگر اس کی مخلوق سے دور رہتے ہیں حالانکہ یہ بات ثابت ہے کہ ایک عاشق کو اپنے محبوب کی چیزوں سے بھی محبت ہوتی ہے اس لیے اگر آپ کو خالق سے محبت ہے تو اس کی مخلوق سے بھی پیار ہونا چاہیے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں مخلوق سے نفرت تھوڑی کرتا ہوں، مجھے اس کی مخلوق سے پیار ہے لیکن میں خالق کی یاد میں وقت دیتا ہوں ابھی میں خالق کی محبت کے مزے لے رہا ہوں اور اتنی فرصت کہاں کہ اس کی مخلوق کی طرف دیکھوں۔"

ایک شخص نے کہا۔ "آپ اگر اپنے سے کم عمر لوگوں میں بیٹھیں تو میرے خیال میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ کم عمر لوگوں کی باتیں آپ کے معیار سے کم ہوں گی اس لیے آپ انہیں حقیر اور کم تر سمجھ کر ان کا اثر نہیں قبول کریں گے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "یہ بات نہیں ہے بلکہ میں ان کی محبت سے اس لیے گریز کرتا ہوں کہ وہ مجھے کچھ دے نہیں سکیں گے اور جن سے میں کچھ حاصل نہ کر سکوں ان کے پاس اٹھنا بیٹھنا وقت کا زیاں سمجھتا ہوں۔"

اس شخص نے کہا۔ "چھوڑوں سے اگر کچھ حاصل نہ ہوگا تو کوئی نقصان بھی نہ ہوگا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "نقصان تو ہوگا اور نقصان یہ ہوگا کہ وہ میرا احترام کریں گے اور اس احترام میں وہ مجھے کچھ سکھا نہیں پائیں گے۔"

اس شخص نے کہا۔ "تب پھر آپ عمر رسیدہ لوگوں کی صحبت اختیار کریں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "وہ مجھے میرے عیوب سے آگاہ نہ کرسکیں گے اس لیے ان کی صحبت بھی میرے لیے بے کار ہے۔"

کسی اور شخص نے کہا۔ "لیکن آپ کی باتیں ہیں بڑی عجیب۔ آپ نے اب تک شادی بھی نہیں کی، معلوم نہیں کیوں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں کیا شادی کروں، میری مالی حالت تو لوگوں کو معلوم ہی ہے اور یہ بات بھی سب پر ظاہر ہے کہ میرا ذریعہ معاش بھی کچھ نہیں پھر میں کسی عورت سے شادی کر کے اسے بھی اپنی ہی جیسی سخت حالت میں کیوں مبتلا کروں اور جس حالت کو میں بخوشی گوارا کیے ہوئے ہوں اسے ایک عام عورت پر کیوں مسلط کروں۔"

ایک اور شخص نے کہا۔ "جناب! آپ جس مشکل زندگی کو اختیار کیے ہوئے ہیں کوئی اور نہیں اختیار کرسکتا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میری زندگی میرے لیے اور دوسروں کی زندگی ان کے لیے۔"

"آپ تو اپنے لیے بھی کچھ نہیں کرتے، ہمیشہ بال الجھے الجھے رہتے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "بھائی! یہ ساری باتیں فرصت کی ہیں اور میں یادِ الٰہی سے فرصت ہی نہیں پاتا، پھر میں داڑھی میں کنگھی کس طرح اور کب کیا کروں؟"

ایک عرصہ بعد آپ کی نظر آسمان کی طرف اٹھ گئی اس وقت آپ چھت پر کھڑے تھے چودھویں کا چاند مشرق سے ابھر رہا تھا اور اس کی کمزور چاندنی سیاہی میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوتی تھی گویا چاندنی تاریکی میں غوطہ لگا کر نمودار ہو رہی تھی آپ اس دلکش منظر میں کھو گئے۔ چاند کے اوپر ہر طرف تاروں کی محفل سجی ہوئی تھی اور وہ اس طرح چشمک زنی کر رہے تھے گویا داؤد طائی کی طرف اشارے کر کر کے کہہ رہے ہوں کہ اس صوفی کو تو دیکھو، زہے نصیب جو اس نے ہماری طرف نظریں تو اٹھائیں، ہمیں دیکھنے والے داؤد طائی! تمہارا بہت بہت شکریہ۔

داؤد طائی نے چاند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اے چاند! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تو نے یہ نور کہاں سے حاصل کیا ہے؟ کیا تو انسانوں کے لیے یہ پیغام لے کر نہیں آیا کہ اس خاکی کو بھی نورانی ذات کا قرب اور اتصال حاصل کر کے نور بن جانا چاہیے۔"

آپ پر جذب و مدہوشی طاری تھی اور آپ اس کیفیت میں اپنی چھت پر ادھر ادھر ٹہلنے لگے آپ کی زبان سے بے اختیار یہ کلمات جاری تھے۔ "اے آسمان کے دلکش ستارو! تم مجھے دیکھ دیکھ کر آنکھیں کیوں جھپکا رہے ہو؟ کیا تم مجھ پر ہنس رہے ہو؟ کیا تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کیا تم بھی مجھے دیکھ رہے ہو؟ میں تو تمہیں دیکھ دیکھ کر یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میرا وہ خالق جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ جس نے تمہیں آنکھیں جھپکانے اور سیاب وش کی کیفیت عطا کی ہے وہ کتنا عظیم اور اعلیٰ ہے۔ اے کاش میں تم میں سے ہوتا کہ خاموشی سے ذکر کر رہا ہوتا جس پر میرے رب نے مجھے مامور کیا ہوتا لیکن مجھے انسان بنادیا اور انسان کے پیچھے اتنے بہت سارے آزار لگا دیے گئے کہ یہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے۔ اے کاش میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ اے کاش! اگر میں پیدا ہوا تھا تو مجھے پیدائشی طور پر یہ توفیق ملی ہوتی کہ میں اپنے رب کے سوا کسی اور کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھاتا۔"

آپ پر وارفتگی طاری ہوگئی اور اس وارفتگی میں آپ بے ہوش ہو کر پڑوسی کی چھت پر جا گرے۔ گرنے کے دھماکے سے پڑوسی یہ سمجھا کہ اس کی چھت پر شاید کوئی چور پھاندا ہے اس نے تلوار نیام سے نکال لی اور آہستہ آہستہ چھت پر چڑھنے لگا۔ وہ چھت پر پہنچا تو کسی کو منہ کے بل پڑا ہوا دیکھا۔ وہ سمجھا یہ کوئی چور ہے جو اسے دیکھ کر بن کے پڑ رہا ہے۔ وہ داؤد طائی کے سر پر جا کھڑا ہوا۔ کڑک کر بولا۔ "اے شریر! اٹھ اور دیکھ کہ موت تیرے سر پر کھڑی تیری گردن کا انتظار کر رہی ہے۔"

لیکن آپ پر تو بے ہوشی طاری تھی، آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس شخص نے آپ کو ٹھوکر لگائی اور غصے میں کہا۔ "بن کے پڑے رہنے سے تجھے معاف تھوڑی کر دوں گا، اٹھ اور بتا کہ تو یہاں کیا لینے آیا تھا اور تو کہاں سے آیا ہے؟"

لیکن آپ پر اس کی ٹھوکر کا بھی اثر نہ ہوا آپ اسی

طرح پڑے رہے۔ پڑوسی نے آپ کے سر پر ایک شدید ٹھوکر لگائی۔ بولا۔ "میں کہتا ہوں اب بننے کی ضرورت نہیں ہے اٹھ اور بتا کہ تو یہاں کیا لینے آیا تھا اور تو کہاں سے آیا ہے؟"

لیکن آپ بدستور پڑے رہے، پڑوسی نے چاندنی میں آپ کے سر سے خون بہتے دیکھا تو ذرا چونکا کیونکہ کسی آدمی میں کتنی ہی قوت برداشت کیوں نہ ہو، سر میں اتنی شدید چوٹ کھا کر اف یا سی سوں تو کرتا ہی ہے مگر یہ کیسا چور ہے کہ سر سے خون بہہ رہا ہے مگر خاموش پڑا ہے اس نے ایک ہاتھ سے آپ کو سیدھا کیا اور صورت دیکھتے ہی آپ کو پہچان لیا۔ حیرت سے بولا۔ "ارے یہ آپ! داؤد یہ آپ ہیں؟ یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ خیریت تو ہے؟ میری چھت پر کیسے؟"

آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ پڑوسی نیچے گیا۔ پانی لے کر پھر چھت پر پہنچا اور آپ کے منہ پر چھینٹے دیئے۔ کچھ دیر بعد آپ میں حرکت پیدا ہوئی اور آپ نے آنکھیں کھول دیں۔ پڑوسی نے خوش ہو کر پوچھا۔ "داؤد طائی! یہ آپ میری چھت پر کس طرح آ گئے؟ خیریت تو ہے؟"

آپ نے آہستہ سے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتا کہ تمہاری چھت پر کس طرح آ گیا؟ لیکن یہ جانتا ہوں کہ میں چاند ستاروں کے نظاروں میں کھویا ہوا تھا اور اس میں کچھ اتنا وارفتہ ہو گیا کہ تمہاری چھت پر بے ہوش ہو کر گر گیا۔ اب تم جو چاہو سزا دے لو، میں تمہارا مجرم یا گناہ گار ہوں۔"

پڑوسی نے شرمندگی سے کہا۔ "حضرت! میں تو اس پر شرمندہ ہوں کہ لاعلمی میں، میں نے نہ صرف یہ کہ آپ کو برا بھلا کہا بلکہ آپ کے ٹھوکریں بھی لگائیں اور آپ کو لہولہان کر دیا۔ خدا کے لیے آپ مجھے معاف کر دیجیے۔"

آپ نے کہا۔ "معافی تو مجھے مانگنی چاہیے کیونکہ میں تیری چھت پر آ گیا ہوں اور تیری اجازت کے بغیر، میں اس کوتاہی اور غلطی پر نادم ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔"

پڑوسی رونے لگا، بولا۔ "میں اس وقت تک آپ کو جانے نہیں دوں گا جب تک آپ مجھے معاف نہیں کر دیں گے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اچھا چلو ہم دونوں ایک دوسرے کو معاف کر دیں۔"

چنانچہ ان دونوں نے ایک دوسرے کو معاف کیا اور پڑوسی نے آپ کو نہایت احترام سے آپ کے گھر تک پہنچایا۔

☆——☆

آپ کے پاس ایک ہی چادر تھی۔ آپ اس چادر کو اوڑھ کر باجماعت نماز ادا کیا کرتے تھے۔ بغداد کے لوگ آپ کو بعض وجوہ سے ناپسند کرتے تھے، انہیں آپ کے توکل اور نامانوس باتوں سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ جب آپ نماز پڑھنے جاتے تو لوگ آپ پر ہنستے۔ آپ ان پر کوئی توجہ دیئے بغیر نماز باجماعت ادا کرنے مسجد چلے جاتے اور نماز ادا کر کے فوراً ہی واپس آ جاتے۔

ایک دن ظہر کی نماز پڑھ کر آپ واپس آنے ہی والے تھے کہ چند لوگوں نے آپ کو روک لیا، بولے۔ "حضرت! آپ سے ہمیں کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں براہِ کرم ہمیں بات چیت کا موقع دیجیے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں تم لوگوں کو بات چیت کا بہت تھوڑا وقت دے سکتا ہوں، بولو کیا بات کرنا چاہتے ہو۔"

ایک نے دریافت کیا۔ "آخر آپ کو جلدی کس بات کی ہے کیا آپ کہیں ملازمت کرتے ہیں یا کسی دربار سے وابستہ ہیں جہاں تاخیر سے پہنچنے پر آپ کو جواب دہ ہونا پڑے گا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "بھائی! میں نے سب سے بڑے دربار کی ملازمت اختیار کر رکھی ہے اور وہاں مجھے جواب دہ نہیں ہونا پڑے گا مگر پھر بھی میں اس سے اس لیے خوف زدہ رہتا ہوں کہ اگر وہ میری کسی بات پر ناراض ہو گیا تو وہاں کسی کی سفارش بھی کام نہ آئے گی اور وہاں میری کوتاہیوں یا خامیوں کی تلافی کا ازالہ بھی ناممکن ہو گا۔"

وہ ہنسنے لگے۔ ایک دوسرے شخص نے کہا۔ "حضرت! کیا بات ہے جو آپ نے دنیا کو دیکھنا ہی ترک کر دیا اور معلوم نہیں کن خیالوں میں گم رہتے ہیں۔ آپ تارکِ دنیا ہو کر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ پوری دنیا غلط راہ پر جا رہی ہے اور صرف آپ نے صحیح راہ اختیار کر رکھی ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "نہیں بھائی! میں ایسا بھی نہیں سمجھتا۔ یہاں کون غلط ہے اور کون درست؟ اس کا فیصلہ کرنا ہمارا تمہارا کام نہیں ہے میں نے جو راستہ اختیار کیا ہے اسے میں اپنے لیے بہتر سمجھتا ہوں کیونکہ میرے دل میں جیسی خشیت پائی جاتی ہے اگر تم میں سے کسی کے دل میں پیدا ہو جائے تو تمہاری بھوک پیاس اڑ جائے اور تم پر تمہاری

نیندیں حرام ہو جائیں۔"

کسی نے طنزاً ہنس کر کہا۔ "بھائی ہماری بھوک پیاس اور نیند تو آپ کو دیکھ کر اڑی ہوئی ہے۔ ایک چادر، ٹوٹا پھوٹا مکان، مٹکا، پانی کا گھڑا، گھر میں مستقل قحط سالی۔ واللہ ہم جب بھی آپ کی بات سوچتے ہیں بے سکون ہو جاتے ہیں۔"

آپ نے بڑے افسوس سے کہا۔ "افسوس کہ تم لوگ جس قسم کی باتیں کر رہے ہو اس میں وقت کی بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں، کیا تم لوگ مجھے معذور نہیں سمجھو گے؟"

لوگوں نے ہنس کر جواب دیا۔ "ہم لوگ آپ کا وقت نہیں ضائع کر رہے ہیں بلکہ ان سوال و جواب سے ہم کچھ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کیا آپ بخیل بنے رہیں گے اور ہمیں کچھ بھی نہ دیں گے؟"

آپ نے کہا۔ "میں جانتا ہوں تم لوگ مجھ سے کچھ بھی نہیں حاصل کر سکو گے بلکہ مجھے فضول کی غرض سے روک رکھا ہے۔"

ایک نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "خوب! خوب یار تم تو بہت ہوشیار نکلے میں تو تمہیں بھی کچھ سمجھ رہا تھا، اچھا بتاؤ تم اور کیا سمجھے؟"

دوسرے نے بھی قہقہہ لگایا۔ "یارو یہ دنیا کو چھوڑ دینے والے کبھی نہیں ہوتے، ذرا کم ہمت ضرور ہوتے ہیں اور دنیا کا مقابلہ کرنے کا ان میں حوصلہ نہیں ہوتا۔ انہی میں یہ داؤد بھی شامل ہیں۔"

داؤد نے جواب دیا۔ "بھائی اب میں تمہاری باتوں کا کیا جواب دوں، ورنہ تم خود سوچ کہ یہ دنیا جہاں قدم قدم پر ترغیب و تحریص کے جال بچھے ہوئے ہیں اور اگر اس سے ایک قدم پیچھے ہٹاؤ تو یہ اس قدم آگے بڑھ کر پکڑ لیتی ہے اس سے پیچھا چھڑانا بڑے حوصلے کی بات ہے یہ تعجب کی بات ہے کہ تم لوگ ترک دنیا کو کم ہمتی پر محمول کر رہے ہو۔"

ایک نے زور کا قہقہہ لگایا بولا۔ "میں تو پہلے ہی داؤد کی عقل کا قائل تھا، دیکھو تو کیسی عقل کی باتیں کر رہا ہے، اے کاش یہ شخص ہم میں شامل ہو جاتا اور ہم اس سے عقل کی باتیں کرنا سیکھ سکتے۔"

داؤد نے اپنی راہ لی بولے۔ "تو گویا خدا کے لیے مجھے تنگ نہ کرو تم نے مجھے کس خرافات میں لگا دیا۔"

سب نے مل کر قہقہہ لگایا اور سیٹیاں بجائیں، بولے۔ "میاں! اس صوفی کو یوں ہی روز روک لیا کرو اور مختلف مسائل پر باتیں کیا کرو، واقعی مزہ آ گیا اس سے باتیں کر کے۔"

کسی نے آپ کی چادر پکڑ کر کھینچ لی۔ آپ روہانسے ہو گئے تیز تیز قدم اٹھاتے گھر آئے اور دروازے کو اندر سے بند کر لیا، سجدے میں گر کر گڑگڑانا شروع کیا۔ "خدایا! یہ تو مجھے کس بات کی سزا دے رہا ہے میں تو تیرے لیے زیادہ سے زیادہ وقت وقف کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ دنیا والے شیطان کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ مجھے چھیڑتے ہیں ستاتے ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں انہیں کیا جواب دوں اور انہیں کس طرح منع کروں۔ اب تو ان لوگوں نے میرے خلاف ایسا منصوبہ بنا لیا کہ مجھے مسجد جاتے ہوئے ڈر لگنے لگا ہے میں مسجد میں باجماعت نماز کے لیے جاتا ہوں لیکن چند لوگوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ وہ مجھے ستائیں اگر ان حالات میں، میں مسجد میں جانا بند کر دوں تو اسے گناہ میں تو نہیں شمار کیا جائے گا؟ میں نہیں جانتا کہ اس معاملے میں، میں تیری منشا کس طرح معلوم کروں اگر تجھے اس میں کوئی اعتراض نہ ہو کہ میں مسجد نہ جاؤں تو تو میری چادر چوری کرا دے، کیونکہ نہ یہ چادر ہوگی اور نہ میں عریاں مسجد جانے کی ہمت کروں گا اور اس طرح میں تیری حیثیت سے بھی آگاہ ہو سکوں گا۔"

آپ عشاء کی نماز پڑھ کر واپس آئے اور بیت الخلاء چلے گئے۔ پیٹ میں قراقر ہو رہی تھی جب وہاں سے فارغ ہو کر نکلے تو سردی سی محسوس ہونے لگی، چادر اتار کر بستر پر ڈال گئے تھے لیکن واپس آ کر چادر اوڑھنے کے لیے جو تلاش کی تو وہ غائب تھی اسے کوئی چرا لے گیا تھا۔ سردی میں چادر کا گم ہو جانا آپ کے لیے بڑا تکلیف دہ ثابت ہوا لیکن پھر فوراً ہی یہ خیال آیا کہ اس طرح انہیں حیرت انگیز طور پر خدا کی مشیت معلوم ہو چکی ہے۔ آپ نے دوسرے ہی دن سے مسجد جانا بند کر دیا اور اپنے گوشے ہی میں نماز پڑھنا شروع کر دی۔ اب وہ زیادہ خشوع و خضوع سے عبادت کرنے لگے تھے۔

باہر بڑی سخت دھوپ پڑ رہی تھی آپ دھوپ میں بیٹھے عبادت کر رہے تھے آپ کے ارادت مندوں نے آپ کو اس حال میں دیکھا تو بڑا قلق ہوا۔ وہ آپ کو ٹوکنا چاہتے تھے لیکن ٹوکنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کیونکہ اس طرح اندیشہ تھا کہ آپ کی عبادت میں خلل پڑے گا۔ پسینے نے آپ کو شرابور کر دیا تھا کپڑا بھیگ کر چپک رہا تھا اور پیشانی سے بہتے ہوئے پسینے کے قطرات گالوں تک آ چکے تھے آپ کے ایک انتہائی محبت کرنے والے مرید نے بلند آواز میں

کہا۔ "حضرت! سائے میں آجایئے کیا گرمی آپ کو نہیں پریشان کر رہی؟"

آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس نے پھر کہا۔ "جناب! کیا میری آواز آپ نے نہیں سنی؟ میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ خود پر رحم کیجیے۔ کہیں آپ کو کچھ ہو نہ جائے سائے میں آجایئے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اے شخص! مجھے پریشان نہ کر، میری مشغولیت میں خلل نہ ہو۔"

مرید نے عرض کیا۔ "میں آپ کی مشغولیت میں خلل ہونے کی جرأت نہ کرتا لیکن میں آپ کو گرمی کی مصیبت میں مبتلا دیکھ رہا ہوں اس لیے آپ کو اس اذیت میں دیکھ کر اپنے دل میں تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔ اگر آپ وہاں سے نہیں ہٹیں گے تو ہم سب بھی بے چین رہیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم سب بھی دھوپ ہی میں آجائیں اور آپ جیسی اذیتوں میں خود کو مبتلا کر لیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں اپنے نفس کو خوش کرنے کے لیے سائے میں آنے سے گریز کر رہا ہوں تم لوگ یہاں دھوپ میں ہرگز نہ آنا کیونکہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس میں نفس کشی سے زیادہ رضائے الٰہی کو دخل ہے شاید میرا خدا اسی طرح میری عبادت کو شرف قبولیت عطا فرما دے۔"

لوگ خوشامد کرتے رہے مگر آپ نے ان کی ایک نہ سنی آخر وہ اپنا سا منہ لے کر وہاں سے چلے گئے۔

آپ ہر وقت اداس اور غمگین رہا کرتے تھے دیکھنے والے یہ محسوس کرتے گویا داؤد طائی کسی بڑے سانحے سے گزر چکے ہیں۔

ایک دن آپ کے مریدوں نے سوچا کہ ان سے بحث و مباحثہ کر کے کوشش کریں گے کہ وہ خوش رہنے لگیں، آخر اس اداسی میں رکھا ہی کیا ہے چنانچہ انہوں نے ایک دن صبح ہی صبح آپ سے اس مسئلے پر بات چیت شروع کر دی۔ پوچھا۔ "حضرت! آج ہم آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ان کے صحیح صحیح جواب مرحمت فرمائیں گے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "پوچھو! بہرحال تم یقین کرو کہ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

ایک مرید نے پوچھا۔ "کیا آپ کے کسی عزیز کا انتقال ہو گیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں میرے ایک بہت ہی قریبی عزیز کا انتقال ہو چکا ہے تم نے میرے حالات سے صحیح اندازہ لگایا۔"

مرید نے پوچھا۔ "کس عزیز کا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میرے نفس کا جسے میں نے خود ہی ہلاک کر دیا ہے۔"

مرید نے عرض کیا۔ "جب آپ نے اپنے نفس کو خود ہی ہلاک کر دیا ہے تو اس کامیابی سے آپ کو بہت خوش ہونا چاہیے لیکن ہم لوگ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ آپ اپنے نفس کی ہلاکت سے خوش نہیں ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "نہیں یہ بات نہیں ہے میں اپنے نفس کو ہلاک کر کے بہت خوش ہوا تھا مگر کچھ عرصے بعد مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ نفس انسانی بہت ہی سخت جان ہوتا ہے اور اس کا ہمیشہ امکان باقی رہتا ہے کہ یہ دوبارہ پیدا ہو جائے اور اس دوبارہ پیدائش کے دھڑکے نے مجھے ہمیشہ کے لیے ملول کر دیا ہے۔"

دوسرے مرید نے پوچھا۔ "میرا خیال یہ ہے کہ آپ پر کوئی بڑی مصیبت پڑی ہے جس نے آپ سے آپ کی خوشیاں چھین لی ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "تیرا اندازہ بھی درست ہے اس سے بڑی مصیبت اور کیا ہو گی کہ مجھے جس نے پیدا کیا ہے میں اس کا پوری طرح شکر نہیں ادا کر پا رہا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس سے ایک زمانہ ناراض ہے میں یہ سوچ سوچ کر گھلتا رہتا ہوں کہ جب میں ایک زمانے کو خوش نہیں رکھ سکا تو وہ ذات جس کی وجہ سے میں نے ایک زمانے کو ناراض کیا ہے اگر مجھ سے ناراض رہی اور میں خوش نہ کر سکا تو میرا کیا حشر ہو گا اب تم خود ہی سوچو کہ جس پر اتنی بڑی مصیبت آپڑی ہو وہ کس طرح خوش رہ سکتا ہے۔"

تیسرے مرید نے پوچھا۔ "مجھے تو آپ بیمار بیمار سے لگتے ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں میں بیمار بھی ہوں اور یہ بیماری عصیاں کی ہے تائب ہونے سے پہلے میں نے نامعلوم کیسے کیسے گناہ کیے ہیں معلوم نہیں خدا انہیں معاف بھی کرے گا یا نہیں اور اس وسوسے نے مجھے بیمار بنا رکھا ہے۔"

مرید نے مزید کہا۔ ”اور حضرت! صاف بات تو یہ ہے کہ آپ رجائی نہیں ہیں قنوطی ہیں آپ ہر چیز سے مایوس ہی نظر آتے ہیں اگر آپ رجائی انداز فکر اختیار کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کے چہرے پر مستقلاً بشاشت نظر آنے لگے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”تجھے جو بات کہنی تھی کہہ چکا اب اپنی زبان بند کرلے کیونکہ یہ تو نہیں بول رہا ہے بلکہ یہاں مجھ سے وہ شخص ہمکلام ہے جس کے قبضہ و اختیار میں بہت کچھ ہے اور خدا نے اسے ڈھیل دے رکھی ہے کیا تجھ میں شیطان نے حلول نہیں کیا ہے اور تیرے سارے سوال اس کے مرتب کیے ہوئے ہیں۔“

آپ کے سارے مرید شرمندہ ہو کر چلے گئے۔

لیکن ایک دن آپ کو لوگوں نے اس حال میں دیکھا کہ آپ مسکرا رہے ہیں یہ مسکراہٹ ایسی تھی جیسے گرہن کی مصیبت میں مبتلا چاند اپنے پورے آب و تاب سے دنیا کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کرے آپ کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر ایک درویش نے کہا۔ ”جناب! آج کیا بات ہے کہ میں آپ کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ رہا ہوں۔“

آپ نے کیف و سرمستی میں جواب دیا۔ ”ہاں! مجھے خدا نے شراب محبت پلا دی ہے آج میں اس کا غیر معمولی سرور محسوس کر رہا ہوں اور اسی خمار نے مجھے مسرور کر رکھا ہے۔“

ایک دن آپ اپنے حجرے سے نکلے اور بازار کا رخ کیا لیکن ابھی وہ بازار میں چند لمحے ہی رکے ہوں گے کہ دہشت زدہ ہو کر ایک طرف بھاگ کھڑے ہوئے وہ اپنے حجرے کی جانب بھاگ رہے تھے کسی نے آپ کو روکنے کی کوشش کی پوچھا۔ ”یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے آپ بھاگ کیوں رہے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ارے کیا تیری بینائی تجھ سے چھین لی گئی ہے؟ سامنے دیکھ وہ کون آ رہا ہے؟“

اس شخص نے سامنے دیکھا لیکن اسے کچھ بھی نظر نہ آیا بولا۔ ”جناب وہاں تو کچھ بھی نہیں۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”بس جناب! اندھا کیا جانے تو کچھ دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی کچھ سن سکتا ہے۔ دیکھ میری انگلی کی سیدھ میں دیکھ وہ سامنے دیکھ مُردوں کا لشکر ہماری طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے آپ اپنے حجرے میں چلے گئے اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ جب یہ بات جنید بغدادیؒ کے روبرو دہرائی گئی تو انہوں نے کہا۔ ”داؤد جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں اس کی تائید کرتا ہوں کہ اس نے مُردوں کا لشکر ضرور دیکھا ہوگا۔“

اس کے کچھ عرصے بعد شہر میں وبا چلی اور اس میں آبادی کا بڑا حصہ ہلاک ہو گیا۔

☆—☆

ایک دن اس عہد کے مشہور بزرگ ابو ربیع آپ کے پاس ملنے آئے اور بڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ آخر میں انہوں نے کہا۔ ”حضرت! میں آپ کے پاس سے خالی ہاتھ ہرگز نہ جاؤں گا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”ابو ربیع! میرے پاس رکھا ہی کیا ہے؟ ایک چادر تھی وہ بھی کوئی چرا لے گیا۔“

ابو ربیع نے کہا۔ ”میں کچھ نہیں جانتا، میں تو آپ سے کچھ نہ کچھ لے کر ہی چلوں گا۔“

آپ نے کہا۔ ”کچھ مانگ کر تو بھی شرمندہ ہوگا اور نہ دے کر میں بھی ندامت محسوس کروں گا اس لیے بہتر یہی ہے کہ تو خاموش رہ اور ملاقات کا وقت پورا کر کے اپنی راہ لے۔“

ابو ربیع بھی بڑے ضدی تھے بولے۔ ”آپ کچھ بھی کہیں لیکن میں نے جو بات کہہ دی ہے اس پر عمل کروں گا اور آپ کے پاس سے خالی ہاتھ ہرگز نہ جاؤں گا۔“

آپ نے عاجز آ کر کہا۔ ”بھائی ابو ربیع! تم معلوم نہیں ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو، خدا کے لیے مجھے تنگ نہ کرو۔“

ابو ربیع نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں نے آپ سے جو بات کہی ہے آپ کو اس کا اہل بھی کر دیا ہے۔ آپ کے پاس جو کچھ ہے اس میں سے اپنے مطلب کی چیز مانگ لوں گا۔“

آپ نے عاجز آ کر کہا۔ ”اچھا بھائی! اگر یہ بات ہے اور وہ چیز میرے پاس موجود ہے جو تم مانگنا چاہتے ہو تو ضرور مانگو موجود ہوگی تو میں انکار بھی نہیں کروں گا۔“

ابو ربیع نے عرض کیا۔ ”حضرت میں آپ کے پاس سے ایک آدھ نصیحت لے کر جاؤں گا اور وہ نصیحت بھی ایسی ویسی نہیں ہونا چاہیے۔“

آپ نے مسکرا کر پوچھا۔ ”ابو ربیع! تم روزہ رکھتے ہو

یا نہیں؟"

ابو ربیع نے جواب دیا۔ "ہاں میں روزے رکھتا ہوں۔"

آپ نے نصیحت کی۔ "ابو ربیع! اب تم دنیا سے روزہ رکھو اور اس کی افطار آخرت سے کرنا۔"

ابو ربیع جھوم گئے، بولے۔ "حضرت! ایک نصیحت اور؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ابو ربیع میری دوسری نصیحت یہ ہے کہ تم بدگوئی سے پرہیز کرو، مخلوق سے کنارہ کشی اختیار کرو۔ دین کو دنیا پر ترجیح دو اور ہمیشہ یہ کوشش کرو کہ مخلوق کا خیال تک دل سے محو ہو جائے۔"

ابو ربیع نے عرض کیا۔ "کوئی اور نصیحت؟"

آپ نے بڑے جوش میں کہا۔ "ابو ربیع! کیا تمہیں معلوم ہے کہ مُردے تمہارا انتظار کر رہے ہیں یعنی تمہیں بھی مرنا ہے اس لیے آخرت کا سامان کرو۔"

ابو ربیع مارے خوشی کے رونے لگے، بولے۔ "حضرت اور کچھ؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ابو ربیع! ترک دنیا سے بندہ خدا تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔"

ابو ربیع نے عرض کیا۔ "حضرت! آپ نے یہ فرمایا تھا کہ آپ تہی دست ہیں اور یہ کہ آپ کے پاس کچھ بھی نہیں لیکن میں جانتا تھا کہ آپ دولت مند ہیں اور آپ کے پاس گراں مایہ خزانہ موجود ہے میں اس میں سے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کر لوں گا چنانچہ میں نے اس میں سے اپنا حصہ حاصل کر لیا ہے اور اب خوشی خوشی آپ کے پاس سے رخصت ہو رہا ہوں۔"

ابو ربیع چلے گئے، آپ نے بڑے دکھ سے خود کو مخاطب کیا۔ "داؤد! تو دنیا کو تو نصیحتوں کے خزانے دے رہا ہے لیکن ذرا یہ تو بتا کہ تو خود اس پر کس حد تک عمل پیرا ہے؟ شاید کچھ بھی نہیں۔ خدا تجھ پر رحم کرے۔"

☆—☆

حضرت ابراہیم بن ادھم کے مرشد فضیل بن عیاض آپ سے ملنے گئے آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوئے دونوں دین کی باتیں کرتے رہے دوران گفتگو فضیل بن عیاض نے کہا۔ "داؤد میں محسوس کر رہا ہوں کہ اگر آپ اس چھت کے نیچے عبادت کرتے رہے تو یہ کمزور چھت کسی بھی دن آپ کے اوپر ڈھے جائے گی۔"

آپ نے جواب دیا۔ "ابن عیاض! تم پر رحمت ہو کہ تم نے پہلی ملاقات ہی میں میری چھت کی بوسیدگی کا اندازہ لگا لیا حالانکہ میں اس چھت کے نیچے برس ہا برس سے بیٹھا ذکر و فکر میں لگا ہوا ہوں اور میں نے ایک بار بھی گردن اٹھا کر اس چھت کی طرف نہیں دیکھا۔

فضیل بن عیاض نے عرض کیا۔ "حضرت! میں یہ کب کہتا ہوں کہ آپ چھت کی طرف نہ دیکھئے، آپ ہر اس طرف ضرور دیکھیے جدھر آپ کی نظر جا سکتی ہے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "واہ ابن عیاض یہ مجھے کیا مشورہ دے رہے ہو تم؟"

فضیل بن عیاض نے کہا۔ "جناب والا! آپ کو مسلسل غلط فہمی ہوئی ہے اب میں آپ سے کیا بات کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، خدا نے آپ کو وہ مرتبہ عطا کیا ہے کہ ہم لوگ آپ پر رشک ہی کرتے رہیں گے، میرے لیے کوئی نصیحت؟"

آپ نے جواب دیا۔ "فضیل! دنیا سے کنارہ کشی دنیا سے حذر، دنیا سے پرہیز، دنیا سے گریز۔"

فضیل رونے لگے، بولے۔ "داؤد! آپ کی باتوں

لفظ کتاب پر مختلف آراء ظاہر کی جاتی ہیں لیکن عام طور پر اس کو برچ ٹری سے ماخوذ کیا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں لفظ بک Book, Bock, Boc, Buk, Buck استعمال کیا جاتا ہے جو قدیم انگلش Boc کو ظاہر کرتا ہے اور برچ ٹری کے معنوں میں مستعمل ہے۔ چونکہ انگریز مبلغین اپنی تحریریں برچ بارک (ایک درخت کی چھال) پر لکھتے تھے، غالباً اسی وجہ سے یہ لفظ بوک کہلایا۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں کتاب کی تعریف اس طرح کی گئی ہے "کتاب سے مراد ایک ایسی تحریری یا مطبوعہ مقالہ ہے جو متعدد صفحات پر مشتمل ہو اور جسے تہ کر کے ایک طرف سے سی دیا گیا ہو۔" کتاب کے قدیم مفہوم میں دو رول بھی شامل کیے جا سکتے ہیں جن میں تحریر یا ادب کے شعبوں میں سے کوئی مواد یا آسمانی کتاب انجیل کا کوئی حصہ یا کوئی ایسی چیز جس سے ہم علم حاصل کر سکیں شامل ہو، کتاب کہلاتی ہے۔

اقتباس: کتب خانوں کی تاریخ، از: اشرف علی

مرسلہ: حامد بلوچ۔ حب، بلوچستان

میں کتنا سوز ہے بخدا آپ نے میرے سینے کی آگ اور تیز کر دی ہے، خدا آپ کو جزائے خیر دے۔"

داؤد نے کہا۔ "فضیل! تم مستجاب الدعوات ہو خدا سے دعا کرو وہ میرا انجام بخیر کرے۔"

فضیل نے جواب دیا۔ "آپ میرے لیے دعا کیجیے، میں آپ کے لیے کروں۔"

داؤد اس پر راضی ہو گئے اور ان دونوں نے ایک دوسرے کے لیے دعائے آخرت بخیر کی۔

اس عہد کے ایک دوسرے بزرگ معروف کرخی نے آپ کی بات پہ خیال ظاہر کیا کہ میں نے داؤد طائی سے زیادہ دنیا سے نفرت کرنے والا کوئی اور انسان نہیں دیکھا۔

آپ کے بال بہت بڑھ گئے تھے، آپ حجام کے پاس چلے گئے اور اس سے کہا۔ "میری حجامت بنا دے۔"

اس نے دوسروں کی حجامت روک کر آپ کی حجامت بنانا شروع کر دی وہ بولتا رہا آپ خاموش رہے آخر اس کی بک بک سے تنگ آ کر آپ نے کہا۔ "اے شخص! تو اپنا کام کر، زبان کو ذرا آرام کرنے دے۔"

حجام شرمندہ ہو کر چپ ہو رہا۔ آخر میں آپ نے اسے ایک دینار دے دیا۔ حجام کو اس اجرت پر حیرت ہوئی وہاں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے انہوں نے آپ کو روک لیا۔ بولے۔ "جناب! آپ سچ سچ بتائیے آپ اپنے ہوش میں تو ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں میں اپنے ہوش میں ہوں، کیوں، میں نے کون سی بے ہوشی کی بات کی ہے؟"

کسی شخص نے کہا۔ "آپ نے حجام کو ایک دینار دے کر بہت زیادہ اجرت دے دی ہے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اگر میں نے ایک دینار دیا ہے تو اس پر تو کیوں اعتراض کر رہا ہے؟"

اس شخص نے کہا۔ "میرے خیال میں یہ اسراف بے جا ہے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں اسے اسراف میں شمار نہیں کرتا کیونکہ دین میں مروت ضروری ہے اور اسے میں نے مروت سمجھ کر دیا ہے بے جا اسراف سمجھ کر نہیں دیا۔"

وہ شخص خاموش رہا۔

امام ابو حنیفہ کے دو شاگرد امام ابو یوسف اور امام ابو محمد کا ایک زمانہ احترام کرتا تھا خلیفہ ہارون رشید نے ان دونوں کو قاضی القضاۃ کا منصب پیش کیا۔ امام ابو محمد نے اپنے استاد امام ابو حنیفہ کی پیروی میں یہ منصب قبول نہیں کیا لیکن ابو یوسف نے قبول کر لیا۔ آپ کو ابو محمد سے عقیدت ہو گئی لیکن امام ابو یوسف کی قدر و منزلت دل سے نکل گئی۔

امام ابو یوسف نے آپ سے پوچھا۔ "حضرت! میں نے سنا ہے کہ آپ ابو محمد کو مجھ پر ترجیح دیتے ہیں، کیا درست ہے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں یہ درست ہے۔"

امام ابو یوسف نے کہا۔ "آپ مجھے کیوں ناپسند فرماتے ہیں؟"

آپ نے دو ٹوک جواب دیا۔ "صرف اس لیے کہ جب آپ کے استاد امام ابو حنیفہ کو خلافت کی طرف سے یہ منصب پیش کیا گیا تھا تو انہوں نے اسے ٹھکرا دیا تھا اور اس انکار کی انہیں سزا بھی دی گئی تھی اور تم نے اسی منصب کو قبول کر لیا ہے پھر میں تم کو کس طرح پسند کر سکتا ہوں مجھے امام ابو محمد زیادہ پسند ہیں کیوں کہ انہوں نے اپنے استاد کی پیروی میں یہ منصب نہیں قبول کیا۔"

امام ابو یوسف نے جواب دیا۔ "لیکن میں اس منصب کے ذریعے لوگوں کی خدمت کر رہا ہوں۔"

آپ نے طنزیہ کہا۔ "ہاں ایک طرف خلیفہ لوگوں کی خدمت کر رہا ہے دوسری طرف تم کر رہے ہو اور تم دونوں لوگوں کی کون سی خدمت انجام دے رہے ہو میں آج یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

امام ابو یوسف خاموش ہو گئے۔

ایک دن امام ابو یوسف آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ "حضرت! امیر المومنین ہارون رشید آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں جب فرمائیں لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔"

آپ نے صاف انکار کر دیا، بولے۔ "نہ تو اسے میرے پاس ہرگز نہ لانا وہ میرے پاس کیوں آنا چاہتا ہے؟ میں اس سے نہیں ملوں گا، ہرگز نہیں ملوں گا۔"

امام ابو یوسف نے التجا کی۔ "حضرت! میں نے امیر المومنین سے وعدہ کر لیا ہے کہ آپ سے ان کی ملاقات ضرور کرا دوں گا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "مجھ سے ملے بغیر تو نے ہارون رشید سے وعدہ کیوں کر لیا؟"

امام ابو یوسف نے کہا۔ "اس لیے کہ میں جانتا ہوں آپ ایک خوش اخلاق انسان ہیں۔ میری بات ضرور مان

لیں گے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "تو نے سخت غلطی کی میں دنیا دار ظالموں سے سخت نفرت کرتا ہوں اور ہارون رشید ان ہی ظالموں میں سے ایک ہے اسی لیے میں اس سے نہیں ملنا چاہتا۔"

امام ابو یوسف مایوس ہو کر چلے گئے جب ہارون رشید کو اس بات کا علم ہوا کہ داؤد نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا ہے تو وہ بہت سٹپٹایا، بولا۔ "اب کیا ہو گا؟ میں ان سے ہر قیمت پر ملوں گا۔"

آخر بڑی گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ ہارون رشید اپنی ماں خیزران کو آپ کے پاس بھیجے گا اور وہ خوشامد درآمد سے آپ کو ہارون کی ملاقات پر آمادہ کر لیں گی۔

خیزران کوئی معمولی عورت نہیں تھی چنانچہ اس نے آپ کو ملاقات پر آمادہ کر لیا آپ نے شکایتاً کہا۔ "خیزران! ہارون تیرا بیٹا ہے کیا تو اپنی آخرت کی طرف سے فکرمند نہیں ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں تو سوچ سوچ کر قدم اٹھاتی ہوں اسی لیے میں شرمندگی سے محفوظ رہتی ہوں۔"

آپ نے فرمایا۔ "اچھا اپنے بیٹے کے پاس جا اور اسے اس شرط پر میرے پاس بھیج دے کہ وہ مجھے کچھ دینے کی کوشش ہرگز نہ کرے، کیونکہ میں بادشاہوں کو ظالم و جابر سمجھتا ہوں اور اسی لیے میں بادشاہ سے کچھ لینا بالکل پسند نہیں کرتا۔"

خیزران اپنے بیٹے ہارون رشید کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ان دونوں کے ساتھ امام ابو یوسف بھی تھے۔ ہارون رشید بڑے احترام سے پیش آیا۔

آپ نے کہا۔ "ہارون! تیرے پاس کس چیز کی کمی ہے پھر وہ کیا چیز تھی جو تجھے میرے پاس لائی؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "آپ کی بے نیازی آپ کا استغنا، واللہ میں جو چاہوں خرید لوں، جسے چاہوں ملازم رکھ لوں لیکن آپ کے سامنے میری کوئی حیثیت ہی نہیں اور اس وقت تو مجھے اپنی اس کمزوری اور بے بضاعتی کا بہت زیادہ احساس ہوا جب میں نے آپ کی خدمت میں امام ابو یوسف کو بھیجا اور آپ نے انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ آپ مجھ سے نہیں مل سکتے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں ہارون! میں بادشاہوں اور حکمرانوں کو جابر اور ظالم سمجھتا ہوں تم لوگ عوام کی امانت کو اپنے آپ پر خرچ کرتے ہو اپنی خواہشات میں عدل و انصاف سے کام نہیں لیتے چنانچہ روز قیامت جتنا بڑا محاسبہ تم لوگوں کا ہو گا کسی اور کا عشر عشیر بھی نہیں ہو گا۔"

ہارون کچھ دیر آپ کی خدمت میں رکا رہا اس کے بعد کہا۔ "حضرت مجھے کوئی نصیحت کیجیے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں تجھے نصیحت نہیں، تجھ سے خواہش کروں گا۔"

ہارون نے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اب آئندہ تو مجھے یا میرے جیسے کسی اور کو ملاقات کی زحمت سے محفوظ رکھے گا۔"

ہارون نے کہا۔ "میرے دل میں یہ خواہش تھی کہ میں آپ کو کچھ پیش کروں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "خواہش کو مار، نفس کشی کر کیوں کہ یہ وہ موذی ہیں جو انسان کو زندگی بھر سانپ کی طرح ڈستے رہتے ہیں۔"

ہارون کے ہاتھ میں ایک دینار تھا اسے آپ کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ "آپ زیادہ نہیں تو ایک دینار ہی قبول فرما لیں۔"

آپ نے ہارون کی ماں خیزران کی طرف دیکھا اور کہا۔ "کیا میں نے ملاقات سے پہلے ہی یہ شرط نہیں رکھ دی تھی کہ میں ملاقات اس شرط پر کروں گا کہ بادشاہ سے کچھ قبول نہ کروں گا؟"

خیزران نے جواب دیا۔ "ہاں یہ شرط آپ نے رکھی ضرور تھی لیکن میرے بیٹے کی یہ معمولی خواہش اگر آپ پوری کر دیں گے تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔"

آپ نے کہا۔ "میرے پاس اپنے خرچ کے لیے جائز رقم موجود ہے اس لیے بادشاہ سے کچھ لینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

ہارون نے کہا۔ "آپ یہ دینار رکھ لیجیے کیونکہ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، جب آپ کے پاس اپنی رقم خرچ ہو جائے گی اس وقت یہ میرا دینار آپ کے کام آ جائے گا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اوّل تو یہ ہے کہ میرے پاس جتنی رقم موجود ہے وہ زندگی بھر کے لیے کافی ہے لیکن اگر یہ رقم ناکافی بھی ہو گی تو میں خدا سے دعا کروں گا کہ میری اسی دن موت واقع ہو جائے جب یہ میری رقم میرے پاس ختم ہو جائے۔"

امام ابو یوسف نے ہارون رشید کو منع کیا۔

"امیر المومنین! آپ داؤد کو مجبور نہ کیجیے انہوں نے اگر ایک بار کچھ لینے سے منع کر دیا ہے تو یہ ہمارے لاکھ اصرار اور خوشامد کے باوجود کچھ بھی نہ لیں گے۔"

مجبوراً ہارون رشید کو یوں ہی واپس آجانا پڑا۔

آپ جس مکان میں رہتے تھے وہ آپ کا آبائی تھا اور خاصہ بڑا مکان تھا۔ ایک مدت سے دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے یہ مکان جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ رہا تھا آپ کے مریدوں نے آپ کو منع کیا کہ وہاں سے ہٹ جایئے ورنہ یہ کسی دن سر پر آرہے گا لیکن آپ نے اس کی کوئی پروانہ کی اور بدستور عبادت و ریاضت میں مشغول رہے آپ کے ایک مرید نے کہا۔ "حضرت آپ توجہ نہیں دے رہے ہیں اور مجھے بڑا خوف محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں مکان کا یہ حصہ آپ پر نہ گر جائے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "لیکن میں خوف نہیں محسوس کر رہا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ اگر یہ گرا بھی تو مجھ پر ہرگز نہ گرے گا۔"

مرید نے کہا۔ "یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں یہ بوسیدہ عمارت ہر اس شخص پر گر سکتی ہے جو اس کے نیچے موجود ہوگا۔"

آپ نے کہا۔ "اگر میرا رب بھی چاہتا ہے کہ میں اس کا ذکر کرتے کرتے دیوار تلے دب کر اس کے پاس پہنچ جاؤں تو مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔"

جب مریدوں نے یہ دیکھا کہ آپ پر نصیحتیں کارگر نہیں ہو رہی ہیں تو خاموشی اختیار کر لی مگر خود احتیاط کرنے لگے وہ آپ کے پاس جاتے۔ آپ سے باتیں کرتے لیکن بوسیدہ دیوار سے دور رہتے کیونکہ وہ اس یقین کی دولت سے محروم تھے جو داؤد طائی کو حاصل تھی۔

ایک دن فجر کی نماز سے فارغ ہو کر آپ جیسے ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے دیوار ہلنے لگی اور اس سے گرد و غبار جھڑنے لگا۔ مریدوں نے شور کیا۔ "حضرت! پیچھے دیوار لرز رہی ہے۔"

آپ نے دیوار کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ "اے دیوار! میں نے تجھ سے اپنی پشت ہی تو لگائی تھی، تجھ پر اپنا پورا بوجھ تو نہیں ڈالا تھا، پھر تو کیوں کانپ رہی ہے؟"

لوگوں نے دیکھا دیوار نے ہلنا بند کر دیا تھا۔ آپ اس سے پشت لگا کر دوبارہ بیٹھ گئے۔

آپ نے اپنے مریدوں سے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "لوگو! اگر انسان خود کو اللہ کے حوالے کر دے تو اللہ کی مخلوق اسے گزند نہیں پہنچا سکتی، ہاں اگر اللہ ہی نہ چاہے تو دوسری بات ہے۔"

ایک مرید نے کہا۔ "حضرت! آپ کی بات میری سمجھ میں اس لیے نہیں آتی کہ چیزیں کسی کے لیے اپنا خواص کس طرح بدل سکتی ہیں؟ آگ کی گرمی، برف کی ٹھنڈک یہ تو قائم ہی رہیں گی۔"

"ہاں، بے شک ان کے خواص میں کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوگی۔"

مرید نے عرض کیا۔ "پھر جب یہ طے ہو گیا کہ چیزیں اپنے خواص نہیں بدلتیں تب پھر یہ شکستہ دیوار اپنی عمر پوری کر کے کس طرح کھڑی رہ سکتی ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "چیزوں کے خواص اللہ کے حکم سے ہی تو قائم ہیں، ان خواص میں اللہ کے حکم ہی سے رد و بدل بھی ہو سکتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح خدا کے حکم سے حضرت خلیل اللہ کے لیے آگ گلزار بن گئی تھی۔"

آپ باتوں میں مشغول ہی تھے کہ دیوار لرزی اور لرز کر دوسری طرف گر گئی آپ بالکل محفوظ رہے، آپ نے گری ہوئی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھ خدا نے شکستگی میں کوئی تبدیلی نہیں فرمائی، بس اس کے گرنے کا رخ بدل دیا اور اس طرح اس نے اپنے بندے کو بچا لیا۔"

مریدوں کو اس پر بڑی حیرت ہوئی بولے۔ "بے شک خدا چاہے تو آگ گلزار بن سکتی ہے۔"

آپ نے اپنا مختصر سامان سمیٹا اور دوسری دیوار کے سائے میں جا بیٹھے۔

آپ کا پورا مکان ہی شکستہ و بوسیدہ ہو چکا تھا، جس دوسری دیوار کے سائے میں آپ جا کر بیٹھے تھے، وہ بھی بہت کمزور تھی، مریدوں نے ایک بار پھر اصرار کیا کہ آپ یہاں سے بھی ہٹ جائیں۔

آپ نے جواب دیا۔ "میں اس دیوار کے سائے سے ہٹ کر کہیں تو جاؤں گا ہی اور یہ پورا مکان بوسیدہ و خستہ ہو رہا ہے تم لوگ پورے مکان میں گھوم پھر کر وہ جگہ تو بتاؤ جو نسبتاً زیادہ اچھی اور مضبوط ہو میں وہیں منتقل ہو جاؤں گا۔"

مریدوں نے مکان کا ہر حصہ خوب غور سے دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کی ہر جگہ ہر حصہ قریب مخدوش اور بوسیدہ ہے مجبوراً خاموشی اختیار کی اور آپ جہاں بیٹھے تھے وہیں بیٹھا رہنے دیا۔

ایک دن ایک شخص آپ کے پاس آیا اور عرض کیا۔
"حضرت! مجھے آپ کے پاس امام ابو یوسف نے بھیجا ہے۔"
آپ نے پوچھا۔ "کس لیے؟ کوئی کام؟"
آدمی نے جواب دیا۔ "کام تو کوئی بتایا نہیں، بس یہ پوچھا ہے کہ آپ کے پاس اس وقت کتنی رقم موجود ہے؟"
آپ نے کہا۔ "اگر میں تیرے سوال کا جواب دے بھی دوں تو اس سے اس کو یا مجھ کو کیا حاصل ہوگا؟"
آدمی نے کہا۔ "میں تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس سے آپ دونوں میں سے کس کو کیا حاصل ہوگا؟ لیکن انہوں نے مجھے بھیجا اس لیے کہ میں ان کے اس سوال کا جواب آپ سے لے کر ان تک پہنچا دوں۔"
آپ مسکرائے، بولے۔ "امام ابو یوسف سے کہہ دینا کہ جس امام ابو حنیفہ کے تم شاگرد ہو اس کا میں سال تک میں بھی شاگرد رہا ہوں، تم فقیہ ہو تو میں غریب درویش ہوں جو بات تمہارے دل میں ہے خدا نے اس کا کشف میرے دل پر کر دیا ہے۔ تم امام ابو یوسف سے کہہ دینا کہ میرے پاس اتنی رقم موجود ہے کہ اس کے سہارے کسی کا احسان لیے بغیر اپنی بقیہ زندگی گزار دوں۔"
امام ابو یوسف کے آدمی نے کہا۔ "حضرت! مجھے یہ تو معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے یہ سوال کیوں کیا ہے اور اگر آپ پر یہ بات کشف سے منکشف ہو چکی ہے تو میں جواب لے جانے کا پھر بھی پابند رہتا ہوں۔"
آپ نے جواب دیا۔ "امام ابو یوسف سے کہہ دینا ابھی میرے پاس چاندی کے دس درہم باقی ہیں۔"
وہ آدمی یہ جواب لے کر چلا گیا لیکن کچھ ہی دیر بعد پھر واپس آیا اور کہا۔ "حضرت اب وہ یہ دریافت فرما رہے ہیں کہ چاندی کا ایک درہم آپ کو کتنے دنوں کے لیے کافی ہوتا ہے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "تقریباً دو ماہ کے لیے۔"
جب یہ شخص آپ کا جواب لے کر چلا گیا تو آپ نے اپنے مریدوں سے دریافت فرمایا۔ "تم لوگوں نے کچھ محسوس کیا کہ ابو یوسف مجھ سے کیا معلوم کر رہے تھے؟"
لوگوں نے جواب دیا۔ "ہمیں نہیں معلوم کچھ آپ ہی وضاحت فرمائیں۔"
آپ نے کہا۔ "میں نے ایک بار ابو یوسف سے یہ کہا تھا کہ میرے پاس جو رقم موجود ہے وہ پوری زندگی کے لیے کافی ہے اس طرح وہ یہ پوچھ کر کہ میرے پاس کتنی رقم باقی رہ گئی ہے اور چاندی کا ایک درہم مجھے کتنے دنوں کے لیے کافی ہوتا ہے وہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ میں ابھی کتنے دن اور جیوں گا۔"
مریدوں نے دل ہی دل میں حساب لگایا، اس حساب سے آپ کو بیس ماہ اور زندہ رہنا تھا۔
جیسے جیسے رات پوری ہو رہی تھی لوگوں کی فکر و تشویش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا وہ جس دیوار کے سائے میں بیٹھے تھے۔ وہ پہلی دیوار سے زیادہ کمزور تھی اور ہوا کے جھونکوں سے ہلنے لگتی تھی لوگوں کو شبہ ہونے لگا کہ اگر داؤد سابقہ گری ہوئی دیوار سے بچ گئے تھے تو اس دیوار تلے دبنے سے نہیں بچیں گے انہوں نے آپ کو ایک بار پھر متنبہ کیا۔ "حضرت! یہ دیوار پچھلی دیوار سے زیادہ کمزور ہے خدا کے لیے یہاں سے ہٹ جائیے۔"
آپ نے جواب دیا۔ "لوگو! جس خدا نے مجھے پہلے بچایا تھا وہی اس وقت بھی میرا محافظ ہے۔"
ایک مرید نے کہا۔ "ہمیں تو اس لیے زیادہ فکر ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کا جو حساب بتایا تھا اس کے اعتبار سے یہ دیوار بڑی خطرناک محسوس ہو رہی ہے۔"
آپ نے جواب دیا۔ "تم جس خطرے کا اظہار کر رہے ہو، ہو سکتا ہے وہ اسی طرح رونما ہو جائے لیکن میں تقدیر الٰہی سے بھاگ کر جا بھی کہاں سکتا ہوں۔"
مرید نے عرض کیا۔ "آپ میرے گھر تشریف لے چلیں، میں آپ کی خدمت بھی کروں گا اور رہنے کے لیے ایک اچھا سا گھر ابھی دوں گا آپ کے لیے کیا کمی ہے؟"
"افسوس کہ میں نے آج تک کسی کا احسان نہیں لیا پھر ان آخری لمحوں میں کسی کا کیا احسان لوں۔"
مرید نے کہا۔ "میں جو کچھ کروں گا وہ احسان کب ہو گا؟ آپ نے مجھے صراط مستقیم پر ڈالا ہے میں جو کچھ بھی کروں گا عقیدتاً کروں گا، آپ میرا دل نہ توڑیے۔"
آپ نے جواب دیا۔ "میں تیرا دل نہیں توڑ رہا ہوں بلکہ وہی کر رہا ہوں جس کا میرے اللہ نے مجھے حکم دیا ہے۔"
مرید کو بڑا قلق ہو رہا تھا۔ کمزور دیوار کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ "خدا کے لیے اس ہلتی ہوئی دیوار سے ڈریے۔"
آپ نے جواب دیا۔ "میں صرف اللہ سے ڈرتا ہوں اور کسی سے نہیں۔"
مرید نے عرض کیا۔ "ظاہر ہے میں آپ سے

درخواست ہی کر سکتا ہوں کہ آپ یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو جائیں۔" لیکن آپ نے مرید کی بات نہیں مانی۔

آپ دیوار کے سائے میں بیٹھے وعظ فرما رہے تھے۔

"لوگو! لمحے ساعتوں میں ساعتیں گھڑیوں میں اور گھڑیاں پہروں میں، پہر دنوں میں اور دن ہفتوں، مہینوں اور سالوں میں بدلتے جا رہے ہیں، جو آیا ہے اسے جانا بھی ہے جس نے زندگی کا مزہ چکھا ہے اسے موت کا مزہ بھی چکھنا ہے۔ لوگو! میں ان پر حیران ہوں جو ہنستے ہیں اور ان سے زیادہ ان پر حیران ہوں جو قہقہے لگاتے ہیں واللہ اگر عرفان ذات اور عرفان کائنات حاصل ہو جائے تو وہ مسکرانا اور قہقہے لگانا بھول جائیں گے۔"

ایک مرید نے پوچھا۔ "ہمیں زندہ رہنے کے لیے بھی کچھ کرنا پڑتا ہے اس لیے یہ بتائیے کہ ہم صاف ستھری زندگی کس طرح بسر کریں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اگر تم یہ سمجھو کہ تم پل صراط عبور کر رہے ہو تو تم زندگی اور دنیا میں صحیح زندگی گزار سکو گے کیونکہ پل صراط پر چلنے والا نہ تو ہنس سکتا ہے اور نہ ہی قہقہے لگا سکتا ہے۔"

اس وقت دیوار نے ہلنا اور گرنا شروع کر دیا۔ مرید بھاگ کر ادھر ادھر ہو گئے اور دیوار گرتے گرتے دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اس کا ایک حصہ بائیں طرف اور دوسرا دائیں طرف گرا لیکن جہاں آپ بیٹھے تھے وہ جگہ محفوظ رہی آپ نے اپنا سامان سمیٹا اور صدر دروازے والے حصے پر منتقل ہو گئے یہاں چھت پڑی تھی مگر یہ بھی بہت زیادہ بوسیدہ تھی آپ کے مریدوں نے عاجز آ کر عرض کیا۔ "حضرت! آخر آپ ہماری بات مان کیوں نہیں لیتے؟ آپ ہم میں سے جس کے گھر میں بھی رہنا چاہیں چل کر رہیں اور اس بوسیدہ مکان کو چھوڑ دیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "افسوس کہ جیسا میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میں اپنا آبائی مکان نہیں چھوڑ سکتا۔"

ایک مرید نے کہا۔ "تب پھر مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس حصے کی چھت ہی ڈلوا دوں کیونکہ یہ بہت بوسیدہ ہے اور اگر گری تو آپ کے اوپر ہی گرے گی۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اب میری زندگی ہی کتنی رہ گئی ہے جو میں نئی چھت کی فکر کروں۔"

ایک دن آپ کو ان کے مریدوں نے دیکھا کہ دھوپ میں بیٹھے قرآن پاک کی تلاوت فرما رہے ہیں۔ انہیں خوشی ہوئی کہ چلیے آپ نے خود ہی چھت سے کنارہ کشی تو اختیار کی لیکن آپ کے بعض مریدوں کو اس پر بہت قلق ہوا کہ آپ دھوپ میں بہت پریشان ہو رہے ہیں۔ ایک مرید نے درخواست کی۔ "حضرت! آپ سائے میں تلاوت فرمائیں اس تپش میں دھوپ آپ کی صحت بگاڑ دے گی۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے زندگی بھر اپنے نفس کا کہا نہیں مانا۔ اس وقت بھی میرے نفس کی یہی خواہش ہے کہ میں سائے میں چلا جاؤں، لیکن میں زندگی کے ان آخری لمحوں میں نفس کی بات مان کر پوری زندگی کے اعمال برباد نہیں کروں گا۔"

آپ نے اپنے مریدوں سے کہا۔ "دیکھو جب میں مر جاؤں تو مجھے میرے اس مکان کی دیوار تلے دفن کر دینا۔"

مریدوں نے ایک دوسرے کی صورتیں دیکھنا شروع کر دیں۔ وہ آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ "کیا آپ رحلت فرمانے والے ہیں؟"

"شاید باتوں سے تو یہی معلوم ہو رہا ہے۔"

"لیکن کب؟ کیا دو چار دن میں یا دو چار ہفتوں میں۔"

"کچھ پتا نہیں لیکن شاید ایک آدھ ماہ میں۔"

اس دن آپ کے مرید آپ کے پاس نصف رات تک موجود رہے۔

اس رات ایک مرید نے خواب میں دیکھا کہ آپ فضا میں پرواز کر رہے ہیں، جاگنے کے بعد اس نے سوچا کہ خدا نے آپ کا مرتبہ بہت بلند کر دیا ہے، وہ علی الصباح اپنا خواب بتانے آپ کے پاس پہنچا، وہاں بہت سے مرید جمع تھے اور بوسیدہ چھت کے نیچے لوبان کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ لوگ سسکیاں لے کر رو رہے تھے، ایک مرید نے اعلان کیا۔ "حضرت وصال فرما چکے ہیں۔"

خواب دیکھنے والے مرید نے دوسرے مریدوں کو اپنا خواب سنایا اور بہ آواز بلند بتایا کہ "مجھے میرے خواب کی تعبیر مل چکی ہے میں نے رات آپ کو پرواز کرتے دیکھا تھا چنانچہ آپ نے عالم بالا کا سفر اختیار کیا اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔"

آپ کے مریدوں نے آپ کو وصیت کے مطابق ان کے آبائی مکان ہی کی ایک دیوار کے نیچے دفن کر دیا۔

کہتے ہیں وہ بوسیدہ چھت بھی اسی دن زمین بوس ہو گئی۔

✦✦

نغماتِ کشمیر

ابصار احمد

کشمیر آج ظالم و استبداد کے چنگل میں پھنسا پھڑ پھڑا رہا ہے۔ اس جنت نظیر خطے پر غاصبوں نے ظلم کے پہاڑ توڑ رکھے ہیں۔ "ہندو ٹو" کے خنجر سے اس کا تشخص بھی مٹایا جارہا ہے۔ وہاں کے عوام نعرہ زن ہیں کہ کشمیر بنے گا پاکستان۔ ان کے جذبوں کو ہمارا سلام۔

کشمیری جدوجہد پر لکھے گئے نغموں پر سرسری نظر

15 اگست 1947ء کی صبح ہر طرف شادمانی تھی۔ ایک طرف بھارت اپنی آزادی کا جشن اپنے پہلے گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن اور وزیراعظم جواہر لال نہرو کے ساتھ منا رہا تھا تو شمال مغربی حصے میں مملکت خداداد پاکستان جو صرف آزاد نہیں بلکہ تخلیق ہوا تھا بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح اور دیگر اکابرین ملت کے ساتھ شکر خدائے واحد میں مصروف تھا۔ ہر چہرہ مسرتوں کا پیکر اور خوشی سے شادمان تھا کیونکہ دو صدی بعد مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی سے نجات ملی تھی۔ سراج الدولہ کی

شکست سے جو غلامی کی ابتداء ہوئی اس کا اختتام ہوا تھا۔ سراج الدولہ کی شکست سے جو غلامی کی ابتداء ہوئی اس کا اختتام ہوا تھا۔ سندھ، بنگال، کشمیر اور پنجاب میں ہر طرف پاکستان زندہ باد نعرے تھے مگر ابھی پاکستان کی تکمیل باقی تھی کیونکہ اس کی شہ رگ جنت نظیر ارض کشمیر کا فیصلہ باقی تھا۔ یہ سب کو یقین تھا کہ مسلم اکثریت کی وجہ سے کشمیر پاکستان میں رہے گا کیونکہ 1946ء میں یہاں انتخابات ہوئے تو آل انڈیا مسلم کانفرنس نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کر لی تھی جس کے اکثر اراکان پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے تھے۔ تاہم ماؤنٹ بیٹن کے 3 جون کے اعلان آزادی کے بعد 565 ریاستوں کو یہ حق تھا کہ وہ جس مملکت کے ساتھ شامل ہونا چاہیں ہو جائیں اور اگر اپنا الگ تشخص رکھنا چاہیں تو وہ اس کے لیے بھی خود مختار ہیں لیکن چھوٹی ریاستوں کا اکیلے چلنا محال ہوتا ہے اسی لیے مذہبی بنیاد پر کئی ریاستوں نے بھارت اور پاکستان سے از خود الحاق کر لیا۔ تاہم کشمیر کا مسئلہ ابھی باقی تھا جواہر لال نہرو نے اسے بھارت کا اٹوٹ انگ کہا تو قائد اعظم نے بھارت کو واضح پیغام دے دیا کہ "کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے۔"

معاملہ ابھی حریت ناک صورت حال اختیار کرتا لیکن 12 اگست کو کشمیر کے ہندو راجا ہری سنگھ سے قائد اعظم نے مذاکرات کر لیے کہ جلد یہاں کے عوام کی رائے کے مطابق فیصلہ کر لیا جائے گا اسی لیے آج کشمیر میں بھی ہر طرف پاکستان کے نام پر چراغاں تھا لیکن دوپہر کو راجا ہری سنگھ اپنے محل سے باہر نکلا اور اس نے سری نگر میں پاکستانی پرچم کو سلامی دی کیونکہ کشمیر کے عوام پاکستان کے ساتھ تھے۔ یہ بات بھارتی وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو پہنچی تو اسے کشمیر جاتا ہوا نظر آیا اور بھارت نے وہاں اندرونی فسادات کروانے شروع کر دیے اور کچھ ہی دنوں میں پوری وادی میں ہندو مسلم فسادات پھیل گئے۔ سری نگر، جموں اور ڈوڈا میں مسلمانوں کی املاک ہندوؤں کے ہاتھوں لٹنے لگیں۔ راجا یہ سب کچھ دیکھ کر بھی خاموش رہا۔ 28 اگست کو سری نگر میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا اور سینکڑوں مسلمان عفیف خواتین کی عزتوں کو ہندو بنیوں نے تاراج کیا۔ 29 اگست کو 4 مسلم خواتین کے جسد خاکی عزت لوٹنے کے بعد سری نگر میں سر عام جلا دیے گئے۔ وادی سے مسلمان حریت پسند اٹھے تو راجا کی فوج نے ان کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ اب غریبان وادی کے پاس اسلحہ بھی نہ تھا کہ وہ اپنا دفاع ٹھیک سے کر سکتے چنانچہ ایسی صورت حال میں تمام پاکستانیوں پر واجب ہو چکا تھا کہ وہ اپنے کشمیری بھائیوں کا ساتھ دیں چنانچہ پاکستان کے قبائلی ہندو کے خلاف اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کے لیے پہنچ گئے۔ پاکستانی قبائلیوں نے مختصر جنگ کے بعد کشمیر کا ایک حصہ راجا سے آزاد کروا لیا۔ راجا ہری سنگھ جو در پردہ کشمیر کو بھارت کے سپرد کرنا چاہتا تھا وہ دہلی پہنچا اور نہرو سے ملا۔ جواہر لال نہرو اسی لمحے کا تو منتظر تھا۔ اسی دوران شیخ عبداللہ نے بھی عوام سے غداری کرتے ہوئے بھارت کے حق میں تائید کر دی تو بھارت کو وادی میں فوجیں اتارنے کا موقع مل گیا۔

27 اکتوبر 1947ء وہ منحوس دن تھا جب بھارتی فوج ڈکوٹا جہازوں کے ذریعے وادی میں اترنے لگیں۔ پہلے ہندو لوٹ اور آگ زنی کر رہے تھے اب انڈین فوج بھی مسلمانوں پر قہر ڈھانے لگی تب قائد اعظم نے پاکستانی فوج کو حرکت میں آنے کا حکم دیا اور آزادی کے پہلے ہی سال دونوں ممالک کی فوجیں آمنے سامنے آ گئیں۔ کشمیریوں کی مدد کے لیے قبائلی لشکر بھی میدان میں آ گئے تھے۔ راولا کوٹ، مظفر آباد، میرپور کا علاقہ آزاد کروا لیا گیا۔ فوجیں ابھی سری نگر تک پہنچیں کہ اقوام متحدہ بیچ میں آ گیا اور کشمیر کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ دکھاوے کے لیے چند قراردادیں پیش ہوئیں جن میں وادی کشمیر کے مکینوں کو حق خود ارادیت کا جھانسا دیا گیا تھا۔ چنانچہ 5 فروری 1948ء کو بھارت کی اپیل پر اقوام متحدہ نے جنگ بندی اس شرط پر کروائی کہ یہاں جلد رائے شماری ہو گی۔ پاکستان نے بھی اقوام متحدہ کے اس فیصلے کا احترام کرتے ہوئے جنگ روک دی اور فی الفور وادی کے دونوں حصوں میں لائن آف سیز فائر قائم کر دی گئی جو اب لائن آف کنٹرول کہلاتی ہے۔ مگر بھارت نے چالاکی سے 26 جنوری 1950ء کو ایک قانون بنایا جو آرٹیکل 370 کہلاتا ہے جس کے تحت مقبوضہ کشمیر کو ایک خصوصی حیثیت دیتے ہوئے اسے داخلی، مواصلاتی اور عسکری معاملات میں خود مختاری دی گئی لیکن یہ سب صرف زبانی کلامی رہا کیونکہ یہ کشمیر کو ہڑپ کرنے کا ایک ڈھونگ تھا۔ اس وقت کچھ قوم پرست کشمیری رہنما جن میں شیخ عبداللہ سر فہرست تھے اس پر اطمینان کرتے نظر آئے لیکن قائد اعظم کی دور اندیشی دیکھیے کہ وہ 1947ء میں ہی کہہ رہے تھے کہ جو مسلمان آج ہندوؤں کے ساتھ خوش نظر آتے ہیں ان کی نسلیں اس فیصلے پر ہمیشہ افسوس کریں گی۔ جیسا کہ گذشتہ سال ہوا جب اگست 2019ء میں بھارت نے آرٹیکل 370 ختم کر کے وہاں کرفیو لگا دیا تو قوم پرست کشمیری لیڈر بھی چیخ

اٹھے کہ جنات تسخیر کیتے تھے۔ تادمِ تحریر کشمیر بھارت کے ہاتھوں محصور ہے جہاں 7 لاکھ بھارتی فوج نے پانچ ماہ سے کرفیو لگا رکھا ہے جبکہ سری نگر کا بچہ بچہ "کشمیر بنے گا پاکستان" کے نعرے لگا کر گولیاں کھاتا ہے لیکن پاکستانی پرچم لہراتا ہے۔

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
جسے اہل نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

حکیم الامت علامہ محمد اقبال کا یہ شعر کشمیر کی داستان مجبوری و محکومی 1930ء سے ہی سنا رہا ہے جہاں مقامی ہندو راجاؤں نے ہمیشہ مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے۔ کشمیر چونکہ مذہبی، جغرافیائی اور عوامی لحاظ سے پاکستان کا حصہ ہے اسی لیے پاکستانی عوام اور اہل قلم و فن کے دل بھی ہمیشہ اپنے کشمیری بھائیوں کے ساتھ دھڑکتے ہیں چنانچہ 1947ء میں کشمیر کے مسئلے پر پاک بھارت جنگ چھڑی تو ریڈیو پاکستان سے کشمیر کی آزادی کی نوائیں بھی گونجنے لگیں۔ سب سے پہلے ریڈیو پاکستان لاہور نے کشمیر کے لیے نغمہ "جنت ہے کشمیر ہمارا ــــ کشمیر ہمارا

قدرت کی گودی میں کھیلے پیارا پیارا پیارا"

نشر کیا جو قیام پاکستان سے قبل کسی فلم میں شامل تھا جسے مبارک بیگم نے ریکارڈ کروایا تھا۔ اس نغمے کو لاہور ریڈیو پر دلشاد بیگم اور ساتھیوں نے بھی گا کر کشمیر سے پاکستان کے جذبات کا اظہار کیا۔

یوں وادی کشمیر کی آزادی پر قومی نغمات بنانے کا سلسلہ شروع ہوا جو ہمارے قومی نغمات کی ایک مستقل جہت بن گیا۔

☆—☆

کشمیری مجاہدین کی تحریک آزادی کو دو سال گزر چکے تھے اسی لیے وادی میں شدید بے چینی پائی جاتی تھی۔ کشمیر جو پاکستان کا حصہ تھا اور ہے گا اس کی آزادی کے ترانے ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتے رہے اس دوران ابو الاثر حفیظ جالندھری کو حکومت پاکستان کی جانب سے یہ تفویض نامہ ملا کہ وہ کشمیر کے لیے ایک پرجوش اور عام فہم ترانہ لکھ دیں۔ پیغام موصول ہونے کے بعد انھوں نے کشمیر کے لیے ایک خصوصی ترانہ لکھ دیا۔ چونکہ ہر پاکستانی کشمیر کو آزاد دیکھنا چاہتا ہے اسی لیے انھوں نے ترانہ میں لفظ "آزاد کشمیر" استعمال کیا تاکہ عوام کو اپنی آزادی کی منزل یاد رہے۔

حفیظ جالندھری کا یہ ترانہ جس کے بول "وطن ہمارا آزاد کشمیر" تھے 1958ء تک صرف عوام کے ذہنوں اور دلوں میں ہی رہا تاہم لاہور ریڈیو سے وابستہ اسٹیشن ڈائریکٹر جناب شمس الدین بٹ صاحب کا تبادلہ ریڈیو صدائے کشمیر راولپنڈی میں ہوا تو انھوں نے اس ترانے کو باقاعدہ ریکارڈ کرنے کا فیصلہ کرلیا جس کے لیے انھوں نے راولپنڈی کے موسیقار عنایت شاہ اور بھارت سے آئے ہوئے موسیقار رشید عطرے کو اس کی دھن بنانے کے لیے کہا۔ دونوں موسیقاروں نے مل کر طرز بنائی تو اب ریکارڈنگ کا مرحلہ آگیا۔ عنایت شاہ نے اقبال بانو اور نذیر بیگم کو فوراً منتخب کرلیا تاہم نغمہ چونکہ پوری وادی کی آواز تھی اس لیے اسے کورس کرنا ضروری تھا جس کے لیے انھوں نے راولپنڈی کے مزید اسٹاف آرٹسٹ بھی شامل کرلیے۔ تاہم ابھی بھی کچھ کمی محسوس ہو رہی تھی کیونکہ بٹ صاحب لاہور یا کراچی سے بھی کسی فنکار کو شامل کرنا ضروری سمجھتے تھے تاکہ کشمیر کی آواز کے لیے پاکستان کی ایک نمائندہ آواز بھی شامل ہو جائے۔ اس بابت انھوں نے رشید عطرے سے مشورہ کیا تو انھوں نے لاہور سے منور سلطانہ کو بلوانے کا مشورہ دیا جو ان دنوں قومی نغمات میں اپنا مقام بنا چکی تھیں لہٰذا منور سلطانہ کو اسپیشل بکنگ پر لاہور سے بلوا لیا گیا اور اس نغمہ کو پروڈیوس کرنے کے لیے معروف موسیقار اور ریڈیو پروڈیوسر جناب سجاد سرور نیازی کو یہ ذمہ داری سونپ دی گئی۔ سجاد سرور نیازی کے مشورے پر یہ ترانہ 14 اگست کو نشر کرنا تھا تاکہ کشمیری عوام بھی پاکستان کے ساتھ جشن آزادی میں شریک ہو سکیں۔ 18 اگست 1958ء کو وہ دن آگیا جب راولپنڈی اسٹوڈیو میں تمام فنکار موجود تھے۔ منور سلطانہ فنکاروں کی صف میں سب سے آگے تھیں جن کے ساتھ اقبال بانو، نذیر بیگم، گل رعنا اور شوکت مرزا بھی موجود تھے جبکہ مائیکروفون کی دوسری جانب کچھ نئے فنکار بھی تھے۔ صبح تقریباً 10 بجے کے قریب سجاد سرور نیازی نے "کیو" دیا تو ساز بج اٹھے۔ فوجی ڈرم، نقارے اور ہارمونیم جیسے ہی بجنا شروع ہوئے اسٹوڈیو میں ایک جذباتی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ہارمونیم پر اعجاز حسین حضروی نے بھی کمال کیا تو فوجی بینڈ کی قیادت کرتے لعل دین نے نہایت عمدگی سے موسیقی کا ساتھ دیا۔

اور یوں تقریباً دوپہر بارہ بجے تک ریکارڈنگ مکمل ہوگئی۔ یہ ترانہ پہلے ڈسک پر ریکارڈ کیا گیا جسے سننے کے بعد سجاد سرور نیازی نے اس کو اسپول ٹیپ پر منتقل کروا کر اس کی ریکارڈنگ مختلف اسٹیشنوں میں بھجوا دیں۔

ریکارڈنگ مکمل ہو چکی تھی تاہم نغمہ یوم قیام پاکستان کے دن 14 اگست کی صبح ایوان صدر کی تقریب کے بعد بجا۔ اس ترانے کو شارٹ ویو کے ذریعے مقبوضہ وادی میں بھی بھیجا

گیا جہاں سننے والوں کے دلوں میں جہاں اپنی آزادی کا جذبہ مزید ابھرا وہاں اس کی عسکری دھن یہ بتا رہی تھی کہ وادی میں جہاد ابھی جاری ہے۔ مکمل ترانہ یہ تھا۔

وطن ہمارا آزاد کشمیر آزاد کشمیر

باغوں اور بہاروں والا ——— دریاؤں کہساروں والا
آسمان ہے جس کا پرچم ——— پرچم چاند ستاروں والا
جنت کے نظاروں والا ——— جموں اور کشمیر ہمارا
کوہستانوں کی آبادی ——— وطن ہمیں ہے تاج آزادی
عزت کے پروانے جاگے ——— آزادی کی شمع جلا دی
تم بھی اٹھو اہل وادی ——— حافظ ہے اللہ تمہارا
زر کے لالچ سے او شیطان ——— کیوں بیچیں ہم دین ایمان
پاکستان کے ساتھ کھڑے ہیں ——— عزت حرمت حکم قرآن
جان بھی قربان ——— مال بھی قربان
وطن ہمارا آزاد کشمیر آزاد کشمیر

اس ترانہ کا آخری انترا جس میں پاکستان کے ساتھ رشتہ اسلام کی بنیاد پر یکجہتی شامل ہے اور اس میں بھارت کو "زر کی لالچ کا شیطان" کہا گیا ہے اُسے سنتے ہی بھارتی فوج اور وادی کے بھارت نوازوں میں آگ لگ گئی اور اسے سننے پر بھی پابندی لگا دی گئی لیکن آزادی کے متوالوں کے دلوں پر تو یہ ترانہ پہلے ہی نقش تھا بھلا بھارت کی یہ بات کیسے مانتے؟

جون 1975ء میں جب آزاد کشمیر میں بھی پارلیمانی نظام نافذ ہوا تو حکومت نے پاکستانی قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری کی شاعری کے سبب اس ترانے کو اپنا سرکاری قومی ترانہ بھی بنا لیا کیونکہ یہ ترانہ پہلے صرف جہاد کشمیر کی وجہ سے ہی ریکارڈ ہوا تھا تاہم اس کے ایک مصرعے "تم بھی اٹھو اہل وادی" کی جگہ "جاگ اٹھی ہے ساری وادی" کر دیا گیا۔ یہ نغمہ آج بھی آزاد جموں کشمیر کا سرکاری قومی ترانہ ہے لیکن مظفرآباد اور آزاد کشمیر کے دیگر شہروں کی اسمبلیوں میں پاکستانی قومی ترانے کو ہی فوقیت حاصل ہے اور یہ ترانہ طوالت کی وجہ سے صرف خاص خاص موقعوں پر ہی بجایا جاتا ہے۔

☆——☆

جس طرح پاکستانی قومی ترانے کے بعد سب سے زیادہ مقبول قومی نغمہ "دل دل پاکستان" یا "جیوے جیوے پاکستان" ہے اسی طرح کشمیر کے سرکاری ترانے کے بعد جسے قومی ترانے کا اعزاز حاصل ہے، اور اُس کی دھن اتنی مقبول ہے کہ پاکستان کے سرکاری و غیر سرکاری میڈیا میں جب بھی کشمیر کا ذکر اگر موسیقی کے ساتھ آتا ہے تو اُسی کی دھن بجتی ہے اور وہ ایک تاریخی ترانہ اور پاکستان کی طرف سے اپنے مظلوم کشمیری بھائیوں کی آواز ہے۔

1965 کی جنگ سے قبل کشمیر اور پنجاب جوڑیاں سیکٹر میں غنیم جہاں بھارت سے معرکہ آرائی جاری تھی کیونکہ بھارت اقوام متحدہ کی تمام قراردادوں کی دھجیاں اڑا کر سکون سے کشمیر ہڑپ کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا اور اقوام عالم کی خاموشی بھارت کو تھپکی دے رہی تھی لیکن یہ شہ رگ پاکستان ہے اور یہاں کی اکثریت مسلمان ہے اور دل سے پاکستان کی حامی ہے اسی لیے کشمیر جوناگڑھ اور حیدرآباد کی طرح تر نوالہ نہ بن سکا اور وادی کا ہر بچہ و جواں جاگ اٹھا۔ پاکستان بھی کشمیری بھائیوں کا ساتھ دینے کے لیے حق بجانب تھا چنانچہ آپریشن جبرالٹر بھی بھارت کی شر انگیزیوں کے خلاف شروع کرنا ناگزیر تھا۔ اسی آپریشن اور مختلف معرکہ آرائیوں کے دوران راولپنڈی میں ریڈیو صدائے کشمیر جو اب تراڑکھل کہلاتا ہے وہاں ایک خصوصی سیل قائم کیا گیا جہاں سے جہاد کشمیر کے پروگرام کے ساتھ ساتھ خصوصی ترانے بھی نشر ہو رہے تھے۔ ایک دن سیل کے اہم رکن قدرت اللہ شہاب نے ایک ترانہ منتخب کیا جسے مشرقی پنجاب کے اس شاعر نے تحریر کیا تھا جو نعت نگاری کے سبب حسان العصر کہلاتے تھے چنانچہ انہیں ریڈیو بلوایا گیا اور ان کی نظم پر منتخب اشعار میں ترامیم کے ساتھ اسے موسیقی میں ڈھالنے کا فیصلہ ہوا۔ عنایت شاہ نے کشمیری علاقائی سازوں کو یکجا کر کے اس کی شاندار دھن بنائی جس میں رزمیہ میوزیکل نوٹس بھی شامل تھے۔ فیصلہ کیا گیا کہ یہ ترانہ 15 اگست کو نشر کیا جائے گا۔ اس ترانے میں کشمیر کے دریائے ڈل کی نرم روانی بھی تھی تو پنجاب کے دریائے جہلم کے شور کی طغیانی بھی۔ گلوکار کے انتخاب کی بات ہوئی تو سب کا فیصلہ راولپنڈی ریڈیو کی معروف گلوکارہ اقبال بانو کی طرف تھا کیونکہ ان کے کشمیری گیت سری نگر میں بھی پسند کیے جاتے تھے اور وہ پہلے ہی "وطن ہمارا آزاد کشمیر" جیسے ترانے میں اپنی آواز سے نوائے حریت وادی میں پہنچا چکی تھیں۔ اقبال بانو کو جب پتا چلا کہ وہ کشمیر کے لیے نغمہ جہاد گا رہی ہیں تو انھوں نے بلا معاوضہ اسے ریکارڈ کروانے کا عزم کر لیا اور یوں اقبال بانو کی آواز میں یہ ترانہ ریکارڈ ہو گیا۔

15 اگست 1965 کو جب ملک اور مقبوضہ کشمیر کی فضاؤں میں یہ نغمہ گونجا تو ہر فرد جذباتی تھا کیونکہ حافظ مظہر الدین کے الفاظ سب کو آبدیدہ کرنے کی بجائے پُرعزم کر رہے تھے۔

"میرے وطن تیری جنت میں آئیں گے اک دن
ستم شعاروں سے تجھ کو چھڑائیں گے اک دن"

اس نغمے کو جوشیلے آہنگ کے ساتھ ساتھ کشمیر کے حسین مناظر کی صوتی تصویر دکھانے کے لیے سولہویں صدی میں کشمیری ادب عالیہ کی معروف شاعرہ، موسیقار اور کشمیری غزل کی بانی حبہ خاتون کا تحریر کردہ یہ مصرعہ بھی شامل کیا گیا۔ "کریو منتہ مجہ اس جائی ممنوہ مائی بھائی"

بس کیا تھا؟ اب اس ترانے کی گونج جو بھی سنتا اُس کی آنکھوں میں بھارت کے خلاف خون اتر آتا۔ اور جب یہ اشعار آتے تو جہادی فضا اور بھی جذباتی ہو جاتی۔

جہادِ حق کے لیے کر رہے ہیں تیاری
دکھائیں صف دشمن کو شان تمہاری
تیری فضاؤں میں پھر مسکرائیں گے اک دن
میرے وطن تیری جنت میں آئیں گے اک دن

اِس ترانے میں ہر پاکستانی کشمیر سے عہد کرتا ہے۔
شگفتہ گل، دستر ان نہیں بھولے
حسین پھولوں کی وہ انجمن نہیں بھولے
تیری فضاؤں میں کلیاں کھلائیں گے اک دن

یہ نغمہ اتنا مقبول ہوا کہ اس کی پابندی کے لیے بھارتی مہا سبھا میں بھی بھارت کی چیخیں نکل آئیں!

نغمے کی مقبولیت کے سبب کشمیر کے جہادی نغمات میں سب سے زیادہ اسے ہی ری لوڈ کیا گیا ہے۔ ریڈیو پاکستان راولپنڈی نے اس کا دوسرا ورژن رخسانہ مرتضیٰ کی آواز میں تیار کیا تو پاکستان ٹیلی ویژن نے اسے فریحہ پرویز، شبنم مجید اور ناصرہ مشتاق کی آوازوں میں بھی ریلیز کیا۔ پھر عاطف اسلم جیسے گلوکار نے بھی اس کے ابتدائی اشعار گا کر کشمیری بھائیوں سے یکجہتی کا ثبوت دیا۔ ان شاء اللہ کشمیر جب پاکستان کا حصہ بن جائے گا تو کشمیر کی آزادی میں اس ترانے کا حصہ بھی شامل ہوگا۔

☆……☆

بھارت کے ہاتھوں کشمیری عوام کا خون بہتا رہا مگر اقوام عالم کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ تاہم پاکستان اپنی شہ رگ کو نہیں بھولا جس کا اظہار یہاں کے ملی نغمات میں گاہے بگاہے ہوتا رہا۔ جو آگے چل کر فلمی دنیا کے قومی نغمات میں بھی شامل ہو گیا۔

1958ء میں ریلیز ہونے والی ہدایتکار رفیق رضوی کی فلم بیداری جو نظام تعلیم کے موضوع پر جذبۂ حب الوطنی

فروری 2017ء میں راقم الحروف نیوز پاکستان سے بطور اینکر اور پیچ پروڈیوسر وابستہ تھا۔ نیوز پاکستان کو بی بی سی کا تعاون حاصل تھا۔ یوم یکجہتی کشمیر میں پانچ دن باقی تھے تو ادارے کی جانب سے فرمائش آئی کہ کشمیر پر کوئی نغمہ لکھ دو۔ راقم نے فوراً قلم سنبھالا اور ایک ایسا نغمہ تیار کیا جس میں کشمیر کی وادی خود ظلم و ستم کی داستان بتا رہی ہے۔ صرف بیس منٹ میں نغمہ لکھ لیا اور دفتر پہنچا تو جمالی صاحب نے اسے فوراً بنوانے کا حکم دے دیا۔ ریڈیو پاکستان کے سابق انجینئرنگ منیجر جناب سید عزیز مہدی نے تہجد عباس اور محسن شیرازی کو نغمہ دیا جنھوں نے ایک دن میں اُس کی موسیقی مرتب کی اور نغمہ سرائی کے لیے گلوکار عارف انصاری کو فون کیا۔ ایک دن میں ہی اسے ریکارڈ کروا دیا۔ 4 فروری کو نغمہ تیار ہو کر ملا تو 4 اور 5 پانچ کی شب اس کی وڈیو بھی میں نے ترتیب دی اور والد صاحب اعجاز احمد فریدی (جو ان دنوں نیوز پاکستان میں ڈائریکٹر بھی تھے) کے ساتھ نہایت سرد موسم میں صبح گھر واپس آیا تو نغمہ سوشل میڈیا پر اپ لوڈ ہو چکا تھا۔ یہ نغمہ صدر آزاد کشمیر سردار مسعود خان کو بھی پسند آیا۔

"ظلم کی توڑوں گا زنجیر ...... نام میرا جموں کشمیر"

الحمد للہ! راقم الحروف کے اس نغمے کا مصرع "پاکستان کی میں تقدیر ...... نام میرا جموں کشمیر" اتنا مقبول ہوا کہ سری نگر میں حزب المجاہدین اور دختران ملت کے بینرز پر بھی یہ نظر آیا بلکہ آسیہ اندرابی نے اپنی ایک تقریر میں پورا بند پڑھا۔

2019ء میں بھارت نے اپنی بزدلی اور خباثت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کشمیر کو بھارت میں ضم کرنے کا قانون بنا ڈالا اور 5 اگست سے وہاں کرفیو نافذ ہے لیکن اس دوران آزادی کے لیے منتظر ہر کان کشمیر سے یکجہتی کے بے شمار ترانے سنتے ہوئے بھی صدا لگاتا ہے" بنے گا سارا ہندوستان ...... کشمیر بنے گا پاکستان"

چناچہ فلم بھی عوام میں بے حد پسند کی گئی۔ فلم اپنی کہانی سے زیادہ ملی نغمات کی وجہ سے کامیاب رہی جس کے نغمات آج بھی روز اوّل کی طرح مقبول ہیں جنہیں فیاض ہاشمی نے تحریر کیا جبکہ موسیقی ناشاد علی خان کی تھی۔ ان قومی نغمات میں کشمیر کا ذکر بھی شامل تھا۔ سلیم رضا کی آواز میں نغمہ "آؤ بچو سیر کرائیں تم کو پاکستان کی — جس کی خاطر ہم نے دی قربانی لاکھوں جان کی" کا آخری انترا کشمیر پر مبنی اشعار پر تھا۔

ایک طرف کشمیر ہمیں جنت کی یاد دلاتا ہے
یہ راوی اور اٹک کا پانی امرت کو شرماتا ہے
پاکستان زندہ باد — پاکستان زندہ باد

اسی طرح فلم میں شامل دوسرے قومی نغمے کا آخری انترا بھی سلیم رضا کی آواز میں قوم کے نونہالوں کو سبق دے رہا تھا۔

تم راحت و آرام کے جھولے میں نہ جھولو
کانٹوں پہ ہے چلنا میرے ننھے ہوئے پھولو
لینا ابھی کشمیر ہے یہ بات نہ بھولو
کشمیر پہ لہراتا ہے جھنڈا اچھال کے
اس ملک کو رکھنا میرے بچو سنبھال کے

1963ء میں فلم "اک تیرا سہارا" ریلیز ہوئی تو اس فلم میں بھی حمایت علی شاعر کا تحریر کردہ فوجی دھن پر ایک قومی نغمہ شامل تھا جسے نسیم بیگم اور آئرین پروین نے مل کر گایا جس کا آخری انترا اپنا عزم بتاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

وقت آنے تو بن جائیں گے تیر ہم
لے کے اک دن دکھا دیں گے کشمیر ہم
اس کی خاطر کٹا دیں گے اپنے گلے
اپنے پرچم تلے ہر سپاہی چلے

☆—☆

1965ء کے آغاز میں وہی بھارت جو 1962ء میں چین سے شکست کھا چکا تھا اپنی جھینپ مٹانے کے لیے کشمیری عوام پر ظلم و ستم ڈھانے لگا۔ یہی نہیں اس نے مارچ 1965ء کو کشمیری الگ حیثیت بھی ختم کرکے اس جنت نظیر وادی کو بھارت کا صوبہ بنانے کا بل پاس کرلیا۔ مقبوضہ کشمیر میں آئین سازی بھی روک دی اور وہاں اپنا گورنر تعینات کر دیا۔ نتیجتاً کشمیر کے غیور عوام ایک بار پھر آزادی کی خاطر کھڑے ہوگئے۔ بھارت سے کامل آزادی کے لیے ہتھیار بھی اٹھا لیے۔ اپریل 1965ء میں کشمیر سے غداری کرنے والے ہندو کے پٹھو شیخ عبداللہ کو گرفتار کرلیا کیونکہ اب وہ بھی بھارت سے کشمیر کی آزادی مانگ رہا تھا۔ کاش شیخ صاحب کی آنکھیں 1947ء میں کھل گئی ہوتیں تو آج کشمیری عوام پاکستان کے ساتھ ہوتے۔ بہرحال اب کشمیر کے بچے بچے میں ایک ہی نعرہ گونج رہا تھا "کشمیر بنے گا پاکستان کشمیر رہے گا پاکستان"۔

اگست 1965ء تک مجاہدین آزادی کے ہاتھوں کشمیر کا بیشتر حصہ بھارت کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ آزادی کے شعلے فروزاں تھے تو پاکستان میں ریڈیو پاکستان نے قومی نغمات کے ساتھ ساتھ کشمیر کے لیے خصوصی نغمات بنانے کا فیصلہ کرلیا جس میں آزادی کے مضامین کے ساتھ ساتھ وہاں بھارت پر سر پیکار مجاہدین کے جذبات گرمانے والے اشعار بھی شامل تھے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ریڈیو پاکستان کراچی آگے بڑھا جہاں ٹرانسکرپشن سروس کے نگراں سید سلیم گیلانی موجود تھے۔

جولائی کے اختتام پر سلیم گیلانی نے ریڈیو کے ملازمین کی ایک خصوصی میٹنگ طلب کی اور قومی نغمات کے ساتھ ساتھ کشمیریوں کے لیے نغمات بنانے کا منصوبہ بھی بنایا۔ انھوں نے تمام شاعروں کو تلقین کی کہ وہ کشمیری مجاہدین کے لیے بھی نغمات تحریر کریں بلکہ اس سال یوم تخلیق پاکستان کے موقع پر کشمیر سے متعلق نغمات بھی قومی نغمات کے ساتھ پیش ہوں گے۔ گیلانی صاحب کے حکم کے بعد دو دن تک کوئی بھی اعلیٰ پائے کا کلام نہیں آیا تو ریڈیو کے جونیئر پروڈیوسر جناب عظیم سرور نے خود پہلا نغمہ لکھا جو 4 اگست 1965ء کو ٹرانسکرپشن سروس پر ریکارڈ ہوگیا جسے لعل محمد کی دھن پر خورشید بیگم، تاج ملتانی، اقبال علی، ایس بی جان اور ساتھیوں نے ریکارڈ کروایا۔ جس کے بول بھی وادیٔ لالہ زار میں بیداری کا منظر نامہ بیان کر رہے تھے۔

علم اٹھاؤ کہ کشمیر جاگ اٹھا ہے
قدم بڑھاؤ کہ کشمیر جاگ اٹھا ہے

اس طرح یہ ترانہ ٹرانسکرپشن سروس پر ریکارڈ ہونے والا پہلا قومی نغمہ بنا ہے جتنی کشمیر بھی بن گیا۔

اگست کے وسط میں پاکستان سے آزادیٔ کشمیر کے لیے ایک خصوصی ریڈیو کا آغاز ہوا۔ جس کے سربراہ ڈی اے سلاری تھے۔ اس خصوصی سیل کے لیے بھی ریڈیو پاکستان کے فنکار کشمیر کے لیے قومی نغمات ریکارڈ کرواتے جو آکاش وانی کی ہرزہ سرائی کا جواب ہوتا۔ اس ریڈیو سے اگست 1965ء میں مخشر بدایونی کا تحریر کردہ نغمہ "وادیٔ کشمیر ہے — دیکھو انتظار"

بھی نشر ہوا جسے نعل محمد کی موسیقی میں نذیر بیگم (لاہور والی)، تاج ملتانی اور ساتھیوں نے گایا تھا"ٹرانسکر پشن سروس کراچی پر تیار کردہ اس نغمہ میں پہلی بار کشمیر کے علاقوں اور وہاں کی صورتحال کو بھی نظم بند کرتے ہوئے جذبۂ حریت پر اس طرح ابھارا۔

اٹھ حضرت بل کی ڈوبی ذرا آہ دیکھ
تو نے شب کالی دیکھتے ہیں راہ
چل کہہ دے "میرا اس کا دل" کب سے ہے انتظار

14 اگست 1965ء کو جب قیام پاکستان کی 18 ویں سالگرہ منائی جا رہی تھی تو اس دن ریڈیو پاکستان سے قومی نغمات کے ساتھ ساتھ کشمیر پر بنائے گئے خصوصی نغمات بھی گونج رہے تھے جو کشمیری مجاہدوں کو جذبۂ جہاد کی تلقین کرتے ہوئے ہر ساز اور ہر آواز میں یہی کہہ رہے تھے "جاگ اٹھا کشمیر" ۔ یہ نغمات چونکہ ٹرانسکر پشن سروس پر ریکارڈ ہوئے تھے اسی لیے ان کی صدائیں ملک کے مغربی حصے کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان میں بھی سنی جا رہی تھیں۔

ریڈیو پاکستان نے 14 اگست کی خصوصی نشریات میں یہ نغمات کشمیر بھی پیش کیے۔

"اے جنت کشمیر ــــ اے جنت کشمیر
اے تو کہ ہے مردان جگرور کی جاگیر"
(گلوکاران۔ ایس بی جان، نسیم بانو و ساتھی۔ شاعر۔ جعفر طاہر)

سن لو گو آزادی کی فریاد ــــ مٹ جائے گا صیاد
ہوگا اب کشمیر آزاد ــــ سن لو لوگو!
(گلوکارہ۔ ملیحہ بانو، ریڈیو صدائے کشمیر)

14 اگست ہی کو ریڈیو پاکستان کراچی پر شہنشاہ غزل مہدی حسن خاں صاحب نے ساتھی فنکاروں کے ساتھ مل کر سلیم گیلانی مرحوم کا تحریر کردہ یہ نغمہ حریت کشمیر بھی گایا جو جنگ ستمبر کے آغاز سے قبل ایک مقبول نغمہ بن چکا تھا جس کے بول کچھ اس طرح تھے۔

"آزادی کے آئے سویرے ــــ اللہ اکبر ــــ اللہ اکبر
گونجے ہر گھر
چناروں کے دیے جلائے ــــ ارض کشمیر ہوا اب منور
اللہ اکبر ــــ اللہ اکبر"

☆ــ☆

ماہ اگست میں کشمیری مجاہدوں کے حملوں سے بھارت کی کمر ٹوٹ چکی تھی اسی لیے اب بھارتی فوج بزدلی کی حد سے

آگے گزرتے ہوئے کشمیری خواتین کو بھی نشانہ بناتی۔ سری نگر میں بھارتی فوج کے ایک ٹولے نے کشمیری خواتین کے ساتھ آبرو ریزی کی تو کشمیری خواتین سروں سے کفن باندھے لال چوک پر پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لہراتی ہوئی آ گئیں۔ اب اس جنگ میں کشمیری مرد و جوان کے ساتھ ساتھ خواتین بھی عملی طور پر موجود تھیں۔ ایک کشمیری طالب نے بھارتی فوج کے سامنے بھارت کا پرچم اور وزیر اعظم لعل بہادر شاستری کی تصویر نذر آتش کی جو دراصل غم و غصہ تھا بھارت سے نفرت کا۔ کشمیری خواتین کے اسی جذبے کو دیکھتے ہوئے ریڈیو پاکستان کے اسکرپٹ رائٹر جناب ابو سعید قریشی نے کشمیری خواتین کے نام ایک شاندار ترانہ تحریر کیا جسے ٹرانسکر پشن سروس ریڈیو پاکستان پر نذیر بیگم اور ساتھیوں نے نہایت جوش و خروش سے گایا جو ہر کشمیری خواتین کے جذبۂ جہاد کو اس طرح سلام کر رہا تھا۔

"نڈر دلیر بچیاں سری نگر کی بیٹیاں
جہاد کا لگا چمن ــــ اڑ کیا بجا ب کا وہ چمن
سروں پہ باندھ کر کفن ــــ نکل پڑی ہیں بہر خدمت وطن
نڈر دلیر بچیاں سری نگر کی بیٹیاں
کھڑی ہیں لال چوک ــــ ستم گروں کا دست ظلم توڑنے
وہ ڈٹ رہی ہیں ہر طرف ــــ جہان کے ضمیر کو جھنجھوڑنے
کفن کی ساری تختیاں ــــ سری نگر کی بیٹیاں"

اس نغمے نے کشمیری خواتین کی نہ صرف بلند ہمت کو آشکار کیا بلکہ گھروں میں بیٹھی کشمیری خواتین کو بھی میدان عمل میں نکلنے پر مجبور کیا۔ بھارت اس ترانے سے اس قدر طیش میں آتا کہ اگر کوئی نہایت کم سن کشمیری بچی بھی اسے گنگناتی ہوئی ملتی تو اسے یا تو شہید کر دیا جاتا یا پھر نذر زنداں ــــ یہ ہے بزدل بھارت کی اوقات ــــ!

اس ترانے کی مقبولیت بھی کم نہ ہوئی اسی لیے 1994ء میں اسے کشمیری فنکارہ رخسانہ مرتضٰی نے راولپنڈی ریڈیو پر دوبارہ ریکارڈ کروایا جسے پاکستان ٹیلی ویژن نے بھی نشر کیا۔

☆ــ☆

اگست 65ء کے ختم ہوتے ہوتے کشمیر میں بھارتی فوج کے دو ڈویژن مجاہدین کے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکے تھے اور مجاہدین کشمیر کی منزل آزادی قریب تر تھی، مگر بھارت نے دنیا کی توجہ ہٹانے کے لیے پاکستان پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا لیا، جس کا پہلا وار 28 اگست کو پاکستانی شہر گجرات کے ایک گاؤں اعوان شریف پر بھارتی فضائیہ کی بمباری تھی۔

ادھر بھارت چھمب جوڑیاں کے محاذ پر بھی پاکستان کے ہاتھوں پسپا ہو رہا تھا اسی لیے اُس نے 5 اور 6 ستمبر کی شب' رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح پاکستان پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں جہاں پاک فوج نے جرأت و بہادری کی نئی داستانیں رقم کیں وہاں قومی فنکاروں نے اپنے اپنے فن بھی اس طرح نذرِ وطن کیے جس کی مثال تاریخ میں شاید ہی مل سکے۔

یہاں سے پاکستانی قومی نغموں کا مزاج باقاعدہ بدلا اور رزمیہ ترانے ہمارے قومی نغمات میں ایک مستقل جہت بن گئے جن کے ساتھ ساتھ کشمیری مجاہدین اور آزادیٔ کشمیر کے لیے بھی کئی پُرجوش ترانے اسی جنگ میں ریڈیو پاکستان نے تیار کیے۔

☆—☆

جنگ ستمبر کا آغاز ہو چکا تھا۔ لاہور اور سیالکوٹ کے ساتھ ساتھ کشمیر میں بھی مجاہدین کی ہاتھوں بھارتی فوج بری طرح پسپا ہو رہی تھی۔ بری' بحری اور فضائی محاذوں کے ساتھ ساتھ ریڈیو پاکستان بھی ایک محاذ بنا ہوا تھا جہاں سے روزانہ جنگی و قومی نغمات تیار ہو کر نشر ہوتے یا پھر وقت کی قلت کے باعث براہِ راست ہی پیش کر دیے جاتے۔ جنگ کو شروع ہوئے ابھی تیسرا دن ہی گزرا تھا کہ ریڈیو پاکستان کی پرانی عمارت میں فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے عوام میں مقبول گلوکار احمد رشدی داخل ہوئے۔ احمد رشدی ریڈیو پاکستان کے کراچی اسٹیشن پر آنے والے فلمی دنیا سے وابستہ پہلے گلوکار تھے (واضح رہے کہ سلیم رضا نے لاہور ریڈیو پر پہلے دن ہی آواز کا مورچہ سنبھال لیا تھا اور تیسرے دن ملکہ ترنم نور جہاں بھی ریڈیو پاکستان لاہور پہنچ چکی تھیں' جبکہ شہنشاہِ غزل مہدی حسن جو کراچی ہی میں تھے فلمی دنیا میں ہونے کے باوجود ریڈیو پاکستان کے اسٹاف آرٹسٹ تھے) احمد رشدی سیدھا ٹرانسکر پشن سروس کے نگراں سید سلیم گیلانی کے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے گیلانی صاحب سے وقت ضائع کیے بغیر نغمہ طلب کر لیا۔ گیلانی صاحب اُس وقت رفیق غزنوی اور حمید کیم کے ساتھ بیٹھے ترانے ہی منتخب کر رہے تھے' انھوں نے آزادیٔ کشمیر کے موضوع پر ہی عاشور کاظمی کا تحریر کردہ نغمہ منتخب کر لیا لیکن مسئلہ یہ تھا نغمہ کے لیے فنکار پہلے ہی بک ہو چکے تھے اور یہ نغمہ بھی چونکہ کورس میں گانا تھا اسی لیے انھوں نے احمد رشدی سے اُس دن کے لیے معذرت کرنا چاہی لیکن احمد رشدی نے وطن پاک کی خاطر گلوکاری کے میدان میں اپنا رتبے کا لحاظ کیے بغیر کورس میں گانے کی استدعا کر دی۔ احمد رشدی کے اس فیصلے کے بعد گیلانی صاحب انھیں خود اسٹوڈیو لے گئے جہاں تاج ملتانی' اقبال علی' خورشید بیگم اور شمیم بانو پہلے ہی موجود تھے۔ سب نے مل کر استاد نتھو خان کے ساتھ معمولی سی ریہرسل کے بعد کورس کی شکل میں ترانہ ریکارڈ کروا لیا جس میں احمد رشدی کی آواز بھی شامل تھی جو کشمیر کی وادیٔ چنار سے کہتی تھی۔

مدت سے مسلط تھے غلامی کے اندھیرے
وہ دیکھ دھندلکوں میں مچلتے ہیں سویرے
ملنے کو ہے آزادی کے ہر خواب کو تعبیر
اے وادیٔ کشمیر — اے وادیٔ کشمیر

یہ نغمہ بھی نشر ہوتے ہی مقبول ہو گیا۔ یہ جنگ ستمبر کے دوران آزادیٔ کشمیر کا پہلا نغمہ تھا جس کی فی منٹ 45 کی رفتار والی گراموفون ڈسک بھی جاری ہوئی اور پھر ای ایم آئی نے جنگی ترانوں کا لانگ پلے بنایا تو اُس میں بھی یہ نغمہ شامل تھا۔ اس طرح یہ نغمہ نہ صرف مقبول و محفوظ ہوا بلکہ موسیقی کے شائقین کی پہنچ میں بھی آ گیا۔

دورانِ جنگ 10 ستمبر کو ریڈیو پاکستان کراچی ٹرانسکر پشن سروس کشمیر کی جانب سے گل پوش وادی کے لیے ایک نہایت خوش ساعت نغمہ گلزار احمد اور نگہت سیما کی آوازوں میں نشر ہوا جس میں کشمیر کے نظاروں کی قسم کھا کر اسے پاکستان کی شہ رگ بتایا گیا۔ اس نغمے کو تنویر خورشید نے موسیقی سے سجایا جس میں کشمیر کا لوک رنگ بھی نمایاں تھا۔

جنت کشمیر تیرے رنگ و نزہت کی قسم
ہم سے وابستہ ہے تو اور تجھ سے وابستہ ہیں ہم

اسی طرح نگہت سیما نے اپنے شوہر نامدار تاج ملتانی کے ساتھ شفیع عقیل مرحوم کا تحریر کردہ ایک اور نغمہ 19 ستمبر 1965ء کو ٹرانسکر پشن سروس کراچی پر ریکارڈ کروایا جس کا عنوان "جاگ اٹھا کشمیر" تھا۔ یہ صرف ایک نعرہ ہی نہیں بلکہ کشمیر کے جلتے چناروں کی آواز تھی جو کئی ترانوں سے آ رہی تھی۔ لعل محمد کی موسیقی سے سجے اس نغمے کے بول کچھ اس طرح تھے۔

پتھر پتھر پھوٹ رہی ہے ذرّے کی تنویر
سبزہ سبزہ جاگ رہی ہے کرنوں کی تحریر
جاگ اٹھا کشمیر..... جاگ اٹھا کشمیر

ریڈیو پاکستان کراچی ٹرانسکر پشن سروس پر دورانِ جنگ کشمیر سے متعلق سب سے زیادہ نغمات تیار ہوئے جن کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

☆ اے وادئ کشمیر کانٹے بھی تیرے پھول ہیں کنکر بھی گوہر ہیں (آوازیں۔ تاج ملتانی، خورشید بیگم، ایس بی جان وساتھی۔ شاعر۔ کشفی بدایونی۔ موسیقار۔ استاد نتھو خان)

☆ اٹھے جہاد کے لیے سری نگر کے نوجواں (آوازیں تاج ملتانی، اقبال علی وساتھی۔ موسیقار۔ قدیر جمال)

☆ اے جنت کشمیر — جرأت بھا دے جذبے ہے (آوازیں۔ تاج ملتانی، خورشید بیگم، اقبال علی، اختر عباس علی وساتھی۔ شاعر۔ کشفی بدایونی۔ موسیقار۔ استاد نتھو خان)

ریڈیو پاکستان کراچی ٹرانسکرپشن سروس کی طرح ریڈیو پاکستان لاہور بھی آواز کے محور پر صف آرا تھا بلکہ سب سے پہلے اسی اسٹیشن نے صوتی محاذ پر دشمن کی یلغار کا منہ توڑ جواب دیا تھا جس کی صوتی لہروں سے ابھرتی ہوئی آوازوں سے بھارت میں لرزہ طاری ہوتا تھا۔ یہاں بھی کشمیر کے جذبۂ حریت کے لیے فنکاروں نے نغمات پیش کیے جن میں سلیم رضا، منیر حسین اور نسیم سلطانہ نے نیاز حسین شامی کی موسیقی میں سب سے پہلے وادئ کشمیر کے نام پاکستان کا پیغام اس طرح سنایا۔

باطل سے نہ ہوگی کبھی تسخیر ہماری
کشمیر سے وابستہ ہے تقدیر ہماری

دوران جنگ ساحل فارانی کا تحریر کردہ جنگی ترانہ جسے سلیم رضا اور مسعود رانا نے گایا تھا اس کے آخری بند میں بھی کشمیر کا ذکر ملتا ہے۔

میدان میں کافر کو ہر گام پہ مارا ہے
اے غازیو! آگے بڑھو کشمیر ہمارا ہے
کشمیر کو اپنا — تو جیت کے ہی آؤ

لوک فنکار محمد عالم لوہار نے مختار صدیقی کے الفاظ میں بھارتی مظالم بیان کیا۔

ہند کے حاکموں بے جبر بہرہ
ارض کشمیر پر ظلم تم نے کیے
تم شہیدوں کو بدنام کر... تم ز

استاد امانت علی خان اور فتح علی خان نے اثر ترابی کے تحریر کردہ نغمہ "اے شہیدان وطن تم پر سلام" میں سبز ہلالی پرچم کو کشمیر پر لہرانے کا عزم یوں کیا۔

پرچم اسلام کھلتا جائے گا
اک دن کشمیر پہ لہرائے گا
عزم رکھتے ہیں یہ محمدؐ کے غلام
اے شہیدان وطن تم پہ سلام

اسی نغمہ کی بنا پر استاد امانت علی خان کو بعد از جنگ تمغۂ خدمت سے نوازا گیا تھا۔ جنگ ستمبر کے دوران ایسے کئی قومی نغمات تھے جن میں جہاد کشمیر کا ذکر موجود تھا۔

☆—☆

جنگ کے اختتام کے بعد پاکستان میں اپنے مظلوم کشمیری بھائیوں سے والہانہ محبت وعقیدت جاری تھی کیونکہ یہاں بھی ہر آنکھ کشمیر کے لیے خواب آزادی کی منتظر تھی۔ اس جذبے کا اظہار ہماری فلم نگری میں بھی ہوا اور جنگ کے فوراً بعد ایک فلم "جاگ اٹھا کشمیر" بننے لگی جس کے نغمات بھی تیار ہو چکے تھے۔ فلم کا ٹائٹل نغمہ "جاگ اٹھا کشمیر" سلیم شہزاد اور ساتھیوں نے گایا تھا۔ تاہم فلم ریلیز نہ ہو سکی۔ اس کے بعد 1966ء میں ایک فلم "کشمیر کی کلی" بھی نامکمل رہی۔ تاہم مشہور فلمساز و ہدایت کار ریاض شاہد جو تاریخی فلمیں بنانے کے لیے مقبول تھے انہوں نے کشمیر میں ظلم و زیادتی کے خلاف فلم "امن" بنانے کا فیصلہ کیا۔ جس کے لیے انہوں نے اپنی جیب سے سرمایہ لگایا لیکن فلم سنسر بورڈ نے ریاض شاہد کو فلم کے موضوع پر اس قدر تنگ کیا کہ وہ بلڈ کینسر میں مبتلا ہو گئے اور اسی غم میں ان کا انتقال ہو گیا۔ سنسر بورڈ نے فلم "امن" کو "یہ امن" کے نام سے منظور کیا اور اس کے شدید بھارت مخالف مناظر بھی کاٹ دیے۔ یہ کٹی پھٹی فلم ریلیز ہوئی پھر بھی اپنی کہانی اور نغموں کے اعتبار سے کامیاب رہی۔

فلم کے نغمات مشہور انقلابی شاعر حبیب جالب نے تحریر کیے تھے جن میں اقوام عالم سے یہ اہم سوال اٹھایا تھا۔

"ظلم رہے اور امن بھی ہو؟ — کیا ممکن ہے تم ہی کہو"

حبیب جالب کے تحریر کردہ اس نغمہ میں موجود سوال کا جواب اقوام عالم کے پاس نہ تھا اور نہ آج ہے۔ اس نغمے کو ملکۂ ترنم نور جہاں اور شہنشاہ غزل مہدی حسن کی آوازوں میں الگ الگ ریکارڈ کیا گیا۔ جس کے بول کشمیر میں ظلم کی داستان بیان کرتے ہیں۔

ہنستی گاتی روشن وادی تاریکی میں ڈوب گئی
بیتے دن کی لاش پہ اے دل!
میں روتا ہوں تو بھی رو...!

اسی طرح فلم میں مہدی حسن اور ساتھیوں کی آوازوں میں نغمہ "جب تک چند لٹیرے تیرے گھر کو لوٹتے ہیں، اپنی جنگ رہے گی" یہ بھی ایک مقبول نغمہ ثابت ہوا۔ فلم میں شامل حبیب جالب کا ایک اور نغمہ "آزادئ کشمیر"

کبھی ہوئی دل پہ میرے خونی تیر کشمیر

واپس کر دے مجھ کو میرے خوابوں کی تعبیر
اے میرے کشمیر ــــ اے میرے کشمیر

جسے نور جہاں، عجیب عالم اور ساتھیوں نے گایا تھا اپنے حسن اور نغمائیہ کلمات کی وجہ سے بے حد مقبول ہوا۔

☆ــــ☆

1971ء کی جنگ کے بعد کشمیر کا مسئلہ ایک بار پھر اٹھا لیکن شملہ میں جو مذاکرات ہوئے وہ کیا حالات تھے اور کیا مجبوری جس کی بنا پر کشمیر کے مسئلے کو پاکستان کا نہیں بلکہ دونوں ممالک کا مسئلہ قرار دلوا کر آپس میں حل کرنے کے معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ اس طرح کشمیر کا معاملہ بجائے اقوام متحدہ کے ذریعے حل ہوتا اب دونوں ممالک کے درمیان ایک اختلافی مسئلہ بن گیا ہاں اگر کوئی تلاش کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

1986ء میں بھارتی گورنر جگموہن نے بھارت کے کٹھ پتلی وزیر اعلیٰ غلام محمد شاہ کی حکومت برطرف کر کے خود اختیارات سنبھالتے ہوئے مسلمانوں پر سرکاری نوکریوں کے دروازے بند کر دیے۔ 1989ء میں بھارت نے کشمیری مسلمانوں کے ساتھ پھر ظلم و زیادتی کرنا شروع کی تو اب کل جماعتی حریت کانفرنس کے رہنماؤں نے مل کر کشمیر کی آزادی کی جدوجہد کرنا شروع کر دی جس کے لیے انھوں نے کشمیر میں انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ 20 جنوری 1990ء کو بھارتی گورنر جگموہن نے گوکدل کے مقام پر مسلمان عورتوں اور بچوں پر گولیاں چلوا دیں جس سے کشمیری عوام میں بیداری کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ یکم مارچ 1990ء میں کشمیر کے پانچ لاکھ مسلمانوں نے سری نگر میں اقوام متحدہ کے ملٹری آبزرور کے دفتر کے باہر بھارت کے خلاف مظاہرہ کیا جس سے بھارتی فوج تلملا اٹھی اور اس نے نہتے مسلمانوں پر گولیاں چلوا دیں۔ بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔ یوں کشمیر کی حسین وادی ایک بار پھر انگار وادی بن گئی۔ ادھر پاکستان نے بھی اپنے مظلوم کشمیری بھائیوں کا ساتھ دینے کا اعلان کیا اور پہلی بار 5 فروری کو یوم یکجہتی کشمیر منایا گیا جو اب ہر سال منایا جاتا ہے۔

کشمیر کی اس تحریک آزادی کی نشاۃ ثانیہ میں پاکستان نے اپنی ہر رگ سے اظہار یکجہتی کے لیے ایک بار پھر نغمہ سازی شروع کی اور تمام قومی شاعروں نے کشمیر کے لیے اپنا اپنا کلام نذر کیا۔ اب ریڈیو پاکستان کے ساتھ ساتھ پاکستان ٹیلی ویژن بھی پیش پیش تھا جہاں کشمیر میڈیا سیل کی جانب سے فراہم کردہ فوٹیجز کے ساتھ نغمات حریت کشمیر روزانہ پاکستان ٹیلی ویژن کی اسکرین پر نشر ہوتے۔ جن میں غلام عباس کی آواز میں "ہو رہا ہے ظلم جو کشمیر میں، بہہ رہا ہے خون ناحق جو وہاں" اور اسد امانت علی کی آواز میں احمد فراز کا تحریر کردہ نغمہ "اے ہم نفسو! تم پہ یہ کیا گذری ہے بولو ــــ کس کا چھپا ہاتھ تھا گردن پہ تمہاری" نے کشمیر کا درد اہل جہاں کو بتایا۔

پاکستان ٹیلی ویژن اسلام آباد مرکز نے کشمیری فنکارہ رخسانہ مرتضیٰ کی آواز میں علامہ محمد اقبال کے کشمیر کے لیے تحریر کردہ اشعار کو بھی اپنی آواز میں ڈھالا جس کی موسیقی خالد صدیقی نے مرتب کی تھی۔ اس طرح میرا اپنا نے زاہد قریشی کا کلام قادر علی شگن کی موسیقی میں پاکستان ٹیلی ویژن لاہور مرکز پر ریکارڈ کروایا جو ارض کشمیر کو پاکستان کا پیغام دے رہا تھا۔

کہتا ہے دریا کا پانی ــــ تیری میری ایک کہانی
ہم کبھی ساتھ تم ساتھ سنگ رہیں گے
اے وادیٔ بہشت تجھے مل کے ہم سجائیں گے

1994ء میں پاکستان ٹیلی ویژن اسلام آباد مرکز نے کشمیر میڈیا سیل کے تعاون سے ایک ایسا نغمہ بھی تیار کیا جو کشمیر کی دختران ملت کو شاندار خراج تحسین تھا۔ ریاض الرحمن ساغر مرحوم کے تحریر کردہ اس نغمہ کو میرا اپنا، سائرہ نسیم اور ساتھیوں نے گا کر انسانوں کے ضمیر پر دستک دی جس کی آواز گونج گونج کر کشمیری خواتین کو نہ صرف خراج تحسین پیش کر رہی تھی بلکہ ان کا عزم و حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

اے بنت کشمیر ــــ ہمت کی تصویر
تیرا بہتا ہوا لہو، آزادی کی تحریر

اسی زمانے میں پاکستان ٹیلی ویژن لاہور مرکز سے پروڈیوسر ایوب خاور کی پروڈکشن میں ایک ایسا نغمہ بھی گونجا جس نے ہر آنکھ کو آبدیدہ کر دیا۔ ریاض الرحمن ساغر کے تحریر کردہ اس نغمہ میں کشمیر یا آزادی کا ذکر تو نہیں تھا لیکن بھارت کا خبیث اور مکروہ چہرہ ضرور دکھائی دے رہا تھا۔ الفاظ کے ساتھ ساتھ آواز اور موسیقی میں بھی سوز و گداز تھا جو استاد نصرت فتح علی خان جیسے بڑے گلوکار اور موسیقار کی آواز میں انوکھے لہجے سے کہتے ہیں۔

جانے کب ہوں گے کم اس دنیا کے غم
جینے والوں پہ سدا بے جرم و خطا
ٹوٹے ہیں ستم
جانے کب ہوں گے کم اس دنیا کے غم

اس نغمہ کی ریکارڈنگ کے دوران استاد نصرت فتح علی

سمیت سارے سازندے بھی آبدیدہ تھے۔ اور جب یہ نشر ہوا تو اسے اقوام متحدہ میں بھی پیش کیا گیا۔ آج بھی یہ نغمہ اقوام عالم سے چیخ چیخ کر سوال کرتا ہے "جانے کب ہوں گے کم اس دنیا کے غم"

☆.....☆

90ء کی دہائی میں ریڈیو پاکستان سے محمد افراہیم، انیتا ریاض اور ساتھیوں کی آوازوں میں نغمہ۔

ابھرے گی تیرے اپنے ہی زخموں سے وہ شمشیر
جو کاٹ کے رکھ دے گی ہر ایک ظلم کی زنجیر
کشمیر..... کشمیر..... کشمیر

روزانہ صبح نشر ہوتا تو پاکستان ٹیلی ویژن سے ہر جمعہ کو "صدائے کشمیر" کے عنوان سے ایک نغماتی پروگرام بھی نشر ہوتا۔ ریڈیو پاکستان راولپنڈی میں شعبۂ مالیات کے ایک افسر جن کا نام جاوید احمد تھا، وہ شعر و شاعری بھی کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے دفتر ہی میں بیٹھ کر بنام کشمیر ایک ایسا نغمہ لکھا جسے تراڑ کھل ریڈیو نے فوراً ریکارڈ کر لیا۔ نغمہ کے الفاظ عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی تھے اسی لیے فیصلہ کیا گیا کہ یہ نغمہ کشمیری فنکارہ رخسانہ مرتضیٰ کی آواز میں ہی ریکارڈ ہونا چاہیے۔ چنانچہ یوم یکجہتی کشمیر کے موقع پر اسے ریکارڈ کر لیا گیا اور جب یہ ریڈیو سے نشر ہوا تو اسے پاکستان ٹیلی ویژن نے بھی کشمیر میں جاری بھارتی مظالم کے مناظر کے ساتھ نشر کر کے کشمیر کی آواز پوری دنیا کو سنوائی جو ہر لفظ میں اقوام عالم اور دنیا کے نام نہاد مگر اسلام دشمن "چوہدریوں" سے یوں مخاطب تھی۔

"اے دنیا کے منصفو ! سلامتی کے ضامنو !
کشمیر کی جلتی وادی سے بہتے ہوئے خون کا شور سنو!"

ایم عبداللہ کی موسیقی سے سجا یہ نغمہ جب نشر ہوا تو دیکھنے والوں کے ذہنوں میں کئی سوالات چھوڑ جاتا۔ پروڈیوسر شاہد عمران گکھڑ نے اس نغمہ میں بار بار سلامتی کونسل اور اقوام متحدہ کے مناظر دکھائے۔ پھر اس نغمہ کو اقوام متحدہ میں بھی پیش کیا گیا کہ شاید وہاں کوئی باضمیر انسان کشمیر میں ظلم و ستم کو محسوس کر سکے اسی لیے شاعر نے عالمی ضمیروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

" آزادی کی فضاؤں میں رہنے والو !
انسانوں کا حق تسلیم بھی کرتے ہو
اور کشمیر میں ظلم و ستم کرتے ہیں جو
اُن کے لیے کوئی حد ستم نہیں رکھتے ہو"

جاوید احمد کو اس نغمہ پر 2002ء میں حکومتِ پاکستان

کی جانب سے صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے بھی نوازا گیا۔

☆—☆

90ء کی دہائی کے آغاز اور وسط میں پاکستانی موسیقی پوپ میوزک سے ہمکنار ہو چکی تھی جس میں ملی نغمات بھی بن رہے تھے۔ چنانچہ 1994ء میں ایک میوزیکل بینڈ "جنون" نے کشمیر کے لیے پہلا نغمہ "جاگو" کے عنوان سے گایا جو اپنی موسیقی اور شاعری کے لحاظ سے عوام میں بھی مقبول ہوا۔ جسے تحت اللفظ کے انداز میں گایا گیا جس کے کچھ الفاظ بھی خوب تھے۔

آندھیاں تیز ہیں، کلیاں نوخیز ہیں
توڑ کے مت پھینکنا، ہر طرف دیکھنا
کر کون کس طرح سے ہے —— جاگو جاگو جاگو

1999ء میں کشمیر کی آزادی کی منزل ایک بار پھر قریب آ گئی تھی جب کارگل کا محاذ چھڑ گیا۔ پاک فوج اور مجاہدین نے بھارت کے کارگل میں چھکے چھڑا دیے تھے۔ مجاہدین لائن آف کنٹرول سے بھی آگے نکل چکے تھے۔ بھارت کی واحد سپلائی لائن پر بھی قبضہ ہو چکا تھا لیکن ایک بار پھر —— برسرِ اقتدار قیادت نے جون 1999ء میں اعلان واشنگٹن پر دستخط کر کے اپنی فوجیں بلوا لیں۔ مگر بھی ہر سال یوم یکجہتی کشمیر منایا جاتا رہا جس میں بھارتی ظلم و ستم کی تصاویر سے جڑے نغمات کشمیر ضرور دکھائے جاتے۔ کراچی اور لاہور میں ریڈیو کے سینٹرل پروڈکشن یونٹ بھی نغمات تیار کر رہے تھے جن میں ریڈیو پاکستان لاہور سے رستم فتح علی خان اور ساتھیوں کی آوازوں میں خالد شیرازی کا تحریر کردہ نغمہ "سری نگر سے جہلم دریا لایا ایک کہانی —— ایسی ایک کہانی جس کا عنوان ہے قربانی" اور ڈاکٹر امجد پرویز کی آواز میں ناصر رضوی کا تحریر کردہ نغمہ "اے ارضِ کشمیر زمانہ دیکھے گا" بے حد مقبول ہوئے۔ 2006ء میں زیک آفریدی کی آواز میں پہلا نغمہ یکجہتی کشمیر "خزاں کے ماروں کو یاد کر لیں —— حسیں چناروں کو یاد کر لیں" ریلیز کیا۔ 5 فروری 2016ء کو سینٹرل پروڈکشن یونٹ ریڈیو پاکستان لاہور نے پروفیسر ناصر بشیر کا تحریر کردہ نغمہ "اے وادیٔ کشمیر" ریلیز کیا جس میں شاعر نے بھارت کو خوب جواب دیتے ہوئے کہا۔

"وہ کہتے ہیں کشمیر کو اک خواب ہی سمجھو
ہم کہتے ہیں ہر خواب اک ہوتی ہے تعبیر
اے وادیٔ کشمیر —— اے وادیٔ کشمیر"

پروڈیوسر ثروت علی خان کی پیشکش میں ریلیز ہونے والے اس نغمہ کو انور رفیع اور حافظ نصر اللہ نے نہایت خوبصورتی سے گایا اور پھر یہ موجودہ دور میں کشمیر سے اظہار یکجہتی کا ایک نمائندہ نغمہ بھی بن چکا ہے۔

جولائی 2016ء میں نوجوان کشمیری مجاہد برہان وانی کی شہادت کے بعد کشمیریوں کی پاکستان سے محبت کھل کر سامنے آ گئی۔ جب اُن کے جسدِ خاکی کو حزب المجاہدین کے ساتھ ساتھ پاکستانی پرچم میں بھی لپیٹا گیا۔ بھارت نے پورے سری نگر میں کرفیو لگا دیا لیکن اس کے باوجود عوام سڑکوں پر نکل آئے اور سری نگر کے مرکزی چوک پر بھی پاکستانی پرچم کی بہاروں نے کشمیر میں آزادی کا سبزہ بھارت کو دکھلا دیا۔ 19 جولائی 2016ء کو یوم شہدائے کشمیر و برہان وانی شہید منایا۔ جس کے بعد ریڈیو اور پاکستان ٹیلی ویژن کے علاوہ نجی اداروں نے بھی کشمیر کے لیے خصوصی نغمات تیار کیے۔ جن میں ایک اہم ادارے کا تیار کردہ نغمہ "اب تو آزاد ہے وادیا" جسے ایک بچے اذان علی نے گایا تھا عوام میں کشمیریوں کی آواز بنتا رہا۔ پھر 5 فروری 2017ء کو آئی ایس پی آر نے کشمیری عوام کے لیے ایک پُرجوش نغمہ جاری کیا جس میں ہر کشمیری کا فخر محسوس اور دیگر فنکاروں کی آواز میں کہتا ہے "اٹھا یا جا کشمیر سے نکل جا تو میرے گھر میری جنت سے نکل جا"

اس پُرجوش نغمے نے جہاں کشمیری عوام کا درد بیان کیا وہاں بھارت کے مظالم اور کشمیری عوام کی پاکستان سے عقیدت و محبت کو بھی نمایاں کیا۔ اور پھر جنگ ستمبر کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب کشمیر پر نغمات میں بھارت کا نام لے کر مخاطب کیا گیا۔ جس کا دوسرا مظہر اسی سال یوم دفاع کے موقع پر شجاع حیدر کی آواز میں نغمہ "کشمیر کو حق دو بھارت" بھی شامل تھا۔ اسی طرح علی عظمت اور دیگر فنکاروں نے پہلی بار پاپ میوزک میں بتا دیا کہ "کشمیر بنے گا پاکستان"

2019ء میں جب سے کرفیو جاری ہے یہاں ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی ویژن کے علاوہ نجی اداروں نے بھی نغمات تیار کیے ہیں جن میں "کشمیر بنے گا پاکستان" کے عنوان سے کئی نغمات سامنے آئے جو ماضی میں بس ایک نعرہ ہی تھا۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی نے بھی اسی عنوان سے نغمہ ریکارڈ کروا کر ایک مقبول نغمہ یکجہتی کو ہمارے ملی نغمات کی فہرست میں شامل کروا دیا جسے نذیر یاد نے تحریر کیا۔

++

شاعرِ بنگالہ

الف ف

مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا تو اردو ادب کا سورج غروب ہو گیا۔ اردو کے دلدادہ ترس گئے۔ ایسے وقت میں فقط دو چار قلم کار تھے جنھوں نے اردو ادب کے لیے کام کیا۔ انہی میں سے ایک شاعر کا مختصر سا تذکرہ۔

اس نے خط میں مرتی ہوئی زبان کی آبیاری کی

نوشاد نوری سے میرا شعر و ادب سے ہی نہیں، کاروباری تعلق بھی تھا۔ بات ذرا عجیب سی لگتی ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے۔

ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''میں کتابوں کی ایک دکان کھول رہا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ تم میرے پارٹنر کی حیثیت سے کام کرو۔ میرا سرمایہ تمہاری محنت۔ منافع میں تم پچاس فی صد کے حصے دار۔''

میں ان دنوں بیکار تھا، میں نے ان کی آفر قبول کر لی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نوشاد صاحب بھی ان دنوں کوئی ملازمت نہیں کر رہے تھے لہٰذا ان کے بڑے سالے نے جو وکیل ہونے کے باوجود وکالت نہیں کرتے تھے، مختلف طرح کے کاروبار کرتے تھے، انہوں نے نوشاد صاحب کو بھی کسی طرح کے چھوٹے موٹے کاروبار میں جوت دیا تھا۔ کچھ دنوں تک ان سے مختلف اشیاء کی ایکسپورٹ کا کام کروایا، پھر ڈھاکے کی نیو مارکیٹ میں دو دکانیں حاصل کر کے نوشاد صاحب کو دے دیا۔ ایک دکان میں گھڑیوں کا کاروبار، دوسری میں کتابوں کا۔ دونوں دکانوں کا نام ایسوسی ایٹ ٹریڈرز رکھا گیا۔ گھڑیوں کی دکان میں نئی گھڑیاں بکتیں اور پرانی کی مرمت ہوتی تھی۔ کتابوں کی دکان میں ادبی کتابیں فروخت کی جاتی تھیں۔ نوشاد صاحب دونوں کی نگرانی کرتے تھے اور کام کارکن کرتے تھے۔

کتابوں کی دکان کی ساری ذمّے داری اکیلے مجھ پر تھی۔ لاہور اور کراچی کے پبلشروں سے خط و کتابت، آرڈر دے کر کتابیں بذریعہ وی پی منگوانا، انہیں پوسٹ آفس سے لانا اور دکان پر انہیں فروخت کرنا میری ذمّے داری تھی۔ میں صبح گھر سے نکلتا تو رات نو دس بجے ہی لوٹتا تھا۔ نوشاد نوری اور میرے حوالے سے کتابوں کی یہ دکان ادیبوں شاعروں اور ادب دوستوں میں بہت جلد مقبول ہو گئی۔ ایسا کوئی بھی شخص نیو مارکیٹ آئے اور ایسوسی ایٹ ٹریڈرز میں حاضری نہ دے، یہ ممکن نہیں تھا۔ خاص طور پر شام کے بعد ادیبوں شاعروں کی اچھی خاصی تعداد دکان میں آ جاتی تھی۔ اس موقع پر نوشاد صاحب بھی دکان میں موجود ہوتے تھے جو عام طور پر دن کے وقت حاضر نہیں ہوتے تھے۔ پانچ ہزار سے جو کاروبار شروع کیا گیا تھا، تھوڑے ہی عرصے میں ڈبل مالیت کی کتابوں سے دکان بھر گئی۔ کچھ دنوں تک تو یہ سلسلہ کامیابی کے ساتھ چلتا رہا، پھر نوشاد صاحب کی لاابالی طبیعت اور غیر کاروباری اصولوں کے تحت دکان کی پہلے جیسی پوزیشن نہیں رہی۔ نوشاد صاحب اکثر شام کو آتے اور گلے میں ہاتھ ڈال کر مٹھی بھر رقم اٹھا کر شیروانی کی جیب میں ٹھونس کر چل دیتے۔ اس طرح نئی کتابوں کی وی پی وقت پر پوسٹ آفس سے وصول نہیں کی جاتیں۔

کوئی سال بھر بعد ان کے برادر نسبتی نے جب کتابوں کی دکان کا جائزہ لیا تو انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ گھڑی کی دکان کے مقابلے میں کتابوں کی آمدنی پہلے ہی کم تھی جب کہ نوشاد صاحب نے کاروباری اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نفع نقصان کا کوئی حساب کتاب رکھنے کی بجائے غلط حساب خرچ کیا۔ لہٰذا اصل سرمایہ کار ہونے کی حیثیت سے وکیل صاحب نے کتابوں کی دکان بند کروا دی۔

میں نے اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے نوشاد صاحب سے کوئی لکھت پڑھت یا ایگریمنٹ نہیں کی تھی۔ میں نے خود ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ منافع میں شراکت دار ہوں اس لیے تنخواہ کیا لوں۔ بس دوپہر کے کھانے پر دو چار روپے اور آنے جانے کے کرائے کے لیے دو تین روپے لے لیتا تھا۔ نوشاد صاحب نے بھی کبھی یہ نہیں کہا کہ یار اپنے خرچ کے لیے بھی کچھ پیسے لے لیا کرو۔ میں اس بات پر مگن تھا کہ سال بھر کے بعد منافع میں حصہ تو ملے گا مگر اب جب گھاٹے پر دکان بند کر دی گئی تو میری ساری خوش فہمی ہوا ہو گئی مگر میں نے اس موقع پر نوشاد صاحب سے کوئی شکوہ شکایت نہیں کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نوشاد صاحب نے بھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ معذرت کے طور پر دو بول بھی نہیں کہے۔ اس کے باوجود میرے ان کے ساتھ جو تعلقات پہلے سے تھے، برقرار رہے۔

یہ تھا میرا نوشاد نوری صاحب کے ساتھ کاروباری رشتہ۔ اس دوران مجھے ان کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان کی شخصیت کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ وہ بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کے ہم عصر ساتھیوں کی زبانی ان کی ہمہ جہت ادبی سرگرمیوں کی کہانی سن چکا تھا۔ پاکستان آنے سے پہلے وہ ایک فعال ترقی پسند شاعر اور دانشور کی حیثیت سے بڑے شہرت یافتہ تھے۔ ان کی اور اختر پیامی کی بہار میں متحدہ ترقی پسند شاعروں کی حیثیت سے بڑی دھوم تھی۔ ان کے بارے میں بہت سی باتیں سن رکھی تھیں مگر کتابوں کے کاروبار کے دوران ان کو میں نے جس روپ میں دیکھا وہ اس کہانی سے بہت مختلف تھے۔ اپنی عمر کے لحاظ سے بھی اب انہیں جس قدر سنجیدہ اور متین ہونا چاہیے تھا، وہ اس کے برخلاف تھے۔ وہ اپنے جونیئرز کے ساتھ مل کر جس موج مستی کا مظاہرہ کرتے تھے، ان کی عمر کے کچھ شاعر و ادیب اسے اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ لونڈے لپاڑوں کے ساتھ وہ جو غل غپاڑہ کرتے ہیں، وہ انہیں زیب نہیں دیتا۔ جب کہ ہماری عمر کے لڑکے غلام محمد، شہزاد اختر، زین العابدین، احمد زین الدین اور ذکی آذر وغیرہ اسے ان کی کشادہ دلی اور اعلیٰ ظرفی سمجھتے تھے کہ وہ ہمارے پاس آ کر

بھی اپنے بڑے پن کا رعب نہیں جھاڑتے۔

ابھی دنوں کی بات ہے کراچی سے چند صفحوں پر مشتمل ایک ''ادبی گزٹ'' شائع ہوتا تھا جس میں ادیبوں اور شاعروں کی پگڑیاں اچھالی جاتی تھیں۔ اس گزٹ کے شائع کرنے والوں کا نام پتا شائع نہیں ہوتا تھا۔ اس ''ادبی گزٹ'' کی کچھ کاپیاں ہماری دکان کو بھی مفت ارسال کی جاتی تھیں۔ نوشاد صاحب نے اس ادبی گزٹ سے نہ صرف خود بڑی تفریح حاصل کی بلکہ ادبی حلقوں کو بھی اس سے فیضیاب کیا۔ اس طرح کی چند چیزوں سے ماحول میں جو خوشگوار تفریحی رنگ بکھرتے ہیں، ڈھاکے میں بھی اس کی رنگ آمیزی دیکھ کر نوشاد صاحب کی رگِ شرارت پھڑکی اور انہوں نے بھی اسی نوعیت کی ادبی ہلچل پیدا کرنے کی منصوبہ بندی کر لی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنے کچھ نوجوان ادیب اور شاعر دوستوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا پروگرام بنایا۔ انہوں نے کوئی ادبی گزٹ کا پرچہ تو شائع نہیں کیا بلکہ ادبی رپورٹ کے طور پر ایک تحریر لکھوانا شروع کی جسے لاہور کے ادبی جریدے ''نصرت'' میں بھیجا جاتا تھا۔ یہ ادبی رپورٹ ابنِ بطوطہ کے نام سے ارسال کیا جاتا تھا۔ یہ چٹ پٹی اور مسالے دار رپورٹ بڑے عجیب طریقے پر لکھوائی اور حنیف رامے کے جریدے کو بھجوائی جاتی تھی۔ ''نصرت'' ڈھاکے میں پہلے ہی مقبول تھا۔ اس رپورٹ کی وجہ سے اور بھی بڑھا جانے لگا۔ سارے ادیب و شاعر حیران و پریشان تھے کہ یہ کس کی شرارت ہے۔ ابنِ بطوطہ کون ہے؟ چند لوگوں کے علاوہ اور کوئی اس سربستہ راز سے باخبر نہیں تھا کہ جناب نوشاد نوری اپنے چند نوجوان دوستوں کے ساتھ یہ شرارت فرما رہے ہیں۔

نوشاد صاحب کی یہ ''زندہ دلی'' کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ابتدا ہی سے ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد کے وہ بہت پہلے سے قائل تھے۔ اس چھیڑ خانی کے کھیل میں، انہوں نے جواہر لال نہرو کو بھی نہیں بخشا تھا۔ یہ قصہ 1951ء کا ہے جب بھارتی وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو امریکی امداد کے حصول کے لیے امریکا گئے تھے تو انہوں نے بظاہر ایک احتجاجی نظم لکھی مگر حقیقتاً ان پر بھکاری کی پھبتی کسی۔ اس نظم کا عنوان بھی 'بھکاری' تھا جس نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ حکومت مخالف میڈیا نے اسے خوب اچھالا۔ نوشاد نوری صاحب نے تو اسے اشاعتِ خاص کی غرض سے ایک پرچے کو بھیجا تھا مگر ہندوستان بھر کے بے شمار اخباروں اور رسالوں نے بھی اسے چھاپا جس سے حکومت کی بنیادیں ہل کر رہ گئیں۔ اس نظم کے کئی بندوں کے اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

در پر تیرے دور کہیں کا ایک بھکاری آیا ہے
اپنے دکھ کی بھیک بتا تیرے وطن میں لایا ہے
گھر گھر میرا اسد اوپر تھا گیا تو ... خوش حال
لیکن بھائی میرے گھر میں کال پڑا ہے کال
کرتی بھوکی بھارت ماتا راجا کو پرنام
دے دے رام دلا دے رام دینے والا سیتا رام

—

راج سنبھالے مدت بیتی لیکن پھر اس سال
بھوکا ہے پنجاب رے بھائی بھوکا ہے بنگال
کرتی بھوکی بھارت ماتا راجا کو پرنام
دے دے رام دلا دے رام دینے والا سیتا رام

—

بھارت جگ میں سب سے اونچا اونچی ہے شان
ہاتھ پسارے کب سے کھڑا ہے بھوکا ہندوستان
واشنگٹن کی گلیوں میں ہے بھارت کا نیلام
دے دے رام دلا دے رام دینے والا سیتا رام

—

دے دے رام دلا دے رام دینے والا سیتا رام ملک بھر میں اتنا مقبول ہوا کہ پنڈت جی اور ان کی حکومت کو اپنی ٹوپی سنبھالنی مشکل ہو گئی۔ لہٰذا بھارتی حکومت کو اس نظم کے لکھنے پر نوشاد نوری کے خلاف گرفتاری کا پروانہ جاری کرنا پڑا۔ اب وہاں سے دم دبا کر بھاگنے کے علاوہ ان کے لیے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ جس وقت وہ بھاگ کر ڈھاکے آئے تھے وہ جوان تھے اور یہ ان کی شہرت اور مقبولیت کے عروج کا دور تھا۔ وہ 1946ء سے 1950ء تک انجمن ترقی پسند مصنفین بھارت کی صوبہ بہار شاخ کے سیکریٹری جنرل تھے۔ ایک مستند اور مقبول شاعر کی حیثیت سے انہیں تسلیم کیا جاتا تھا۔ ترقی پسندوں کے کئی ترجمان جریدوں کے سرورق پر ان کی نظمیں شائع کی جاتی تھیں۔ اپنی اس 'زندہ دلی' اور 'چھیڑ چھاڑ' کی عادت کی وجہ سے انہیں سارا سنگھاسن چھوڑ کر ایک نئی جگہ نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنا پڑا۔ یہاں کچھ دنوں تک تو انہوں نے جدوجہد جاری رکھی، سرکاری ملازمتیں کرتے رہے پھر جب ذرا قدم جمے تو اپنی چھیڑ خانی

کی پرانی عادت سے مجبور ہو کر حکومت وقت کے ساتھ پنگے لینے لگے اور اس کے نتیجے میں سرکاری ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ خود تو مست ملنگ تھے اس لیے تنگی ترشی کے زمانے میں بھی اپنے فلک شگاف قہقہوں سے اپنے دکھ پر پردہ ڈالے رکھتے مگر ان کے گھر اور گھر والوں پر یہ وقت بڑا صبر آزما گزرتا۔ بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے اس لیے ہر خانے میں فٹ ہو جاتے تھے۔ ہر ماحول میں اپنے آپ کو ڈھال لیتے تھے۔ سر سے پاؤں تک مکمل شاعر ہونے کے باوجود انہوں نے دو اور دو چار کا کام بھی کیا (آڈٹ اور اکاؤنٹس کے محکمے میں)، صحافت بھی کی اور تجارت بھی۔ تنگی ترشی کا مزہ بھی چکھا اور خوش حالی اور فارغ البالی کا دور بھی دیکھا مگر سارے ادوار میں ان کا ایک پہلو نمایاں رہا۔ چھیڑ چھاڑ اور پنگے بازی سے وہ کبھی باز نہیں آئے۔ ہمیشہ مخالف انداز اپنائے رکھا۔ ٹھیک ہے یہ ان کا ایک اصول تھا کہ وہ کسی کے آگے جھکے نہیں، کسی سے کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ہمیشہ اپوزیشن کا ساتھ دیا جس سے انہیں نقصان بھی پہنچا اور فائدہ بھی ہوا۔ ان کی عادتیں اور باتیں بہت سے لوگوں کو پسند نہیں تھیں۔ ان کی زندہ دلی، چھیڑ چھاڑ اور پنگے بازی کو سنجیدہ ادبی حلقہ ان کے شایان شان نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے یہ بات کتابوں کی دکان کے دوران شدت سے محسوس ہوئی تھی۔ کچھ ادیب و شاعر میرے سامنے بھی اس کا اظہار کرتے تھے تو میں کہتا تھا، وہ اپنے بارے میں آپ سے اور مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں، وہ ایک ذمے دار آدمی ہیں اگر وہ ایسی کچھ باتیں کرتے ہیں جو آپ کو یا کسی کو پسند نہیں تو اس سے ان کی شخصیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ ان کا حق ہے کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے آپ کو پیش کریں۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان کا اصل نام محمد مصطفیٰ معصوم ہاشمی تھا اور وہ ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد عبدالغنی ہاشمی نے اپنے آبا و اجداد کی طرح زمینداری سے وابستہ رہنے کی بجائے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ ان کے گھر 21 جولائی 1926ء کو محمد مصطفیٰ معصوم ہاشمی پیدا ہوئے تو ان کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کا یہ فرزند ارجمند برصغیر میں ان کے خاندان کا نام روشن کرے گا۔ صوبہ بہار کے ضلع دربھنگ کے موضع پنڈاری بشت میں پیدا ہونے والے بچے کے سلسلے میں کون سوچ سکتا تھا کہ ایک دن اس کی شہرت کے ڈنکے بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش میں بجیں گے۔

وکیل صاحب کثیر العیال تھے۔ دو لڑکے اور چھ لڑکیوں کی انہوں نے تعلیم و تربیت میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لیا۔ ان کا بیٹا معصوم ہاشمی بچپن سے ہی بڑا ذہین تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے تعلیمی مراحل طے کیے اور بے حد کمسنی میں گورنمنٹ ہائی اسکول سیتامڑھی سے میٹرک پاس کیا اب کہ بی این کالج پٹنہ سے بی اے کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

شعر و شاعری کی لت انہیں بہت کم عمری میں ہی لگ چکی تھی۔ ہمہ وقت شعر موزوں کرنے میں لگے رہتے تھے۔ آٹھویں جماعت میں تھے کہ ہندی زبان کے معروف انقلابی شاعر رام دھاری سنگھ دنکر سے ان کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس نوخیز شاعر کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور شاید انہی کی صحبت کا نتیجہ تھا کہ انقلابی شاعری کی طرف ان کی طبیعت مائل ہوئی۔ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے شاعروں میں باضابطہ شامل ہو گئے اور ادبی محفلوں میں شرکت کرنے لگے مگر انہیں اپنا نام شاعر کی حیثیت سے استعمال کرتے ہوئے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا لہٰذا ایک دن وہ معصوم ہاشمی سے نوشاد نوری ہو گئے۔

اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے وہ ترقی پسندی کے خانے میں فٹ ہوتے تھے لہٰذا ابتدائی شاعری میں پر پرزے نکالنے کے ساتھ ہی وہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ ترقی پسندوں نے ان کی نئی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور جلد ہی وہ اس تحریک کے ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ اور پھر انہیں بہار شاخ کا جنرل سیکرٹری بنا دیا گیا۔ یہ ان کی نوجوانی کا دور تھا۔

انہوں نے اس تحریک میں جو عزت اور مقام حاصل کیا وہ ان کی شاعرانہ عظمتوں اور قادرانہ صلاحیتوں کا نتیجہ تھا۔ اپنی ذہانت، متانت اور خوش مزاجی کی وجہ سے وہ پٹنہ میں موجود سینئر ادیبوں اور شاعروں میں بھی بہت مقبول ہو گئے۔

1951ء میں حکومت وقت کے پنگے سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے انہیں انتہائی خفیہ طریقے پر ترک وطن کرنا پڑا۔ پٹنہ سے بذریعہ ریل دیناج پور پہنچے اور اسی دن بذریعہ ٹرین ڈھاکا پہنچے تو ان کے ہم خیال شاعروں ادیبوں نے انہیں اپنے درمیان پا کر خوشی کا اظہار کیا۔ ڈھاکا میں آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس آفیسر کا امتحان ہو رہا تھا۔ دوستوں

نے انہیں اس امتحان میں بٹھا دیا اور وہ کامیاب ہو گئے۔ اس طرح انہیں سرکاری ملازمت مل گئی پھر ان کا تبادلہ 1952ء میں کراچی ہو گیا۔ کراچی میں دو سال گزارنے کے بعد ان کا تبادلہ کوئٹہ ہو گیا اور پھر کوئٹہ سے وہ کراچی لوٹ آئے۔ یہ سرکاری ملازمت انہوں نے 1952ء سے 1963ء تک کی۔ اس کے بعد وہ ڈھاکا لوٹ گئے اور روزی روٹی کے لیے صحافت کے کوچے میں داخل ہو گئے۔ 1967ء سے 1969ء تک پاکستان فیچر سنڈیکیٹ میں کام کیا۔ 1968ء میں چاند میاں (شیخ الرحمٰن) کے سیاسی ہفتہ وار رسالے "روئداد" (اردو) کے مدیر رہے۔ 1969ء سے 1971ء تک تاج الدین احمد کی زیر قیادت اردو ہفت روزہ "جریدہ" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔

آرٹ اینڈ اکاؤنٹس کے محکمے سے علیحدگی اور صحافت سے وابستگی کے درمیان میں جو وقفہ تھا اس میں انہوں نے اپنے سسرالی عزیزوں کے دباؤ پر مختلف نوعیت کے چھوٹے موٹے کاروبار کیے جن میں وہ اپنے آپ کو ایڈجسٹ نہ کر سکے اور بیچ دیں، یہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ شاعر و ادیب تھے اس لیے صحافت انہیں راس آ گئی اور آخری عمر تک اسی میں آسودہ رہے۔ بچوں کی پرورش و پرداخت اچھی طرح کی۔ انہیں پڑھایا لکھایا شادی بیاہ کی۔ ان کی پانچ اولادیں ہیں، جن میں ایک بیٹا اور چار بیٹیاں، بیٹا مصطفیٰ ہلال ہاشمی ایک بیرونی بینک میں افسر اعلیٰ کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ سب سے بڑی بیٹی ادیب افروزی دربھنگہ ہی میں رہتی ہے جب کہ دیگر بچیاں شبانہ نوری، رضوانہ نوری اور صدف نوری ڈھاکا ہی میں قیام پذیر ہیں۔ انہیں سوہادن کی لسانی تحریک کے موضوع پر "سوئی جو واڑ" جیسی معرکۃ الآرا نظم کہی۔ اس کے علاوہ 26 مارچ 1971ء کے موضوع پر کہی جانے والی نظم "لہو میں شرابور دن" مشرقی پاکستان کے پاکستانی دور کی آخری اردو نظم ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب ان پر ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھتا گیا تو آہستہ آہستہ ان کے موڈ مزاج میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ صحافت کے پیشے نے ان کی سنجیدگی اور متانت میں اضافہ کیا اور وہ ایک ذمہ دار شاعر و ادیب اور صحافی کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرنے لگے۔ 1971ء کے بعد بنگلہ دیش میں اردو ادب کی رکھوالی کا منصب اور ذمہ داری بھی ان پر آن پڑی کیونکہ بنگلہ دیش بنتے ہی اردو شاعری اسی مقام پر لوٹ آئی تھی جہاں 1947ء میں اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس موقع پر انہوں نے "قبلہ اول" جیسی بے مثل نظم کہی۔

"یہی مٹی جو مرا پاؤں دھرے بیٹھی ہے۔ اس پہ سجدے کی گھڑی آ پہنچی" اس دور میں انہوں نے موقع محل کی مناسبت سے جو شاعرانہ اور صحافیانہ کردار ادا کیا اس نے انہیں بنگالی ادیبوں شاعروں اور صحافیوں سے بہت قریب کر دیا۔ ان کی اردو زبان میں کہی ہوئی نظمیں بنگالی اور انگریزی زبان میں شائع ہونے لگیں جس سے برصغیر ہی میں نہیں امریکا، مشرق وسطیٰ اور برطانیہ میں بھی ان کی ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوا۔ اب وہ پان چباتے سڑکوں اور چائے خانوں میں نوجوان دوستوں کے ساتھ نظر نہیں آتے تھے نہ ہی ان کی پہلی جیسی خوش فعلیاں موجود تھیں۔

نوشاد نوری، غزلوں کے نہیں نظموں کے شاعر تھے، مگر ان کی نظموں میں غزل اور غنائیت کی پوری فضا موجود ہوتی تھی۔ اپنے آخری دور میں احباب کے اصرار پر کچھ غزلیں بھی کہیں اور یہ ثابت کر دیا کہ نظم نگار، غزل گو بھی ہو سکتا ہے۔

ان کی شاعری فکر، احساس اور جذبے کی شاعری ہے۔ انہوں نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں اپنے فن کو خوب صورت بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری عام انسانی، سیاسی اور قومی المیے کا اظہار ہے۔

عمر کے آخری حصے میں ان پر کینسر کا حملہ ہوا۔ ڈھاکا کے علاوہ کلکتے جا کر بھی علاج کروایا لیکن اپنے بھرپور ہمت اور حوصلے کے باوجود اس موذی مرض کو شکست نہ دے سکے۔ بڑے سے بڑے دشمن کو للکارنے والے نوشاد نوری کی قوت گویائی بھی اس دشمن انسانیت نے سلب کر دی اور اسی لب بستگی کی حالت میں وہ اپنے تمام چاہنے والوں کو سوگوار چھوڑ گئے۔

لیکن ان کی آواز، گھن گرج دار نظمیں اور ان کے افکار کی بازگشت ہمیشہ گونجتی رہے گی۔ ان کے اس شخصی خاکے کا اختتام میں ان ہی کے ان اشعار پر کرتا ہوں:

میں زمانے میں صحیفے کی طرح اترا ہوں
روشنی مجھ سے نظر کو ودیعت ہوگی
میرے مخطوطۂ کمیاب کو محفوظ رکھو
اس حوالے کی مورخ کو ضرورت ہوگی
اس کٹھن دور کی ناگفتہ صداقت لوگو
میری ہی ذاتِ گرامی سے روایت ہوگی

++

کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں کہا نہیں جاتا اور پھر بھی سب کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ کچھ باتیں سنی نہیں جاتیں۔ سننے کے لیے شیر کا جگر چاہیے ہوتا ہے پھر بھی ساعت تک وہ پہنچ ہی جاتی ہیں جیسے یہ بات رضیہ تک خود ہی پہنچ گئی۔

"اگر برات آئی تو خون کی ندیاں بہیں گی۔ باراتیوں کا جسم گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔ دولھے کا سر کاٹ کر اسی پیڑ پر لٹکا دوں گا۔ رضیہ پیلا جوڑا پہنے گی، میرے

ساحرِ قلم

زین مہدی

وہ خود میں ایک درس گاہ تھا۔ ان کہی کو زباں، آرزوؤں کو انا کا پیکر دیتا۔ درد سے لذت کشید کر کے دکھوں کو فریاد کی لے دیتا، اسی لیے اسے ساحرِ قلم کہا گیا۔ اس نے پنجابی ادب کو سنوارنے کی سعی کی، پوٹھوہار کے ان گیتوں کو جو زمانے کی گرد میں دب کر فنا ہو رہے تھے انہیں شباب بخشا۔

ایک بے مثل شاعر کی زندگی کا مختصر سا عکس

بچتے بھی ایسا بھی نہیں ہوگا۔ اس کے جوڑے کو میں اسی کے خون سے سرخ کروں گا۔"

یہ دھمکی بھرا اعلان عبدالمجید کر رہا تھا، علاقے میں گھوم گھوم کر وہ اعلان کر رہا تھا۔

"رضیہ جو ابھی جوانی کی سیڑھیوں پر پہنچی ہی تھی، وہ ان اطلاعات کو سن سن کر عبدالمجید کو کوس رہی تھی۔ مسلسل رو رہی تھی۔ اس کا رونا کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا اس لیے کہ وہ یتیم تھی اور عبدالمجید اس کا تایازاد تھا۔ تایازاد ہو کر بھی وہ اس کی شادی میں رخنہ ڈال رہا تھا۔ رضیہ نے سہیلیوں سے سنا تھا کہ عبدالمجید جہاں بھی دو چار لوگوں کو جمع دیکھتا ہے وہاں پہنچ کر وہ کہتا ہے کہ مجھ سے چھپا کر چاچی نے رضیہ کا نکاح کرایا ہے تو اب وہ دیکھے گی کہ میں کیا کرتا ہوں۔ ایسی سزا دوں گا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔"

وہ یہ سب اپنی مونچھوں پر تاؤ دے دے کر کہتا تھا۔ اس کی مونچھیں بھی اپنی مثال آپ تھیں۔ وہ مونچھ نہیں کسی گلہری کی پونچھ تھی۔ اس دور میں موٹی مونچھوں کا فیشن تھا۔ سرکاری عہدے دار ایسی موٹی مونچھ رکھنا اپنی شان سمجھتے تھے۔ کہتے تھے کہ یہ تاج برطانیہ کی شان ہے۔ عبدالمجید کو تاج برطانیہ سے کوئی غرض نہ تھا اس لیے وہ اپنی مونچھوں کو مردوں کی پہچان قرار دیتا تھا۔ ہر وقت اسے مروڑتا رہتا تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ وہ صبح اٹھتے ہی اپنی مونچھوں پر گھی لگایا کرتا ہے۔ پہلوانی کا شوق تھا۔ صبح شام ڈنڈ پیلتا تھا۔ مگدر گھماتا تھا۔ اسے اپنے قوت بازو پر بڑا ناز تھا۔ علاقے کے تمام لوگ اس بات سے آگاہ تھے کہ وہ اپنی چاچی کو بے وقوف بنا رہا ہے لیکن کوئی کچھ بولتا نہیں تھا۔ کون کسی کے پھڈے میں ٹانگ اڑاتا ہے۔ اپنی عزت کا جنازہ نکلوانا پسند کرتا ہے۔ سب کو اپنی پڑی تھی۔ سب جانتے تھے کہ اگر انہوں نے اسے ٹوکا تو وہ ان کا دشمن بن جائے گا۔ لوگ اس کے منہ لگنا نہیں چاہتے تھے مگر اس کے غیاب میں اسے گالیاں ہی گالیاں دیتے۔ برا بھلا کہتے۔

لیکن اب جب اس نے اپنی ہی چچازاد بہن کی برات کے بارے میں ایسا کچھ بولنا شروع کیا تو لوگ فکر میں آ گئے۔ وہ سب سر جوڑ کر بیٹھے اور اس کا حل تلاش کرنے لگے۔ اگر یہی کچھ کوئی اور کہتا تو وہ سمجھتے کہ لڑکی میں کوئی خرابی ہے اسی لیے اس کا محبوب دھمکی پر اتر آیا ہے لیکن سبھی عبدالمجید کی فطرت سے آگاہ تھے اس لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک معصوم لڑکی کی زندگی تباہ ہو۔ کافی سوچ بچار کے بعد طے یہ پایا کہ کوئی جا کر لڑکے والوں کو خبر کر دے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ برات لے کر آ جائیں اور یہاں کوئی حادثہ پیش آ جائے۔

لڑکی کا شوہر (نکاح پہلے ہو چکا تھا۔ برات تو صرف رسم کی تکمیل کے لیے آ رہی تھی) افضل بھی کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ اس تک یہ بات پہنچی تو وہ غصے میں بھر اٹھا کیونکہ یہ بات اس کے لیے ایک چیلنج سے کم نہ تھی۔ اگر براتیوں پر ایک تنکا بھی کوئی مارتا تو ان کی ساکھ بری طرح متاثر ہوتی۔ یہ نکاح آج نہیں ہوا تھا۔ کئی سال قبل ہوا تھا۔ گھر والوں نے بڑے ارمان سے رضیہ کو ان کے لیے منتخب کیا تھا۔ رضیہ کے والد خان عبدالحق خان بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ کافی رعب داب رکھتے تھے مگر قسمت سے ہار گئے تھے۔ ان کے رعب سے سارا علاقہ کانپتا تھا لیکن 1923 میں جب طاعون کی وبا پھیلی تو وہ حد درجہ قاتل ثابت ہوئی۔ ان کے رعب میں نہ آئی اور انہیں اپنی لپیٹ میں لے لی۔ اس وقت علاج معالجے کا فقدان تھا اسی لیے انہیں بچایا نہ جا سکا (عبدالحق خان بےنظیر بھٹو کی پولیٹیکل سیکریٹری ناہید خان کے دادا تھے) ان کے انتقال کے بعد خاندان میں جتنے بھی لوگ تھے ان میں شور پشت عبدالمجید ہی تھا۔ وہ اس شادی کو رکوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔

خبر پہنچانے والوں نے یہ خبر راولپنڈی پہنچا دی۔ خبر اس تک پہنچی تو وہ غصے میں کھڑا ہو گیا۔ اسے یوں لگا کہ یہ سراسر اس کی بے عزتی ہے۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر اسے ابھی سبق نہ دیا گیا تو وہ مزید شور پشت ہو جائے گا اور عمر اسے دھمکاتا رہے گا۔ بس اسی وقت اس نے بھی ٹھان لیا کہ وہ ہر حال میں برات لے کر جائے گا۔ اسے بتائے گا کہ ہم بزدل نہیں ہیں۔ وہ لوگ جو اس کے غصے سے واقف تھے اور اس کے بہی خواہ تھے انہوں نے مشورہ دیا کہ رخصتی کا خیال چھوڑ دو۔ خواہ مخواہ کی لڑائی میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لڑکی کے گھر والوں سے بات کرو اور پھر ان سے کہو کہ وہ لڑکی کو لے کر یہاں آ جائیں۔ یہاں ہم لوگ ہیں۔ نہایت اہتمام سے شادی کرا دیں گے لیکن یہ مشورہ اسے ذرا بھی نہیں بھایا۔ اس کا کہنا تھا کہ نہ میں جھکوں گا اور نہ برات رکے گی۔ ہم ہر حال میں جائیں گے۔ برات جائے گی اور عزت کے ساتھ رضیہ کی ڈولی لائے گی۔ اس وقت راولپنڈی آج جتنا بڑا شہر نہ تھا مگر ایک اچھا خاصا شہر تھا۔ یہ بات شہر بھر میں پھیل گئی کہ افضل کی برات کو روکا

جائے گا۔

افضل بھی کوئی عام آدمی نہ تھا۔ گو کہ نوجوانی تھی لیکن شہر میں ایک نام تھا اس لیے کہ وہ خاکسار تحریک کے اہم عہدے داروں میں شامل تھا۔ تحریک کی راولپنڈی شاخ کا سالار اعلیٰ تھا۔ اس وجہ سے خاکساروں میں بہت اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ اس وقت مسلم لیگ جتنی مقبول جماعت کانگریس تھی تو خاکسار بھی کم نہ تھی۔ اس کے کارکنوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی اور اس کی پہچان بیلچہ اور وردی تھی۔ وہ سب جب مارچ کرتے ہوئے نکلتے تو وردی اور بیلچے کی وجہ سے دیکھنے والوں پر دھاک جم جاتی تھی۔ خاکسار تحریک کے تمام ساتھی اس کا ساتھ دینے کے لیے اس کے گھر آنے لگے۔ ایک جتھا سا جمع ہو گیا۔ اس وقت تھانہ وارث خان کا داروغہ ایک سکھ تھا۔ اس نے سنا تو وہ بھی ملنے چلا آیا۔ اس لیے کہ اسے خبر مل گئی تھی کہ خاکسار بڑی تعداد میں جمع ہو رہے ہیں۔ اس نے تمام باتیں سنیں اور کہا "بیٹا غم نہ کر۔ ماضی میں پرتھوی راج چوہان ، سنجوگتا کو اس کے گھر سے لایا تھا۔ سب کی آنکھوں کے سامنے بہادری سے اٹھا لایا تھا۔ تو بھی اپنی سنجوگتا کو لائے گا۔ ضرور لائے گا۔ میں تیرا ساتھ دوں گا۔"

ادھر خاکسار تحریک کے کارکنوں کی تعداد پانچ سو پر پہنچ گئی تھی۔ ایک خاکسار چوہدری محمد شفیع جو ریس کے لیے گھوڑے فراہم کرتا تھا اس نے ریس میں جیتا ہوا گھوڑا بھیج دیا۔ اس گھوڑے کو سجایا گیا۔ افضل سجے ہوئے گھوڑے پر اس انداز میں بیٹھا کہ خاکسار تحریک کی جسم پر وردی تھی۔ کندھے پر بیلچہ تھا اور کمر سے تلوار لگی ہوئی تھی۔ تحریک کا بینڈ بھی پہنچ گیا۔ اب برات چلی مگر اس انداز سے کہ آگے آگے مارچ کرتے ہوئے خاکسار تھے۔ ان کے پیچھے بینڈ پارٹی اور پھر گھوڑے پر سوار وہ خود۔ اس کے پیچھے پولیس کا دستہ تھا۔ شہر بھر میں مارچ کرتے ہوئے وہ سب رضیہ کے گھر پہنچے۔

اتنی بڑی جمعیت کو دیکھ کر دھمکی دینے والا فرار ہو گیا۔ ایک شان سے افضل سسرال پہنچا اور رضیہ کو رخصت کرا کر اسی شان سے واپس آیا۔ اس علاقے کی یہ ایک یادگار شادی تھی۔

اس ڈرامائی شادی کا دولہا افضل شہر بھر میں مرکز نگاہ بن گیا۔ لوگ اسے دیکھتے ہی پہچان جاتے کہ یہ وہی ہے جو بینڈ مارچ کرتے ہوئے بیوی کو گھر لایا تھا۔ افضل اس ایک واقعہ سے شہر کا ہیرو بن چکا تھا۔ اسے تحریک نے جتنی شہرت نہ دی تھی اس واقعہ نے اس سے زیادہ شہرت دے دی تھی۔ مزیدار بات یہ تھی کہ افضل کسی ایسے ویسے خاندان کا بھی نہیں تھا۔ وہ شہر کے معروف اور عزت دار خاندان کا فرد تھا۔ اس کے خاندان کے آگے بڑے بڑے لوگوں کے سر تعظیم میں جھک جاتے تھے۔ پردادا قاضی روح اللہ یمن جیسے ملک کے قاضی القضاۃ تھے۔ جب وہاں کے حکمرانوں سے اختلاف ہوا تو ہجرت کر کے بلوچستان کی ریاست مکران چلے آئے۔ مکران میں ان سے پہلے ان کی شہرت پہنچ گئی تھی اس لیے ریاست کے حکمران نے ان سے استدعا کی کہ وہ انصاف کا منصب سنبھال لیں۔ حکمران کی دعوت کو انہوں نے قبول کیا اور مکران کے قاضی القضاۃ کا منصب

اعزازات

رائٹرز گلڈ نیشنل ایوارڈ 1972ء (کنگراں دی چھاں)
حبیب بینک ایوارڈ 1973ء (خان پھلواری)

افضل پرویز پر تحقیقی کام

افضل پرویز شخصیت اور فن۔ راجا شکیل انجم لاہور۔ پنجاب یونیورسٹی 1992ء۔
افضل پرویز دیاں پنجابی زبان و ادب لئی خدمتاں، فوزیہ اسحاق لاہور، پنجاب یونیورسٹی 2006ء مقالہ برائے ایم اے۔
افضل پرویز شخصیت اور فن۔ مرتبہ قاضی فاروق امجد پرویز راولپنڈی نیرنگ خیال پبلی کیشن 2005ء۔

ادبی سرمایہ

کنگراں دی چھاں (پنجابی شاعری) طبع اول 1972ء۔
بن پھلواری۔ نیشنل کونسل آف آرٹس 1973ء۔
غم روزگار کے۔ مکتبہ خرابات 1975ء۔
کہندا اسا نیں (پنجابی نثر) پاکستان پنجابی ادبی بورڈ 1978ء۔
چنبی کی شادی۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ 1980ء۔
چٹھیاں۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ 1980ء۔
نوا سے راز۔ لوک ورثہ اشاعت گھر 1983ء۔
لوک تھیٹر۔ لوک ورثہ اشاعت گھر 1988ء۔
چنبی اور راول (طویل مضمون)۔ علمی پرنٹنگ پریس 1961ء۔

سنبھال لیا۔ عرصہ تک انصاف کی کرسی پر رہے مگر ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے مولانا محمد نے کہران میں رہنا پسند نہیں کیا اور 1865 میں انہوں نے کہران چھوڑ دیا۔ ترک وطن کر کے وہ راولپنڈی چلے آئے۔

راولپنڈی کہران سے کمتر تھا لیکن اس شہر کا رابطہ دیگر شہروں سے تھا اس لحاظ سے یہ شہر کہران سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا پھر وہ یہاں خود سے نہیں آئے تھے۔ جب وہ کہران میں تھے تو ایک رات خواب دیکھا کہ کوئی انہیں ایک مینار پر چڑھ کر بگدستہ اذان سے انہیں آواز دے رہا ہے۔ وہ اس آواز پر مینار کے نزدیک جاتے ہیں تو بگدستہ پر کھڑا شخص ان سے کہتا ہے "تم کہران میں کیا کر رہے ہو۔ تمہاری ضرورت یہاں ہے۔ جلد چلے آؤ۔"

انہوں نے اس حکم کو پورا کرنے کی ٹھان لی مگر وہ مینار تھا کہاں اس کی خبر انہیں نہیں تھی۔ اسی دوران ایک تاجر ان سے ملنے کہران آیا۔ آیا تو تھا اپنے کام سے گھوڑے بیچنے لیکن وہ مولانا کی شہرت سننے کے بعد ان سے ملنے ان کے حجرے میں آ گیا تھا۔ اس سے باتیں کرتے کرتے انہوں نے پوچھا "یہاں سے تم کس شہر کا ارادہ رکھتے ہو؟"

جواب میں اس تاجر نے کہا "مولانا مجھے جانا تو مشرق میں ہے۔ سنتے ہیں کہ دہلی میں گھوڑوں کی قیمت اچھی مل جاتی ہے اس لیے وہاں جاؤں گا لیکن کچھ دن راولپنڈی میں ٹھہروں گا۔"

اس شہر کا نام انہوں نے پہلے بھی کئی لوگوں سے سنا تھا۔ اس دن جب سوداگر سے سنا تو انہیں ایسا لگا جیسے کہ وہ جس شہر کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں وہ وہی شہر ہے۔ انہیں اس شہر کے نام میں ایک خاص کشش محسوس ہوئی تھی بس انہوں نے وہاں جا کر ٹھکانا بنانے کا ارادہ کر لیا اور اس کے ساتھ بیوی بچوں کو ہمراہ لے کر چل پڑے۔ کئی دن کے سفر کے بعد وہ راولپنڈی پہنچے۔ اس وقت راولپنڈی ایک چھوٹا سا قصبہ تھا لیکن وہاں آتے ہی انہیں ایک انجانی سی خوشی محسوس ہوئی اور انہوں نے وہیں ٹھہر جانے کی ٹھان لی اس لیے بھی کہ وہاں انہیں تبلیغ کے لیے میدان نظر آیا تھا۔ شہر میں مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم نظر آ رہے تھے جو ان کی دلچسپی کے لیے کافی تھا۔

دراصل ابوتراب مولانا محمد یحییٰ کہرانی علم میں والد کی مثل تھے۔ طبیب بھی تھے اور دین کے علم میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ محدث تھے۔ فلسفہ، منطق اور فقہ پر عبور تھا۔ عربی فارسی کے علاوہ پوٹھوہاری اور بلوچی زبان بھی جانتے تھے۔ مقامی زبان پر قدرت حاصل تھی اس وجہ سے دین کی تبلیغ میں بہت آسانی تھی۔ وہ راولپنڈی کے گرد و نواح میں گھوم گھوم کر تبلیغ دین کرتے۔ مناظرے میں بھی شرکت کرتے اور کھلا چیلنج دیتے کہ جو بھی چاہے مجھ سے مناظرہ کر لے۔ کئی نامی گرامی پنڈتوں نے ان سے مناظرہ کیا اور ان کی کوشش سے مذہب حق پر آ گئے۔ ایک بڑی تعداد میں ہندوؤں نے آپ کی تقاریر سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ مولانا محمد نے "شہاب ثاقب" کے عنوان سے 1900 میں ایک دینی رسالہ بھی تحریر کیا تھا جو پورے پنجاب میں بہت زیادہ پسند کیا گیا تھا۔ انہوں نے عوام الناس کے التماس پر مرکزی جامع مسجد میں امامت بھی شروع کر دی تھی مگر ایک شرط کے ساتھ کہ اس خدمت کی تنخواہ نہیں لیں گے۔ کسی بھی قسم کا نذرانہ لینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ نماز پڑھانے کا صلہ صرف اللہ دے سکتا ہے اور اسے ذریعہ معاش بنا کر میں جنت کھونا نہیں چاہتا۔

انہی مولانا محمد یحییٰ کہرانی کے گھر 8 مارچ 1915 کو افضل نے آنکھ کھولی تھی۔ راولپنڈی ..... میں ہی وہ پروان چڑھنے لگا۔ دین دار گھرانا تھا اس لیے بچپن سے ہی دین کی جانب رغبت دلائی گئی مگر حیرت انگیز طور پر افضل میں دین سے لگاؤ تو پیدا ہوا لیکن اس نے خود کو مولوی یا مبلغ بنانے کی بجائے عام انسان بننے کی کوشش جاری رکھی۔ والد نے اپنی نگرانی میں اسے حافظ بنایا، حفظ کرنے کے بعد درس نظامی بھی مکمل کیا۔ گلستان اور بوستان سے والد نے ہی آشنا کرایا تھا اس وجہ سے فارسی کی بنیاد مضبوط رہی پھر بھی اسکول کی تعلیم کی طرف جھکاؤ زیادہ رہا۔ سیف الملوک اور ہیر وارث شاہ کی لوریاں اچھی لگتیں۔ جس گلی میں اس کا گھر تھا اس گلی سے باہر نکلتے ہی سامنے دور تک پھیلے کھیت تھے۔ اسے لہلہاتے کھیت دیکھنا زیادہ اچھا لگتا تھا۔ جب کسان ہل چلاتے ہوئے ماہیا گاتے تو وہ کان لگا کر سنتا۔ اسے ایک عجیب سی کشش محسوس ہوتی۔ وہ سحر زدہ سا ہو جاتا۔ اس دور میں سوانگ خوب پسند کیا جاتا تھا۔ سوانگ کا مظاہرہ ایسے دیکھتا جیسے وہ بھی اب سوانگ بھرے گا۔ اسے اسلامیہ اسکول میں داخل کرایا گیا۔ وہاں اس کی دلچسپی کا ایک اور سامان سامنے آیا۔ دراصل اس کے بڑے بھائی نے بھی والد کی راہ پر نہ چل کر اپنی راہ الگ سی تبدیل کر لی تھی۔ وہ شعر و شاعری میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ یوں بھی وہ

دور شعر و شاعری کے عروج کا تھا۔ شہر میں کافی سارے اچھے شاعر جمع تھے۔ جگہ جگہ طرحی مشاعرے منعقد ہوتے تھے جن میں اعلیٰ درجے کا کلام پیش کیا جاتا۔ خود اس کے گھر بھی بڑے بھائی انجم رضوانی مشاعرے منعقد کراتے جس میں بڑے بڑے شاعر بلائے جاتے۔ ان مشاعروں کا اثر بھی اس پر پڑا اور وہ ——— بھی شعر و شاعری کی جانب اپنا رجحان محسوس کرنے لگا۔ ایک بار اسکول میں اسے عدل جہانگیری پر مضمون لکھنے کو کہا گیا۔ اس نے بھی عدل جہانگیری پر اپنی تحریر ماسٹر صاحب کے سامنے پیش کر دی۔ ماسٹر صاحب نے دیکھا تو چونک گئے اس لیے کہ وہ مضمون کی شکل میں نہیں تھا۔ اس نے عدل جہانگیری پر جو کچھ لکھا تھا وہ ایک مکمل ڈراما تھا۔ باقاعدہ کردار اور ایکشن کے ساتھ۔ انہوں نے تحریر پڑھ کر شاباشی دی اور وہ تحریر ہیڈ ماسٹر کو بھی دکھائی کہ یہ بچہ ایک دن بڑا فنکار بنے گا۔ اسی طرح ایک بار اس نے اپنے ایک ساتھی کی ہجو لکھی۔ اتفاق سے وہ کاپی جس میں ہجو لکھی تھی ماسٹر صاحب تک پہنچ گئی۔ انہوں نے ہجو دیکھ کر کلاس کے تمام لڑکوں کو جمع کیا اور خود پڑھ کر سنائی۔ یہ بھی کہا کہ اس عمر میں یہ ایسا لکھ رہا ہے تو آگے چل کر یہ اور بھی اچھا لکھے گا۔ قلم اس کی پہچان بنے گا۔ ان باتوں نے اس کا جھکاؤ ادب کی طرف مائل کرنا شروع کر دیا۔ اب اس نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی لکھنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ پہلے خیالوں میں ایک خاکہ تیار کرتا اور پھر اس میں رنگ بھرنا شروع کر دیتا اور دلچسپ داستان تیار ہو جاتی۔ ان داستانوں کی خوب صورتی ہوتی اس کی پیشکش۔ وہ چھوٹے چھوٹے مگر تیکھے جملوں سے داستان بنتا۔ خوب صورت الفاظ کو نگینے کی طرح جڑتا۔ یہ سجاوٹ کا گر وہ شاعری سے سیکھ رہا تھا۔ شاعری میں وہ کثرت سے اساتذہ کے کلام پڑھتا، غور کرتا کہ الفاظ کی نشست و برخواست سے معنی کیسے بدلتے ہیں۔ مفہوم کیسے تبدیل ہوتا ہے۔ الفاظ کو برتنے کا سلیقہ بھی آتا جا رہا تھا۔ اب وہ خوب صورت منظر کشی کرنے لگا تھا۔ ایسے جملے بناتا کہ خود اسے مزہ آ جاتا مگر وہ انہیں کسی کو دکھاتا نہیں تھا۔ سب سے چھپا کر رکھتا کیونکہ شرم مانع تھی۔ وہ حافظ قرآن بھی تھا۔ اس کی قرأت کی دھوم تھی۔ اکثر لوگ اسے گھر بلا کر شوق سے سنتے تھے۔ پھر وہ درس نظامی بھی کر چکا تھا یعنی کہ وہ مولوی کہلانے لگا تھا۔ گو کہ ابھی وہ جوانی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ یہ عمر کچھ زیادہ ہی خواب آلود ہوتی ہے۔ وہ بھی خواب دیکھنے لگا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی پرورش سیف الملوک اور ہیر وارث شاہ کی لوریوں میں ہوئی تھی۔ کچے ذہن پر منعکس خیال اپنا اثر چھوڑتا ہے۔ اس کے ذہن و دل پر بھی لوریوں کا خمار چڑھا ہوا تھا مگر یہ خمار کسی حسین صورت کا نہیں تھا۔ کوئی ہیر یا سوہنی

غزلیات

مہکا ہوا کھلا ہوا شاداب چمن ہے
اک روح لطافت ہے کہ جاناں کا بدن ہے

انداز بیاں میں جو یہ بے ساختہ پن ہے
تیری ہی چبھن ہے اور مرے دل کی لگن ہے

دوراں کے بیاباں میں خیاباں تری آغوش
اس دھوپ میں آنچل ہی ترا سایہ فگن ہے

تاریکئ ہجراں میں اتر ہی چلی جائے
امید وصال اک چمکتی سی کرن ہے

دم لینے کو بیٹھا ہوں تو اس دم ہوا محسوس
چھاؤں میں جلن کتنی ہے کس درجہ گھٹن ہے

اے یارو کوئی چارہ کرو شمع جلاؤ
اس گھور اندھیرے میں سفر دو بھر کٹھن ہے

مہلت ہی کہاں عرض تمنا کی ملی ہے
دل اور زباں میں ابھی گھمسان کا رن ہے

سن لیتے ہیں ناکردہ وفاؤں کے فسانے
محفل میں کسے تیرے سوا تاب سخن ہے

کہہ دیتا ہوں بس سیدھے سبھاؤ سے کھری بات
وہ کہتے ہیں پرویز بڑا صاحب فن ہے

☆ ☆

یہاں سب کچھ وہاں کچھ بھی نہیں ہے
ورائے آسماں کچھ بھی نہیں ہے

اب اس منزل پہ آ پہنچے ہیں درویش
جہاں فکر و زباں کچھ بھی نہیں ہے

ترے افسانے رنگین و دلآویز
ہماری داستاں کچھ بھی نہیں ہے

وہ محبوب تجسم مرحلے ہیں
فقط آہ و فغاں کچھ بھی نہیں ہے

وہ گھبرایا ہوا جسم اللہ اللہ
حریر و پرنیاں کچھ بھی نہیں ہے

نگاہ زیست ہے اور میں ہوں پرویز
ہمارے درمیاں کچھ بھی نہیں ہے

اس کی زندگی میں آئی ہی نہیں تھی۔ یہ خطہ قدرتی نظاروں کا تھا۔ جس گلی میں اس کا گھر تھا اس گلی سے نکلتے ہی کھیت ہی کھیت تھے۔ ان کھیتوں میں ہل چلاتے کسان، فضا میں تیرتے پرندے، لہلہاتی فصلیں اسے اپنی جانب کھینچتی تھیں۔ ماہیا کی تانیں اس کی کمزوری بن چکی تھیں۔ اس الاپ کو سنتے ہی وہ مسحور ہو جاتا تھا۔ یہی سب اس کے فکر و فن کی تعمیر و تشکیل میں بنیادی کردار ادا کر رہی تھیں۔

اس دور میں سوانگ بہت مقبول تھا۔ خوب پسند کیا جاتا تھا۔ یہ طلسماتی فضا اسے متاثر کرتی تھی لیکن درس نظامی کر چکا تھا اس لیے سوانگ کے فن پر لب کشائی سے گریز کرتا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ کوئی کہہ نہ دے کہ یہ مولوی ہو کر سوانگ پسند کرتا ہے لیکن دل ہی دل میں سوانگیوں کے مکالمے دہراتا تھا۔ خود کو ان کی جگہ تصور کرتا تھا۔ اس دور میں شرفا کا مشغلہ شعر و شاعری تھا۔ راولپنڈی طرحی مشاعروں میں ایک مقام رکھتا تھا۔ شہر میں کئی بڑی ادبی تنظیمیں خدمت ادب میں مصروف تھیں اور ادب کی آبیاری کر رہی تھیں جن میں بزم ادب اور بزم اردو نمایاں تھیں۔ ان کی نشستیں باری باری سے مختلف گھروں میں ہوتیں۔ اس کے گھر بھی اردو اور پنجابی مشاعرے ہوتے۔ اس کے بڑے بھائی انجم رضوانی شعری ذوق رکھتے تھے۔ وہی مشاعرے کرواتے تھے۔ ان مشاعروں میں باہر کے شعرا بھی شامل ہوتے تھے۔ افضل بھی خدمت گزاری کے بہانے شریک ہو جاتا تھا۔ چائے کا انتظام کرتا۔ شعرا کے لیے تانگے لانا جیسے کام اس کے ذمے تھا۔

مشاعرے کی تاریخ نزدیک آ رہی تھی کہ افضل نے بڑے بھائی سے کہا۔ "میں بھی مشاعرے میں پڑھنا چاہتا ہوں۔"

بھائی نے اسے حیرت سے دیکھا پھر وہ تعجب خیز انداز میں بولے۔ "تم پڑھو گے؟ مگر مشاعرہ طرحی ہے۔"

"جی، طرحی غزل پڑھوں گا، یہ والی۔" کہہ کر اس نے غزل بڑھا دی۔

بھائی نے غزل دیکھتے ہی پوچھا۔ "یہ ہے کس کی؟"

"میری ہے۔"

بھائی کے چہرے پر حیرت چھا گئی اس لیے کہ ہر شعر بحر میں، وزن میں چست درست، خیال بھی اچھا اس لیے انہوں نے دوبارہ پوچھا۔ "غزل تمہاری ہی ہے ناں؟"

"جی جی میری ہی ہے۔" "مصرع طرح" "آج کس کے قتل کا ساماں ہے" تھا۔ ہاں اسی بحر میں کہی ہے۔"

غزل انہیں پسند آئی تھی اس لیے پڑھنے کی اجازت دے دی۔ نوآموز ہونے کی وجہ سے پہلے اسے پڑھوایا گیا پھر بھی اس نے سامعین کو متوجہ کر لیا۔ ایک تو اس کی آواز کا لوچ پھر ترنم بھی غضب کا، اس پر اشعار میں ندرت و آس نے گویا مشاعرہ لوٹ لیا۔ ہر ہر شعر پر سامعین کا شور اٹھتا رہا۔ [illegible] واہ واہ [illegible] سے کلام نہیں لیا۔

اس غزل نے شہر کے ادبی حلقوں میں اس کی پہچان کرا دی اور وہ دور و نزدیک کے مشاعروں میں مدعو کیا جانے لگا۔ وہ غزل میں چنیدہ الفاظ بہترین ترتیب میں پیش کرتا۔ کمزوری حقیقتوں اور نظریات کو اشاروں کنایوں کی خوب صورت زبان میں بیان کرتا تو سامع اس کے ندرت خیال سے حظ اندوزی کے متنوع پہلو کشید کر لیتے۔ اس کا انداز اس دور سے بالکل الگ تھا۔

سنتے ہیں کہ چمن مہکے بلبل چہکے بن ٹھنے
اپنے نشیمن تک جو نہ پہنچی ایسی بہار کہاں
کلیوں کو آج چمن بندی کا دعویٰ ہے پوچھ
اب دیکھیں لٹ کر بکتا ہے کلی کلی کا نکھار کہاں

اسے موسیقی سے بھی رغبت تھی۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا جس میں موسیقی کے لیے گنجائش نہ تھی مگر شوق نے چور راستے نکال ہی لیے۔ چھپ چھپا کر استاد نواب علی خاں اور استاد اسد علی خاں سے باقاعدہ موسیقی کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ فن موسیقی سے وابستگی کا اظہار اس کی شاعری سے بھی عیاں ہوا۔

اس کے انگ انگ میں ٹھمری کا گداز اور لے
میں نے چھیڑا تو وہ کھماج کی سرگم نکلی
شاہ کے دربار میں ٹوڈی کے سرگیوں تھے
آہوئے دل اس گجری صحراؤں میں آوارہ تھا

موسیقی سے رغبت کی وجہ سے مشاعروں میں ترنم سے پڑھتا۔ اس کی آواز بھی غضب کی تھی۔ جب پڑھتا تو ایک سماں بندھ جاتا۔ لوگ گیت سمجھ کر اس کی غزل گنگناتے۔ اس طرح اس کی شاعری پھیل رہی تھی۔ شاعری کے ساتھ اسے کھیلوں سے بھی رغبت تھی۔ رغبت بھی ایسی کہ لوگ جنون کا نام دے لیتے۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا اس کے اندر رچ بس جاتا۔ مثلاً گلی ڈنڈا کھیلتا ہے تو بس اس کا ہو کر رہ جاتا۔ جب دیکھو وہ گلی ڈنڈا کھیل رہا ہے۔ اس وقت تک وہ اس کھیل کو کھیلتا جب تک دل نہ بھر جاتا۔

اس وقت کرکٹ اور فٹ بال بھی مقبول تھے۔ فرنگی کا کھیل کہہ کر بھی لوگ اسے کھیلتے لیکن یہ ان کھیلوں پر دیسی کھیلوں کو ترجیح دیتا۔ کبڈی، مگدر گھمانا، کشتی بازی کے علاوہ تلوار زنی و گھڑ سواری بھی اسے پسند تھا۔ وہ ان کھیلوں میں بہت دلچسپی لیتا۔ شاید وہ ان کھیلوں کے ذریعے مٹی سے اپنے پیار کا اظہار بے زبان خاموشی کرتا تھا۔ رنگ سانولا اور قد درمیانہ تھا مگر جسم مضبوط اور سڈول تھا جس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ جاذب نظر دکھتا تھا۔ چہرے پر سختی تھی جو عام پختون کی پہچان ہے مگر بھی لوگ اس کی سخت نوائی کا برا نہیں مانتے تھے۔ وہ خود ہی اپنے تعارف میں کہتا۔

گرم گفتار ہمارا ہے نہ کھلوائیں

بڑے ہے بہت بہت ہے پاک ہیں ہم

واقعی جب کوئی بات مزاج پر گراں گزرتی تو وہ لحاظ، مروت سب کچھ بھول جاتا اور وہ سناتا کہ سننے والا برسوں یاد رکھتا مگر جب ادبی محفل میں بیٹھتا تو شرافت کی معراج پر نظر آتا۔ احمد علی ساحر، رجب علی جوہر، غلام نبی کامل، سید محمد خان، چرنجی لال فانی، چاندی رام اثر، کیدار ناتھ عابد، تلوک چند محروم جیسے بڑے شعرا کے سامنے یوں بیٹھتا جیسے شرافت اسی پر آ کر ختم ہو گئی ہے مگر کیا کرتا کہ اس کے اندر ایک شریر بچہ بھی تھا جو ہر وقت ہمکتا رہتا۔ کچھ کرتا ہے کی گردان کرتا رہتا۔ رام پرشاد ذکی بسمل تخلص کرتے تھے۔ بزرگ تھے، ساٹھ بہاریں دیکھ چکے تھے مگر شاعری ایسی چٹخارے دار کرتے تھے کہ جوانوں کو پسینہ آ جاتے۔ ہاتھ میں لرزا تھا لیکن آواز دبنگ تھی۔ ترنم سے انداز میں کلام پیش کرتے۔ اشعار کی خامی آواز سے دور کرنے کے ماہر تھے۔ رہنے والے امرتسر کے تھے لیکن بیٹے کی سرکاری نوکری تھی۔ اسے حکومت نے بنگلہ دیا تو یہ بھی رہائش کے لیے راولپنڈی آ گئے تھے۔ صرف چار پانچ ماہ میں انہوں نے راولپنڈی کے ادبی حلقے کو متوجہ کر لیا تھا۔ انہیں صرف معلوم ہو جانا چاہیے تھا کہ کہیں مشاعرہ ہے۔ وہ خود اپنی سواری سے آ جاتے تھے۔ دیگر بزرگ شعرا ان سے نالاں نظر آنے لگے تھے۔ کئی ایک نے دبی زبان سے شکایت بھی کی تھی کہ یہ حضرت ہر غزل میں کم سے کم دو تین شعر بے وزن ضرور شامل کرتے ہیں اور وزن کو گا کر خامی پر پردہ ڈال لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے شعرا کی خواہش ہوتی کہ انہیں پہلے پڑھا دیا جائے۔ وہ اپنی قابلیت اپنی عمر کا رعب ڈالتے رہ جاتے لیکن ناظم ان کا نام پکار دیتا۔

روز روز کی اس چخ چخ سے وہ بھی تنگ تھا، گو کہ وہ شہر کے تمام شعرا سے کمسن تھا پھر بھی اسے بسمل صاحب کی شاعری پسند نہ تھی بلکہ چڑ تھی۔ تلوک چند محروم نے اسی دن صبح کے وقت باتوں باتوں میں کہا تھا کہ آج کا مشاعرہ کئی معنوں میں اہم ہے کہ بلند شہر اور جالندھر کے دو شاعر شرکت کرنے والے ہیں۔ بسمل جی خوامخواہ وقت برباد کریں گے۔ ان کی وجہ سے مہمان شعرا کو سننے کا وقت کم ہو جائے گا۔ اسی وقت اس کے ذہن میں ایک نادر خیال آ گیا تھا۔ اس نے اپنے ہم عمر چار لڑکوں کو مشاعرے میں بلا لیا تھا۔ وہ سب دروازے کے قریب ایک ساتھ بیٹھ گئے تھے۔ کم عمر ہونے کی وجہ سے اسے سب سے پہلے دعوت دی گئی۔ وہ قدیم علامتوں اور تمثالوں کے ساتھ ساتھ جدید علامتیں اور تمثالیں استعمال کرتا تھا اسی وجہ سے اس کی غزل کو مہمان شعرا نے بھی پسند کیا۔ غزل سنا کر اپنی جگہ آ بیٹھا۔ دو تین نوجوان شعرا کے بعد بسمل صاحب کو دعوت دی گئی۔ شمع سامنے آئی۔ انہوں نے عادت کے مطابق اپنی بزرگی کی دہائی دی پھر غزل گانی شروع کر دی۔ ان کا کہنا تھا کہ جگر مرادآبادی ان کے انداز کی نقل کرتے ہیں۔ جیسے ہی انہوں نے مطلع ختم کیا۔ داد کی بجائے ایک عجیب سی گونج کمرے میں سنائی دی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ سر جھکا کر ایک ساتھ "بھس" کی آواز نکالی تھی اور لمحے بھر میں خاموش ہو گیا تھا۔ پوری محفل نے مڑ کر دیکھا تھا مگر کسی کی سمجھ میں نہ آئی کہ یہ آواز کیسی تھی اور کہاں سے آئی تھی۔ بسمل صاحب نے اگلا شعر پیش کیا۔ شعر ختم ہوتے ہی پھر وہی "بھس" کی آواز۔ ایک دو افراد جو مروتاً داد دے رہے تھے وہ بھی خاموش ہو گئے۔ چوتھے اور پانچویں شعر پر بھی وہی آواز گونجی تو بسمل صاحب آپے سے باہر ہو گئے کہ اب وہ غزل پوری نہیں کریں گے۔ بڑی مشکل سے انہیں سنبھالا گیا۔ انہوں نے قطعہ پڑھا اور شمع آگے بڑھا دی۔ اس دن سے پورے راولپنڈی میں ان کا نیا نام پڑ گیا تھا۔ "بسمل بھس"۔

ایسی شرارتیں وہ اتنی سنجیدگی سے کرتا کہ لوگ حیران رہ جاتے۔ اس کی شاعری میں دم تھا اس لیے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شاعری کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ ادب کی اپنی ایک مخصوص زبان ہوتی ہے۔ گل، پردہ داری، چٹکیوں کا بے رنگ بیان ادب نہیں ہے۔ شاعری خوب صورت لفظوں کی محتاج ہوتی ہے۔ شاعری میں بہترین الفاظ بہترین ترکیب اور بہترین ترتیب ضروری ہے۔ ڈکشن میں

سلیقہ مندی اہمیت رکھتی ہے۔ اس وجہ سے اس کی شاعری دوسروں سے قدرے الگ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی فراوزیں کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ اس کی غزل میں حرارت اور تڑپ بھی جو لوک گیت سے مستعار نظر آتی۔ اس نے کمپنی چوک کی شہری دیہاتی فضا میں آنکھ کھولی تھی سن شعور کو پہنچا تھا۔ وہاں دور تک لہلہاتے کھیت تھے اور ہل چلاتے کسانوں کے ماہیوں کی فضا میں گونجتی تانیں تھیں۔ لوک اور شہری دونوں آوازیں باہم مل کر ایک نیا ترنم اور نغمگی عطا کرتی تھیں۔

پیکر بیکس ترا نظروں سے اوجھل ہو گیا
کس قدر گھل مل گئی ہے چاندنی سے چاندنی
رات بھر میں کاٹ لوں گا درد کا کوہ گراں
صبح تک تو ساتھ دے گی خامشی میں چاندنی

وہ موسیقار اور مصور بھی تھا۔ موسیقی کے بارے میں اس نے لکھا کہ میں نے لڑکپن ہی میں استاد سے باقاعدہ سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہی تعلیم بہت کام آئی، ریڈیو تک رسائی کا ذریعہ بنی۔ موسیقی میں دلچسپی لینے کا سبب بلراج ساحنی بھی تھے۔ وہی بلراج ساحنی جو محلہ شاہ چن چراغ راولپنڈی میں 1912ء میں پیدا ہوا تھا اور تین سال کی عمر میں چھاچھی محلہ عالم خان روڈ کے مکان میں آ گیا تھا۔ اسی محلے میں وہ لڑکپن سے تو جوانی تک رہا اور پھر بمبئی جا کر فلمی دنیا میں خوب نام کمایا۔ بلراج ساحنی کا فلمی دنیا میں آ جانا راولپنڈی کے بہت سے نوجوانوں کو بھایا تھا اور وہ خواب دیکھنے لگے تھے کہ بمبئی جا کر فلمی دنیا پر راج کریں گے۔ بلراج ساحنی نے اپنے سفرنامہ پاکستان میں اس کا ذکر بطور خاص کیا تھا۔

وہ بھی بمبئی جانے کا خواب دیکھنے لگا تھا کیونکہ خالی وقت بہت تھا۔ صبح سویرے موسیقی کا ریاض پھر پہلوانی کے لیے اکھاڑے میں زور آزمائی پھر مشق کشتی، دوستوں کی محفلیں۔ اس دن بھی وہ دوستوں کی محفل سے آ رہا تھا کہ کمپنی باغ میں کافی بھیڑ نظر آئی۔ تجسس نے اکسایا اور وہ باغ میں داخل ہو گیا۔ وہاں اجتماع جاری تھا۔ خاکسار تحریک کی جانب سے اجتماع تھا۔ علامہ مشرقی کے نائب راجا شیر زمان اور ان کے ساتھی سٹیج پر تھے۔ بیلچہ بردار خاکسار مارچ کر رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہ تماشائیوں میں کھڑا رہا۔ علامہ مشرقی کی کتاب ''تذکرہ'' اس نے سترہ سال کی عمر میں پڑھی تھی۔ وہ ان کے افکار سے متاثر تھا یہی وجہ تھی کہ کچھ ہی دیر میں وہ تماشائیوں کی بھیڑ سے نکلا اور اس گروہ میں شامل ہو گیا۔ 1936ء میں اس نے تحریک میں شمولیت اختیار کی اور انتھک محنت و لگن کی وجہ سے سر سالار بنا پھر سالار اعلیٰ حلقہ مغربی کی حیثیت سے خدمت خلق کا جذبہ خاکساروں کی روحوں میں رچا دیا۔ اس کی محنت نے تحریک کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ جانباز اور پھر جاں بازوں کا امیر خاص و تین اضلاع کا منتظم اعلیٰ بنا۔ واہ کیمپ میں راولپنڈی کی خاکساروں کے ساتھ شامل ہوا۔

ابھی وہ خاکسار تحریک کے لیے کام کر ہی رہا تھا کہ ستمبر 1938ء آ گیا اور اسے خبر ملی کہ دلہن کے ایک کزن نے دھمکی دی ہے کہ برات آئی تو وہ خون کی ندی بہا دے گا۔ اس نے چیلنج قبول کیا اور برات لے کر دلہن کو رخصت کرا لایا۔

اب وہ چھڑا چھانٹ تو تھا نہیں، اس کے کندھے پر بیوی کی ذمے داری آ پڑی تھی۔ اکیلے کا خرچ تو کسی نہ کسی طرح پورا ہو ہی جاتا ہے مگر اب اسے بیوی کے اخراجات بھی پورے کرنے تھے اور اس کے لیے آمدنی کا راستہ پانا ضروری تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور کوئی راہ نظر نہیں آ رہی تھی جو اخراجات پورے کرتی کہ اسی دوران حکومت برطانیہ کا اعلان شروع ہو گیا۔ فوج میں بھرتی ہونے کا اعلان۔ اس نے بھی درخواست بھیج دی۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ جنگ کی خوراک ہے انسانی جان۔ ایسے وقت میں رنگروٹ کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ جنگ کی بھٹی میں جھونکنے کے لیے انسانی جسم بڑی تعداد میں درکار تھے۔ متحدہ ہندوستان میں پنجاب ایک ایسا صوبہ تھا جہاں با آسانی لوگ مل جاتے تھے۔ ہلکی پھلکی ٹریننگ کے بعد انہیں محاذ پر بھیج دیا جاتا تھا۔ اسے بھی فوج میں نوکری مل گئی۔ اس کی پہلی پوسٹنگ رائل سروس گورا پلٹن میں ہوئی۔ اسے بارک پور بھیج دیا گیا۔ اس کے ذمے ایک ہی کام تھا۔ اسے ڈی کوڈ کی ٹریننگ دی گئی تھی۔ یہ کام بہت اہم تھا۔ ایک ذرا سی غلطی پوری پلٹن کو تباہ کر سکتی تھی۔ وہ دن بھر کانوں میں ہیڈ فون لگائے وائرلیس سے نبرد آزما رہتا۔ فریکوئنسی پر فریکوئنسی بدلتا جاپانیوں کے پیغامات کو سننے کی کوشش کرتا رہتا۔ جیسے ہی کوئی فریکوئنسی پیچ کرتی وہ اسے وائنڈ کرتا اور قلم کاغذ سنبھال لیتا۔ پوری پوری گفتگو نوٹ کرتا پھر اسے افسران تک پہنچاتا۔ افسران اس کے نوٹس پر غور کرتے سمجھنے کی کوشش کرتے پھر لائحہ عمل ترتیب دیتے۔ جاپانی افواج کس طرف سے حملہ کر سکتی ہے۔ ان کے حملوں کو کیسے روکا جائے گا۔ اس کی پیش بندی کرتے۔ انہی دنوں

انٹیلی جنس کو پیغام آیا کہ دو جاپانی بریگیڈ نزدیک آ رہے ہیں۔ ان کر سپوڈ نیٹ کو کوئی کچھ نہیں بتا رہا ہے۔ انہوں نے فریکوئنسی بھی بتائی۔ یہ اور سید عابد علی کے چھوٹے بھائی جواد نے ان کے پیغامات کو ڈی کوڈ کرنے کی کوشش تیز کر دی۔ صبح سے شام تک لگے رہے۔ بالآخر ان کے الفاظ میں چھپے پیغامات کو کاغذ پر منتقل کر کے انٹیلی جنس افسران کو دے دیا۔ انہوں نے پڑھا تو ایک ہلچل سی مچ گئی۔ جاپانیوں کا منصوبہ بہت بھیانک تھا۔ وہ سمندری راستے سے بٹالین کے عقب میں یکایک نمودار ہوتے اسی وقت بڑی تعداد میں ہوائی جہاز آ جاتے۔ ان میں کچھ بمباری کرتے اور باقی سب میں بیٹھے فوجی پیرا شوٹ سے نیچے اترتے۔ اس طرح اتحادی فوج پر چاروں طرف سے حملہ شروع ہو جاتا۔ ان تھوڑے سے فوجی جوانوں پر جاپانی ٹڈی دل کی طرح حملہ کرتے اور اتحادی فوج بکھر کر رہ جاتی۔

اس منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے تمام افسران سر جوڑ کر بیٹھے اور ایک گھنٹے کے اندر فوج کے ٹکڑوں کو الگ الگ محاذ میں بھیج دیا گیا۔ اس پیش بندی نے محاذ کی تاریخ بدل دی۔ اتحادی جو مسلسل پیچھے ہٹ رہے تھے یکایک وہ فاتح بن گئے۔ انہوں نے جاپانیوں کی قوت توڑ کر رکھ دی۔ سمندری راستے سے آنے والے جاپانیوں کو ہضم کرنے کے لیے نیوی سینہ سپر تھی۔ ہوائی راستے کو روکنے کے لیے بھی ہوائی جہاز بار بار پرواز کر رہے تھے۔ زمینی راستے کو بھی بند کیا جا چکا تھا۔ اس کے ایک آئی کو ڈی لیٹر نے ہاتھ سے نکلتی بازی کو فتح میں بدل دیا تھا۔ یہ خبر کلکتہ دہلی ہی نہیں لندن تک پہنچ گئی تھی۔ تاج برطانیہ کا پیغام آ گیا۔ اس کی تعریف میں سند آ گئی۔ اضافی تنخواہ بھی مل گئی اور بعد میں جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن دہلی آئے تو ان سے ملاقات بھی کرائی گئی تھی۔ بھاری تحفے بھی ملے۔

اتنی واہ واہی کے بعد بھی اس نے فوجی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ 1945ء میں کنگ کمیشن کے لیے کال آئی لیکن دل تو پاگل ہے محبت کا گیت گا رہا۔ شاعر تھا ضرورت کے تحت فوج میں گیا تھا اتنا خون خرابہ دیکھا تو صاف انکار کر بیٹھا۔ دل جنگ و جدل سے پہلے بھی دوری چاہتا تھا اب اور بھی دور ہو گیا۔ گھر سے پھولوں، بادلوں، جھرنوں کی باتیں کرنے لگا۔ محبت کے گیت گانے لگا۔ مشاعروں میں شرکت، نئے کلام کی پیشکش کرنے لگا۔

شاعری سے پیٹ نہیں بھرتا۔ بھوکا پیٹ غزل نظم نہیں، روٹی مانگتا ہے۔ روٹی کی خاطر وہ پھر سے ملازمت تلاش کرنے لگا۔ دوستوں کی سفارش پر اسے ٹنگ واشنگ میں کلرکی مل گئی۔ یہ نوکری بھی بری نہیں تھی بلکہ اس میں آسانیاں ہی آسانیاں تھیں۔ اسی دوران ترقی پسند تحریک نے اسے گرویدہ کر لیا۔ اس کی سوچ بدلنے لگی۔ اس نے پنجابی نظم "الامتحان" کہی۔ نظم کہہ کر وہ مزدوروں کے جلسے میں سنا آیا۔ استعماری قوتیں کب اس کی یہ جسارت پسند کرتیں۔ اسے نوکری سے نکال دیا گیا۔ ایک بار پھر وہ بے روزگار بن گیا۔

نوکری گئی تو اس نے دوبارہ سے ادب میں دلچسپی لینا شروع کر دی لیکن روٹی بھی تو ضروری تھی۔ بھوکے پیٹ شاعری تو ہو سکتی ہے مگر بچوں کی سسکیاں شاعری پر بھی قدغن لگا دیتی ہیں۔ بحالت مجبوری اس نے فن مصوری کو ذریعہ آمدنی بنانے کی کوشش کی۔ سینما کے بل بورڈ بنانے کا کام پکڑ لیا۔ آمدنی انتہائی قلیل مگر ہنر آزمانے کا ذریعہ تھا اس لیے بہ رغبت اس کام کو کرنے لگے لیکن کام زیادہ دن نہ کر سکے۔ دل اکتایا تو کام سے تائب ہو گئے۔ محنت کم دکھی ہاتھ میں فن تھا۔ انگلیاں بولتی تھیں۔ ایسی نقاشی کرتا کہ کیمرے کی تصویر کا گمان ہوتا مگر پیسے کتنے ملتے صرف 9 آنے۔ اگر مصوری کا شوق نہ ہوتا تو کب کا توبہ کر لیا ہوتا لیکن جب اخراجات مانع ہوا تو اس کام کو چھوڑ کر کیٹی چوک پر پان کا کھوکھا لگا لیا۔ لوگ حیران کہ یہ ہوا کیا ہے۔ مصوری میں سب سے آگے، گیت گائے تو سننے والا گم ہو جائے۔ مرتا پہ مسرور ہو جائے اور کام یہ شروع کر دیا۔ سینے کو جلانے کے لیے سگریٹ اور دانتوں کو خراب کرنے والا پان بیچنے پر اتر آیا ہے، لیکن وہ تو من موجی تھا۔ جو دل میں آئے کر گزرنے والا۔ اسے کسی بات کی پروا بھی نہیں تھی۔ کون کیا کہہ رہا ہے اس پر بھی کان نہ دھرتا تھا۔ بس اپنی کیے جاتا تھا۔ پان کے کھوکھے سے دل بھر گیا تو آٹے کی ایک چکی پر منشی کا کام کرنے لگا۔

اس کی یہ مشقت اور بے روزگاری دوستوں میں موضوع بحث بن رہی تھی کہ یہ خبر جواد تک پہنچ گئی۔ وہ کھنچا چلا آیا۔ اس نے فوجی زندگی کی یادیں تازہ کرنا شروع کر دیں۔ دوسری جنگ عظیم میں جب وہ رائل انڈین فورس کا حصہ تھا اور برما کے محاذ پر جاپانیوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ اس کٹھن وقت موت کو بہت قریب محسوس کرتے ہوئے بھی کس طرح وہ زندہ دلی کا مظاہرہ کرتا۔ زندگی سے بھرپور

گیت گاتا تھا۔ ان گانوں کی یاد دلا کر جواد نے کہا۔ "تو میرے ساتھ چل میں ریڈیو پر بات کرتا ہوں۔"

اس وقت افضل پر ضرورت کا دباؤ تھا۔ وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھا اس لیے جواد کے ساتھ چل پڑا۔ ریڈیو میں دلچسپی کی ایک وجہ اور بھی۔ موسیقی بھی اس کے شوق میں شامل تھی۔ اس نے استادوں سے یہ فن سیکھا تھا اور ریاض بھی خوب کیا تھا۔

جواد اسے ساتھ لے کر ریڈیو اسٹیشن پہنچا۔ وہاں اس کا ایک بہت قریبی دوست تھا جو موسیقی کے پروگرام کرتا تھا۔ اس کے پاس لے جا کر اس نے کہا۔ "یہ میرا یار جانی ہے۔ نام افضل پرویز ہے۔ بہت اچھا گاتا ہے۔"

پروڈیوسر نے اس کا سرتاپا جائزہ لیا اور پوچھا۔ "اچھے لوک گیت ہوندے نے۔"

افضل پرویز نے جواب میں کہا۔ "جتھے لوک ہوندے نے اُتھے لوک گیت وی ہوندے نے۔"

جواب سن کر پروڈیوسر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے گلے سے لگا لیا۔ اسے جو پہلا پروگرام ملا وہ ایک میوزیکل فیچر تھا۔ "ٹوٹ گئے وینا کے تار" نامی فیچر کو اس نے رشید عطرے کے ساتھ مل کر تیار کیا۔ اتنے اچھے انداز میں کیا کہ سب نے تعریف کے پل باندھ دیے۔ اس نے محنت بھی تو خوب کی تھی۔ محنت اسے پسند تھی اسی لیے ہر کام میں محنت ضرور شامل کرتا۔ اخباروں میں مضامین اور فیچر 1948ء سے لکھ رہا تھا۔ تواتر سے لکھتا تھا۔ لوگ پسند بھی کرتے تھے کیونکہ وہ محنت سے لکھتا تھا۔ معلومات کو خوب صورت جملوں میں سجا کر ایسے پیش کرتا تھا کہ لوگ اس کے قلم کا لوہا مان لیتے۔ جس طرح اخباری فیچر کا موضوع انفرادیت کا حامل ہوتا ایسے ہی ریڈیو کا فیچر بھی دلچسپی بھرا ہوتا۔ اسے لوک گیت میں سحر سا محسوس ہوتا۔ شاید اس لیے کہ وہ بچپن سے کسانوں کی تانیں سن رہا تھا۔ جب شعور کی منزل پر پہنچا بھی نہ تھا کہ ماں کی گود میں اس کی قوت سماعت لوری کی عادی ہو گئی تھی۔ اس نے اقبال بانو اور شوکت مرزا کے ساتھ مل کر پنجابی اور پوٹھوہاری گیتوں کو اپنی آواز دینا شروع کر دیا۔ ان بھولے بسرے گیتوں کو ڈھونڈ کر لاتا جو گزرتے وقت کے ساتھ ذہنوں سے محو ہو رہے تھے۔ انہیں پھر سے شباب بخشتا۔ لوگ اس کی کاوش کو پسند بھی کر رہے تھے۔ گیتوں کی تلاش میں وہ اس علاقے سے اس علاقے پھرتا رہتا۔ کبھی مانسہرہ تو کبھی ڈی آئی خان جہاں کا جو پتا ہوتا وہ اس علاقے میں پہنچ جاتا۔ اس کی دوستی ماسٹر صادق سے بچپن کی تھی۔ ماسٹر صادق ہارمونیم کے بے تاج بادشاہ تھے۔ گویا دونوں کا شوق ایک تھا۔ فرق اگر تھا تو ایک نے شوق کو ساز تک محدود کر لیا تھا اور دوسرے نے لامحدود۔ ایک دن دونوں لاہور جانے کے لیے ٹرین میں سوار ہوئے۔ ماسٹر صادق کے ہاتھ میں ایک میگزین تھا وہ اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ان کی نظر افضل پر پڑی وہ سامنے والی سیٹ پر بیٹھے شخص کے چہرے پر نظر گڑائے تھا۔ وہ شخص کوئی ناول پڑھ رہا تھا۔ صادق کو حیرت ہوئی۔ انہوں نے ٹوکا۔ "کیا پڑھ رہے ہو؟"

"سامنے والے بندے کو۔" افضل نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

"کیوں؟"

"سفر میں لوگ وقت گزاری کے لیے ناول پڑھتے ہیں اور میں ناول پڑھنے والے کا چہرہ پڑھتا ہوں۔" اس کی آواز جوش بھری تھی۔

"کیوں! یہ کیا بات ہوئی؟"

"تم نے کبھی غور نہیں کیا۔ جب کوئی ناول پڑھتا ہے تو اس کا عکس اس کے چہرے پر نظر آتا ہے۔ وہ غم ناک منظر پڑھ رہا ہے یا خوشی کا، اس کا چہرہ بتانے لگتا ہے۔"

اس کی بات پر ماسٹر صادق نے بمشکل ہنسی روکی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ افضل ہے ہی ایسا۔ ہمیشہ انوکھا کام کرتا ہے۔ شہر کے کئی زنخے (ہیجڑے) اس کے دوست تھے۔ وہ ان کے گھروں میں جا کر ان کے عادات و اطوار کا مطالعہ کرتا۔ سڑک کنارے بیٹھے فقیر کے برابر میں بیٹھ کر اس سے باتوں کے درمیان اس کی زندگی کا جائزہ لیتا۔ گویا اس کے قلم میں زندگی کا تجربہ ہوتا۔ اس نے تجربے کی کسوٹی سے زندگی کو پرکھا تھا۔

اس کے اندر ایک تجسس تھا۔ کسی ندی کی طرح کے جب بہتی ہے تو بس بہتی ہی چلی جاتی ہے۔ کہیں رکنے کا نام نہیں لیتی بس بہتی چلی جاتی ہے۔ یہی حال اس کا تھا۔ وہ ہر بات میں تجسس پیدا نہیں کرتا بلکہ خود تجسس میں مبتلا ہو جاتا۔ نفسیات پر بے شمار کتابیں زیر مطالعہ رہیں۔ اس نے صرف کتابوں پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ لوگوں کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ ہیجڑوں پر کام کیا۔ ان کے ساتھ وقت گزارا ان کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کیا اور پھر ان پر لکھا تو خوب لکھا۔ پاگلوں کے ساتھ ساتھ پھرتا۔ ان کی حرکات کا مطالعہ کرتا۔ ان کی باتوں کو توجہ سے سنتا۔ پاگل پتھر کیوں

مارتا ہے؟ پاگل مرے ہوئے کتے کے پاس بیٹھ کر روتا کیوں ہے؟ خانہ بدوشوں کے ساتھ ساتھ پھرتا۔ ان کی زندگی کا باریک بینی سے تجزیہ کرتا۔ سپیروں کے ساتھ وقت گزارتا۔ سانپوں سے وہ کیسے نمٹتے ہیں اس کا جائزہ لیتا۔ گوگا پیروں کی چالبازیوں کو سمجھنے کے لیے ان کی صحبت میں وقت گزارتا ان کی نفسیات کا تجزیہ کرتا۔ اور پھر اپنے تجربات کو تحریر کی شکل میں پیش کر دیتا۔ سڑک پر گانے والوں کو قریب سے سمجھنے کے لیے ان کا ساتھ دیتا۔ خود استاد عاشق علی خان کا شاگرد تھا پھر بھی وہ اسٹریٹ سنگر سے لے سر سیکھنے کی کوشش کرتا کہ وہ بغیر کسی اچھے استاد کے نئی دھنیں کیسے بنا لیتے ہیں۔ اچھی دھنوں کو کیسے اپنے ذہن میں ڈھال لیتے ہیں۔ موسیقی پر ہی نہیں سازوں پر بھی کام کرتا۔ معلومات جمع کرتا اور جب معلومات جمع ہو جاتیں تو ان کو احاطہ تحریر میں لا کر "نقوش" اور "ادبیات" جیسے اہم پرچوں میں شائع کراتا۔ لوک گیت پر اس نے جتنا کام کیا بہت کم افراد نے اس طرح کام کیا ہوگا۔ "بن پھلواری" تو ایک سمندر سے نکلا قطرہ ہے۔ انہوں نے لوک گیت پر جتنا کام کیا اسے صفحات پر سجانے کے لیے ایک دفتر درکار ہوگا۔ گھریلو گیتوں کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ اس کی دھنوں کے لیے مجھے اپنی بیوی کی خدمات حاصل کرنا پڑیں۔ گیت وہ لکھتی۔ دھنیں یاد کرتی اور مجھے منتقل کر دیتی۔ میں خود چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو اپنے گرد جمع کر لیتا' کہانیاں سناتا۔ مٹھائی دیتا گیت گاتا اور پھر فرمائش کرتا کہ وہ کوئی گیت سنائیں۔ وہ شرماتی لجاتی تحت اللفظ سناتیں۔ میں منت سماجت کر کے اور رونے کے انداز میں کہتا کہ وہ گا کر سنائیں۔ جس طرح ان کی ماں یا وڈے (بڑی بہن) گاتی ہے۔ مثلاً ڈولی کا گیت جو یوں گایا جاتا ہے "ڈولی نال ہیڑے مہاراج کرینا ہیڑے۔ ڈولی کی آون وے" میں ڈولی کا گیت گاتا' ان سے پوچھتا کہ ٹھیک ہے؟ یوں وہ بتدریج مجھ سے گھل مل جاتیں اور ننھے منے گیت پیاری پیاری آوازوں میں میرے کانوں میں "جھمن جھمن کرنے لگتے۔"

اس نے اپنے گھر "افراحیات" کا ایک پورشن کرائے پر دے رکھا تھا مگر شرط یہ بھی کہ کرائے دار کا فن لطیفہ کا حامل ہونا ضروری تھا۔ اس پورشن کے کرائے داروں میں بڑے بڑے نام شامل ہیں جو مختلف وقت میں یہاں کرایہ دار رہے۔ مثلاً نثار صدیقی، ممتاز مفتی، شاہد ہاشمی، احمد سلیم، شفقت تنویر مرزا، اختر بھائی۔

وہ دورنگی زندگی کا حامل تھا۔ گھرانا کٹر مذہبی مگر ساری زندگی ایسی زندگی جیا کہ لوگ اسے اشتراکی سمجھتے رہے اس لیے کہ سامراج کے خلاف تحریر و آزمائی کا مظاہرہ جو کرتا تھا۔ کچھ دنوں کے لیے دوسری جنگ عظیم کے وقت برطانوی سامراج کے ہاتھوں کھلونا ضرور بنا لیکن جلد ہی سرکاری ملازمت سے جان چھڑالی' پھر جو بغاوت کا پرچم بلند کیا تو دم آخر تک بلند رہا۔ بغاوت کا آغاز اپنے ہی طبقے کی منافرت اور منافقت پر طنز سے کیا۔ ایسے بہت سے اشعار کہے جو معاشرے کا چہرہ ہیں

اور کہ تسلیم ازل سے ہے تمہارا شعور
تم نے ہر راہ میں ہر گام پہ دھوکے کھائے
وہی قارون وہی شداد وہی شہ وہی بت
ہر زمانے میں نیا بھیس بدل کر آئے

افضل کی شاعری میں ہر قسم کے مذہبی اور سیاسی استحصال کے خلاف نظر آتے ہیں۔ عام آدمی کی الجھنوں، مشکلوں، کامیابیوں اور اداسیوں کو موضوع بنایا۔ یہی ان کی شاعری کا کمال ٹھہرا۔ خود کہا کہ میں نے دیکھنے اور غور کرنے کا فرق شرلاک ہوم کے افسانوں سے سیکھا۔ ہر چیز کو Minutely دیکھتا ہوں۔ یہی کچھ صرف شاعری میں نہیں مضامین اور فیچر میں بھی جھلکتا ہے۔

وہ 1959ء میں روزنامہ جنگ راولپنڈی سے وابستہ ہوئے اور 1988ء تک بحیثیت اسٹاف رپورٹر، کرائم رپورٹر رہے۔ سب ایڈیٹر بھی رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کنٹریکٹ پر تقریباً سولہ سال تک ہر بدھ کو کالم ثقافت جھلکی لکھتے رہے۔

ریڈیو کا جو سفر 1952ء میں شروع کیا تھا وہ 1984ء تک جاری رہا' پھر خود ہی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا کہ سارا دن شام کو جانے کی ٹینشن رہتی ہے۔ ریڈیو کے لیے اردو پنجابی ڈرامے، سینکڑوں فیچر اور لوک گیت لکھے۔ پوٹھوہاری پروگرام "جمہور دی واز" میں چودھری کی حیثیت سے کمپیئرنگ کی۔ گراں نی وستی، ماڑا دن دو سہا، ڈچ کوتلی، چار گرائیں بہت مقبول ہوئے۔ شاعری، کہانی نویسی، فیچر رائٹر یعنی کہ بیک وقت کئی میدانوں میں فن کا جھنڈا بلند رکھنے والی ہستی 2 جنوری 2001ء کو دنیا سے منہ موڑ گئی۔ بعد از مرگ کمیٹی چوک سے ظفر الحق روڈ جانے والی سڑک کا نام افضل پرویز روڈ رکھا گیا۔

++

یادگار

انور فرہاد

فلم نگری بڑی ظالم ہے۔ یہاں صرف چڑھتے سورج کو اہمیت ہے ایسا صرف ہمارے ہاں ہی نہیں پوری دنیا میں ہوتا ہے۔ بالیووڈ ہو یا لالی ووڈ سب جگہ ایک ہی کہانی رائج ہے لیکن ایک واضح فرق بھی ہے، بالی ووڈ اور بالی ووڈ یہ سب تقریباً 80 یا نوے سال میں آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچے ہیں لیکن ہمارے ہاں فسادات کی آگ نے سب کچھ خاک کردیا تھا اس خاک کو ترقی کا زینہ خود بنا کر ہنرمندوں نے کمال دکھایا، بغیر وسائل کے نئی فلمی صنعت بنائی اور اس صنعت کو اتنی ترقی دی کہ دنیا حیران رہ گئی۔ ایسے ہی چند ہنرمندوں کا تذکرہ جنہوں نے کمال کر دکھایا۔

قابلیت کا سکہ جمانے والوں کا تذکرہ

اللہ کا بڑا لطف و کرم ہے کہ پاکستانی فلمی صنعت کو بے حد باصلاحیت ہنرمند ملے جنہوں نے تباہ حال فلم انڈسٹری کو اپنی محنت، کوشش اور کاوش سے ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ ایسے ہیروز کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے لیجنڈز کو یاد رکھنا چاہیے۔ اس لیے میں نے ان صفحات پر ایسے فنکاروں اور ہنرمندوں کی یادوں کو تازہ کرنے کی طرح ڈالی ہے کہ ہماری نئی نسل کو اندازہ ہو سکے کہ ہماری فلم انڈسٹری کی تعمیر و ترقی میں کن لوگوں نے کس طرح حصہ لیا۔ کیا کچھ کیا اور کیسے کیا۔ آج

کی نشست کا آغاز بھی میں ایسے ہی ایک معمار موسیقار سے کروں گا جنھوں نے پاکستانی فلموں اور فلمی صنعت کی عظیم خدمت کی۔ اسے زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچایا ہے۔ اس موسیقار کا نام نامی اور اسم گرامی ہے، بابا جی اے چشتی۔ میرے معزز قارئین میری اکثر تحریروں میں موسیقی کے ضمن میں بابا جی کا نام پڑھتے رہے ہیں۔ ان کی ترتیب دی ہوئی دھنوں پر بے شمار گیتوں نے مقبولیت حاصل کی جن کا احوال ہم لکھتے رہے ہیں۔ یہ بابا جی اے چشتی ہیں کون؟ کتنے عرصے فلموں کی موسیقی ترتیب دیتے رہے تھے اس بارے میں بتاتا چلوں۔

بابا جی اے چشتی 1904ء کے لگ بھگ جالندھر (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ (بات چونکہ بہت پرانی ہے اس لیے بعض روایتوں کے مطابق وہ شکار پور میں پیدا ہوئے) بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کے والدین نے ان کا نام غلام احمد رکھا۔ والد محترم مولوی تھے اور مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ بیٹا جب لکھنے پڑھنے کے قابل ہوا تو اسے ایک مدرسے میں قرآن کریم حفظ کرنے میں لگا دیا کہ حافظ بن کر اپنا اور خاندان کی بخشش کا وسیلہ بنے لیکن فرزند ارجمند غلام احمد ابھی چند سپارے ہی حفظ کر سکے تھے کہ ان کے والد اور گھر کے کفیل کا انتقال ہو گیا۔ ابھی غلام احمد بہت کمسن تھے کہ باپ کی چھوڑی ہوئی ذمے داریاں ان کے سر پر آن پڑی۔ اپنی واجبی تعلیم کی وجہ سے انھیں پنجاب کے محکمہ انہار میں ملازمت ملی۔ یوں ان کی زندگی ایک مخصوص ڈھب پر رواں دواں ہو گئی۔

غلام احمد بچپن ہی سے خوش گلو تھے، زمانہ طالب علمی میں خوش الحانی کے ساتھ نعتیں پڑھا کرتے تھے۔ جب ان کی اس صلاحیت کا علم ان کے سینئر افسروں کو ہوا تو انہوں نے ان کی پذیرائی اور حوصلہ افزائی کرنا شروع کر دی۔ طبیعت موزوں ہونے کی وجہ سے وہ پنجابی میں اچھی پھلکی شاعری بھی کرنے لگے۔ وقت کا پہیا جیسے جیسے گھومتا رہا مذہبی گھرانے کے مولوی باپ کے بیٹے کے رنگ ڈھنگ میں تبدیلی کی خوشگوار ظاہر ہونے لگی۔ نعتیں پڑھنے والا اب اچھی خاصی گلوکاری کرنے لگا۔ شعر و شاعری کی بھی اچھی خاصی شد بد ہو گئی تھی۔ گانے کے ساتھ بجانے کا بھی لاحقہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ہونہار نوجوان موسیقی کی جانب بھی مائل ہو گیا اور کچھ سازوں کا استعمال اس نے آہستہ آہستہ سیکھنا شروع کر دیا۔ ذہانت اور متانت انھیں بچپن ہی سے نعمت خداوندی کے طور پر ملی تھی۔ گانے کے ساتھ ساتھ بجانے کا ہنر بھی ان میں پروان چڑھتا گیا پھر اللہ کا کرنا یوں ہوا کہ کسی ہمدرد کے وسیلے سے انھیں لاہور میں ٹائم کو لمبیا گراموفون کمپنی میں بطور کمپوزر کام کرنے کا موقع مل گیا۔ بطور کمپوزر انہوں نے اس وقت کے بڑے گانے والیوں خورشید بائی حضر والی، عنایت بائی ڈھیروالی اور طمنچہ جان سے اپنے کمپوزیشن پر گیت اور غزلیں ریکارڈ کروائیں لیکن ان ریکارڈوں پر ان کا نام موجود نہیں ہے کیونکہ کولمبیا گراموفون کمپنی میں ملازم کمپوزروں کے نام لکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ وہیں جب مشغول ہوئیں تو فلم ساز چونک اٹھے۔ ان دنوں نامور ڈراما نگار اور ہندوستانی شیکسپیئر آغا حشر کاشمیری فلم "بھیشم پرتگیہ" بنانے کی تیاریوں میں تھے۔ انہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے معلوم کیا کہ خورشید بائی، عنایت بائی اور طمنچہ جان کے گیتوں اور غزلوں کی موسیقی دینے والا کون موسیقار ہے؟ اس آگہی کے بعد آغا حشر نے اس کمپوزر کو بلایا اور کہا۔ "نوجوان کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی — خاندانی نام تو غلام احمد ہے مگر جب سے گانے بجانے کا کام شروع کیا ہے۔ کچھ بہی خواہوں نے مشورہ دیا کہ تم کوئی ماڈرن نام رکھ لو" لیکن میں نے کہا "ارے بھائی! یہ میرے ماں باپ کا رکھا ہوا نام ہے۔ میں انھیں کیسے بدل دوں؟" تو وہ بولے۔ "تم غلام احمد کی جگہ GA بن جاؤ۔ یہ غلام احمد کا مخفف ہے۔" میں نے کچھ سوچ کر ان سے کہا۔ "اتنا چھوٹا نام؟ کیا یہ اچھا لگے گا؟ اس میں کچھ اور لگا لو۔ جیسے جی اے جالندھری۔" ایک دوسرا دوست بولا۔ "یا چشتی لگا لو۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارے والد خانقاہ چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے تم اپنے نام کے ساتھ چشتی کا دم چھلا لگا سکتے ہو۔" مجھے یہ مشورہ پسند آیا اور اس دن سے میں جی اے چشتی بن گیا۔"

آغا حشر کاشمیری نے اپنا مخصوص قہقہہ لگایا۔ "بھئی واہ! واقعی یہ نام جی اے چشتی غلام احمد کی جگہ بڑا آرٹسٹک ہے۔" پھر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولے۔ "میاں چشتی میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ میں ایک فلم "بھیشم پرتگیہ" بنا رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم اس کی موسیقی ترتیب دو۔"

"آغا صاحب! یہ تو میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہو گی۔"

اور انہوں نے آغا صاحب کی فلم "بھیشم پرتگیہ" کے کچھ گیتوں کی دھنیں تیار کیں جو ریکارڈ ہوئے اور ان گانوں

اے چشتی ہی نے زکریا بیگم دہلی والی کی آواز میں ریکارڈ کیا تھا۔ جواں سال جی اے چشتی کی بطور موسیقار "سوہنی مہینوال" پہلی فلم تھی۔ جو کاروباری طور پر متوقع کامیابی حاصل نہ کر سکی لیکن اپنی موسیقی کے اعتبار سے کامیاب ثابت ہوئی اور فلمی دنیا میں ان کا نام کامیاب موسیقاروں میں لیا جانے لگا۔

اگلے سال یعنی 1940ء میں جی اے چشتی کی سرشگیت کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر کلکتے کے مشہور فلم ساز ادارے نگواڑ پروڈکشنز کے ہدایت کار آر سی تلوار نے انہیں اپنی فلموں کی موسیقی کے لیے منتخب کیا اور انہوں نے اس ادارے کی کئی فلموں کی کامیاب موسیقی ترتیب دی۔

کلکتہ جاتے وقت جی اے چشتی اپنے ساتھ اپنے دو ہونہار نوجوان شاگردوں کو بھی لے گئے تھے۔ یہ رحمان ورما اور خیام تھے۔ تقسیم کے بعد خیام (ظہور احمد) نے ہندوستان میں ہی رہنے کو ترجیح دی اور ایک صاحب اسلوب موسیقار کے طور پر اپنا لوہا منوایا۔ رحمان ورما نے آگے چل کر استاد سے اپنی محبت کا ثبوت یوں دیا کہ بابا جی اے چشتی کی صاحبزادی کی شادی اپنے بیٹے سے کر دی۔ یاد رہے کہ "بابا" کا لاحقہ ان کے نام کے ساتھ اس وقت لگا جب وہ واقعی "بابا" ہو گئے تھے۔ بوڑھے اور ضعیف ہو گئے تھے۔

1946ء میں جی اے چشتی اپنی اہلیہ کی علالت کی وجہ سے کلکتے سے لاہور واپس آ گئے اور یہاں (لاہور میں) ایک ادھوری فلم "ہیر رانجھا" کے چار گیت ریکارڈ کرائے جو عبدالشکور (موسیقار خیام کے بڑے بھائی اور ریڈیو پاکستان لاہور کے سابق پروگرام منیجر) اور منور سلطانہ کی آوازوں میں صدا بند کیے گئے تھے۔

1947ء میں "یہ ہے زندگی" کے لیے موسیقی ترتیب دی لیکن تقسیم ہند کی وجہ سے اس فلم کی نمائش لاہور کی بجائے کلکتے میں ہوئی۔

ایک فلمی محقق کے مطابق پاکستان بننے کے بعد بھارت میں جی اے چشتی کی دو فلمیں "دو باتیں" اور "نئی بھابی" ریلیز ہوئی تھیں مگر ان کے بارے میں کوئی تفصیل معلوم نہ ہو سکیں۔

کلکتے کے قیام کے دوران جی اے چشتی نے جن فلموں کی دھنیں ترتیب دیں ان میں باپ کی نگری (1939)، پیسے دی گلی (1941)، مبارک (1941)، پردیسی ڈھولا (1941)، خاموشی (1942)، بجلی (1943)، گلیاں (1944)، شکریہ (1944)، البیلی (1945)، ضد (1945)، کے علاوہ ایک اور فلم "جھوٹی قسمیں" بھی تھی جس کی تکمیل کے دوران ہی اسے ادھورا چھوڑ کر وہ اپنی بیگم کی علالت کی وجہ سے لاہور واپس آ گئے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستانی فلمی صنعت سخت بحرانی کیفیت میں تھی۔ تقسیم سے پہلے اور اس کے بعد جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ ان میں جانی اور مالی نقصانات صرف عوامی سطح پر نہیں ہوئے تھے۔ فسادیوں نے لاہور کے نگار خانوں کو بھی نہیں بخشا تھا۔ علاوہ ازیں فلم انڈسٹری سے وابستہ سارے ہندو فنکار اور تکنیک کار بھارت چلے گئے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد اسے نئے سرے سے زندہ کرنے کی کوشش کی گئی تو جہاں فلم سازی کے ضروری ساز و سامان کی کمی دشواری کا سبب تھی، وہاں ان حالات میں سرمایہ کاری کرنے پر کوئی تیار نہ تھا۔ فلم کی ابتدا "تیری یاد" کی نمائش سے کر دی گئی تھی جس کا آدھے سے زیادہ حصہ تقسیم سے پہلے مکمل کیا جا چکا تھا۔ باقی بچا ہوا حصہ مکمل کر کے اس کی نمائش کر دی گئی تھی اور اس فلم نے پہلی پاکستانی فلم کا جھومر اپنے

تقسیم ہند سے پہلے کی فلمیں

سوہنی مہینوال (نمائش 1939ء)، باپ کی نگری (نمائش 1939ء)، پیسے دی گلی (نمائش 1941ء)، مبارک (نمائش 1941ء)، پردیسی ڈھولا (نمائش 1941ء)، خاموشی (نمائش 1942ء)، بجلی (نمائش 1943ء)، گلیاں (نمائش 1944ء)، شکریہ (نمائش 1944ء)، البیلی (نمائش 1945ء)، ضد (نمائش 1945ء)، ہیر رانجھا (نمائش 1946ء)، یہ ہے زندگی (نمائش 1947ء)، جھوٹی قسمیں (ادھوری چھوڑ کر لاہور آ گئے)۔

بابا جی کی کارکردگی

بابا جی اے چشتی نے اپنے 65 سالہ فلمی کیریئر میں تقریباً 5000 گانوں کی دھنیں کمپوز کیں۔ بابا جی نے 20 اردو اور 140 کے قریب پنجابی فلموں کا میوزک دیا۔ انہوں نے پاکستانی فلمی صنعت کو کئی نئے گلوکار دیے جن میں عنایت حسین بھٹی، نذیر بیگم، نسیم بیگم، سلیم رضا، مسعود رانا، مالا اور پرویز مہدی شامل ہیں۔

ماتھے پر سجالیا تھا مگر اس سفر کو آگے بڑھانا آسان کام نہیں تھا۔ ہدایت کار لقمان نے ایسے حالات میں بدقت تمام پاکستان کی دوسری فلم "شاہدہ" کی بنیاد رکھی تو اس کی موسیقی کمپوز کرنے کی ذمے داری ماسٹر غلام حیدر کے ساتھ جی اے چشتی کو بھی سونپی گئی۔ اس تناظر میں چشتی کو پاکستان کی فلمی صنعت کے اولین معماروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ فلم میں جس حیثیت سے بھی کام کیا جائے کام کرنے والوں کی روزی روٹی کا سہارا فلمیں ہی ہوتی ہیں۔ ذرا سوچیے اس دور میں جب فلم انڈسٹری میں فلموں کا قحط الرجال تھا۔ فلم والوں کا کیا حال ہو گا؟ بہرحال جو لوگ بھی اس انڈسٹری سے وابستہ تھے انہوں نے جس بے سروسامانی کے عالم میں اس کی تعمیر و ترقی میں اپنا حصہ ڈالا۔ وہ اس کے لیے قابل تعریف ہے۔ قابل تحسین ہے، کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو مار کر فلمی صنعت کو نئی زندگی دی۔ جی اے چشتی کا تعلق لاہور ہی سے تھا مگر انہوں نے بطور موسیقار لاہور سے باہر رہ کر اپنے آپ کو منوایا تھا۔ فلم والے (لاہور کے) ان کے نام اور کام سے واقف تو تھے مگر عملی ثبوت کے طور پر ان کا پہلا تعارف "شاہدہ" تھی لیکن "شاہدہ" کامیاب نہ ہو سکی۔ جس کی وجہ سے اس فلم سے وابستہ تمام افراد کو وہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ ان میں ہدایت کار لقمان اور موسیقار جی اے چشتی سرفہرست تھے۔ موسیقار جی اے چشتی کا اصل تعارف ہدایت کار نذیر صاحب کی پنجابی فلموں "پھیرے" اور پھر "لارے" سے ہوا۔ ان فلموں کے گیتوں سے ہر طرف دھوم مچ گئی۔ "واہ چشتی! واہ چشتی" ہر فلم دیکھنے والا ان کے گیتوں سے متاثر ہو کر کہتا تھا۔ بلاشبہ ان فلموں کی کہانی، اداکاری اور ہدایت کاری اعلیٰ معیار کی تھی اس لیے یہ فلمیں دیکھنے والوں کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئیں لیکن ان کی موسیقی کا بھی جواب نہیں تھا۔ خود نذیر صاحب کا کہنا ہے۔ "پھیرے" اور "لارے" کی کامیابی میں بڑا حصہ چشتی صاحب کی زبردست موسیقی کا ہے۔"

اچھے موسیقار کی ایک خوبی بلکہ خاص خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے گانوں اور گیتوں کے لیے اچھی اور متاثر کن آوازوں کو منتخب کرتے ہیں۔ کون سا گیت کس گلوکار یا گلوکارہ بہتر طریقے پر پرفارم کر سکے گا یا کر سکے گی۔ اس خوبی یا جوہر سے جو موسیقار نابلد ہوتے ہیں ان کی بہترین دھنوں اور خوب صورت شاعری کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ چشتی جی نے اپنے گیتوں کے لیے جن گانے والوں یا والیوں کا انتخاب کیا انہوں نے ان کے نغموں کو مقبول بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور چشتی نے بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ 1949ء سے 1962ء تک منور سلطانہ، عنایت حسین بھٹی، زبیدہ خانم، کوثر پروین، پکھراج پپو، عبدالشکور، سلیم رضا کی آوازوں کو استعمال کرتے رہے لیکن جب 1962ء کے بعد نور جہاں نے پلے بیک شروع کی تو پھر زیادہ انحصار ان ہی کی آواز پر کیا۔ نور جہاں جی اے چشتی کے لیے کوئی نئی شخصیت نہیں تھیں۔ 9 سال کی عمر میں جب وہ قصور سے لاہور آئیں تو چشتی کی لکھی ہوئی جس نعت کا بہت شہرہ ہوا

چلتے ہیں ستارے یا شاہ مدینہ

یہ نور جہاں ہی کی آواز میں تھی۔ بابا جی کو نور جہاں سے بہت محبت تھی اور موصوفہ بھی ان کا بے حد احترام کرتی تھیں۔ بابا جی کہتے ہیں۔ "ایک بار داتا گنج بخش کے مزار پر دعا مانگتے ہوئے نور جہاں سے ملاقات ہوئی تو نور جہاں نے آگے بڑھ کر میرے گھٹنے چھوئے اور عرض کی کہ میں نور جہاں ہوں مجھے آپ نے نور جہاں بنایا ہے۔"

جی اے چشتی چونکہ پنجابی تھے لہٰذا ان کا اپنا رجحان بھی پنجابی شاعری اور پنجابی فلموں کی جانب زیادہ تھا۔ اگرچہ انہوں نے دو درجن کے لگ بھگ اردو فلموں کی موسیقی بھی ترتیب دی لیکن ان کا اصل کام وہ پنجابی گیت ہیں جو ان کی سینکڑوں پنجابی فلموں میں شامل ہیں مگر یہ بات طے ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کام کے معیار میں کمی آتی چلی گئی۔ وہ چن، پھیرے، لارے، بلبل، ووہٹی، گڈی گڈا، یکے والی، پلکاں، زلفاں، ورثہ، میرا ماہی اور جتھہ جوڑی جیسی فلموں کے شاہکار گیتوں کا معیار برقرار نہ رکھ سکے۔ بالخصوص 1970ء سے آخر تک ان کے کام میں کمرشل ازم اور فلمی صنعت کی روایتی ضروریات پر پورا اترنے والا مسالہ حاوی نظر آتا ہے لیکن انہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں ان سے زیادہ پنجابی فلمیں کسی اور موسیقار نے نہیں کیں۔

بابا جی اے چشتی نے پاکستان میں جن اردو فلموں کی موسیقی ترتیب دی وہ مندرجہ ذیل ہیں۔ سچائی (1949)، انوکھی داستان (1950)، سسی (1954)، نوکر (1955)، محفل (1955)، طوفان (1955)، لخت جگر (1956)، مس 56 (1956)، حقیقت (1956)، سیستان (1957)، سردار (1957)، نغمہ دل (1959)، گمراہ (1959)، رانی خان (1960)، الہ

دین کا چیتا (1960)، خان بہادر (1960)، خیبر میل (1969)، سلطنت (1960)، پہاڑن (1962)، زرینہ (1962)، تیر انداز (1963)، جانباز (1966)، عشق دیوانہ (1971)، سلطانہ ڈاکو (1975)۔

بابا جی اے چشتی بہت تیز ذہن کے مالک تھے۔ باجے کی ریڈ پر منٹوں میں دھنیں بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ (یاد رہے کہ اس دور میں باجے کی ڈبی لکڑی کی باریک پرت سے بنی تھی اس لیے انگلی سے ضرب پڑتے ہی تیز آواز ابھرتی تھی) مرحومہ منور سلطانہ کے بقول "فلم لارے کے 8 نغمے انہوں نے ایک ہی دن میں ریکارڈ کروا دیے تھے۔"

ان کی اس تیز رفتاری کی وجہ سے کچھ لوگ انہیں گیت ڈھالنے کی مشین کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ پنجابی فلموں کے اجارہ دار موسیقار ہونے کے باوجود وہ عوام میں بہت مقبول تھے۔

نغمہ نگار خواجہ پرویز کہتے ہیں۔ "پنجابی فلم "زیلدار" (1972)، کے ایک گیت نے جو رونا لیلیٰ کی آواز میں تھا "دوویں اک دوجے کولوں دور ہو گئے" اس گیت نے اتنی پذیرائی حاصل کی کہ اس کے ایک لاکھ گراموفون ریکارڈز فروخت ہوئے جو بجائے خود ایک ریکارڈ ہے۔"

یہ گیت خواجہ پرویز ہی کا تحریر کردہ تھا۔ بابا جی کی موسیقی میں ترتیب دیے ہوئے گیتوں کی عوام میں اس قدر مقبولیت کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ بابا جی کی لوک موسیقی پر گہری نظر تھی۔ انہوں نے اپنے گیتوں میں لوک اسلوب کو خوب صورتی سے استعمال کیا۔ ان کا ایک مقبول ترین گیت جو فلم "چن مکھناں" (1968) کے لیے ریکارڈ ہوا "چن میرے مکھناں" دراصل اپنے وقت کے معروف لوک گیت "چھلے دی چھا" کی طرز پر ہے۔ یہ گیت خود بابا جی کی آواز میں تھا۔

بابا جی اے چشتی کی اپنے وقت کے مہان گلوکار سہگل سے اچھی خاصی دوستی تھی لیکن دو کلکتے میں رہنے کے باوجود سہگل کی آواز کو استعمال نہ کر سکے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ سہگل نیو تھیٹرز کی ملازمت میں تھے اور صرف اسی کمپنی کے موسیقاروں کی طرزوں میں ہی گا سکتے تھے۔ اگر ایسا ہو جاتا یعنی بابا جی سہگل سے گوا سکتے تو یقیناً ایک ہی علاقے (جالندھر) کے رہنے والے دو فنکار کوئی انمول گیت تخلیق کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔

پاکستان کے معروف نغمہ نگار احمد راہی سے بابا جی اے چشتی کے بہت قریبی تعلقات تھے۔ اس کی وجہ اس قربت کا ہونا تھا جو برسوں تک ان کے شاعر اور موسیقار کے تعلق کی وجہ سے رہی۔

وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ دن کے بعد رات آتی ہے۔ بہار کے بعد خزاں سے سابقہ پڑتا ہے۔ انسانی زندگیوں میں بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ عمر کے پچھلے پہر جوانی کی جولانی اور جوش و جذبہ باقی نہیں رہتا۔ بابا جی اے چشتی بھی بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ بدلتے گئے۔ انہیں الزائمر نامی مرض نے گھیر لیا تھا جسے نسیان بھی کہا جاتا ہے، یہاں تک کہ اپنے ماضی کے بارے میں بہت سی باتیں بھول گئے۔ حتیٰ کہ انہیں اپنی اردو فلموں میں "الفت جگر" کے علاوہ کوئی نام یاد نہ رہا۔ کبھی انہیں اپنے کبوتر والے گیت پر بہت ناز تھا۔ "واسطہ ای رب دا توں جاویں وے کبوترا" اس کی یاد بھی نہ رہی۔ آخری دور میں وہ کبھی ریڈیو پاکستان لاہور اور کبھی EMI کے دفتر میں جو مال روڈ لاہور پر واقع شاہ دین بلڈنگ میں تھا نظر آجاتے تھے۔ بڑی خاموشی سے بیٹھے رہتے تھے۔ لوگوں کے سلام کا جواب بڑی شفقت سے دیتے تھے۔ سفید براق قمیص اور کھلے پائنچے کے پاجامے میں ملبوس ہوتے تھے۔ یہ ان کی ہمت تھی کہ جب تک ان کے دل و دماغ نے ان کا ساتھ دیا، اپنے بڑھاپے کے باوجود انہوں نے کام جاری رکھا اور بہت سے غیر فلمی گیتوں کی موسیقی کی دھنیں کمپوز کیں مگر جب ان کے اعصاب ان کے قابو میں نہیں رہے تو بے بس ہو گئے۔

بابا جی پر ایک الزام یہ ہے کہ انہوں نے بھارتی فلموں کے کچھ گیت من و عن نقل کیے ہیں۔ اس بارے میں بابا جی نے 1985ء میں دیے گئے اپنے ایک انٹرویو میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں! میرے فن کے ماتھے پر یہ تین چار گانے بدنما دھبے ہیں جو میں نے فلم "سسی" اور فلم "نوکر" کے فلمسازوں کے مجبور کرنے پر بنائے۔"

بابا جی اے چشتی ان چوری کے گیتوں کے ذکر پر اکثر رنجیدہ ہو جاتے تھے مگر اپنی تسلی کی خاطر کہتے۔ "ارے یار! میں نے ہیمنت کمار اور ایس ڈی برمن سے اس کی اجازت لے لی تھی۔"

ایسا ہوا ہو یا نہیں۔ اس بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایس ڈی برمن سے بابا جی کے بہت اچھے تعلقات تھے۔

"مسی" اور "نوکر" کے چند چیدہ گیتوں کے علاوہ بابا چشتی کے فن پر انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی۔ وہ ایک زرخیز اور تخلیقی ذہن کے مالک تھے اس لیے طویل عرصے تک اور جتنی دھنیں کمپوز کرتے رہے۔ جب ان کی جوانی کا دور تھا۔ دل و دماغ بھرپور طور پر کام کرتے تھے تو انہوں نے بے شمار مقبول عام گانے تخلیق کیے اور پاکستانی فلمی صنعت کا دامن اپنے مدھر گیتوں سے بھر دیا۔ بابا جی اے چشتی کی فنی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ پاکستان فلم انڈسٹری کے اولین معماروں میں شامل تھے۔ پھیرے (1949) اور سلطانہ ڈاکو (1975) کے درمیان 26 برسوں میں بطور موسیقار جو کام کیا ہے وہ کوئی اور نہ کرسکا۔ انہوں نے گلوکاری بھی کی اور نغمہ نگاری بھی۔ ان کی یہ ساری باتیں پاکستانی فلمی صنعت کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھی جائیں گی۔ برصغیر کا یہ انمول سپوت 25 دسمبر 1994ء کو اپنی کبھی فراموش نہ کرنے والی یادیں چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوگیا۔

انہوں نے بہت کوشش کی تھی کہ کسی طرح اپنے دو بیٹوں تسکین چشتی اور امین چشتی کو فلمی دنیا میں کامیاب کرا دیں مگر وہ دونوں ناکام ثابت ہوئے۔

☆—☆

اللہ کی نعمتوں میں ایک خاص نعمت جو اس نے ہم انسانوں کو عطا کی ہے۔ جسے ہم اس کا انعام عظیم بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ سریلی، میٹھی اور مدھر آواز ہے جو کسی کسی کو ہی عطا ہوتی ہے۔ ایسی آواز جو کانوں کے راستے دل میں اتر جاتی ہے، جو ہوا کے دوش پر لہراتی ہے تو فضا میں مستی سی چھا جاتی ہے۔ ہر شے جھومنے لگتی ہے۔ رقص کرنے لگتی ہے۔ آج اس نشست میں، میں ایک ایسی ہی سریلی اور مدھ بھری آواز کی گلوکارہ کی بات اور ان کی کہانی سناؤں گا جو آج ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن جسے اس بات کا اعزاز حاصل ہے کہ اس نے پاکستانی فلموں اور فلمی صنعت کو اس کے ابتدائی دنوں میں اس کی ترقی و ترویج کے لیے اس کے اولین معمار کی حیثیت سے عظیم فنی خدمات انجام دی ہیں۔ پاکستانی فلموں کو اپنی سریلی آواز سے سجایا بنایا اور کامیاب کرایا ہے اور پاکستان فلم انڈسٹری کو ترقی و ترویج کی راہ پر گامزن کیا ہے۔

ایسے گیت جو آج بھی روز اول کی طرح مقبول ہیں اور اب بھی سنائی دیتے ہیں تو فضا جھوم اٹھتی ہے۔

☆ آئے موسم رنگیلے سہانے
جیا نہیں مانے تو چھٹی لے کے آجا بالما

☆ گھونگھٹ اٹھاؤں کہ گھونگھٹ نکالوں
سیاں جی کا کہنا میں مانوں کہ ٹالوں
☆ بن کے دلہن اٹھلاؤں گی
گھونگھٹ میں شرماؤں گی
☆ گاڑی کو چلانا بابو
ذرا ہلکے ہلکے ہلکے
کہیں دل کا جام نہ چھلکے

کون ہے جو آج بھی ان گیتوں کو سن کر جھومنے پر مجبور نہیں ہو جاتا۔ سرشار اور مخمور نہیں ہو جاتا۔ یہ اور ایسے ہی بے شمار گیت ہیں جو اس جادو بھری آواز کی جادوگر گلوکارہ کی جادو گری سے متاثر نہیں ہوتا؟ آواز کا جادو جگانے والی یہ جادو گرنی زبیدہ خانم تھی مگر کیا "تھی" کہنا اس کے لیے مناسب ہوگا؟ کیونکہ وہ آج بھی ہمارے درمیان گیتوں کی شکل میں موجود ہے اور اپنے امر سنگیت کے حوالے سے ہمیشہ موجود رہے گی۔ سماعتوں میں شہد ٹپکاتی رہے گی۔ سر سنگیت کے رسیا کے دلوں میں زندہ رہے گی۔

☆—☆

زبیدہ خانم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ پاکستان کی فلمی صنعت میں متعارف ہونے والی پہلی مقبول خاتون سنگر ہیں کیونکہ ان سے پہلے ملکہ ترنم نور جہاں، اقبال بانو اور منور سلطانہ وغیرہ قیام پاکستان سے پہلے متحدہ ہندوستان کی فلموں میں بھی گا چکی تھیں۔

زبیدہ خانم بھارتی پنجاب کے شہر امرتسر میں 1935ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد خواجہ عبدالغفار پیشے کے اعتبار سے پینٹر تھے۔ انہیں گانے کا بھی شوق تھا اور وہ بہت اچھا گاتے بھی تھے۔ زبیدہ خانم ابھی صرف پانچ برس کی تھیں کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ باپ کے مرنے کے بعد ان کی زیادہ تر کفالت ان کی نانی نے کی۔ قیام پاکستان کے بعد زبیدہ خانم اپنے خاندان کے ساتھ امرتسر سے لاہور آ گئیں اور گوالمنڈی کے علاقے میں رہائش اختیار کی۔ زبیدہ خانم کو سریلی آواز اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی۔ وہ اکثر اپنی سہیلیوں کے ساتھ شادی بیاہ کی تقریبات میں ڈھولک پر گایا کرتی تھیں۔ فن گلوکاری ان کی خاندانی روایات کا حصہ نہیں تھا لیکن انہیں اوائل عمری سے ہی پلے بیک سنگر بننے کا شوق تھا۔

گائیکی میں جداگانہ اسلوب رکھنے والی زبیدہ خانم نے 1950ء میں ریڈیو پاکستان لاہور سے اپنے فنی سفر کا

آغاز کیا۔ سب سے پہلے ریڈیو اسٹیشن لاہور کے معروف کمپوزر عبدالحق قریشی نے زبیدہ خانم سے ریڈیو کے لیے پنجاب کا لوک گیت گوایا جسے انہوں نے بہت اچھے انداز میں گایا اور اس گیت کو پسند بھی کیا گیا۔ اس لوک پنجابی گیت کی بنیاد پر انہیں پنجابی فلموں میں گانے کا موقع ملا۔ یوں زبیدہ خانم کا فلمی سفر 1951ء میں شروع ہوا جب انہیں فلم ''بلو'' میں گانے کا موقع ملا لیکن زبیدہ خانم کی اصل شہرت کا آغاز 13 جون 1953ء عیدالفطر کے موقع پر نمائش پذیر ہونے والی پنجابی فلم ''شہری بابو'' سے ہوا جس میں زبیدہ خانم نے طفیل ہوشیار پوری کے لکھے گیت ''راتاں ہنیریاں بنا کے ربا نہریاں'' کو اپنی پرسوز آواز میں رشید عطرے کی موسیقی میں اس قدر ڈوب کر گایا کہ دھوم مچ گئی۔ اس فلم ''شہری بابو'' میں کل نو گیت تھے۔ جن میں سے آٹھ زبیدہ خانم سے گوائے گئے۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس وقت زبیدہ خانم کی عمر صرف 17 برس تھی۔

کچھ فلمی محققوں کا کہنا ہے کہ بطور گلوکارہ زبیدہ خانم کی پہلی فلم ''شہری بابو'' تھی مگر یہ درست نہیں۔ ان کے فلمی گانے کی ابتدا فلم ''بلو'' سے ہی ہوئی تھی۔ وہ ''بلو'' کے کورس گانے میں شریک تھیں۔

''شہری بابو'' میں مرکزی رومانوی کردار سنتوش کمار اور سورن لتا نے ادا کیا تھا جب کہ نذیر صاحب اس کے ہدایت کار تھے۔ ''شہری بابو'' کو اگر زبیدہ خانم کی پہلی پنجابی فلم کہا جاتا ہے تو ان کی پہلی اردو فلم ''خاتون'' تھی جو 25 مارچ 1955ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کے موسیقار رشید عطرے اور ہدایت کار نذیر تھے۔ اس فلم کے حوالے سے خاص بات یہ تھی کہ اس کے دس گانے زبیدہ خانم کی آواز میں ریکارڈ کیے گئے تھے۔

1955ء ہی میں زبیدہ خانم کو ایک اور کامیاب پنجابی فلم ''پتن'' میں گانے کا موقع ملا۔ ''پتن'' میں ان کا گایا ہوا گیت ''چھڈ جاویں نہ چناں باہیں پھڑ کے'' بے حد مقبول ہوا جب کہ ان کی اگلی فلم ''ہیر'' کے سدا بہار گیت ''اساں جان کے میٹ لئی رکھ دے سانوں دل تک جہاں'' کی مقبولیت سے زبیدہ خانم کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔

زبیدہ خانم خوش الحان ہونے کے ساتھ ساتھ خوش شکل اور جاذب نظر بھی تھیں۔ لہٰذا ان کو اداکاری کی بھی پیشکش ہوئی جسے انہوں نے قبول کرتے ہوئے اداکاری کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔ زبیدہ خانم نے پہلی بار ہدایت کار ایم اے رشید کی فلم ''پاٹے خان'' میں اداکار ظریف کی محبوبہ کا رول ادا کیا۔ اس کے بعد کچھ اور فلموں میں بھی بطور اداکارہ پرفارم کیا جن میں ''ولا بھنی'' اور ''سوتن'' قابل ذکر ہیں۔

''پاٹے خان'' میں نور جہاں اور اسلم پرویز مرکزی کرداروں میں پیش ہوئے تھے جب کہ زبیدہ خانم سیکنڈ ہیروئن کے طور پر ظریف کی ہیروئن بنی تھیں۔ زبیدہ خانم کی اداکاری کو پسند کیا گیا تھا۔ اسی طرح صبیحہ اور سدھیر کی مشہور فلم ''ولا بھنی'' میں زبیدہ خانم نے صبیحہ خانم کی سہیلی کا کردار بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا تھا۔ انہوں نے ''پتن'' اور ''حمیدہ'' میں بھی ثانوی کردار ادا کیے تھے۔ گلوکاری ان کی پہلی اور آخری ترجیح تھی جب کہ اداکاری انہوں نے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے کہنے پر کی تھی۔ انہوں نے اداکاری سے کنارہ کشی کے بعد اپنے کچھ انٹرویوز میں کہا تھا۔

زندگی نامہ

نام: زبیدہ خانم

پیدائش: 1935ء

جائے پیدائش: امرتسر (بھارتی پنجاب)

والد: خواجہ عبدالغفار۔ پیشے کے اعتبار سے پینٹر تھے مگر یہ اچھا گلوکار بھی تھے۔

کمسنی میں سانحہ: پانچ سال کی عمر تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا جس کے بعد ان کی زیادہ تر کفالت ان کی نانی نے کی۔

پاکستان آمد: قیام پاکستان کے بعد خاندان کے ساتھ امرتسر سے لاہور آگئیں اور گوالمنڈی میں رہائش اختیار کی۔

گلوکاری: گلوکاری کا شوق ابتدا ہی سے تھا۔ اوائل عمری سے ہی پلے بیک سنگر بننا چاہتی تھیں۔ 1950ء سے باضابطہ گلوکاری کا سفر ریڈیو لاہور سے کیا۔ 1951ء میں ایک پنجابی فلم بلو میں گانے کا موقع ملا، جب کہ شہرت پنجابی فلم ''شہری بابو'' سے حاصل ہوئی جو 1953ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

آخری فلم: ''جواب دو'' جو 1974ء میں بہت تاخیر سے نمائش پذیر ہوئی۔ یہ طویل عرصے سے رکی ہوئی فلم ان کے بیٹے جعفر شاہ بخاری کی تھی۔

"میں سمجھتی ہوں کہ مجھ سے کہیں اچھی اداکارائیں موجود ہیں اس لیے مجھے اس شعبے سے زیادہ اپنی گلوکاری پر توجہ دینا چاہیے۔ کیونکہ میری گائیکی کو سب پسند کرتے ہیں لہٰذا اسی میدان میں مجھے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا چاہیے مجھے آج جو عزت اور شہرت حاصل ہے میرے گانوں اور گیتوں کی وجہ سے ہے۔"

زبیدہ خانم ایک حقیقت پسند خاتون تھیں۔ وہ چاہتیں تو مسرت نذیر کی طرح گلوکاری کے ساتھ ساتھ اداکاری بھی جاری رکھ سکتی تھیں لیکن مسرت نذیر میں چونکہ اداکارانہ صلاحیتیں زیادہ تھیں اس لیے ان کی گلوکاری، ان کی اداکاری کے پس منظر میں گم ہو گئی۔ زبیدہ خانم کو سرسنگیت سے زیادہ پیار تھا اس لیے انہوں نے سلور اسکرین پر اپنے جلوے بکھیرنے کو اہمیت نہیں دی اور اپنی ساری کی صلاحیتیں اپنی گائیکی پر مرکوز رکھی۔

زبیدہ خانم کا لب و لہجہ نہایت صاف و شفاف اور شگفتگی کا مرقع تھا۔ ان کی آواز اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کے گیتوں کے لیے یکساں طور پر موزوں تھی۔ انہوں نے اپنے دور کے تقریباً سبھی نغمہ نگاروں کے تحریر کردہ گیتوں میں اپنی آواز کی رنگ آمیزی کی۔

☆ میٹھی میٹھی بتیوں سے جیا نہ جلا۔ جا رے بلم تجھے دیکھ لیا (بول: نعیم ہاشمی۔ فلم: راز)

☆ آگے سے نہ کھیلے بابو۔ دل جل جائے گا (بول: فیاض ہاشمی۔ فلم: رات کے راہی)

☆ سیو نی میرا دل دھڑکے۔ نال اکھ پھڑکے (بول: اقبال حسین۔ فلم: شیخ چلی)

☆ ولا گھیر جا یار دا نظارہ لین دے (بول: وارث لدھیانوی۔ فلم: یکے والی)

☆ میرے انکھوں کا نذرانہ دل ہاتھ لایا ہے (بول: قتیل شفائی۔ فلم: حمیدہ)

☆ بول تیرے ساغر میں کیا ہے۔ او مستوالے پینے والے (بول: سیف الدین سیف۔ فلم: انتقام)

☆ میں وہ افسانہ ہوں جس کا آغاز تو ہے۔ انجام نہیں (بول: تنویر نقوی۔ فلم: شمع)

☆ چمن و چھڑ گیا دل اجڑ گیا (بول: سکید احمد۔ فلم: آبرو)

☆ ہائے میں دل لا کے پچھتائی (بول: استاد دامن۔ فلم: جان بہار)

☆ سوچ سمجھ کر دل دینا۔ یونہی پیار نہ کر لینا (بول: حمید جالب۔ فلم: مسکراہٹ)

☆ نہ مڈ لیے نہ دیکھیں ماہی تڑ گیا۔ میرے یار (بول: ولی صاحب۔ فلم: جگنی)

1960ء میں ہدایت کار اقبال یوسف کی پہلی فلم "رات کے راہی" ریلیز ہوئی تھی جس کا یہ شہرۂ آفاق نغمہ زبیدہ خانم نے گایا تھا۔

کیا ہوا دل پہ ستم تم نہ سمجھو گے بلم
بے وفا میں تھیں ہم اس محبت کی قسم
تم ہمارے ہو کیا بھلے دل تمہیں دے ہی چکے
تم پہ مرنے کے لیے اب تو ہی لیں گے جنم

موسیقار اے حمید کی موسیقی میں اس فلم کے تمام گیت زبیدہ خانم کی دلکش آواز میں ریکارڈ کیے گئے تھے۔ "رات کے راہی" کے ستاروں میں ریحانہ، ورپن، شمیم آرا، لہری، ساقی، آزاد، ایم اسمٰعیل، زلو اور طالش نمایاں تھے۔ زبیدہ خانم کے ساتھ اس فلم کے ساتھی سنگرز میں احمد رشدی، سلیم رضا، ایس بی جون بھی شامل تھے۔

"رات کے راہی" اس لحاظ سے یادگار ثابت ہوئی کہ گلوکارہ زبیدہ خانم اور اس فلم کے عکاس سید ریاض بخاری ازدواجی بندھن میں بندھ گئے۔ اس کے بعد بتدریج زبیدہ خانم کی گلوکاری پر گھر گرہستی غالب آتی گئی اور ان کی فلموں کی تعداد کم ہونے لگی جب کہ ریاض بخاری کے کام میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ ایک ماہر عکاس کی صورت میں اپنے آخری دور تک مصروف رہے جب کہ انہوں نے فلم ساز و ہدایت کار کی حیثیت سے فلمیں بھی بنائیں۔ دریں اثناء انہوں نے زبیدہ خانم کے ساتھ سنتوش صبیحہ، نذیر سورن لتا، ملک سید میر، محمد علی زیبا، شمیم روبن گھوش اور درپن نیر سلطانہ کی طرح فلمی دنیا کی کامیاب فلمی جوڑی کی حیثیت سے طویل اور قابل رشک زندگی بسر کی۔

سید ریاض بخاری نے اپنی دو فلموں کے بائیکل پر بطور پروڈیوسر اپنی بیگم زبیدہ خانم کا نام دیا تھا۔ یہ فلمیں تھیں۔ "محبت زندگی ہے" اور "پھول میرے گلشن کا" ان کے آنگن میں بھی چار پھول کھلے۔ دو صاحبزادیاں اور دو بیٹے فرزند ایاز اور فیصل۔ عجیب اتفاق ہے کہ ان کے بیٹوں کے ناموں کے ہم نام محمود و بیرو بھی اداکاری فلم انڈسٹری میں آ گئے۔

شادی کے بعد ریاض بخاری کے ہاں سید ایاز بخاری کی پیدائش ہوئی تو انہوں نے ایاز فلم کارپوریشن کے بینر تلے

فلم ''قتل کے بعد'' پروڈیوس کی جو 1963ء میں ریلیز ہوئی۔ ان کے دوسرے صاحبزادے سید فیصل بخاری اپنے والد کی طرح نہ صرف بہترین عکاس ہیں بلکہ متعدد فلمیں بھی بطور ہدایت کار بنا چکے ہیں جن میں ''تو پیاسا تو پرابلم'' سلطنت، یلانٹلو، اور بھائی لوگ شامل ہیں۔

ریاض بخاری سے قبل ان کے بڑے بھائی جعفر شاہ بخاری نے اپنی اعلیٰ کارکردگی کی بدولت بحیثیت عکاس نمایاں مقام حاصل کیا تھا۔ 1957ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''انجام'' جعفر شاہ بخاری کی اوّلین ذاتی فلم تھی جس کی ڈائریکشن انہوں نے خود دی تھی اور معاونت کے لیے اپنے چھوٹے بھائی ریاض بخاری کو چانس دیا تھا۔ پھر جعفر بخاری کی اگلی فلم ''بھروسا'' 1958ء کے لیے بھی ریاض بخاری نے موؤی کیمرا آپریٹ کیا۔ اسی سال ہدایت کار رفیق رضوی کی فلم ''واہ رے زمانے'' کی عکاسی بھی ریاض بخاری کے سپرد تھی۔ یوں ریاض بخاری کا کیریئر رواں ہو گیا۔ 1959ء میں انہوں نے اپنے بھائی کی فلم ''فیصلہ'' کے علاوہ صبیحہ خانم کی ذاتی پروڈکشن ''ناگن'' ملک محبوب احمد کی فلم ''فنکار'' ہدایت کار ایم جے رانا کی فلم ''شیرا'' اور رفیق رضوی کی دو فلموں ''سویرا'' اور ''اپنا پرایا'' کی عکس بندی کے فرائض انجام دیے۔

1960ء میں سید ریاض بخاری نے فلم سازی کے میدان میں قدم رکھا اور اپنی پہلی پروڈکشن ''دو استاد'' کی ہدایت کاری کے لیے رفیق رضوی کی خدمات حاصل کیں۔ یہ فلم آر زیڈ پکچرز کے بینر تلے بنی تھی۔ آر سے ریاض اور زیڈ سے زبیدہ کا نام اخذ کیا جا سکتا ہے۔ 1960ء میں ''رات کے راہی'' نے کامیابی حاصل کی جس میں بطور عکاس ریاض بخاری کا کام اور زبیدہ خانم کے گائے ہوئے نغمات پسند کیے گئے۔ 1961ء میں بھی انہوں نے دو فلموں ''تم نہ مانو'' اور ''زمانہ کیا کہے گا'' کی عکاسی کی۔ اقبال یوسف کی فلم ''زمانہ کیا کہے گا'' کی بہترین عکاسی پر، ریاض بخاری نے اپنا پہلا نگار ایوارڈ بھی حاصل کیا۔

زبیدہ خانم سے شادی کے بعد ریاض بخاری کا ڈھاکا جانا ہوا۔ وہاں کے ہدایت کار فضل حق نے اپنی بنگالی فلم ''اذان'' کی فوٹوگرافی کے لیے ریاض بخاری کو دعوت دی تھی۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مذکورہ بنگالی فلم میں زبیدہ خانم نے بھی گلوکاری کی تھی یہ زبیدہ خانم کی واحد بنگالی فلم تھی۔

بات دراصل یہ تھی کہ زبیدہ خانم کی رسیلی اور سماعت کے ذریعے دلوں میں اتر جانے والی آواز کی وجہ سے ہر فلم ساز، ہر ہدایت کار اور ہر موسیقار چاہتا تھا کہ اس کی فلم میں بھی یہ بلبل چہکے اور اس کی فلم کی عوامی پذیرائی زیادہ سے زیادہ ہو۔ بنگالی ہدایت کار فضل حق نے بھی زبیدہ خانم کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا اور ان سے اپنی فلم ''اذان'' کے چند گیت گوائے۔ لاہور اور کراچی کے بھی موسیقاروں کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ بھی اپنی فلموں کو زبیدہ خانم کی مدھر گیتوں سے سجائیں۔ کامیاب بنائیں۔ اس سلسلے میں موسیقار ماشاد، نثار بزمی، کمال رضا، ایم اشرف، روبن گھوش اور خلیل احمد ایسے موسیقار ہیں جنہیں زبیدہ خانم کی جادو بھری آواز سے اپنی فلموں کو سجانے کا موقع نہیں ملا۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ زبیدہ خانم کی فلمی دنیا سے کنارہ کشی کے بعد یہ موسیقار منظر عام پر آئے تھے۔ جن خوش نصیبوں کو اس فلمی آواز سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ ان میں سے چند موسیقار کے نام یہ ہیں۔

☆ گاڑی کو چلانا بابو ذرا ہلکے ہلکے (موسیقی: حسن لطیف۔ فلم: انوکھی)

☆ مسکرائے ہوا گنگنائے فضا۔ گیت گانے کے دن آ گئے (موسیقی: ماسٹر عنایت حسین۔ فلم: معصوم)

☆ میرا دل چناں کچ دا کھڈونا (موسیقی: رشید عطرے۔ فلم: مکھڑا)

☆ گوری گوری چاندنی دی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاں (موسیقی: سلیم اقبال۔ فلم: کرتار سنگھ)

☆ بن کے دلہن لہراؤں گی۔ گھونگھٹ میں شرماؤں گی (موسیقی: صفدر حسین۔ فلم: حمیدہ)

☆ دل جلانے والے آنکھیں اٹھا کے نظریں ملا لے (موسیقی: خواجہ خورشید انور۔ فلم: کوئل)

☆ روتے ہیں چھم چھم نین۔ اجڑ گیا چمن ہو رے... دیکھ لیا تیرا پیار (موسیقی: فیروز نظامی۔ فلم: سولہ آنے)

☆ رات چاندنی میں اکیلی (خواجہ خورشید انور نے بیک وقت خوشی اور غم کی کیفیت میں فلم زہر عشق کے لیے زبیدہ خانم سے یہ گیت گوایا)

ریاض بخاری نے اپنے پہلے فرزند عمایاز کی ولادت کے بعد ایاز فلم کارپوریشن کے بینر تلے فلم ''قتل کے بعد'' پروڈیوس کی تھی جو 1963ء میں ریلیز ہوئی۔ اپنی اس فلم کے علاوہ ریاض بخاری نے 1963ء میں ریلیز شدہ دیگر

فلموں میں ماں کے آنسو، شرارت اور ظلم کی عکاسی کے فرائض انجام دیئے۔ اسی طرح 1964ء میں نیلے پہ دہلا، پانی، بھرجائی اور شیر دی بچی کی عکس بندی کی، پھر ریاض بخاری نے بطور فلم ساز فلم "مجاہد" پیش کی جس کی ہدایت کاری کے لیے انہوں نے جمیل اختر کی خدمات حاصل کیں۔ اس فلم کے ستاروں میں محمد علی، دیبا، صابرہ سلطانہ، سدھیر، بیبا شوری، البیلا، فریدہ، ایمی مینوالا، ادیب اور اسلم پرویز شامل تھے۔ 1967ء میں خلیل قیصر کی فلم حکومت اور ماں باپ کے علاوہ خالد خورشید کی پہلی فلم "شعلہ اور شبنم" کی بھی عکاسی کی۔ اسی طرح 1968ء میں سنگدل، کتاری، میری دوستی میرا پیار، دل دیا درد لیا، میں زندہ ہوں اور جن چودھویں دا نامی فلمیں ریاض بخاری کی عکاسی سے آراستہ ہوئیں۔

1969ء ریاض بخاری کی فلمی زندگی کا اہم سال تھا جس میں بطور عکاس ان کی پہلی رنگین فلم "تم ہی ہو محبوب میرے" منظر عام پر آئی اور پھر اسی سال ریاض بخاری ہدایت کار بھی بن گئے۔ ان کو ادارہ پکچرز کے شیخ عبدالرشید نے اپنی دو فلموں کی ڈائریکشن کی ذمہ داری سونپی۔ پہلی فلم پنجابی زبان میں "دلبر جانی" کے نام سے بنی اور دوسری فلم اردو زبان میں "زندگی کتنی حسین ہے" کے نام سے بنائی گئی۔ اس فلم کے گیت کافی پاپولر ہوئے۔ خاص کر

جب کوئی پیار سے بلائے گا
تم کو ایک شخص یاد آئے گا

بہت مقبول ہوا۔ 1969ء میں ریاض بخاری کی بطور عکاس فلموں میں فسانہ دل، وردہ، آسرا، نازنین، سلطان، چودھواں، تیرے عشق نچایا کے نام شامل ہیں۔ ریاض بخاری نے بطور فلم ساز یا پارٹنر شپ کے تحت یہ فلمیں بھی پروڈیوس کیں۔ گرہستی، پھول میرے گلشن کا، جب جب پھول کھلے، اپنے ہوئے پرائے، پھول اور شعلے، محبت زندگی ہے، ایک دو جے کے لیے اور دل سے نہ بھلانا۔

سید ریاض بخاری نے مجموعی طور پر تقریباً 100 فلموں کی عکاسی کے فرائض انجام دیئے۔ انہیں بہترین عکاس کی حیثیت سے دوسرا نگار ایوارڈ 1980ء کی ڈائمنڈ جوبلی ہٹ فلم "قربانی" میں تفویض کیا گیا۔ ان کی بطور عکاس آخری فلم "پھول" 1994ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

عام طور پر بہت سے شریف لوگ فلم والوں کو معاشرے کے اچھے افراد گننے میں پس و پیش سے کام لیتے ہیں۔ اگرچہ فلم والوں میں بھی اچھے، نیک، پڑھے لکھے اور دیندار ہوتے ہیں۔ روزے نماز کے پابند ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ خیرات دل کھول کر دیتے ہیں۔ عمرے اور حج کی سعادت بھی حاصل کرتے ہیں۔ ریاض بخاری نے بھی اپنی مغفور بیوی زبیدہ خانم کے ساتھ عمرے کی سعادت حاصل کی بلکہ بخاری

زبیدہ خانم کے گیت

گیتوں کی تعداد: محتاط اندازے کے مطابق 480۔ جن میں بے شمار سپرہٹ گیت شامل ہیں۔ اردو اور پنجابی زبانوں کے علاوہ ایک بنگالی فلم "اذان" کے بھی کچھ گیت گائے۔

شادی خانہ آبادی: اقبال یوسف کی فلم "رات کے راہی" کی تکمیل کے دوران نامور عکاس سید ریاض بخاری کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئیں۔ انہوں نے "رات کے راہی" کے لیے سپرہٹ گانے گائے تھے جب کہ ریاض بخاری اس فلم کے کیمرامین تھے۔

اولاد: دو صاحبزادیاں اور دو ہی بیٹے سید ایاز بخاری اور سید فیصل بخاری۔ فیصل بخاری والد کی طرح بہترین عکاس اور ہدایت کار ہیں۔

شادی کے بعد: شادی کے بعد جو ان کی گائیکی کے عروج کا زمانہ تھا۔ انہوں نے بتدریج گلوکاری سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنے آپ کو گھر گرہستی تک محدود کر دیا۔

زبیدہ خانم کے ٹاپ 10 اردو گیت

☆ آئے موسم رنگیلے سہانے، جیا نہیں مانے، تو چھٹی لے کے آجا بالما ☆ گھونگھٹ اٹھالوں کہ گھونگھٹ نکالوں۔ سیاں جی کا کہنا میں مانوں کہ ٹالوں ☆ ان کو چھن کر رانی بن کر، جانا ہے سسرال، تو لے لو چوڑیاں ☆ گاڑی کو چلانا بابو ذرا ہلکے ہلکے ہلکے، کہیں دل کا جام نہ چھلکے ☆ بن کے دلہن لہراؤں گی، گھونگھٹ میں شرماؤں گی ☆ دل جلانا دل والے، آنکھیں اٹھا کے نظریں ملا لے ☆ میٹھی میٹھی بتیوں سے جیا نہ جلا، چارہ گر تجھے دیکھ لیا ☆ میرا نشانہ دیکھے زمانہ، بچ کے نہ کوئی جائے ☆ تیری الفت میں صنم دل نے بہت درد سہے، اور ہم چپ ہی رہے ☆ جیون کے سفر میں راہی، ملتے ہیں بچھڑ جانے کو۔

صاحب کو تو اللہ رب العزت نے یہ سعادت بھی نصیب کی کہ انہوں نے 1971ء میں حج اکبر کی سعادت حاصل کی۔ اس سال محمد علی زیبا، شباب کیرانوی، آغا جی اے گل، اداکارہ زینت، موسیقار نثار بزمی اور فلم ساز چوہدری ثناء اللہ بھی حج اکبر سے مشرف یاب ہوئے۔ ریاض بخاری اور زبیدہ خانم نے تو خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ عمرے کی ادائیگی کی تو بڑھاپے کی وجہ سے کرسی پر بیٹھ کر یہ سعادت ایک بار پھر حاصل کی۔

زبیدہ خانم ابتداء ہی سے بڑی صاف ستھری طبیعت کی خاتون تھیں۔ اپنے عروج کے دور میں بھی انہوں نے فحش فلموں اور گانوں کو اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا۔ گھر گرہستی کو بھی اہمیت دی اپنی گائیکی کے دوران متعدد نعتیں بھی ریکارڈ کرائیں جو بہت مقبول ہوئیں۔

☆ جو نہ ہوتا تیرا جمال، تو جہاں تھا خواب و خیال۔ صلو علیہ وآلہ (فلم: ایاز)

☆ کملی والے کے سوا بس تیرا آسرا (فلم: گمراہ)

☆ سن عرض مری کملی والے۔ کوئی کیا سمجھے کوئی کیا جانے (فلم: زہر عشق)

☆ گردش میں اپنا ستارہ ہے۔ سرکار مدینے والے (فلم: حاتم)

اس دور کی ہماری ٹاپ کی اداکارائیں اس بات کا اظہار کر چکی ہیں کہ زبیدہ خانم کے گیتوں نے ہماری پرفارمنس کو امر کر دیا۔ ایسے کچھ گیت نمونے کے طور پر پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

☆ آئے موسم رنگیلے سہانے۔ جیا نہیں مانے۔ تو چھٹی لے کے آجا بالما (نیلو پر پکچرائز ہونے والا یہ گیت فلم سات لاکھ کا ہے)

☆ جیا گائے تارا را را رم۔ گوری ناچے چھم چھم چھم (ناصرہ پر فلمبند ہوا۔ فلم: ایک دل دو دیوانے)

☆ میرے نصیب میں تیرے ہی ہو یا پیار میرا۔ نظر ملا کے کوئی لے گیا قرار میرا (پکچرائز ہوا نیلی پر فلم چھومنتر)

☆ اے بادلوں کے راہی کس کا پیام لایا۔ کہتی ہے دل کی دھڑکن ان کا سلام آیا (شمیم آرا پر پکچرائز ہوا فلم: رات کے راہی)

☆ گھونگھٹ اٹھالوں کہ گھونگھٹ نکالوں۔ سیاں جی کا کہنا میں مانوں کہ ٹالوں (صبیحہ خانم پر فلمبند ہوا۔ فلم: سات لاکھ)

☆ اساں جان کے میٹ لئی اکھ وے (سورن لتا پر پکچرائز ہوا۔ فلم: ہیر)

☆ تیری الفت میں صنم دل نے بہت درد سہے، اور ہم چپ ہی رہے (جیا شوری پر فلمبند ہوا۔ فلم: سرفروش)

☆ جیون کے سفر میں راہی۔ ملتے ہیں، بچھڑ جانے کو (شیلا رامانی پر پکچرائز ہوا۔ فلم: انوکھی)

☆ بالم تم ہار گئے جیتا میرا پیار ہو۔ مانو نہ مانو پیار ہو ہی گیا پیار ہو (مسرت نذیر پر فلمبند ہوا۔ فلم: باغی)

☆ کیا ہوا دل پہ ستم۔ تم نہ سمجھو گے بلم (ریحانہ پر پکچرائز ہوا۔ فلم: رات کے راہی)

☆ بجائی آج یہ کیسی بین۔ لیا سکھ چین۔ سپیرے بین بجائے جا (زمرد پر فلمبند ہوا۔ فلم: گلبدن)

☆ کیہا دکھایا پیار کا سپنا۔ چھوڑ آئی میں سب گھر اپنا (پکچرائز ترانہ پر ہوا۔ فلم: کالا پانی)

☆ اک دن تم دل دو گے کہیں نہ کہیں۔ ہم ہی کو دے دو ہم برے تو نہیں (مارگریٹ پر فلمبند ہوا۔ فلم: عجب خان تھی)

غالب نے کہا۔ "چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے"

فلم والوں نے بھی اس فارمولے پر عمل کرتے ہوئے زبیدہ خانم سے اپنی چاہت کا اچھا ثبوت دیا۔ کیا موسیقار اور کیا نغمہ نگار اور کیا فنکار سب نے اس سنہری آواز سے سلور اسکرین کو چمکانے دمکانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اس دور کے تقریباً سارے ہی موسیقاروں نے اپنی فلموں میں جادو جگانے کے لیے زبیدہ خانم کی خدمات حاصل کیں۔ جن میں خواجہ خورشید انور، بابا جی اے چشتی، فیروز نظامی، سیف چغتائی، ماسٹر عبداللہ، اختر حسین، خورشید قیس، تصدق حسین، ولی شاہ، ماسٹر منظور، نذیر جعفری، مبارک علی خان، اعظم بیگ، حسن لطیف، رحمن ورما، ماسٹر عنایت حسین، اصغر علی محمد حسین، رشید عطرے، سلیم اقبال، اے حمید، منظور حسین، طفیل فاروقی، استاد جھمو خان، رحیم بخش چارپے، ماسٹر رفیق، محمد علی منو، مصلح الدین، قمر بدنی، ظفر خورشید اور عاشق حسین شامل ہیں۔

اسی طرح اس دور کے نغمہ نگاروں میں قتیل شفائی، سیف الدین سیف، منیر نیازی، ساغر صدیقی، کلیم عثمانی۔ طفیل ہوشیار پوری، فیاض ہاشمی، مجروح سلطان پوری، وارث لدھیانوی، اقبال حسین، ناظم پانی پتی، رئیس امروہوی، عرش لکھنوی، مشیر کاظمی، [illegible]، بابا عالم سیاہ پوش، شوکت

ہاشمی، استاد دامن، ولی صاحب، حبیب جالب، تنویر نقوی، حزیں قادری، شباب کیرانوی، احمد راہی، شورش دہلوی، اشرف سندھو، عزیز میرٹھی، حمید جاذب، ظہور راجا، امین جیلانی، سردار ادیب، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، نصرت منصوری، غلام ربانی، فرحت شاہجہاں پوری، اسماعیل متوالا قابل ذکر ہیں جنہیں اس بات کا شرف حاصل ہے کہ ان کے لکھے ہوئے گیتوں کو زبیدہ خانم نے گا کر شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں تک پہنچایا۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند بہت زیادہ مقبول ہونے والے گیت نگاروں کا نام بتایا جائے۔ مثلاً

☆ میرا نشانہ دیکھے زمانہ۔ بچ کے نہ کوئی جائے (یہ ساسور شاعر ساغر صدیقی کا تحریر کردہ ہے)

☆ تیر پر تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے (اس گیت کے شاعر قتیل ہوشیار پوری ہیں)

☆ ولا تھیر جا یار دا نظارہ لین دے (اس گیت کے خالق وارث لدھیانوی ہیں)

☆ میرے اشکوں کا نذرانہ دل ناشاد لایا ہے (قتیل شفائی اس گیت کے شاعر ہیں)

☆ میری مست جوانی لہرائی، احسان ہے مجھ پر ساقی کا (معروف شاعر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے یہ گیت فلم شام ڈھلے کے لیے لکھا)

☆ اونچے والے حوالے۔ بول تیرے ساغر میں کیا ہے؟ (سیف الدین سیف جیسے جید شاعر نے انور کمال پاشا کی فلم انتقام کے لیے یہ گیت لکھا جسے زبیدہ کی آواز نے امر کر دیا)

☆ روئے میرا دل تو ہے کہاں۔ ڈستی ہیں یہ تنہائیاں (انقلابی شاعر حبیب جالب نے فلم بھروسا کے لیے لکھا اور زبیدہ خانم نے گایا)

زبیدہ خانم کی پہلی فلم جس سے انہوں نے شہرت حاصل کی وہ "شہری بابو" تھی جس کی ہیروئن سورن لتا اور ہیرو سنتوش کمار تھے جب کہ ان کی آخری فلم "جواب دو" کی ہیروئن زمرد اور ہیرو درپن تھے۔ فلم "جواب دو" 1974ء میں ریلیز ہوئی۔ دراصل یہ ایک پرانی اور رکی ہوئی فلم تھی جو تاخیر سے نمائش پذیر ہوئی۔ اس فلم میں زبیدہ خانم کے گائے ہوئے گیت کے بول تھے۔

"اک بے دردی ظالم بن بیٹھی دنیا ہوئے۔ دنیا بجلی سے سونے"

"جواب دو" زبیدہ خانم کے بیٹے جعفر شاہ بخاری نے بنائی تھی۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ جعفر شاہ بخاری کی بطور ہدایت کار ابتدائی چار فلموں انجام، بھروسا، فیصلہ اور نتیجہ میں زبیدہ خانم نے گلوکاری کی تھی۔ ان چاروں فلموں کے موسیقار اے حمید تھے۔

زبیدہ خانم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے پہلی پاکستانی گلوکارہ منور سلطانہ کے ہمراہ فلم "معصوم" کے لیے گیت گایا تھا جو یاسمین اور جانثار اختر (رتن کمار) پر فلمبند ہوا تھا۔

زبیدہ خانم نے اپنے دور کے تقریباً سبھی گانے والوں اور والیوں کے ساتھ دوگانے گائے ہیں۔ جن میں منور سلطانہ، سلیم رضا، منیر حسین، ایس بی جان، احمد رشدی، فضل حسین، وسیم فاروقی، باتش، شفقت حسین، سیف چغتائی، ناہید نیازی، کوثر پروین، اقبال بانو، منظور سلطانہ، نسیم بیگم، نور جہاں، غلام رسول، امداد حسین، عنایت حسین بھٹی اور عمر ریف کے نام قابل ذکر ہیں۔

زبیدہ خانم کے ٹاپ 10 پنجابی گانے

☆ سیونی میرا دل دھڑکے، دل دھڑکے نال اکھ پھڑکے ☆ ساڈا نجرا پیار کیے یار بار ☆ جن نال پیار کرن والیا، نتیجہ ہوندا اے ☆ بابل دا ویہڑا چھڈ کے ویراں، توں دور چلی ☆ اساں جان کے میٹ لئی اکھ وے ☆ ولا تھیر جا یار دا نظارہ لین دے ☆ میرا دل چناں کچ دا کھڈونا ☆ ساڈے انگ انگ وچ، پیار دے چھنکاں پائیاں ☆ ریشم دا لاچا چمک دے ☆ گوری گوری چاندنی دی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاں۔

خداداد صلاحیتوں کی مالک

زبیدہ خانم نے کسی استاد سے گلوکاری کی تربیت حاصل نہیں کی۔ ابتدائی عمر میں شادی بیاہ کی تقریبات میں سہیلیوں کے ساتھ ڈھولک پر گیت گانے لگیں۔ یہیں سے شوق نے مزید مہمیز کیا تو فلموں میں گانے کا شوق پیدا ہوا۔ لاہور آنے کے بعد لاہور ریڈیو سے باضابطہ گانے کا سفر شروع کیا۔ پہلے ہی گانے جو ایک پنجابی لوک گیت تھا، اس نے سننے والوں کو متاثر کیا اور کوئی سال بھر بعد انہیں ایک فلم "بلو" میں گانے کی آفر ہوئی۔ نذیر صاحب کی فلم "شہری بابو" سے شہرت ملی اور پھر انہوں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

ساتھی گلوکاروں کے ساتھ گائے ہوئے چند مقبول گیت یہ ہیں۔

☆ ان کو یمن کر رائی بلگرہ۔ جاتا ہے سسرال۔ تو لے لو چوڑیاں (منور سلطانہ کے ساتھ۔ فلم معصوم)

چاند لگے بیچ بیچ کے او جی بچھو رے۔ ملنے کو آئی ہوں میں تو حضور سے (سلیم رضا کے ساتھ۔ فلم: عشق لیلیٰ)

☆ جب جھک جائیں نین بے چین۔ تو سمجھو یہی محبت ہے (ناہید نیازی کے ہمراہ۔ فلم: اونچے محل)

☆ نظر نظر پیام ہے۔ قدم قدم سلام ہے (ساتھی گلوکارہ اقبال بانو۔ فلم حمیدہ)

☆ اکیلی مت جانا زمانہ نازک ہے (نور جہاں کے ہمراہ۔ فلم: نیند)

☆ ساڈا بھرا پیار کہے بار بار (ساتھی گلوکار عنایت حسین بھٹی۔ فلم: چھن)

☆ میرے دل کو لگا دے تالا علی گڑھ والا (ہمراہ ظریف۔ فلم: امرداد)

☆ ہر تمنا ہر خوشی برباد ہے۔ زندگی شرمندۂ فریاد ہے (ساتھی گلوکار سیف چغتائی۔ فلم: بے گناہ)

☆ چھلک رہی ہیں مستیاں۔ نشے میں جھوم اٹھا جہاں (احمد رشدی کے ساتھ۔ فلم: راز)

☆ ہم اور تم کھوئی کھوئی یہ رات۔ تاروں کی بارات (ایس بی جون کے ہمراہ۔ فلم: انسان بدلتا ہے)

☆ تیری چال قیامت ڈھائے (ساتھی گلوکارہ عذرا سلطانہ۔ فلم: سوسائٹی)

☆ ہمارے صنم او پیارے صنم (ساتھی گلوکارہ کوثر پروین۔ فلم: صبح کہیں شام کہیں)

☆ جوانی مسکرائے گنگنائے۔ گائے ترانے پیار کے (نسیم بیگم کے ساتھ۔ فلم: گل بکاؤلی)

☆ گھومتا ہے آسمان۔ گھومتی ہے یہ زمین (ساتھی گلوکارہ نسیم فاروقی۔ فلم: صبح کہیں شام کہیں)

زبیدہ خانم نے کسی استاد سے گائیکی کی تربیت حاصل نہیں کی تھی جو کچھ ان کا فن تھا خداداد تھا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ باپ کی طرف سے ان کے DNA میں موسیقی رچی بسی ہوئی تھی۔ اسی طرح ان کی تعلیم بھی بس گھریلو تھی لیکن ان کے بزرگوں نے انہیں جو گھریلو تعلیم دی تھی وہ اتنی افضل و اعلیٰ تھی کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں سے بہتر، صاف ستھری اور قابلِ رشک گزاری۔ اپنے پوری فلمی کیریئر میں ہمیشہ محترم رہیں۔ ان کا کوئی اسکینڈل کبھی سامنے نہیں آیا۔ دیگر عام فلم والوں کی طرح ان کے بارے میں اخباروں میں بھی کوئی چٹ پٹی خبر نہیں۔ سید ریاض بخاری سے رشتۂ ازدواج میں بندھنے کے بعد ان کی ساری توجہ شوہر پر ہی مرکوز رہی اور پھر آہستہ آہستہ اپنے گھر اور گھر والے کے لیے اپنا شوقِ گلوکاری کو بھی قربان کر دیا۔ اپنے آپ کو اپنے...... شریک حیات، بال بچوں اور گھر گرہستی تک محدود کر دیا۔ وہ ایک باوفا بیوی تھیں جنہوں نے اپنے لائف پارٹنر کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔ ریاض بخاری نے بھی ایک محبوب شوہر کا کردار زندگی بھر ادا کیا۔ دونوں بوڑھے ہو گئے تھے۔ بال بچے دار ہو گئے تھے۔ اولاد جوان ہو گئی تھی لیکن ان کی آپس کی محبت کبھی ضعیف نہیں ہوئی، کمزور نہیں ہوئی، بوڑھی نہیں ہوئی۔ 19 اکتوبر 2012ء کو جب ریاض بخاری انہیں چھوڑ کر دنیا سے منہ موڑ کر رخصت ہو گئے تو زبیدہ خانم پر کیا بیتی اس کا اندازہ لگانا بڑا مشکل ہے۔ ایک ایسا ساتھی جسے دیکھ کر جس کے ساتھ وہ زندہ تھیں۔ وہ ساتھ چھوڑ گیا تو وہ زندہ درگور ہو گئیں۔ اس صدمے کو وہ سال بھر تک تو برداشت کرتی رہیں لیکن 19 اکتوبر 2013ء کو جب مرنے والے کی پہلی برسی منائی جا رہی تھی تو ان کے صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ دل کا ایسا دورہ پڑا کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ ان کے بچوں کے لیے باپ کی جدائی کا صدمہ ہی کیا کم تھا کہ ماں بھی انہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ ان کے بچے اور چاہنے والے اب ایک ہی روز فلم ساز ہدایت کار اور عکاس ریاض بخاری اور گلوکارہ زبیدہ خانم کی برسی مناتے ہیں۔

☆—☆

محبت بھی عطیہ خداوندی ہے۔ کسی کسی کو ہی ایسی ملتی ہے کہ لوگ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ "محبت ہو تو ایسی ہو" زبیدہ خانم آج ہمارے آپ کے درمیان نہیں لیکن ہم ان کے امر گیتوں کے علاوہ ان کی محبت کی یاد بھی تازہ کر رہے ہیں۔ عظیم ہوتے ہیں وہ لوگ جو اپنی عدم موجودگی میں بھی موجود ہوتے ہیں۔ یادوں کی اسکرین سے ان کی پرچھائیاں بھی غائب نہیں ہوتیں۔

ان کی برسی پر ریڈیو پاکستان لاہور کی جانب سے زبیدہ خانم کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ایک شو منعقد کیا گیا جس کی مہمان خصوصی اداکارہ زیبا تھیں۔ اس میں اداکارہ بہار، نغمہ، عابدہ، مصطفیٰ قریشی، شجاعت ہاشمی، عرفان کھوسٹ وغیرہ شریک ہوئے۔ یادش بخیر۔ ان کی زندگی کی

بھی ایک تقریب پی ٹی وی شو کی یاد آ گئی ہے جو 1999ء میں پی ٹی وی میں ان کے اعزاز میں انعقاد پذیر ہوا تھا جس کی میزبان پی ٹی وی کی منفرد فنکارہ شہناز شیخ تھیں جس میں اس بات کا اظہار انہوں نے اپنی زبان سے کیا تھا کہ میں نے اپنے فنی کیریئر میں کم و بیش 480 فلمی گیت صدابند کرائے ہیں۔

☆—☆

اللہ اللہ کیسے کیسے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اپنے خون جگر سے پاکستانی فلمی صنعت کے پودے کو سینچ کر تناور درخت بنایا ہے۔ ایسے لوگ جو بلاشبہ ہماری فلم انڈسٹری کے اوّلین معماروں میں شمار کیے جائیں گے۔ انہیں ہم فراموش کر چکے ہیں۔ جدید سینما گھروں میں بیٹھ کر فلمیں دیکھتے وقت ہمیں کبھی یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ ہماری یہ صنعت یہاں تک کیسے پہنچی؟ جب کہ آج کی طرح سہولتیں نہیں تھیں، جدید ٹیکنالوجی کا تصور بھی نہیں تھا، بے سروسامانی تھی، حالات کی نامہربانی تھی، بس چند سرپھروں کی اپنی زندگانی تھی، جنہوں نے تمام تر نامساعد حالات کے باوجود یہ عزم کر رکھا تھا کہ وجود میں آنے والے نئے مملکت خداداد پاکستان کو بنانے، سنوارنے اور مستحکم کرنے کے لیے ہم یہاں فلم سازی کو بھی فروغ دیں گے۔ فلمی صنعت کو بھی لعل کریں گے اور انہوں نے اپنے تن من اور دھن کی فکر کیے بغیر اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنایا اور پاکستان فلم انڈسٹری کی مستحکم عمارت کی ایک ایک اینٹ کو دوبارہ جوڑ جوڑ کر کھڑا کر دیا۔ عظیم ہیں وہ لوگ جنہوں نے آنے والی نسلوں کے لیے یہ کارنامہ سرانجام دیا۔

ایسے ہی ایک اوّلین معمار کی داستانِ وقار آج اس وقت آپ کے گوش گزار کروں گا جس کے بارے میں نئی نسل تو کیا پختہ عمر کے بہت سے لوگوں کو بھی ان کی بہت سی باتوں کا علم نہیں۔ یہ ناقابلِ فراموش شخصیت محترم ایم اسماعیل کی ہے۔

ایم اسماعیل ایسے فنکار تھے جنہوں نے پاکستان میں بنائی جانے والی ابتدائی فلم "بیلے" سے "غیرت میرے ویر دی" تک مسلسل اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ "بیلے" 16 مارچ 1949ء کو نمائش پذیر ہوئی تھی۔ پہلی فلم سے آخری فلم تک کی تعداد 71 ہے۔ اس دوران انہوں نے ہر طرح کے کردار کیے۔ وہ ورسٹائل اداکار تھے۔ ہر کردار میں انگوٹھی کے نگینے کی طرح فٹ ہو جاتے تھے۔ متذکرہ پاکستانی فلموں میں انہوں نے زیادہ تر کیریکٹر رول کیے۔ ان کی فنی اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے ہر فلم میں ان کی موجودگی لازمی قرار دی جاتی تھی۔ یہ فلمیں تو وہ تھیں جو 1947ء میں پاکستان بننے کے بعد بنائی گئیں جب کہ ایم اسماعیل کی اداکارانہ خدمات کا سلسلہ تو اس وقت سے جاری ہو گیا تھا جب لاہور کی سرزمین میں پہلی فلم بنائی گئی تھی جو خاموش فلم تھی۔ لہٰذا ان کی کہانی بالکل ابتداء ہی سے سنانی ضروری ہو جاتی ہے۔

☆—☆

ایم اسماعیل 1904ء میں لاہور کے اندرون بھاٹی گیٹ محلہ چوبالہ میں پیدا ہوئے۔ وہ لاہور کی زرگر سنار برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد کتابت کا پیشہ اپنایا اور کمرشل آرٹ کے لیے بھی کام کرنے لگے۔ ایم اسماعیل کا قد دراز تھا، رنگت سفید تھی، آنکھیں نیلی تھیں اور جسم مضبوط تھا۔ وہ بہت خوددار اور روزے نماز کے پابند اور پرہیزگار نوجوان تھے۔ اس دور میں سب سے پہلے لاہور میں کسی کو فلموں میں کام کرنے کا شوق پیدا ہوا تو وہ تھے چارلی، غلام قادر، عبدالرشید کاردار اور ایم اسماعیل۔ عبدالرشید کاردار، ایم اسماعیل کی طرح کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ کاردار اور ایم اسماعیل میں بڑی گہری دوستی تھی۔ دونوں دوستوں پر اداکاری کا بھوت سوار تھا مگر ان کے اس شوق کی تکمیل لاہور میں نہیں ہو سکتی تھی۔

"یار! یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے تو ہم زندگی بھر اداکار نہیں بن سکتے۔" ایک دن ایم اسماعیل نے عبدالرشید کاردار سے کہا۔

"پھر——" کاردار بولے۔ "کس طرح اداکار بن سکتے ہیں ہم؟"

"سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے نا؟"

"ہاں ہوتا ہے۔"

"تو چلو بمبئی چلتے ہیں۔ وہاں فلمیں بنتی ہیں۔ وہیں قسمت آزمائیں گے۔"

"آئیڈیا تو بہت اچھا ہے۔"

"ہم جیسے اچھے لوگ اچھا ہی مشورہ دے سکتے ہیں۔"

دونوں دوستوں نے زبردست قہقہہ لگایا اور چند روز بعد عازمِ بمبئی ہو گئے۔ یاد رہے یہ 1921ء کی بات ہے۔ بمبئی میں دونوں فلم والوں سے ملے، ان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شد۔ آخر ناکام و نامراد

ہو کر لاہور واپس آ گئے۔ وہ بمبئی سے لوٹ کر گھر آئے تو یار دوستوں نے پوچھا۔ "تم تو فلموں میں کام کرنے کے لیے بمبئی گئے تھے۔ واپس کیوں آ گئے؟"

"یار! وہاں کی فلموں میں ہم جیسے لوگ اداکاری نہیں کر سکتے۔"

"کیوں نہیں کر سکتے؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ وہاں کے فلم ساز و ہدایت کار ایسے ہی لڑکے یا لڑکی کو اداکار یا اداکارہ بناتے ہیں جو اداکاری کے ساتھ ساتھ گا بھی سکتا ہو۔ جس کی آواز اچھی ہو اور ہم دونوں کو گانا نہیں آتا۔"

"اور ایک وجہ اور بھی ہے۔" عبدالرشید کاردار بولے۔ "وہاں اکثر خوب صورت لڑکوں کو ضرورت پڑنے پر عورت کا کردار بھی کرنا پڑتا ہے۔"

"اوہ۔۔۔!!"

ایک فلم ساز نے ہم سے کہا۔ "اگر لڑکی کا کردار کرو گے تو ہماری ایک فلم میں ابھی چانس مل جائے گا۔"

دوستو! یہ اس زمانے کی بات ہے جب پلے بیک متعارف نہیں ہوا تھا۔ ہر اداکار اور اداکارہ کو اپنا گانا خود گانا پڑتا تھا اور یہ گانا بھی مکالموں کی طرح شوٹنگ کے وقت ہی گوایا جاتا تھا اور لڑکوں کو لڑکی بنا کر اس لیے پیش کیا جاتا تھا کہ ان دنوں لڑکیوں کا فلموں میں کام کیا جانا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اس لیے بہت کم خواتین تھیں جو فلموں میں کام کرتی تھیں۔ اس کمی کو لڑکوں سے پوری کی جاتی تھی۔

بہرحال بات ہو رہی تھی اے آر کاردار اور ایم اسماعیل کی بمبئی سے ناکام لوٹنے کی۔ دونوں کو گانا نہیں آتا تھا اور وہ لڑکی بن کر اداکاری بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔

ایک بار پھر وہ اپنے کام دھندوں میں لگ گئے مگر فلموں میں کام کرنے کا شوق باقی رہا اور وہ دعائیں مانگتے رہے کہ کوئی سبیل پیدا ہو اور ان کے شوق کی تکمیل ہو۔

طویل انتظار کے بعد 1923ء کی بات ہے کہ ایک صاحب سنتری کے جتنے نے سب سے پہلے لاہور میں پریمیئر فلم کمپنی کے نام سے ایک فلم پروڈکشن ادارہ قائم کیا اور اس ادارے نے "ڈاٹر آف ٹوڈے" کے نام سے پہلی خاموش فلم لاہور میں شروع کی۔ اس کی کاسٹ میں عبدالرشید کاردار، ایم اسماعیل، غلام قادر اور ولایت بیگم شامل تھیں۔ شنکر دیو نامی شخص نے اس فلم کو ڈائریکٹ کیا تھا۔ یوں "ڈاٹر آف ٹوڈے" لاہور میں بننے والی پہلی تاریخی خاموش فلم میں ایم اسماعیل بطور اداکار اسکرین پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہ فلم 1924ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ لاہور میں فلم سازی کا سلسلہ قیام پاکستان کے بعد شروع ہوا۔ ایسا نہیں ہے 1947ء سے پہلے بھی لاہور میں فلمیں بنا کرتی تھیں اور اس سفر کا آغاز جیسا کہ بتا چکا ہوں خاموش فلم سے ہوا تھا جو 1924ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس دور میں بننے والی فلموں میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب ہی فنکاروں نے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔

عبدالرشید کاردار اور ایم اسماعیل نے لاہور کی سرزمین میں بننے والی فلم "ڈاٹر آف ٹوڈے" سے اداکار بننے کا اعزاز حاصل کر لیا تھا۔ اداکاری کا یہ سلسلہ دونوں نے جاری رکھا اور اس کے بعد کی فلموں میں بھی بطور اداکار کام کرتے رہے لیکن کاردار تھوڑے ہی دنوں بعد ڈائریکشن کی طرف مائل ہو گئے اور انھوں نے اپنا ذاتی اوپن ایئر اسٹوڈیو بنایا جہاں یونائیٹڈ پلیئرز کے نام سے ایک فلم کمپنی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کمپنی میں کاردار نے بطور فلم ساز و ہدایت کار پہلی فلم "حسن کا ڈاکو" بنائی۔ اس فلم میں ٹائٹل رول ایم اسماعیل نے ادا کیا۔ اس فلم کی کامیابی کے بعد کاردار نے اسی بینر پر کئی فلمیں بنائیں۔ جن میں صفدر جنگ، گڈریا، سلطان، گولڈن خنجر شامل ہیں۔ ان تمام فلموں میں ایم اسماعیل نے بطور اداکار مختلف انداز میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ انھوں نے اپنے آغاز شباب ہی سے اپنی خداداد فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ ان کی اداکاری کا یہ سلسلہ ان کی آخری عمر تک جاری رہا۔ اس دوران انھوں نے مثبت، منفی، سنجیدہ اور قدرے مزاحیہ کردار میں بھی اپنا لوہا منوایا۔ اے آر کاردار نے 1947ء سے پہلے لاہور میں جتنی بھی فلمیں پروڈیوس کیں ان میں ایم اسماعیل کسی نہ کسی خاص کردار میں ضرور کاسٹ کیے گئے۔ خاص طور پر 1932ء میں لاہور میں پہلی بولتی فلم "ہیر رانجھا" کا ذکر از بس ضروری ہے۔ اس فلم نے نہ صرف لاہور بلکہ ہندوستان کے کونے کونے میں اپنی کامیابی کے جھنڈے لہرائے۔ کاردار کی فلم "ہیر رانجھا" کے فلم ساز حکیم رام پرشاد تھے۔ انھوں نے اس فلم کی ڈائریکشن کے لیے اے آر کاردار کو خصوصی طور پر بمبئی سے بلوایا تھا۔ بمبئی سے اس لیے بلوایا تھا کہ کاردار ان دنوں بمبئی میں تھے۔ وہ لاہور میں اپنی بنائی جانے والی خاموش فلموں سے بطور ہدایت کار کامیاب ثابت ہوئے تو لاہور سے بمبئی شفٹ ہو

گئے اور وہاں ایک باصلاحیت ہدایت کار کے طور پر فلموں کی ہدایات دیتے رہے۔

پروڈیوسر حکیم رام پرشاد نے اپنی فلم کے لیے پنجاب کی مشہور لوک کہانی کو "ہیر رانجھا" کے نام سے فلمانے کا فیصلہ کیا تو ساتھ ہی یہ عزم بھی کیا کہ اسے بولتی فلم کے طور پر پیش کریں گے اور اس کی ڈائریکشن پنجابی ہدایت کار عبدالرشید کاردار سے کروائیں گے جو بمبئی جا کر اے آر کاردار بن گیا ہے۔ اس فلم کا اسکرپٹ حکیم رام پرشاد نے عابد علی عابد سے لکھوایا جو نامور شاعر اور ادیب تھے۔ منظر نامہ بابو صادق سے تحریر کروایا۔ اس فلم میں انوری بیگم نے ہیروئن یعنی ہیر کا کردار کیا جب کہ ان کے ہیرو رانجھا کے روپ میں رفیق غزنوی پیش ہوئے۔

اپنے نوجوان دوستوں سے انوری بیگم اور رفیق غزنوی کا تعارف کرادوں کہ انہیں سمجھنے میں سہولت ہو۔ سلمیٰ آغا کے نام سے تو آپ لوگ بخوبی واقف ہوں گے اور ان کے گائے ہوئے سپرہٹ گانے آپ کو ضرور یاد ہوں گے۔ وہی سلمیٰ آغا جنہوں نے بھارتی فلم "طلاق" سے اداکاری اور گلوکاری کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ انوری بیگم ان ہی سلمیٰ آغا کی نانی تھیں اور رفیق غزنوی سلمیٰ آغا کے نانا تھے۔ وہ اپنے دور کے بہت اچھے اداکار ہی نہیں بڑے نامور موسیقار بھی تھے۔ سرگزشت کے انہی صفحات پر میں رفیق غزنوی پر ایک تفصیلی تحریر لکھ چکا ہوں۔

"ہیر رانجھا" کی رومانوی کہانی میں ایک ولن بھی ہے جس کا نام کیدو ہے۔ یہ مشہور کردار فلم "ہیر رانجھا" میں ایم اسماعیل نے اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ تعجب ہوتا ہے ہیروؤں کا سوفٹ کردار کرنے والے اداکار نے ایسے بدکردار شخص کا رول کیسے ادا کیا!! دراصل ایم اسماعیل ان لوگوں میں ہیں جو ہر کردار کو چیلنج سمجھ کر قبول کر لیتے تھے اور اپنی صلاحیتوں سے کسی کو مایوس نہیں کرتے تھے۔

کیدو ہیر کا چچا ہوتا ہے جو ہیر اور رانجھا کے عشق کو کسی طرح بھی کامیاب نہ کرانے کا سبب ہوتا ہے۔ عام طور پر ہیرو کے کردار کرنے والے ولن کا کردار نہیں کرتے کہ ان کے ہیرو کے امیج پر ناخوشگوار اثر پڑے گا لیکن آفرین ہے اس ورسٹائل اداکار ایم اسماعیل پر کہ انہوں نے اس فلم "ہیر رانجھا" میں ولن کا بدنما کردار کیا بلکہ اتنی عمدگی سے کیا کہ ایک بار پھر جب اسی لوک رومانوی کہانی کو "ہیر سیال" (3 نومبر 1965ء) کے نام سے پیش کیا گیا تو اس رول کو انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ خوب صورتی اور موثر انداز میں پیش کیا۔

1947ء سے پہلے لاہور میں جتنی بھی فلمیں بنیں ان میں ایم اسماعیل کسی نہ کسی خاص رول میں ضرور کاسٹ کیے گئے۔ ان فلموں میں الف لیلیٰ، مست فقیر، ہیر سیال، ساتھی، بھیدی ہار، آرٹسٹ گرل، انارکلی، نئی زندگی، کاروان حسن، انتقام، شہر خموشاں، دشمن پرست، بمبئی کی سیٹھانی، پریم پجاری، چودھری، خزانچی، زمیندار، کماری، پھول، پونجی، لیلیٰ مجنوں، لال حویلی، گل بکاؤلی، بھلا جٹ، ملاپ، سوالی، مکھڑا، خونی جادوگر اور دوسری متعدد قابل ذکر ہیں۔ یہ ساری ایم اسماعیل کی قیام پاکستان سے قبل کی فلمیں ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستان منتقل ہونے والے سینئر اور تجربہ کار فنکاروں میں ایم اسماعیل سرفہرست تھے۔ یاد رہے کہ اے آر کاردار نے انہیں بمبئی بلایا تھا اور وہ کاردار کی فلموں کے علاوہ دیگر فلم سازوں کی فلموں میں بھی کام کرنے

زندگی نامہ

نام: ایم اسماعیل

ولادت: 16 اگست 1904ء

مقام پیدائش: بھاٹی گیٹ محلہ چوہال لاہور

خاندانی تعلق: زرگر سنار گھرانے سے تعلق تھا مگر نوجوانی میں یہ پیشہ اختیار نہیں کیا۔

ابتدائی پیشہ: جوان ہوئے تو تعلیم سے فراغت کے بعد کتابت کا پیشہ اپنایا اور کمرشل آرٹسٹ کی حیثیت سے بھی کام کرنے لگے۔

اداکاری کا شوق: نوجوانی سے ہی اداکاری کا شوق تھا۔ ان دنوں لاہور میں فلمیں نہیں بنتی تھیں۔ لہٰذا اپنے دوست عبدالرشید کاردار کے ساتھ 1921ء کو بمبئی گئے مگر ناکام لوٹ آئے۔ 1923ء میں لاہور میں ایک صاحب جی کے مہتا نے فلم بنانے کی ابتدا کی تو اس میں ایم اسماعیل کو پہلی بار کسی فلم میں اداکاری کرنے کا موقع ملا۔ یہ خاموش فلم تھی اور اس کا نام تھا "ڈاٹر آف ٹوڈے" جو 1924ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کے بعد لاہور میں جتنی فلمیں بنیں سب میں انہوں نے اداکاری کی۔ لاہور کے علاوہ بمبئی کی بھی متعدد فلموں میں اداکاری کی۔ قیام پاکستان کے بعد بمبئی سے لاہور آ گئے۔

لگے تھے۔ انہیں لاہور کی فلموں میں بھی کام کرنے کو بلایا جاتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ایم اسماعیل تو پاکستان آ گئے جب کہ عبدالرشید کاردار وہیں رہ گئے اور بعد ازاں ان کا انتقال بھی وہیں ہوا۔

☆—☆

قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے آنے والوں میں اداکار بھی تھے۔ اداکارائیں بھی اور مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے تکنیک کار بھی تھے۔ یہ سارے لوگ بیک وقت نہیں آئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں آئے۔ آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ 1946ء میں جو فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑے تھے اس کی وجہ سے وہاں کے مسلمان اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ 1947ء جو تقسیم کا سال تھا۔ یہ تو بڑا ہی افراتفری کی حالت میں گزرا۔ جب حالات پُرسکون ہوئے تو مسلمان فنکار اور ہنرمند آہستہ آہستہ ہجرت کر کے پاکستان آنے لگے۔

آنے والے بمبئی کی فلم انڈسٹری چھوڑ کر آئے تھے جو متحدہ ہندوستان کا سب سے بڑا فلمی مرکز تھا جہاں بے شمار فلمیں بنتی تھیں۔ یہاں لاہور کا فلمی مرکز بمبئی کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا جو بٹوارے کے دنوں میں فسادیوں کے ہاتھوں تہس نہس ہو گیا تھا۔ بمبئی سے آنے والے آئے تو یہاں کے حالات دیکھ کر انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ بمبئی میں بھرا میلہ چھوڑ کر اس خیال سے آئے تھے کہ لاہور کی فلم انڈسٹری سے انہیں بمبئی جتنا نہ سہی اس کے نصف برابر تو فلمیں مل جائیں گی مگر یہاں کے تو حالات ہی دگرگوں تھے جو یہاں کے مستقل آرٹسٹ اور ہنرمند تھے، وہ بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔

پاکستان سے محبت کرنے والے لوگوں نے اس نوزائیدہ مملکتِ خداداد کو بنانے اور سنوارنے کا عزم کیا اور زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والوں نے اپنے اپنے شعبے میں تعمیر و ترقی کا کام شروع کر دیا۔ فلم والوں نے بھی فلم انڈسٹری کی ری وائیول کا بیڑہ اٹھایا۔ 1948ء سے اس کام کا آغاز ہوا۔ کوئی بھی اسٹوڈیو سلامت نہیں رہا تھا۔ فلم سازی کے ساز و سامان یا تو فسادی لوٹ کر لے گئے تھے اور جو لے جا نہیں سکے تھے تو توڑ پھوڑ کر ناکارہ کر دیا تھا۔ چند سرپھروں نے اس کی تعمیر نو کے لیے تن من دھن لگا دیا۔ ہجرت کر کے آنے والے فنکاروں اور ہنرمندوں نے بھی اس موقع پر ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ ان میں ایم اسماعیل بھی تھے۔ جب

آہستہ آہستہ فلمیں بننے لگیں تو فلم بنانے والوں کو مختلف قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایسے میں جس سے جو بن پڑتا فلم ساز کی معاونت کرتا۔ ایم اسماعیل کی یہ بات قابلِ تحسین ہے کہ ان دنوں فلم ساز کے پاس پبلسٹی کے لیے پیسے نہ ہوتے تو وہ فلموں کے پوسٹر بلا معاوضہ پینٹ کر دیتے تھے۔ اسی طرح اداکاری کے معاوضے کے سلسلے میں بھی وہ فلم سازوں کی استطاعت کے مطابق اپنا محنت معاوضہ طلب کرتے تھے۔

پاکستان آمد کے بعد ان کی پہلی فلم جو نمائش پذیر ہوئی وہ "پھیرے" تھی جو 16 مارچ 1949ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ جب کہ قیام پاکستان سے پہلے ایم اسماعیل نے یملا جٹ اور خزانچی جیسی فلموں میں یادگار رول نہایت مہارت ، محنت اور کامیابی سے ادا کیے تھے، جس سے انہیں ہمہ گیر شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ جن تماشائیوں نے مرحوم کے آصف کی فلم "پھول" دیکھی ہے انہیں ترکی کے ایک بوڑھے بزرگ حکیم کا وہ لاجواب اور یادگار رول ضرور یاد ہوگا جو ایم اسماعیل نے ادا کیا تھا۔ اسی طرح ولن کے کردار میں انہوں نے فلم "واحق عذرا" میں کردار نگاری کا ایک نیا اسلوب پیش کیا تھا جو بے حد کامیاب رہا۔ سارے ولن ان کی فنکارانہ عظمتوں کے مقابلے میں کمتر نظر آنے لگے تھے۔ ایم اسماعیل نے نذیر اجمیری کی فلم "قسمت" میں رحمت علی کے نام سے ایک منفرد اور انوکھا رول ادا کیا جو نسیان (بھول جانے کا مرض) کے مرض میں مبتلا ہونے کے باعث اکثر اپنا نام تک بھول جاتا ہے۔ یہ کردار انہوں نے اس فطری انداز میں نبھایا کہ انہیں 1955ء کا صدارتی ایوارڈ ملا۔ ان کے اس کردار کو اب تک یاد کیا جاتا ہے۔ ایم اسماعیل کو ان کے تجربے اور طویل فلمی کیریئر کی وجہ سے فلم والے بعد احترام و عقیدت انہیں "بھائیا جی" کہہ کر پکارتے تھے۔

قیام پاکستان سے پہلے فلم "خزانچی" کے یادگار رول میں ان کی اداکارانہ عظمت کو پاک و ہند میں بے حد سراہا گیا تھا۔ ان کا شمار صفِ اوّل کے اداکاروں میں ہونے لگا۔ وہ عظیم فنکار 70ء کی دہائی میں عمر کے اس حصے میں داخل ہو گیا جب طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں رہتی۔ جب قدرے ٹھیک ہو جائے تو کسی کسی فلم میں چھوٹے موٹے رول میں اداکاری کر دیتے لیکن یہ کردار ان کے شایانِ شان نہیں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود "دو راستے" اور "پاٹل واویڑہ" میں ان کی اداکاری قابلِ دید تھی۔ "دو راستے" میں انہوں نے ایک

پاگل کا کردار کیا تھا۔ آخری دنوں میں بے کاری کی وجہ سے ہاشمی چوک کے ایک ہوٹل میں روزانہ آنا ان کا معمول ہو گیا تھا۔ وہ چار پانچ گھنٹے دوستوں کے ساتھ خوش گپیاں لگاتے اور سرِ شام گھر چلے جاتے اور پھر چل چلاؤ کا وقت آ گیا کہ زندگی کا سفر تمام ہو گیا تھا۔ ہفتے کی رات وہ حسبِ معمول گھر گئے لیکن صبح دل کا دورہ پڑا اور ڈاکٹر کے آنے سے پہلے وہ اس فانی دنیا سے عالمِ جاودانی کو کوچ کر گئے تھے۔ ڈاکٹر نے آ کر تصدیق کر دی کہ وہ انتقال کر گئے ہیں۔ یہ 22 نومبر 1975ء کی بات ہے جب برصغیر پاک و ہند کا ایک عظیم فنکار اپنے بے شمار چاہنے والے پرستاروں کو سوگوار کر کے راہیِ ملکِ عدم ہوا۔

آج ایم اسماعیل ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن جب تک پاکستان فلم انڈسٹری زندہ ہے، ان کا نام اور کام زندہ و تابندہ رہے گا۔ پروردگار ان کی مغفرت کرے، آمین ثم آمین۔

☆—☆

اس تحریر کو آگے بڑھانے کے لیے جس فلمی شخصیت کا انتخاب کیا ہے اس کی حیثیت بھی پاکستانی فلمی صنعت کے اوّلین معمار کی ہے۔ عجب اتفاق ہے کہ اس شخصیت کا فلمی کیریئر بھی پاکستان کی پہلی فلم سے ہی شروع ہوتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ریلیز ہونے والی پہلی فلم ”تیری یاد“ تھی۔ ”تیری یاد“ ہی اس فلمی شخصیت کی بھی پہلی فلم تھی، جس سے اس نے اپنی فلمی نغمہ نگاری کی ابتداء کی تھی اور یہ فلمی نغمہ نگار قتیل شفائی تھے۔ قتیل شفائی کو کون نہیں جانتا۔ پاکستان اور ہندوستان ہی نہیں، دنیا بھر میں جہاں جہاں اردو بولنے اور سمجھنے والے بستے ہیں وہاں وہاں قتیل شفائی کے سدا بہار گیتوں سے فضا گونجتی ہے۔ آج اس جگہ اسی البیلے گیت نگار کی کہانی سناؤں گا۔ ان کے دھوم مچانے والے گیتوں کے بارے میں آپ کی معلومات میں اضافہ کروں گا۔

قتیل شفائی کی بطور فلمی گیت نگار پہلی فلم ”تیری یاد“ تھی جس کے گیت انہوں نے لکھ کر گیت نگاری کی دنیا میں پہلا قدم رکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ قتیل شفائی پر کچھ لکھنے سے پہلے ہماری آپ کی اور پاکستان کی پہلی فلم ”تیری یاد“ کی یاد کیوں نہ تازہ کر لی جائے کیونکہ عام طور پر اس فلم کے بارے میں بہت کم لوگوں کو معلوم ہے جن کو کچھ معلوم بھی ہے وہ بھی بہت واجبی معلومات ہیں۔ یوں بھی اس فلم کے بارے میں اب کچھ ایسی باتیں سامنے آئی ہیں جو پہلے معلوم نہیں تھیں۔

ایم اسماعیل۔ تعلیم اور ملازمتیں

ایم اسماعیل کو ان کے والد نے میو اسکول آف آرٹ لاہور میں داخل کیا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر کمرشل آرٹ کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔ کتابت بھی کرنے لگے۔ بمبئی سے ناکام لوٹنے کے بعد انہوں نے روزنامہ شوکت لاہور اور ماہنامہ ہلال لاہور میں ملازمت کر لی۔ جب تک اداکاری سے وابستہ نہیں ہوئے مختلف قسم کی ملازمتیں کرتے رہے۔

ایم اسماعیل کی خاموش فلمیں

ڈاٹر آف ٹوڈے، حسن کا ڈاکو، صفدر جنگ، گنڈریا سلطان، گولڈن تجر۔

قیامِ پاکستان سے پہلے کی فلمیں

لاہور اور بمبئی میں بننے والی فلمیں لاہور کی پہلی بولتی فلم ہیر رانجھا، الف لیلیٰ، مست فقیر، ہیر سیال، ساحی، بھیدی ہاتھ، ڈریمنگ گرل، انارکلی، نئی زندگی، کاروانِ حسن، انتقام، شہر خموشاں، وطن پرست، بمبئی کی سیٹھانی، پریم پجاری، چودھری، خزانچی، زمیندار، گوانڈی، پھول، پونجی، بیلی بجھوں، لال حویلی، گل بکاؤلی، پیلا جٹ، ملاپ، سونی مہینوال، خونی جادوگر، واحق ظفر۔

”تیری یاد“ 7 اگست 1948ء کو عید الفطر کے دن لاہور کے پربھات سینما میں ریلیز کی گئی جو میکلوڈ روڈ پر واقع تھا۔ بعد ازاں اس سینما کا نام بدل کر صنوبر رکھ دیا گیا۔ کاروباری اعتبار سے یہ فلم بری طرح ناکام ہو گئی کیونکہ تکنیکی طور پر یہ فلم بہت کمزور تھی۔ جب کہ کراچی میں ”تیری یاد“ 1949ء میں ایمپائر سینما میں نمائش پذیر ہوئی۔ اس سینما کا نام بھی بعد میں بدل کر قسمت سینما رکھ دیا گیا تھا۔ کراچی میں بھی اسے چند لوگوں نے ہی پاکستان کی پہلی فلم سمجھ کر دیکھا۔ اس طرح یہاں بھی فلاپ فلم کی حیثیت سے تماشائیوں کی توجہ حاصل نہ کر سکی۔ اس کے بعد سے آج تک یہ فلم پاکستان کے کسی بھی شہر کے کسی بھی سینما میں نمائش کے لیے پیش نہیں کی گئی۔ اب اس فلم کے پرنٹ کیسے ہیں؟ کہاں ہیں؟ کس کے پاس ہیں؟ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ”تیری یاد“ کے پرنٹ ضائع ہو گئے ہیں۔

کئی برس پیچھے کی بات ہے کہ "تیری یاد" کے فلم ساز دیوان سرداری لال کے صاحبزادے بھارت سے پاکستان آئے تھے اور ان کے حوالے سے یہ خبر بھی اڑی تھی کہ انہوں نے پاکستان میں فلم ایشیا کے ڈائریکٹر سے ملاقات کی تھی اور فلم ایشیا کے ادارے کو فلم "تیری یاد" کا ویڈیو دیا تھا۔ اس وقت کئی صحافیوں نے لکھا تھا اگر یہ خبر درست ہے تو ہم فلم ایشیا کے ڈائریکٹر سے گزارش کرتے ہیں کہ فلم "تیری یاد" کو اپنے ادارے سے ڈی وی ڈی پر ریلیز کریں یا اپنے چینل سے ٹیلی کاسٹ کریں تاکہ پاکستان کے لوگ اپنے ملک کی پہلی فلم دیکھ سکیں۔

"تیری یاد" کے فلم ساز دیوان سرداری لال اور ڈی پی سنگھ تھے۔ دیوان سرداری لال پنچولی آرٹس کے جنرل منیجر تھے۔ تقسیم ہند سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات کو دیکھ کر پنچولی آرٹس کے کرتا دھرتا بمبئی چلے گئے تھے اور پنچولی آرٹس کا سارا انتظام دیوان سرداری لال ہی سنبھالتے تھے۔

دیوان سرداری لال بڑے زیرک اور دور اندیش شخص تھے۔ انہوں نے اپنی ذاتی فلم بنانے کی منصوبہ بندی کی کہ اگر پنچولی صاحب واپس نہیں آئے تو وہ ایک فلم ساز کی حیثیت سے اپنا کیریئر برقرار رکھیں گے۔ اگرچہ ان دنوں لاہور کے حالات اچھے نہیں تھے لیکن انہوں نے اپنی منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنی فلم کی ابتداء کر دی۔

اس کی کہانی لکھوائی اور کہانی کی مناسبت سے آرٹسٹوں کا انتخاب کیا اور پردھان فلم اسٹوڈیو میں اس کی شوٹنگ شروع کروا دی۔ قیام پاکستان کے بعد پردھان اسٹوڈیو ملک بھگراج کے نام الاٹ کر دیا گیا اور اس کا نام بدل کر ملک اسٹوڈیو رکھ دیا گیا تھا۔

"تیری یاد" کی کہانی اور اسکرین پلے دیوان سرداری لال نے خود لکھی جب کہ اس کے مکالمے خادم محی الدین سے لکھوائے۔ اس کی موسیقی کمپوز کرنے کے لیے عنایت علی ناتھ کا انتخاب کیا جو ریڈیو پاکستان میں سازندے تھے اور اس فلم کی ہیروئن آشا پوسلے اور اس کی بہن رانی اور کرن کے والد تھے۔ نغمہ نگاروں میں تنویر نقوی، طفیل ہوشیار پوری اور قتیل شفائی شامل تھے۔ مگر تنویر نقوی اور طفیل ہوشیار پوری نے بس ایک ایک گیت لکھے تھے۔ باقی سارے نغمے قتیل شفائی نے تحریر کیے تھے۔ ان گیتوں کو آشا پوسلے، منور سلطانہ اور علی بخش ظہور کی آوازوں میں صدا بند کیا گیا تھا۔ دیوان سرداری لال نے اپنی اس فلم کی ہدایت کاری کے لیے داؤد چاند کا انتخاب کیا تھا جو 1938ء سے فلموں کی ہدایت کاری کر رہے تھے۔ ان کی پہلی فلم "سسی پنوں" تھی۔ اس فلم کی کوریوگرافر (ڈانس ڈائریکٹر) بھی آشا پوسلے تھیں جو فلم کی ہیروئن بھی تھیں جب کہ کاسٹ میں ناصر خان، آشا پوسلے، نذر، سردار محمد، نجمہ، رانی، کرن، شعلہ اور جہانگیر خان شامل تھے۔ اس یادگار فلم کے گیت درج ذیل ہیں۔

☆ او تیری یاد آئے، تیری یاد آئے۔ بیتی باتوں کے افسانے دہرائے (بول: تنویر نقوی۔ آواز: منور سلطانہ)

☆ ہمیں چھوڑ نہ جانا جی، منہ موڑ نہ جانا جی۔ او بھولے بالموا جی توڑ نہ جانا جی (بول: قتیل شفائی۔ آواز: منور سلطانہ)

☆ دکھ کی ماری ناری برسوں اپنے بھاگ کو روئی (بول: قتیل شفائی۔ آواز: منور سلطانہ)

☆ محبت کا مارا چلا جا رہا ہے۔ نہ راہوں کو جانے نہ منزل کو جانے (بول: قتیل شفائی۔ آواز: علی بخش ظہور)

☆ میں تتلی بن کر آئی جوبن نے لی انگڑائی۔ نیند نہ آئی جوانی بھرتی ہے اترائی (بول: قتیل شفائی۔ آواز: آشا پوسلے)

☆ چنچل جوانی ہائے جیا مورا ڈولے۔ پریم کہانی پنچھی بولے (بول: قتیل شفائی۔ آواز: آشا پوسلے)

☆ بیتی بہار چھائی خزاں۔ سارا چمن رو رہا ہے (بول: قتیل شفائی۔ آواز: آشا پوسلے)

☆ سپنے ٹوٹ گئے من میں پیار بسانے والے۔ ہم سے روٹھ گئے (بول: قتیل شفائی۔ آواز: علی بخش ظہور)

☆ بول بول بھری دوپہریا۔ میں کہاں کی تھی (بول: طفیل ہوشیار پوری۔ آوازیں: منور سلطانہ، علی بخش ظہور)

☆ کیا آئی ہے یاد سہانی۔ من کرے ہے آج من مانی (بول: قتیل شفائی۔ آواز: منور سلطانہ)

ان دس گیتوں کے علاوہ تین مزید گانے اور ریکارڈ کیے گئے تھے جو فلم میں شامل نہیں کیے گئے۔ وہ یہ ہیں۔

☆ کوئی من پہ میری چھائے رہے۔ کوئی اور بھی من میں آئے رہے (بول: قتیل شفائی۔ آواز: منور سلطانہ)

☆ برباد ہے کیوں میری امیدوں کا گلستاں (بول: قتیل شفائی۔ آواز: علی بخش ظہور)

☆ میرا دل دھڑک رہا ہے تیری یاد کے سہارے (بول: قتیل شفائی۔ آواز: منور سلطانہ)

"تیری یاد" کو پاکستانی فلمی صنعت کی پہلی ریلیز شدہ

فلم ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اسے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہ عید الفطر کے مبارک دن ریلیز ہونے والی بھی پہلی فلم ہے۔ آشا پوسلے اس فلم کی ہیروئن، ناصر خان ہیرو، سردار محمد ولن اور نذر کامیڈین تھے۔ جہانگیر خان کی یہ پہلی فلم تھی۔ اداکارہ شعلہ کی بھی یہ پہلی فلم تھی۔ رضا میر اس فلم کے عکاس تھے۔ انہوں نے 1946ء کی فلم "شہر سے دور" سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا اور اداکار کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ پاکستان میں یہ برسوں تک عکاسی کے شعبے سے وابستہ رہے۔ پھر ڈائریکٹر بن گئے اور کئی شاہکار فلمیں تخلیق کیں۔ ان کے صاحبزادے آصف رضا میر نے بھی بطور اداکار بڑی شہرت حاصل کی اور آج کل ان کے فرزند ارجمند احمد رضا میر اداکاری کر رہے ہیں۔ یہ فلم "تیری یاد" لاہور کے پردھان اسٹوڈیو میں بحال کی گئی تھی۔ ان دنوں لاہور میں مجموعی طور پر چھ نگار خانے تھے۔ اگرچہ تقسیم سے پہلے لاہور کی فلم انڈسٹری بمبئی اور کلکتہ کی فلم انڈسٹری کے مقابلے میں بہت چھوٹی تھی مگر یہاں کی اکثر فلمیں پورے ہندوستان میں کامیابی میں بمبئی اور کلکتے کی فلموں سے کم نہیں ہوتی تھیں۔

☆—☆

قتیل شفائی کا اصل نام اورنگ زیب خان تھا۔ وہ 1919ء کو ہری پور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کاروبار کرتے تھے۔ ہری پور میں ان دنوں دور دور تک علم و ادب کا نام و نشان نہیں تھا۔ علم و ادب کے ایسے بنجر علاقے میں جنم لینے والے لڑکے کو شعر و شاعری کا شوق کیسے پیدا ہوا؟ یہی کہا جا سکتا تھا کہ یہ اللہ کی دین تھی۔ جب وہ اسکول میں پڑھتے تھے تو انہوں نے ایک نعت لکھی اور اپنے ماسٹر صاحب کو دکھائی تو انہوں نے کہا۔ "یہ کس کی نعت ہے۔ تم نے کہاں سے نقل کی ہے؟"

"یہ میری نعت ہے۔ میں نے لکھی ہے۔"

استاد نے انہیں غور سے دیکھا اور ایک مصرع دیا اور کہا۔

"اس پر دوسرا مصرع لگاؤ۔"

کمسن اورنگ زیب خان نے ذرا سوچ کر دوسرا مصرع لگا کر شعر مکمل کر دیا۔ اب ماسٹر صاحب کو یقین آ گیا کہ اس لڑکے میں شاعری کے جراثیم موجود ہیں۔ انہوں نے کہا۔ "تم شاعری کرتے رہو، مگر اچھے شاعر بننے کے لیے ضروری ہے اچھے طالب علم بنو۔ جی لگا کر خوب تعلیم حاصل کرو۔" اورنگ زیب خان کے ابتدائی اساتذہ میں ایک صاحب حکیم محمد یحییٰ شفا کانپوری تھے جو اچھے خاصے شاعر بھی تھے۔ جب اورنگ زیب نے باضابطہ شاعری شروع کر دی تو اپنا تخلص قتیل رکھ لیا اور اس میں استاد شفا کانپوری کی نسبت سے شفائی کا اضافہ کر دیا۔ یعنی قتیل شفائی بن گئے۔

کرنا خدا کا یوں ہوا کہ قتیل شفائی ابھی کمسن ہی تھے کہ ان کے والد کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا اور انہیں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر والد کا کاروبار سنبھالنا پڑا، مگر

کہاں عاشق کجا کاج کی ہوس

کے مصداق، دلگداز اشعار لکھنے والے۔۔۔۔۔ بھلا کاروبار کہاں ہو سکا۔ یہ بس ان کے بس کی بات نہیں تھا۔ کاروبار ختم کر کے انہیں ملازمت کرنی پڑی۔ نوکری حاصل کرنے کے لیے انہیں ہری پور سے راولپنڈی آنا پڑا۔ یہاں انہیں ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں کلرکی کرنی پڑی۔ جہاں انہیں ماہوار 60 روپے تنخواہ ملتی تھی۔ کلرکی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری بھی جاری رہی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کی پہلی غزل لاہور کے ہفت روزہ "انتخاب" میں شائع ہوئی تھی جس کے مدیر قمر جلالی

زبیدہ خانم کے ٹاپ 10 پنجابی گانے

☆ سینے وچ میرا دل دھڑکے، دل دھڑکے نال اکھ پھڑکے ☆ ساڈا انجرا پیار کے یار بار ☆ چن تال پیار کرن والیا، نتیجے ہوندا اے ☆ پائل والو وچ اینڈے کے ویراں، توں دور چلی ☆ اساں جان کے میٹ لئی اکھ وے ☆ ولا نعمہ جا ماروا نظارہ لیکن دے ☆ میرا دل چناں کچ دا کھنڈ وا ☆ ساڈے انگ انگ وچ پیار تے جنگاں پائیاں ☆ ریشم دا لاچا چمک دے ☆ گوری گوری چاندنی دی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاں۔

خداداد صلاحیتوں کی مالک

زبیدہ خانم نے کسی استاد سے گلوکاری کی تربیت حاصل نہیں کی۔ ابتدائی عمر میں شادی بیاہ کی تقریبات میں سہیلیوں کے ساتھ ڈھولک پر گیت گانے لگیں۔ یہیں سے شوق نے مزید مہمیز کیا تو فلموں میں گانے کا شوق پیدا ہوا۔ لاہور آنے کے بعد لاہور ریڈیو سے باضابطہ گانے کا سفر شروع کیا۔ پہلے ہی گانے جو ایک پنجابی لوک گیت تھا، اس نے سننے والوں کو متاثر کیا اور کوئی سال بھر بعد انہیں ایک فلم "بلو" میں گانے کی آفر ہوئی۔ نذیر صاحب کی فلم "شہری بابو" سے شہرت ملی اور پھر انہوں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

آبادی تھے۔ قابلِ ذکر باتوں میں ایک بات یہ بھی تھی کہ جب ان کی عمر صرف بیس برس تھی تو انہوں نے اپنے آبائی شہر ہری پور میں علامہ اقبال کی برسی کے موقع پر 1939ء میں مشاعرہ کروایا تھا۔ ہری پور میں یہ کسی بھی قسم کا پہلا مشاعرہ تھا۔

قتیل شفائی نے ملازمت کے ساتھ ساتھ شعر و ادب سے بھی اپنے آپ کو وابستہ رکھا اور ان کی غزلیں اور نظمیں مستند ادبی جریدوں میں شائع ہوتی رہیں۔ جلد ہی وہ ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے اپنے آپ کو منوا چکے تھے۔ 1946ء کی بات ہے کہ انہیں لاہور کے مشہور ادبی رسالے ”ادبِ لطیف“ میں معاون ایڈیٹر کی ملازمت مل گئی اور وہ راولپنڈی سے لاہور آ گئے۔ اب ان کا ادب اور ادیبوں شاعروں سے تعلق وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ 1947ء میں تقسیم ہند کے بعد پاکستان عالم وجود میں آیا تو قتیل شفائی کو بھی اس دور کے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر بٹوارے سے پہلے جب دیوان سرداری لال نے اپنی ذاتی فلم ”تیری یاد“ شروع کی تو قتیل شفائی کو فلمی نغمہ نگاری کی دعوت دی۔ اس وقت تک قتیل شفائی صاحب دیوان ہو چکے تھے اور عوامی حلقوں میں بھی انہیں اچھی خاصی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ ”تیری یاد“ کے موسیقار نے احتیاطاً تنویر نقوی اور طفیل ہوشیار پوری سے بھی نغمہ نگاری کی بات کر رکھی تھی کہ اگر قتیل شفائی فلمی معیار پر پورے نہیں اترے تو حسبِ ضرورت دونوں مستند فلمی شاعروں سے تمام گیت لکھوائیں گے مگر عنایت علی ناتھ کو قتیل شفائی سے مایوسی نہیں ہوئی۔ پہلی فلم ہونے کے باوجود قتیل شفائی نے موسیقار ناتھ کی توقعات سے بڑھ کر نغمہ نگاری کی۔ لہٰذا انہوں نے سارے گیت قتیل شفائی ہی سے لکھوائے۔ صرف تنویر نقوی اور طفیل ہوشیار پوری سے بس ایک ایک گیت ہی تحریر کروائے۔

”تیری یاد“ کاروباری طور پر کامیاب تو نہ ہو سکی مگر بطور فلمی نغمہ نگار قتیل شفائی کے حصے میں کامیابی ضرور آئی اور انہیں دوسرے موسیقاروں نے اپنی فلموں میں گیت نگاری کی دعوت دینا شروع کر دی۔

فلم ”دو آنسو“ کے لیے موسیقار مبارک علی خان نے بھی قتیل شفائی سے اس کے گیت لکھوائے۔ یہ فلم دو ہدایت کاروں مرتضیٰ جیلانی اور انور کمال پاشا کی مشترکہ ڈائریکشن میں بنی تھی اور 1950ء میں ریلیز کی گئی تھی۔ اس فلم نے سلور جوبلی کی تھی اور اس کی کامیابی میں اس کی موسیقی اور گیتوں کا بھی بڑا حصہ تھا۔ اس فلم میں قتیل شفائی کا یہ گیت بہت مقبول ہوا تھا جسے منور سلطانہ کی آواز میں صدا بند کیا گیا تھا۔ ”معلوم نہیں کب ہو

میرے غم کا سویرا“

”دو آنسو“ کی خاص بات یہ تھی کہ یہ انور کمال پاشا کے والد حکیم احمد شجاع کے مشہور ناول ”باپ کا گناہ“ پر بنائی گئی تھی۔ واضح رہے کہ اسی ناول کی کہانی پر 1945ء میں بھی ”بھائی جان“ کے نام سے فلم بن چکی تھی اور غالباً 60ء کی دہائی میں بھی ”باپ کا گناہ“ کے نام سے بھی ایک فلم بنائی گئی تھی۔

1950ء ہی میں ریلیز ہونے والی سلور جوبلی فلم ”امانت“ میں بھی قتیل شفائی سے گیت نگاری کروائی گئی تھی اس کے موسیقار نذیر جعفری تھے۔ اس فلم کے گیت

☆ سن لے صدا ہماری۔ ہم پریم کے بھکاری آئے تری گلی میں (آوازیں: سلمیٰ بیگم اور علاؤالدین)

☆ دم مست قلندر بول کہ دنیا چار دنوں کا میلہ ہے (آوازیں: علاؤالدین، عطار محمد قوال اور ساتھی)

اس فلم کی دو خاص باتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ اداکارہ صبیحہ کی پہلی فلم تھی۔ دوسری یہ کہ اداکار علاؤالدین نے اس فلم میں گلوکاری کی تھی۔

قتیل شفائی کی 1953ء میں ریلیز ہونے والی فلم ”گمنام“ تھی جس کے گیتوں نے دھوم مچا دی تھی اور انہیں صفِ اول کے گیت نگاروں میں کھڑا کر دیا تھا۔

☆ بچپن کی یاد کو رو رو میں ڈھونڈتی ہوں تم کو۔ تم بھی مجھے پکارو (آواز: نور جہاں)

☆ لو چل دیے وہ ہم کو تسلی دیے بغیر۔ اک چاند چھپ گیا ہے اجالا کیے بغیر (آواز: نور جہاں)

☆ لے پیار بھرا زمانہ میرے پیارے بلم (آوازیں: نور جہاں، طفیل احمد)

اس فلم کے موسیقار پاک و ہند کے نامور موسیقار ماسٹر غلام حیدر تھے جو اس فلم کی نمائش کے تیسرے دن اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ یہ فلم اگرچہ کاروباری اعتبار سے کامیاب نہیں ہوئی تھی لیکن کئی باتوں کی وجہ سے فلمی تاریخ میں اسے خاص مقام حاصل ہے۔ پہلی خاص بات یہ تھی کہ ”گمنام“ کے کہانی نویس اور ہدایت کار سید امتیاز علی تاج تھے جنہیں اردو کا ممتاز ادیب سمجھا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ماسٹر غلام حیدر کی یہ آخری فلم تھی جس کی نمائش کے تیسرے ہی دن ان کا انتقال ہو گیا۔ ”گمنام“ کو اس بات کا بھی اعزاز حاصل ہوا کہ اس کے مکالمے نامور مزاح نگار شوکت تھانوی نے تحریر کیے اور اداکاری بھی کی۔ اس فلم کی یہ بات بھی خاص ہے کہ اس میں موسیقار طفیل احمد نے نور جہاں کے ساتھ گلوکاری بھی کی۔ ایک دوگانا

ریکارڈ کروایا۔ اس وقت تک وہ موسیقار نہیں بنے تھے۔ اس فلم میں ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم کا بھی ایک آئٹم تھا۔

1953ء ہی کی ایک فلم ''آغوش'' کے لیے قتیل شفائی نے صرف ایک گانا تحریر کیا تھا لیکن اپنی نغمہ نگاری کا لوہا منوالیا تھا۔ وہ گیت تھا ''محبت مسکرائی جھوم اٹھی ہر شے جوانی میں۔ کسی کا نام شامل ہو گیا میری کہانی میں'' (آوازیں: منور سلطانہ اور فضل حسین۔ موسیقی: ماسٹر عنایت حسین)

فلم ''آغوش'' کی خاص بات یہ تھی کہ اس کی کہانی سعادت حسن منٹو اور مکالمے احمد ندیم قاسمی نے لکھے تھے۔

قتیل شفائی کی نغمہ نگاری کے حوالے سے یہ بات تمام ناقدین اور مبصرین تسلیم کرتے ہیں کہ قتیل شفائی کو قتیل شفائی بنانے والی فلم ''قاتل'' ہے۔ مشہور تو وہ پہلے بھی تھے لیکن ''قاتل'' کے گیت لکھ کر انہیں بین الاقوامی سطح پر شہرت ملی۔ اس فلم نے اپنے گیتوں کی وجہ سے بھارت میں بھی دھوم مچادی تھی۔ کمال پکچرز کے بینر تلے بننے والی یہ فلم 1955ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ اس کے ہدایت کار انور کمال پاشا اور فلم ساز آغا جی اے گل تھے۔ موسیقی کی دھنیں ماسٹر عنایت حسین نے ترتیب دی تھیں۔ قتیل شفائی کا گیت ''الفت کی نئی منزل کو چلا تو بانہیں ڈال کے بانہوں میں، دل توڑنے والے دیکھ کے چل ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں'' (آواز: اقبال بانو)

اس سپرہٹ گیت کے بارے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قتیل شفائی نے یہ گیت خاص طور پر اقبال بانو ہی کے لیے لکھا تھا۔ سوال یہ ہوگا کہ کیوں؟ اقبال بانو ہی کے لیے کیوں لکھا تھا؟ تو اس کی وجہ یہ بات ہے کہ سال بھر پہلے گلوکارہ اقبال بانو کی دھماکا خیز آمد فلم ''گمنام'' (1954ء) میں سیف الدین سیف کے لکھے ہوئے اس گیت سے ہوئی تھی۔ ''تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے۔ پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے'' اس کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین تھے۔ اس گیت سے بے شمار سننے والے ہی متاثر نہیں ہوئے تھے۔ قتیل شفائی بھی ہوئے تھے اور ان کی زبردست خواہش تھی کہ انہیں بھی کسی فلم میں ایسا ہی کوئی سچویشن ملے تو وہ بھی ایسا ہی دھماکا خیز گیت لکھیں اور اسے اقبال بانو ہی سے گوائیں۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ان کی مراد اگلے سال پوری ہوئی جب انہیں فلم ''قاتل'' میں ایک ایسا ہی سچویشن ملا۔ ''قاتل'' کے موسیقار بھی ماسٹر عنایت حسین تھے۔ قتیل شفائی نے ماسٹر صاحب سے کہا۔ ''ماسٹر صاحب! آپ ایسی ہی کوئی جادو اثر دھن تیار کیجیے جیسا ''تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے'' کے لیے تیار کیا تھا۔''

زندگی نامہ

خاندانی نام: اورنگ زیب خان

ادبی نام: قتیل شفائی

مقام پیدائش: ہری پور

سن پیدائش: 24 دسمبر 1919ء

شعر و شاعری: اسکول کے زمانے سے ہی شعر گوئی شروع کر دی۔

یتیمی کا دکھ: کم عمری ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد کاروبار کرتے تھے۔ لہٰذا تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور والد کا کاروبار شروع کر دیا۔

ملازمت: ناتجربہ کاری اور کاروبار سے رغبت نہ ہونے کی وجہ سے کاروبار چھوڑ کر ملازمت کرنا شروع کر دی۔ راولپنڈی آ کر ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں 60 روپے ماہوار کے عوض کلرکی کرنے لگے۔ 1946ء میں ماہنامہ ''ادب لطیف'' کے معاون ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت کرنے لگے۔

فلمی گیت نگاری: پاکستان کی پہلی فیچر فلم ''تیری یاد'' سے فلمی نغمہ نگاری کی ابتداء کی جو آخری عمر تک جاری رہی۔ پاکستانی فلم کے لیے ہی نہیں بھارتی فلموں کے گیت بھی لکھے۔

فلم سازی: اپنی مادری زبان ہندکو میں ایک فلم ''قصہ خوانی'' کے نام سے بھی بنائی۔

''دیکھو ابھی کوشش کرتا ہوں۔''

وہ اور دور تھا۔ موسیقار ہو، گلوکار ہو یا نغمہ نگار سبھی لگ کر کام کرتے تھے اور چاہتے تھے ان کا ہر اگلا کام پچھلے سے بہتر ہو۔ ماسٹر عنایت حسین نے ''قاتل'' کے اس سچویشن کو پیش نظر رکھ کر دھن کمپوز کی اور اس پر قتیل شفائی نے بھی اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا اور اقبال بانو سے ہی ریکارڈ کروا کر اسے امر سنگیت کے درجے کو پہنچا دیا۔

''قاتل'' نے 1955ء میں پاکستان کے ساتھ ساتھ بھارت میں بھی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ قتیل شفائی کا تجربہ اور کوشش کامیاب ہوئی اور اقبال بانو کا یہ گیت بھی پہلے گیت کی طرح بے حد پسند کیا گیا۔ ''قاتل'' کا ایک اور گیت بھی خاص و عام میں مقبول ہوا۔

او مینا جانے کیا ہو گیا، کہاں دل کھو گیا (آواز: کوثر

پرویز ملک، پکچرائزیشن: صبیحہ خانم)

قتیل شفائی کے لیے 1955ء خوش بخت ثابت ہوا۔ اسی سال عیدالفطر کے موقع پر فلم "قاتل" نمائش کے لیے پیش کی گئی اس کے فلم ساز و ہدایت کار سید عطاء اللہ شاہ ہاشمی تھے۔ جب کہ ان کے شریک ہدایت کار کرشن کمار تھے۔ موسیقار بابا جی اے چشتی اور نغمہ نگار قتیل شفائی تھے۔ اس فلم کے لیے قتیل شفائی نے ایک لوری لکھی۔ جس کے بول تھے۔

راج دلارے

تو ہے دل میں بساؤں، تو ہے گیت سناؤں، او میری انکھیوں کے تارے

میں تو واری واری جاؤں، راج دلارے میری انکھیوں کے تارے

(آواز: کوثر پروین۔ موسیقی: بابا چشتی)

اس لوری نے گلوکارہ کوثر پروین کو شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا۔ یہ بابا جی اے چشتی، قتیل شفائی اور کوثر پروین کی مشترکہ کامیاب کاوش ہے۔ قتیل شفائی کے الفاظ کے چناؤ اور ان پر بابا جی نے کوثر پروین سے کیا دل گداز ادائیگی کروائی کہ جس کا جادو آج تک سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ پاک و ہند میں اس سے پہلے بھی لوریاں لکھی اور گائی گئیں، آئندہ بھی لکھی اور گائی جائیں گی مگر "قاتل" کی یہ لوری اپنی مثال آپ ہے۔

"انتظار" 1956ء کی سپرہٹ فلم ہے۔ جس کے فلم ساز، موسیقار اور کہانی نویس خواجہ خورشید انور تھے جب کہ شریک فلم ساز سلطان جیلانی تھے۔ یہ پاکستان میں خواجہ خورشید انور کی پہلی فلم تھی۔ قیام پاکستان سے پہلے وہ بمبئی میں موسیقار کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اس فلم کے ہدایت کار مسعود پرویز تھے۔ مکالمے امتیاز علی تاج نے لکھے تھے جب کہ گیت نگار قتیل شفائی تھے۔ اس فلم کی موسیقی اور گیت پاک و ہند میں بے حد پسند کیے گئے۔ جن میں چند یہ ہیں۔

☆ آ گئے گھر پردیسی، چن پردیسی (آواز: نور جہاں)

☆ چاند ہنسے دنیا بسے روئے میرا پیار، دکھ بھرے دل کے میرے ٹوٹ گئے تار (آواز: نور جہاں)

☆ چھن چھن چھن باجوں گی گن گن گاؤں گی۔ سیاں سوئے آ گیں گے ان کو جگاؤں گی (آواز: نور جہاں)

☆ آ بھی جا آ بھی جا او کیا کروں

مجھ پہ گزری ہے کیا، تیرے پیار میں (آواز: نور جہاں)

اس کے علاوہ بھی اس فلم کے کئی گیت مقبول ہوئے۔

1957ء میں قتیل شفائی کی ایک فلم "عشق لیلیٰ" کے گیتوں نے بھی دھوم مچادی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس فلم کے سارے گیت قتیل شفائی نے لکھے اور سارے کے سارے ہی پسند کیے گئے۔ اس فلم کے 15 گیتوں کے گراموفون ریکارڈ بنے، مارکیٹ میں آئے اور ریڈیو پاکستان سے بار بار سنوائے گئے۔ اس کے علاوہ گلوکار عنایت بھٹی کی آواز میں ایک مکمل سونگ (قصہ لیلیٰ مجنوں) اور تین عدد آئٹم، قطعات اور شعر کی صورت میں فلم میں شامل ہیں۔ یوں عنایت حسین بھٹی کے کل 4 گیت ہو جاتے ہیں۔ یہ فلم بھٹی صاحب کی فلمی گلوکاری کے سفر کی سب سے زیادہ ممتاز فلم ہے۔ موسیقار صفدر حسین نے بھی گیتوں کو ایسا سجایا کہ سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک ثابت ہوئے۔ "عشق لیلیٰ" کے کچھ گیت یوں ہیں۔

☆ پریشاں رات ساری ہے ستارو تم تو سو جاؤ۔ سکون مرگ طاری ہے ستارو تم تو سو جاؤ (آواز: اقبال بانو)

☆ جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے۔ محبت کا جنازہ جا رہا ہے (آواز: عنایت حسین بھٹی)

☆ نکل کر تیری محفل سے یہ دیوانے کدھر جائیں (آواز: عنایت حسین بھٹی)

☆ اداس ہے دل نظر پریشاں، قرار بن کر چلے بھی آؤ چلے بھی آؤ۔ ہمارے اجڑے ہوئے چمن میں بہار بن کر چلے بھی آؤ چلے بھی آؤ (آواز: سلیم رضا)

☆ اک ہلکی ہلکی آہٹ ہے اک ہلکا ہلکا سایا ہے۔ یہ کون خیالوں میں مجھ کو دیوانہ بنانے آیا ہے (آواز: اقبال بانو)

☆ چاند تکے چھپ چھپ کے اونچی کھجور سے

ملنے کو آئی تھی میں تو حضور سے (آوازیں: زبیدہ خانم، سلیم رضا)

☆ لیلیٰ لیلیٰ، اختر خوباں لیلیٰ (آواز: زبیدہ خانم)

"عشق لیلیٰ" نے کراچی میں سلور جوبلی کامیابی حاصل کی۔ اس کی وجہ اس کی موسیقی اور گیت کو قرار دیا گیا۔ یہ فلم 12 اپریل 1957ء کو لاہور اور کراچی میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے اسی دن اور تاریخ کو ایک اور فلم "لیلیٰ مجنوں" کے نام سے ریلیز ہوئی تھی جو ظاہر ہے کہ اسی لوک رومانوی کہانی پر بنائی گئی تھی۔ جس پر فلم ساز جگدیش چند آنند اور ہدایت کار منشی دل نے "عشق لیلیٰ" بنائی تھی۔ فلم "لیلیٰ مجنوں" کے فلم ساز و ہدایت کار انور کمال پاشا تھے اور موسیقار رشید عطرے تھے۔ گیت نگاروں میں تنویر نقوی، طفیل ہوشیارپوری اور حکیم احمد شجاع شامل تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ "لیلیٰ مجنوں" کے موسیقار رشید عطرے، "عشق لیلیٰ" کے موسیقار صفدر

حسین کے حقیقی ماموں اور ان کے استاد بھی تھے لیکن اتفاق دیکھیے کہ بھانجے کی فلم "عشق لیلیٰ" کے تمام ہی گیت ہٹ ہو گئے اور ماموں جان کی فلم "لیلیٰ مجنوں" کا ایک بھی گیت مقبول نہ ہوسکا۔ فلمی پنڈتوں کا کہنا ہے کہ صفدر حسین کی موسیقی اور قتیل شفائی کے گیتوں کا ہی کمال تھا جس نے "عشق لیلیٰ" کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔

قتیل شفائی کے گیتوں سے سجی اگلی فلم "زہر عشق" تھی جو 1958ء میں سلور اسکرین کی زینت بنی۔ اس کے فلم ساز خواجہ خورشید انور اور سلطان جیلانی تھے۔ جب کہ اس فلم کے ہدایت کار مسعود پرویز اور اس کی کہانی اور موسیقی خواجہ خورشید انور کی تھی۔ سارے گیت قتیل شفائی نے لکھے تھے۔ "زہر عشق" ایک معیاری فلم تھی۔ تکنیکی طور پر بہت مضبوط فلم تھی لیکن باکس آفس پر کامیابی حاصل نہ کرسکی۔ اس فلم کا ایک گیت امر ہوگیا۔

"موہے پیا ملن کو جانے دے ہے ری۔ موہے پیا ملن کو جانے دے" (آواز: ناہید نیازی)

خواجہ صاحب کی طرزیں عام طور پر خاصی مختلف ہوتی تھیں پھر قتیل شفائی کا یہ گیت تو خاص طور پر سحر زدہ کرنے والا تھا۔ کمپوزیشن کے لحاظ سے اس کی پکچرائزیشن بھی اعلیٰ معیار کی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس گیت کا صحیح لطف فلم دیکھتے وقت ہی آتا ہے۔ اس گیت اور اس کی موسیقی کا سحر آج بھی حیران کن ہے جو آج بھی سننے والوں کو متاثر کرتی ہے۔ "زہر عشق" کے دیگر گانے بھی اچھے ہیں مگر اس گیت کے آگے دب گئے۔

قتیل شفائی کو اگلے سال 1959ء میں ایک اور فلم ایسی ملی جس کے دو گیتوں نے ان کی شہرت اور مقبولیت میں مزید اضافہ کیا۔ یہ فلم "ناگن" تھی جس کے فلم ساز وزیر علی، ہدایت کار خلیل قیصر اور موسیقار صفدر حسین تھے۔ چار دانگ عالم میں دھوم مچانے والے گیت یہ تھے۔

☆ امبوا کی ڈالیوں پہ جھولنا جھلا جا۔ اب کے ساون تو سجن گھر آجا (آواز: اقبال بانو)

☆ سیاں جی کو ڈھونڈنے چلی۔ پھروں میں گلی گلی۔ جوگن بن کے (آواز: ناہید نیازی)

1960ء میں نمائش پذیر ہونے والی فلم "وطن" ایسی فلم تھی جس نے کوئی کامیابی حاصل نہیں کی۔ ایسی فلموں کو لوگ یاد بھی نہیں رکھتے مگر اس کے لیے لکھے ہوئے قتیل شفائی کے اس گیت کو گانے سننے کے شوقین آج بھی شوق سے سنتے ہیں۔

"سونے کی لونگ پہن کر میں چلی۔ میں تیری گلی او پیا تیری گلی"
(آواز: ناہید نیازی۔ موسیقی: ماسٹر عنایت حسین)

قتیل شفائی کی ادبی حیثیت

ادبی سرگرمیاں: فلمی نغمہ نگاری کے دور میں اپنی ادبی سرگرمیوں میں کمی آنے نہیں دی۔ پاکستان اور ہندوستان کے تمام معیاری ادبی جریدوں میں ان کی غزلیں اور نظمیں شائع ہوتی رہیں اور وہ پاک و ہند کے تمام بڑے مشاعروں میں شرکت بھی کرتے رہے۔ ان کے 20 شعری مجموعے بھی شائع ہوئے اور انہوں نے اپنی آپ بیتی بھی لکھی اور شائع کروائی۔

فلمی گیت: انہوں نے 201 پاکستانی اور ہندوستانی فلموں کے لیے کئی ہزار گیت لکھے۔ ان میں 7 پنجابی فلموں کے 21 گیت بھی شامل ہیں۔

خدمات کے صلے: ان کی ادبی خدمات کے صلے میں انہیں سرکاری سطح پر تمغہ حسن کارکردگی ملا۔ آدم جی ایوارڈ بھی انہیں حاصل ہوا اور چار نگار ایوارڈز ان کی چار فلموں میں بہترین نغمہ نگاری پر دیا گیا۔ یہ فلمیں اناڑی، ناگن، آگ اور سرکٹا انسان تھیں۔ پاکستان اور ہندوستان میں ان کے ادبی کارناموں پر مقالے لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی گئی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے نام پر ہری پور میں ان کے محلے کا نام "محلہ قتیل شفائی" رکھا گیا جب کہ لاہور میں ان کے گھر تک جانے والی سڑک کا نام بلدیہ لاہور نے قتیل شفائی اسٹریٹ رکھ دیا۔

انتقال پر ملال: 11 جولائی 2001ء کو 82 برس کی عمر میں ہوا۔

1960ء میں ریلیز ہونے والی اور سلور جوبلی کامیابی حاصل کرنے والی فلم "سلطنت" میں قتیل شفائی کا ملی نغمہ "قدم بڑھاؤ ساتھیو قدم بڑھاؤ" بہت مقبول ہوا۔ اس کے موسیقار بابا جی اے چشتی تھے اور اسے عنایت حسین بھٹی، آئرن پروین اور ساتھیوں نے گایا تھا۔ سیج دہلوی اس فلم کے فلم ساز اور محمد شفیع ڈار (ایس ایم ڈار، اسلم ڈار کے والد) ہدایت کار تھے۔

فلم ساز آغا جی اے گل اور ہدایت کار انور کمال پاشا کی سلور جوبلی فلم "محبوب" 1962ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ اس کے موسیقار رشید عطرے تھے۔ اس فلم کے دو گیت جو قتیل شفائی کے تحریر کردہ تھے عوامی فرمائش پر ریڈیو پاکستان سے بہت نشر ہوئے۔

☆ آنکھیں ملا کر بدل جانے والے۔ مجھے تجھ سے کوئی

…یت نہیں ہے (آواز: نور جہاں)

☆ سپنوں میں اڑی اڑی جاؤں (آواز: مالا)

قتیل شفائی کا ایک امر نغمہ کا درجہ حاصل کرنے والا گیت 1963ء کی فلم "عشق پر زور نہیں" کا ہے۔ یہ گیت تھا۔

دل دیتا ہے رو رو دہائی
کسی سے کوئی پیار نہ کرے
بڑی مہنگی پڑے گی یہ جدائی
کسی سے کوئی پیار نہ کرے (آوازیں: مالا اور سائیں اختر حسین)

اپنی مثال آپ اس گیت کو امر بنانے کا ایک نمایاں حصہ موسیقار ماسٹر عنایت حسین کا بھی ہے۔ اس فلم نے اپنی کہانی، ہدایت کاری اور موسیقی کی وجہ سے سلور جوبلی کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کے فلم ساز الیاس کاشمیری اور ہدایت کار شریف نیر تھے۔

کامیاب اور مقبول گیت لکھنے میں اپنا جواب آپ قتیل شفائی نے ہر دور میں اپنی نغمہ نگاری میں ایک نیا رنگ ایک نیا تاثر چھوڑا ایسے اس گیت کو دیکھئے "اے دل کسی کی یاد میں ہوتا ہے بے قرار کیوں، جس نے بھلا دیا تجھے اس کا ہے انتظار کیوں" (الگ الگ سلیم رضا اور نسیم بیگم نے گایا)

اس گیت کو قتیل شفائی نے فلم "اک تیرا سہارا" کے لیے تحریر کیا تھا جس کے فلم ساز آغا جی اے گل ہدایت کار نجم نقوی اور موسیقار ماسٹر عنایت حسین تھے یہ فلم بھی 1963ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کے دیگر گیت بھی مقبول ہوئے۔ جو یہ ہیں۔

☆ بادلوں میں چھپ رہا ہے چاند کیوں (آوازیں: سلیم رضا، نسیم بیگم)

☆ گھنگھور گھٹا لہرائی ہے
پھر یاد کسی کی آئی ہے
میرا ساتھی میرے پاس نہیں
میرے نیناں روئیں چھم چھم چھم (آواز: نسیم بیگم)

قتیل شفائی کے سدا بہار گیتوں سے آراستہ فلم "فرنگی" بھی تھی جو 1964ء میں ریلیز پذیر ہوئی تھی۔ "فرنگی" کے فلم ساز و ہدایت کار خلیل قیصر اور موسیقار رشید عطرے تھے اس فلم کے تقریباً سارے ہی گیت مقبول ہوئے تھے اور قتیل شفائی کی نغمہ نگاری کو چار چاند لگا دیا تھا۔ ان میں چند کے تیور دیکھئے۔

☆ آ بھی جا دلدارا
کب سے دل ہے پکارا
آ بھی جا دلدارا (آواز: نسیم بیگم)

☆ بن کے میرا پریمی آ
آئے گا اکبر خاناں
کہہ دوں گی دلبر جاناں
نکھرے رانجھے (آواز: نسیم بیگم)

اگلے برس 1965ء میں قتیل شفائی نے پھر ایک فلم کے گیت لکھ کر چار دانگ عالم میں دھوم مچا دی۔ جہاں جہاں اردو گیت اور غزل سنے جاتے تھے وہاں وہاں اس فلم کے ذریعے قتیل شفائی کے نام کا ڈنکا بجا۔ یہ فلم تھی "نائلہ" جس کے فلم ساز آغا جی اے گل ہدایت کار شریف نیر اور موسیقار ماسٹر عنایت حسین تھے۔ یہ اس دور کی پہلی رنگین فلم تھی جس نے اپنی کہانی، ہدایت کاری، اداکاری اور موسیقی کے اعلیٰ معیار کی وجہ سے گولڈن جوبلی کامیابی حاصل کی تھی۔ اس فلم میں صرف یہ ایک گیت حمایت علی شاعر کا تھا۔ "دور ویرانے میں اک شمع ہے روشن کب سے" باقی سارے گیت قتیل شفائی کے تحریر کردہ تھے۔

☆ غم دل کو ان آنکھوں سے چھلک جانا بھی آتا ہے

☆ اب ٹھنڈی آہیں بھر پگلی، جا اور محبت کر پگلی

اس گیت میں کتنی سادہ بات کی گئی ہے کہ دیکھا اس کا نتیجہ؟ ہم نہ کہتے تھے کہ محبت مت کرو۔ پھر ماسٹر صاحب کی بولوں کی مناسبت سے سادہ دھن جو سماعت کے راستے دل میں جا اترے۔ کیا کمال کے لوگ تھے۔ جن کی گیتوں کی کمپوزیشن لاجواب تھی وہیں گیتوں کے بول بھی انمول تھے۔

قتیل شفائی، جنہوں نے اپنے بارے میں خود کہا ہے۔ "نام کا تو قتیل ہے لیکن۔ اہل دل کے لیے شفائی ہے" وہ ایسے گیت نگار تھے جن کا ہر گیت پہلے والے گیت سے بڑھ کر جادو جگاتا تھا اور سننے والے کہتے تھے۔ "تم جگ جگ جیو مہاراج اور ایسے ہی جادو جگاتے رہو۔"

سلور جوبلی فلم "پائل کی جھنکار" جو 1966ء میں ریلیز ہوئی تھی اور جس کے فلم ساز آغا جی اے گل اور ہدایت کار نجم نقوی تھے جس کی موسیقی رشید عطرے نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم میں بھی قتیل شفائی نے یادگار گیت لکھ کر ایک نئی تاریخ رقم کی تھی۔ جن کی عوامی پسندیدگی کی وجہ سے ریڈیو پاکستان اور ایف ایم ریڈیو اسٹیشنوں سے انہیں بار بار نشر کیا جاتا تھا۔ چند گیت درج ذیل ہیں۔

☆ حسن کو چاند جوانی کو کنول کہتے ہیں
ان کی صورت نظر آئے تو غزل کہتے ہیں (آواز: سلیم رضا)

☆ میرے دل کے تار بجیں بار بار
ہوا تجھ سے پیار آ جا
ہوں بےقرار کروں انتظار
گئے تھیں بار، آ جا (یہ الگ الگ دو طرح سے ریکارڈ ہوئے)

ایک مہدی حسن کی آواز میں دوسرا مہدی حسن اور نسیم بیگم کی آوازوں میں۔ 1966ء میں ریلیز ہونے والی ایک اور فلم "دل میرا دھڑکن تیری" میں قتیل شفائی کے گیتوں نے ہر طرف دھوم مچا دی۔

☆ ترکِ الفت کا صلہ پا بھی لیا ہے میں نے۔ اب تو آجا کہ تجھے یاد کیا ہے میں نے (آواز: مہدی حسن)

☆ جھوم اے دل
وہ میرا جانِ بہار آئے گا (آواز: مسعود رانا)

☆ کیا ہے جو پیار تو پڑے گا نبھانا
رکھ دیا قدموں میں دل نذرانہ
قبول کر لو (ایک احمد رشدی کی آواز میں دوسرا احمد رشدی اور مالا کی آواز میں)

☆ تم پوچھو اور میں نہ بتاؤں
ایسے تو حالات نہیں (آواز: مالا)

اس فلم کے فلم ساز غلام مرتضیٰ، ہدایت کار ایم اے رشید اور موسیقار ماسٹر عنایت حسین تھے۔ اس فلم نے گولڈن جوبلی کامیابی حاصل کی تھی اور اس کامیابی کو بھی اس کی موسیقی اور گیتوں کا زبردست ذریعہ سمجھا گیا تھا۔

"نائلہ" قتیل شفائی کی ایک ایسی فلم تھی جس کے ایک گیت نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ یہ گیت تھا۔

مجھے آئی نہ جگ سے لاج
میں اتنے زور سے ناچی آج
کہ گھنگرو ٹوٹ گئے (آواز: مالا۔ موسیقی: [illegible])

اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ بھارتی گلوکار پنکج اداس نے بھی ریکارڈ کرایا اور اسے جگجیت سنگھ بھی اپنی محفلوں میں سناتے رہے اور بعض نامی گرامی قوال بھی اکثر اس گیت کا مکھڑا ترنگ میں سناتے ہیں۔

سرگزشت کے قارئین علی سفیان آفاقی سے بخوبی واقف ہیں جو نہ صرف ایک جید صحافی تھے بلکہ ایک فلم ساز ہدایت کار اور کہانی، مکالمہ نویس کی حیثیت سے بھی انہوں نے اچھا وقت گزارا ہے۔ انہی آفاقی صاحب کی ایک فلم تھی "سزا" جس کے لیے انہوں نے بھی قتیل شفائی کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اس فلم کے ہدایت کار ہمایوں مرزا اور موسیقار ناشاد تھے۔ آفاقی فلمز کے بینر تلے بننے والی یہ فلم 1969ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ یہ فلم باکس آفس کے معیار پر پوری نہ اتر سکی مگر اس کے دو گیت آج بھی تر و تازہ اور شگفتہ ہیں۔

☆ جب بھی چاہیں اک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ (آواز: مہدی حسن)

☆ تو نے بار بار کیا مجھے بےقرار
جا رے سانورے پیا
تیرا او کچھ لیا پیار (آواز: مالا)

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ قتیل شفائی نے بطور فلم ساز ایک فلم بھی بنائی تھی۔ ایک وقت تھا جب ہماری فلمی صنعت سے وابستہ کامیاب اداکار یا اداکارہ یا ہنرمند اس انڈسٹری سے کمایا ہوا پیسا اس صنعت پر بھی خرچ کرتے تھے۔ یعنی فلم سازی کے لیے سرمایہ کاری کرتے تھے۔ ذاتی فلمیں بناتے تھے جس کی وجہ سے باہر کے انویسٹرز پر انحصار کم تھا۔ فلم کامیاب ہو جاتی تو لگایا ہوا سرمایہ منافع کے ساتھ واپس آ جاتا۔ ناکام ہوتی تو رقم ڈوب جاتی تھی۔ قتیل شفائی نے بھی غالباً یہ سوچا کہ اس صنعت ہی سے اتنا کمایا ہے تو اس پر کچھ خرچ بھی کرنا چاہیے اور ایک فلم کا اعلان کر دیا کہ میں بھی بناؤں گا۔ انہوں نے سوچا کیوں نہ میں اپنی مادری زبان ہندکو میں فلم بناؤں اور انہوں نے 1970ء کے ایک شبھ موقع پر "قصہ خوانی" کے نام سے فلم شروع کر دی۔ شاعر تھے، حساب کتاب کے ماہر نہیں تھے۔ فلم سازی کے لیے جو منصوبہ بندی کی جاتی ہے، اس پر بھی سوچ بچار نہیں کی۔ ایسے حالات میں جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ ہوا۔ فلم بڑی مشکلوں سے کوئی دس برس کے بعد 1980ء میں مکمل ہو کر ریلیز ہوئی اور سپر فلاپ کا اعزاز حاصل کر کے ڈبوں میں بند ہو گئی۔

میں نے ایک ملاقات میں ان سے پوچھا تھا۔ "محترم! یہ آپ کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی تھی کہ فلم سازی کی اوکھلی میں سر ڈال دیا؟"

"ارے بھائی! بس مت ماری گئی تھی۔ اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"اتنے فلم سازوں ہدایت کاروں کو آپ نے سپرہٹ گانے لکھ کر دیے۔ کسی نے بھی آپ کو فلم سازی کی اونچ نیچ کے بارے میں نہیں بتایا؟"

"کسی کے بارے میں کیا عرض کروں۔ شکایت تو دوستوں سے ہے۔ جب میں دلدل میں اچھی طرح پھنس گیا تو

بولے۔ "یار! تم نے ہند کو فلم بنانے کا فیصلہ ہی غلط کیا تھا۔ کتنے لوگ ہیں اس کے دیکھنے والے؟"

"یہ بات تم لوگوں نے پہلے کیوں نہ بتائی؟"

"یہ سمجھ کر نہیں بتائی کہ تم کہیں برا نہ مان جاؤ۔"

عجیب منطق تھی ان لوگوں کی۔ میں نے تو سوچا تھا کہ کچھ اپنا پیسا لگاؤں گا کچھ تقسیم کاروں سے حاصل ہونے والا پیسا لگا کر فلم مکمل کرلوں گا مگر کسی تقسیم کار نے گھاس نہیں ڈالی۔ سب نے یہی کہا۔ "ہند کو فلم دیکھنے والے لوگ ہی کتنے ہیں؟ کہ ہم اسے خریدیں؟"

میں نے ان سے کہا۔ "کاش کہ اس وقت ہماری آپ سے ملاقات ہوجاتی تو۔۔۔"

"یار! اور بھی تو تمہاری طرح سمجھتی تھے۔ انہوں نے بھی مجھے کوئی گائیڈ نہیں کیا جس طرح اب سب باتیں کررہے ہیں۔ اس وقت کسی نے ایسی بات نہیں کی۔"

"آپ کی ہمت اور حوصلے کی داد دوں گا کہ ایسے نامساعد حالات میں بھی آپ نے "قصہ خوانی" کا قصہ اختتام تک پہنچایا۔"

"ہاں!" انہوں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "فلمی نغمہ نگار کی آمدنی ہی کتنی ہوتی ہے۔ بال بچوں اور گھر بار کے اخراجات سے کٹوتی کرکے فلم مکمل کرنا واقعی بڑا صبر آزما کام تھا۔"

1971ء میں قتیل شفائی نے پھر ایک سپرہٹ گانے کی نغمہ نگاری کی تھی یہ فلم تھی "سلام محبت" اور اس کا مقبول ترین گیت تھا۔ "کیوں ہم سے خفا ہوگئے اے جانِ تمنا۔ بھیگے ہوئے موسم کا مزہ کیوں نہیں لیتے" (آواز: مہدی حسن)

آغا جی اے گل "سلام محبت" کے فلم ساز اور ایس ٹی زیدی ہدایت کار تھے جب کہ موسیقی کی دھنیں دو موسیقاروں خواجہ خورشید انور اور رشید عطرے نے ترتیب دی تھیں دیگر گانے بھی پسند کیے گئے تھے۔ اس فلم نے اپنی موسیقی اور گیتوں کے سہارے سلور جوبلی کامیابی حاصل کی تھی۔

ہر فلم کا ہر گیت ایک جیسے معیار کا نہیں ہوتا۔ بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی نغمہ اتنا مقبول ہوجاتا ہے کہ دوسرے اچھے گیت بھی اس کے اثر سے ماند پڑ جاتے ہیں ایسا ہی ایک نغمہ "ہر آدمی الگ سہی مگر انگ ایک ہے۔ جدا جدا ہیں صورتیں لہو کا رنگ ایک ہے" (آواز: مہدی حسن) تھا جس نے 1972ء کی فلم "زندگی ایک سفر ہے" کو سلور جوبلی کے معیار اور کاروبار کا رتبہ دلایا۔ یہ فلم ساز لطیف بٹ اور ہدایت کار ایس ایم یوسف کی فلم تھی۔

قتیل شفائی کے گیت پاکستان کے علاوہ بھارت میں بھی بڑے شوق سے سنے جاتے تھے۔ ان کی مقبولیت کی وجہ سے کئی بھارتی فلم سازوں نے ان سے اپنی فلموں کے گیت لکھوائے۔ ایسی فلموں میں پھر تیری کہانی یاد آئی، وقت ہمارا ہے، سُر، ناراض، دیوانہ تیرے نام کا بڑے دل والا قابلِ ذکر ہیں۔ چند بھارتی فلموں کے چند گیتوں کے مکھڑے

☆ شاعرانہ ہے زندگی کی فضا
آپ بھی زندگی کا مزہ لیجیے
(آواز: الکا یاگنک۔ موسیقی: انو ملک۔ فلم: پھر تیری کہانی یاد آئی۔ 1993ء میں ریلیز ہوئی)

☆ میں نے پی یا تو نے پی
ارے بات ایک ہی ہوئی
(آوازیں: الکا یاگنک اور محمد عزیز۔ موسیقی: ندیم شیرون ریلیز 1993ء فلم: وقت ہمارا ہے)

☆ آج ہم نے دل کا قصہ تمام کردیا
خود بھی پاگل ہوئے تم کو بھی پاگل کردیا
(آوازیں: کمار سانو اور کویتا کرشنا مورتی۔ موسیقی: انور سردار ملک المعروف انو ملک۔ فلم: سُر۔ ریلیز 1993ء)

☆ سنبھالا ہے میں نے بہت اپنے دل کو
زبان پر ترا پھر بھی نام آرہا ہے
(آواز: کمار سانو۔ موسیقی: انو ملک۔ فلم: ناراض، ریلیز 1994ء)

قتیل شفائی نے یہ فلمیں اپنی عمر کے آخری حصے میں کیں۔ وہ چونکہ مشاعروں کے لیے بھارت بلائے جاتے تھے اس لیے بھارتی فلم سازوں اور موسیقاروں نے بھی ان سے فیض اٹھانا شروع کیا۔ یوں تو مشاعروں میں وہ بہت پہلے سے مدعو کیے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے ایسے ہی مشاعرے کے لیے بھارت میں اپنی نغمہ نگاری کے حوالے سے ایک واقعہ سنایا تھا۔ ان کے بقول۔ "میں اور حبیب جالب نئی دہلی کے ایک ریسٹورنٹ میں جائے پینے گئے تو دیکھا وہاں آنے والے گاہک پیسے دے کر اپنی فرمائش کے فلمی گانے بجواتے ہیں۔ ان میں پاکستانی گیت بھی تھے۔ جالب بولے۔ "چلو یار! ہم بھی فرمائش کرکے اپنے گانے بجواتے ہیں۔"

"اور اگر ہمیں کسی نے پہچان لیا تو۔۔۔؟"

"ارے نہیں یار! یہاں ہمیں کون پہچانے گا۔"

ابھی ہم یہ باتیں کررہے تھے کہ کسی کی فرمائش پر میرا فلم "قاتل" کا گیت بجادیا گیا۔

الفت کی نئی منزل کو چلا تو ڈال کے بانہیں بانہوں میں
دل توڑنے والے دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

اور ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے اور ہماری چائے کا مزہ دوبالا ہو گیا۔

اگرچہ قتیل شفائی کو شہرت کی بلندیوں پر لے جانے میں ان کی فلمی گیت نگاری کا بڑا نمایاں حصہ ہے مگر وہ اپنے آپ کو ادبی شاعری کی حیثیت سے شمار کروانے کو اہمیت دیتے ہیں اور فلمی شاعری کو روزگار کا ذریعہ گردانتے ہیں۔

ایک وقت تھا کہ خالص ادبی لوگ فلمی گیت نگاروں کو ادب میں کوئی خاص مقام دینے کو تیار نہیں تھے لیکن قتیل شفائی نے اپنے چند ہم عصر ادبی شاعروں کے ساتھ مل کر یہ ثابت کیا کہ فلمی گیت بھی شاعری کا ایک حصہ ہے۔

قتیل شفائی نے بھرپور فلمی نغمہ نگاری کرنے کے باوجود اپنی خالص ادبی شاعری بھی جاری و ساری رکھی اور برصغیر ہند و پاک کے تمام ادبی رسالوں اور میگزین میں ان کی نگارشات شائع ہوتی رہیں اور وہ مشاعروں میں بھی شرکت کرتے رہے۔ ان کے 20 شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو ان ناموں پر شائع ہوئے۔

ہریالی، گجر، جلترنگ، روزن، جھومر، مطرب، چھتنار، گفتگو، پیراہن، آموختہ، ابابیل، برگد، گھنگرو، سمندر میں سیڑھی، پھوار، صنم، پرچم جب کہ انتخاب کے نام سے منتخب کلام کا مجموعہ الگ ہے۔ اس کے علاوہ "گھنگرو ٹوٹ گئے" کے نام سے انہوں نے اپنی آپ بیتی بھی لکھی ہے۔

ان کے بیشتر کلام کے تراجم ہندی، گجراتی، چینی اور روسی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ قتیل شفائی اردو میں حفیظ جالندھری کو گیت نگاری کا بانی اور تنویر نقوی کو فلمی گیتوں کا بانی گردانتے ہیں۔ تنویر نقوی اور ساحر لدھیانوی وہ شاعر ہیں جنہوں نے فلمی گیت نگاروں کو بھی ادبی شاعر تسلیم کروایا جس پر قتیل شفائی نے مہر ثبت کر دی۔ ان سب نے فلموں میں گیت نگاری کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی وقت دیا جب کہ مجروح سلطان پوری اور شکیل بدایونی وغیرہ جب فلم میں گئے تو اس کے بعد ادب کی طرف توجہ نہیں دی۔

قتیل شفائی کو حکومت پاکستان کی طرف سے صدارتی تمغۂ حسن کارکردگی سے نوازا گیا جب کہ انہیں آدم جی ادبی انعام بھی دیا گیا۔ بھارت کے امیر خسرو ایوارڈ سے بھی انہیں نوازا گیا جب کہ ان کی فلمی گیت نگاری پر انہیں ملک کا سب

ناصر خان کی کچھ فلموں کے کچھ مقبول گیت

ڈھونڈو ڈھونڈو رے ساجنا میرے کان کا بالا (فلم: گنگا جمنا)، دو ہنسوں کا جوڑا بچھڑ گیو رے (فلم: گنگا جمنا)، آ جا میری جان سنڈے کے سنڈے (فلم: شہنائی)، جوانی کی ریل چلی جائے رے (فلم: شہنائی)، مار کٹاری مر جاؤں (فلم: شہنائی)، کبھی تم خواب میں بھی صورت دکھا جاتے تو کیا ہوتا (فلم: شاہدہ)، پردے ہی پردے میں اس ظالم نے رسوا کر دیا (فلم: شاہدہ)، کیسی خوشی کی ہے رات ہم میرے ساتھ (فلم: نگینہ)، چاندنی راتوں میں جس دم یاد آ جاتے ہو تم (فلم: نازنین)، یہ جوانی یہ حسین رات خدا خیر کرے (فلم: خوب صورت)۔

سے بڑا عوامی ایوارڈ نگار ایوارڈ ان کی چار فلموں پر بہترین نغمہ نگاری پر دیا گیا۔

فلم "انار کلی" میں 1958ء کا ایوارڈ، فلم "نائلہ" پر 1965ء کا ایوارڈ، فلم "آگ" پر 1979ء کا ایوارڈ جب کہ چوتھا نگار ایوارڈ فلم "سر کٹا انسان" پر ملا۔ اس کے علاوہ 1999ء میں ان کی طویل فلمی خدمات پر نگار کا لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ بھی دیا گیا۔

قتیل شفائی کی ادبی خدمات کے سلسلے میں پاکستان اور بھارت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ان پر ایسے مقالے بھی لکھے گئے ہیں جنہیں لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری تک حاصل کی گئی ہے جب کہ ان کی نظمیں اور غزل نصابی کتب میں بھی شامل کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں بھارت کی مگدھ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے "قتیل شفائی کے ادبی کارنامے" کے عنوان سے مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی جب کہ صوبہ مہاراشٹر میں ان کی دو نظمیں نصاب کی کتاب میں شامل ہیں۔ ہمارے ہاں بھی بہاولپور یونیورسٹی کی دو طالبات نے ایم اے کے لیے قتیل شفائی پر مقالے تحریر کیے ہیں۔ ڈاکٹر پروفیسر اشفاق احمد "آشفتہ" مشہور شاعر اور محقق اور افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے "قتیل شفائی فن و شخصیت" کے موضوع پر مقالہ لکھا۔ اس پر انہیں 19 اکتوبر 2016ء کو جز اردو یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل ہوئی۔

قتیل شفائی نے بطور شاعر بھرپور زندگی گزاری۔ ادبی شاعری کی حیثیت سے بھی اور فلمی نغمہ نگار کے طور پر بھی اعلیٰ اور

بلند معیار کی شاعری کی۔ فلمی گیت نویسی کے دور میں بھی اپنی ادبی کاوشیں جاری رکھیں اور اپنے ادبی معیار کو متاثر ہونے نہیں دیا ایک اندازے کے مطابق انہوں نے 201 پاکستانی اور بھارتی فلموں کے لیے ڈھائی ہزار گیت لکھے۔ ان میں سات عدد پنجابی فلموں کے 21 گیت بھی شامل ہیں۔ ان کا انتقال پُرملال 11 جولائی 2001ء کو 82 برس کی عمر میں ہوا۔ ان کے دوست انجم جاوید نے ان کی وفات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''قتیل شفائی کی زندگی کا خستہ چھتنا گھنگھور بالآخر موت نے توڑ دیا۔''

قتیل شفائی بہت خوش نصیب تھے کہ ان کی زندگی میں بھی ان کو اچھے چاہنے والے ملے اور ان کی موت کے بعد بھی ان کی چاہت لوگوں کے دلوں میں آج بھی زندہ ہے۔ ان کے انتقال کے بعد جلد ہی لاہور اور اہل محلہ نے ان کے گھر جانے والی سڑک کا نام قتیل شفائی اسٹریٹ رکھ دیا۔ اسی طرح ہری پور میں جہاں وہ رہا کرتے تھے اس جگہ کا نام محلہ قتیل شفائی رکھا گیا ہے۔ قتیل شفائی بہت اچھے شاعر اور نغمہ نگار ہی نہیں تھے بہت اچھے انسان بھی تھے۔ ان کے بارے میں بقول سرور بارہ بنکوی یہ کہنا غلط نہیں ہوگا۔

جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

☆—☆

اللہ نے ناصر خان کو یہ مرتبہ دیا تھا کہ وہ پاکستان کی ریلیز ہونے والی پہلی فیچر فلم ''تیری یاد'' کا ہیرو بنیں اس لیے انہیں بمبئی سے بلا کر اس فلم میں شامل کیا گیا۔ ''تیری یاد'' کے حوالے سے مجھے یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس تحریر میں ان کا بھی کچھ ذکر خیر ہو جائے کیونکہ ہمارے ہاں ان کے بارے میں عام طور پر لوگ یہی جانتے ہیں کہ وہ برصغیر ہندو پاک کے لیجنڈ فنکار دلیپ کمار کے بھائی تھے اور انہوں نے ''تیری یاد'' کے علاوہ ہدایت کار لقمان کی فلم ''شاہدہ'' میں بھی ہیرو کی حیثیت سے کام کیا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد یہاں سب سے پہلے جس فلم کا آغاز ہوا تھا جس کی فلم بندی شروع ہوئی تھی وہ ہدایت کار لقمان کی فلم ''شاہدہ'' تھی۔ اب اگر ریلیز ہونے والی پہلی فلم کو شمار کیا جائے یا پاکستان میں مکمل ہونے والی سب سے پہلی فلم کے تناظر میں دیکھا جائے تو دونوں اعتبار سے ناصر خان پاکستان فلم انڈسٹری کے پہلے ہیرو کہلاتے ہیں۔ کیونکہ ''تیری یاد'' اور ''شاہدہ'' دونوں ہی فلموں میں ناصر خان نے ہیرو کا کردار کیا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے کریڈٹ پر پاکستان کی صرف یہی دو فلمیں تھیں۔ اس کے بعد وہ دوبارہ انڈیا چلے گئے۔

ناصر خان کا بنیادی تعلق پشاور کی اعوان برادری سے تھا جو ہندکو زبان بولتے تھے۔ ان کے والد لالہ غلام سرور خان متحدہ ہندوستان کے دور میں فروٹ مرچنٹ تھے۔ لالہ سرور خان کے فرزندوں میں یوسف خان (دلیپ کمار)، ناصر خان، ایوب خان (کہانی نویس) اور اسلم خان شامل تھے۔ یہ خاندان 1940ء میں کاروباری سلسلے میں بمبئی شفٹ ہو گیا تھا۔ جہاں یوسف خان کی اتفاقیہ طور پر فلمی دنیا میں انٹری ہوئی اور وہ دلیپ کمار کے نام سے ''جوار بھاٹا'' نامی فلم کے ہیرو بن گئے۔ یہ فلم 1944ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

دلیپ کمار کے بعد ان کے بھائی ناصر خان کو بھی فلمی دنیا میں متعارف کرایا گیا اور 1945ء میں منظر عام پر آنے والی فلمستان لمیٹڈ کی پروڈکشن ''مزدور'' میں ہیرو کے کردار میں انہیں پیش کیا گیا۔ اس فلم کے ہدایت کار نتین بوس تھے۔ دلیپ کمار کی پہلی تین فلمیں ناکام ثابت ہوئی تھیں لیکن ناصر خان کی پہلی فلم کامیاب ہوئی اور دیگر فلموں کے لیے ان کا راستہ استوار ہو گیا۔ پھر فلمستان لمیٹڈ نے اپنی اگلی فلم ''شہنائی'' میں انہیں اس وقت کی معروف اداکارہ ریحانہ کے مقابل ہیرو لیا۔ ہدایت کار پی ایل سنتوشی اس کے ہدایت کار تھے۔ یہ فلم 1947ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اسی سال اسی ادارے کی ایک اور فلم ''سندور'' میں بھی ناصر خان نے کشور ساہو کی رفاقت میں کام کیا۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد جو فلم شروع ہوئی وہ ہدایت کار لقمان کی فلم ''شاہدہ'' تھی۔ کچھ پہلے ہی انہیں ''تیری یاد'' میں بطور ہیرو پیش کیا گیا۔ ''شاہدہ'' میں ان کے مقابل اداکارہ شمیم ہیروئن تھیں جو بعد میں انور کمال پاشا کی شریک حیات بن گئیں جب کہ ''تیری یاد'' میں ان کی ہیروئن آشا پوسلے تھیں۔ دونوں فلمیں چونکہ ناکام ہو گئیں اس لیے ناصر خان نے پاکستانی فلموں اور فلم انڈسٹری سے مایوس ہو کر یہاں ٹھہرنا اور یہاں کی مزید فلموں میں کام کرنا مناسب نہیں سمجھا اور واپس بمبئی چلے گئے۔

بھارت واپس گئے تو ان کو دوبارہ فلمیں ملنے لگیں۔ 1951ء میں ان کی چھ فلمیں ریلیز ہوئیں جن میں انہوں نے مرکزی کردار ادا کیے۔ یہ فلمیں روپندر روپ کی فلم ''ہمیشہ'' (ہیروئن نوتن) سوریا کمار کی فلم ''نخرے'' (ہیروئن گیتا بالی) ایم صادق کی فلم ''خزانہ'' (ہیروئن مدھوبالا) جی پی پوار کی فلم ''پھولوں کا ہار'' (ہیروئن گیتا نظامی اور نگار سلطانہ)، دھرم سیسے

کی فلم "سوداگر" (ہیروئن ریحانہ) اور امجد خان کے چچا امین کاردار کی فلم "نازنین" (ہیروئن مدھوبالا)۔

1952ء میں بھی ناصر خان کی چھ فلمیں نمائش پذیر ہوئیں۔ نجم نقوی کی فلم "آسمان" میں شیاما ان کی ہیروئن تھیں۔ رام کملانی کی فلم "ہنگامہ" اور کشور شرما کی فلم "شیشم" میں نوتن ان کی ہیروئن تھیں۔ اداکارہ و گلوکارہ ثریا نے بھی ناصر خان کے مقابل دو فلموں "لال کنور" اور "خوبصورت" میں ہیروئن کا رول کیا تھا۔ پہلی فلم کے ہدایت کار رویندر دوے اور دوسری فلم کے ڈائریکٹر ایس ایف حسنین تھے۔ آئی ایس جوہر نے اپنی فلم "شریمتی جی" میں ناصر خان کے ساتھ شیاما کو ہیروئن بنایا۔

ناصر خان نے 1953ء کی دو فلموں میں ہیرو کا رول کیا۔ جگا کماری کے ساتھ "دائرہ" میں جس کے ہدایت کار کمال امروہوی تھے جب کہ دوسری فلم تھی آر ڈی ماتھر کی "آغوش" جس میں ان کی ہیروئن تھیں نوتن۔

1954ء میں ناصر خان کی ایک ہی فلم "ستارے" منظر عام پر آئی۔ اس کے ہدایت کار کے پی لال تھے جن کی یہ پہلی فلم تھی جس میں ناصر خان کا کلیئر اداکارہ نرگس سے بنایا گیا تھا۔

بمبئی ٹاکیز کے لیے ہدایت کار رویندر دوے کی فلم "[illegible]" میں ناصر خان کے ساتھ اداکارہ جبین ہیروئن تھیں۔ یہ فلم 1955ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اسی سال کی دوسری فلم "انعام" تھی جس میں ناصر خان کی ہیروئن ثریا تھیں۔ "سوسائٹی" بھی اسی برس ریلیز ہوئی تھی۔ یہ شاہد لطیف کی فلم تھی جس میں ناصر خان کی ہیروئن نمی تھیں۔ 1955ء ہی کی ایک اور فلم "جواب" تھی جس میں ناصر خان نے بلراج ساہنی اور گیتا بالی کی رفاقت میں اداکاری کی تھی اس کے ڈائریکٹر اسماعیل میمن تھے جب کہ اس کی موسیقی ناشاد نے ترتیب دی تھی۔

اگلے برس 1956ء میں ریلیز ہونے والی فلم "گرہلا" کے ہیرو ناصر خان اور ہیروئن بیگم پارہ تھیں۔ اسی فلم کے دوران بیگم پارہ اور ناصر خان ازدواجی بندھن میں بندھ کر فلمی ہیروئن اور ہیرو بن گئے۔ یاد رہے کہ بیگم پارہ اور ان کے بھائی عارف الحق نے اپنے والدین کی مرضی کے برعکس فلمی دنیا سے رشتہ جوڑا تھا۔ ان کے والد اپنے وقت کے نامی گرامی جج تھے۔ ان کا نام احسان الحق تھا۔ بیگم پارہ نے 1944ء سے 1957ء تک مسلسل فلموں میں اداکاری کی پھر 50 سال بعد 2007ء میں آخری بار فلم "ساوریا" میں سینما اسکرین پر نظر آئیں۔ بیگم پارہ برصغیر کی وہ پہلی اداکارہ تھیں جس کی تصویر دنیا کے مقبول ترین میگزین "ریڈرز ڈائجسٹ" نے اپنے سرورق پر شائع کی۔

بیگم پارہ اور ناصر خان کا ایک بیٹا ایوب خان بھی انڈین فلموں اور ٹی وی ڈراموں میں ہیرو کے طور پر کام کر چکا ہے۔ بیگم پارہ اور ناصر خان کی پہلی فلم "گرہلا" کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس کے موسیقار ناشاد ہی تھے۔ 1956ء کی دیگر فلموں میں "چار مینار" میں ناصر خان کی ہیروئن جبین تھیں اور یہ رویندر دوے کی تھی۔ زمیندار کی فلم "سمندری ڈاکو" میں نادرہ نے ناصر خان کے مقابلے میں ہیروئن کا رول کیا تھا۔ اس برس ریلیز ہونے والی ناصر خان کی ایک فلم "جلاد" بھی تھی جس کے موسیقار ناشاد تھے۔

اگلے سال 1957ء میں نوتیت رائے کی فلم "آرتی" میں ناصر خان کی ہیروئن بیگم پارہ تھیں۔ اداکار یعقوب نے بھی اس میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

"آرتی" کے بعد ناصر خان کی مارکیٹ ویلیو کافی نیچے آ گئی تھی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ کئی نئے ہیرو آ گئے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ناصر خان کے سر کے بال بھی جھڑ گئے تھے۔ کئی سال بعد ان کے بھائی دلیپ کمار نے ذاتی فلم "گنگا جمنا" بنائی تو ناصر خان کو بھی لیا۔ دونوں نے فلم میں بھی بھائیوں کا رول کیا۔ دلیپ کمار کا نام گنگا اور ناصر خان کا نام جمنا تھا۔ ہیروئن وجنتی مالا تھیں۔ یہ فلم بہت پسند کی گئی۔ نتن بوس کی ڈائریکشن میں بننے والی فلم "گنگا جمنا" 1961ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

اسی سال ہدایت کار شری رام کی فلم "سایہ" میں بھی ناصر خان نے اداکاری کی تھی۔ پھر 1972ء میں انہوں نے تپن سنہا کی فلم "زندگی زندگی" میں انہوں نے اداکاری کی۔ ناصر خان کی 1973ء کی فلم "یادوں کی بارات" تھی جس کے ہدایت کار عامر خان کے ماموں ناصر حسین تھے۔ عامر خان نے اس فلم میں چائلڈ اسٹار کی حیثیت سے کام کیا تھا۔

ناصر خان کی زندگی کی کتاب 3 مئی 1974ء کو بند ہو گئی۔ اس دار فانی سے کوچ کرنے کے بعد ان کی آخری فلم "بیراگ" 1976ء میں ریلیز ہوئی جس میں دلیپ کمار اور سائرہ بانو نے کلیدی کردار کیے تھے۔

ناصر خان نے "مزدور" سے "بیراگ" تک 34 فلموں میں کام کیا جن میں دو پاکستانی فلمیں بھی شامل ہیں۔ وہ صف اول کے ہیرو تو نہ بن سکے مگر پاکستانی فلموں کی تاریخ میں انہیں پاکستان کے پہلے فلمی ہیرو کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

++

دیوانگی

ارشد ابرار ارش

علاقائی کہانیاں سینہ بہ سینہ چلتی ہیں۔ مشہور ہوتی رہتی ہیں۔ گیتوں کی شکل میں پھیلتی رہتی ہیں۔ چولستان کے صحرا میں سانول اور بھاگ بھری کی پریم کہانی بھی گیتوں میں، بانسری کی تانوں میں سفر کرتی ہوئی آج بھی تازہ ہے۔

چولستان کے صحرا سے ایک دلچسپ کتھا

عشق انسان کے لیے پانی کے جیسا ہے لازم بھی اور بے رنگ بھی مگر عشق کا اپنا ایک رنگ ہے وہ رنگ جو دکھائی ہی نہیں دیتا۔ عشق کائنات کے رنگوں میں سب سے جدا رنگ ہے۔ سب سے الگ رنگ۔ دیکھنے کو انسانی آنکھ آج تک عشق کا رنگ نہیں دیکھ پائی مگر یہی عشق کا رنگ جب بنی آدم پر چڑھتا ہے تو اس کے سارے رنگ اتار کے اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے اور پھر جب کسی پر عشق کا رنگ چڑھ جائے تو اسے دنیا کا کوئی اور رنگ نظر ہی نہیں آتا۔ اس کی تو دنیا ہی الگ ہو جاتی ہے۔ وہ جہان کے منطقی اصولوں اور ضوابط سے ہی انکاری ہو جاتا ہے کیونکہ عشق کا نہ تو کوئی قاعدہ ہے

اور نہ کوئی قانون۔
عشق تو بس جنون ہے صرف جنون۔ محبوب کا جنون۔ عشق کو تو صرف محبوب کی چاہ، عشق دیکھے تو صرف یار کی راہ۔
عشق مجازی ہو تو قیس بن کے صحرا میں پھر بھی رسوا تا ہے اور فرہاد سے پہاڑوں کے سینے کھدوا کر دودھ کی نہریں نکلواتا ہے۔ کہیں پر تو مہینوال کو سوہنی کی بھینسیں چرانے پر بھی لگا دیتا ہے اور پھر جب اسی بنی آدم کا عشق عشقِ حقیقی کا چولا پہن لے تو منصور کو ہنستے ہنستے سولی پر بھی چڑھا دیتا ہے اور بلھے شاہ سے "ھو" کے نعرے بھی لگوا دیتا ہے۔
کون جانے عشق کی رمزیں، کون سمجھائے عشق کی گتھیاں۔ دنیا کے کسی مکتب میں عشق کا کوئی نصاب ہی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی معلم آج تک عشق کا سبق پڑھا پایا ہے۔
یہی عشق تو تھا جس کی بدولت اس واحد اور لاشریک ذات نے اتنی بڑی کائنات تخلیق کر ڈالی اور یہی عشق ہی تو ہے جس کی بدولت خالق نے اپنے محبوب کو معراج کرا ڈالی۔ کہنے والے سچ ہی تو کہہ گئے ہیں کہ "سمجھ سکے نہ لوگ سیانے—— عشق کا رتبہ عشق ہی جانے۔"
وہ جھریوں بھرے چہرے والی بوڑھی لڑکی بھی عشق کی ماری ہی تو تھی۔ وقت کی آندھیوں نے اس کی آنکھوں میں موتیا بھر دیا تھا، کمر جھکا دی تھی، چہرے کی رونق اور تروتازگی چھین کر وہاں جھریوں کا ایک جال بچھا دیا تھا۔ گزرتے ماہ و سال نے صرف اس کی عمر میں اضافہ کیا تھا اسے جوانی کے پنگھٹ سے اٹھا کر بڑھاپے کے گھاٹ پر لا پٹخا تھا مگر اس کے دل کی دنیا آج بھی جوان تھی۔
اس کی موتیے بھری آنکھوں میں آج بھی اپنے سانول کے خواب سجائے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آج بھی اپنے سانول کے لوٹ آنے کی اُمید باقی تھی۔
پر جانے والے واپس کب آتے ہیں بھلا؟ اس کا سانول بھی تو جا چکا تھا اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر۔ وہ تو کسی اور ہی دنیا کا باسی بن چکا تھا ایسی دنیا جس کے کھرنے یہاں سے جانے والوں کو بھی واپس مڑ کر دیکھنے کی اجازت تک نہیں دی۔
مگر عشق کو کب فرق پڑا کسی کے جانے سے۔ عشق نے بھی شاید کہیں سے آبِ حیات کے چند قطرے پی لیے ہوں گے جو نہ تو بوڑھا ہوتا ہے اور نہ ہی اسے موت آتی ہے بلکہ یہ تو ہمیشہ جوان ہی رہتا ہے۔
اس بوڑھی لڑکی کا عشق بھی آج تک جوان تھا۔ اس کا دل آج بھی اپنے سانول کی محبت سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں آج بھی اپنے محبوب کے انتظار میں اس کنویں کا طواف کرتی رہتیں جس میں اب پانی کی بوند تک باقی نہیں تھی جو اپنے نظر نہ آنے والے پیندے تک خشک ہو چکا تھا مگر اس کی بوڑھی آنکھیں آج تک خشک نہیں ہوئی تھیں۔
وہ نیر بہاتی رہتی، کنویں کی منڈیر پکڑے روتی رہتی۔
وہ سالوں سے رو رہی تھی جیسے اس صحرا کو ڈبونے کے ارادے سے بیٹھی ہو مگر اس صحرا کی پیاس تھی کہ بجھنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ سالوں سے روتی اس بوڑھی لڑکی کے ہزاروں آنسو بھی اس صحرا کو سیراب کرنے میں ناکام رہے تھے۔ اس پگلی کو کون سمجھاتا کہ جس صحرا نے دریاؤں کو نچوڑ کر پی لیا مگر پھر بھی اس کا حلق تر نہ ہوا اس کی پیاس تمہارے آنسو کہاں بجھا پائیں گے؟
وہ تو پاگل تھی، اسے کون سمجھاتا کہ اس طرح اپنی زندگی تیاگ دینے سے نہ تو تمہارا سانول واپس آنے والا ہے اور نہ ہی صحرا کی پیاس بجھنے والی ہے۔ نہ تو اس کنویں کو تم پر ترس آئے گا اور نہ ہی وہ تمہارے سانول کو باہر پھینکے گا۔
سمجھانے والے بھی سمجھا چکے تھے، کئی بار اس بوڑھی کو زنجیروں میں جکڑ چکے تھے مگر بوڑھی کا جوان اور طاقتور عشق ہر بار وہ زنجیریں توڑ کر اسے واپس کنویں پر کھینچ کے لے ہی آتا۔
کیونکہ وہ تو پاگل تھی، پگلی بھی، یہ اور بات ہے کہ کبھی وہ اس سمندر نگر ریت کی رانی تھی، وہ اپنے سانول کی دیوانی تھی، وہ اس بے آب و گیاہ صحرا کی پری تھی وہ چولستان کی "بھاگ بھری" تھی۔

☆——☆

آج بھی صبح سویرے سرسوتی کی آنکھ ہمیشہ کی طرح اپنی دلاری بچی کے کانوں میں رس گھولتے بھجن کی آواز سے ہی کھلی۔ آج کی صبح بھی معمول کے مطابق ہی تھی۔ بھاگ بھری اپنا بھجن مکمل کر کے اب بھگوان کی مورتی کے ارد گرد پیتل کی تھالی کو آنکھیں بند کیے دائرے میں گھما رہی تھی۔
ادھ کھلی آنکھوں سے سرسوتی نے اپنے بھگوان کا دل سے شکر ادا کیا جو اسے اتنی بھاگوں اور کرموں والی بچی عطا کی تھی جو بولتی تو ایسے لگتا جیسے سمندر نگر کے اکلوتے مندر میں کوئی گھنٹیاں بجا رہا ہو اور بھگوان نے روپ تو اس پر اس قدر لٹایا تھا کہ سمندر نگر کی شہرت ہی اس کے دم سے تھی آس پاس کے سات گاؤں تک بھاگ بھری کے حسن کے چرچے تھے اور

بھاگ بھری جب اپنی سکھی سہیلیوں کے ہمراہ گاؤں کے اکلوتے کنویں سے پانی بھرنے نکلتی تو سرسوتی اسے بدنظری کا کالا ٹیکا لگاتا، بھی تو بھولتی اور وہ بھی مسکراتے ہوئے ٹیکا لگوا جاتی۔ جانتی تھی کہ یہ اس کی ماں کی ممتا بھرے پیار کا ایک معصومانہ سا انداز ہے۔

پہلے بعد دیگرے پیدا ہونے والی دو بیٹیوں "لاج وتی" اور "پاروتی" کے بعد جب سرسوتی ایک بار پھر اُمید سے ہوئی تو اس بار بھی بجرنگ بیٹے کی اُمید باندھ کر بیٹھ گیا۔ اسے بیٹے کی بڑی چاہ تھی، آخری مہینا لگتے ہی اس کے پوجا پاٹ اور دعاؤں میں طوالت کے ساتھ ساتھ شدت آنے لگی۔ مندر کے آنگن میں لگے اکلوتے بوڑھے درخت پر بجرنگ نے کوئی تین رنگ کے دھاگے بھی باندھ ڈالے مگر اس بار بھی اس کے بھگوان نے اس کی نہ سنی اور تیسری بار بھی جب بجرنگ نے سرسوتی کے پہلو میں بیٹی کو روتے ہوئے دیکھا تو وہ بڑا مایوس ہوا اور نومولود کو اٹھا کر پیار دینے کی بجائے پیٹھ پھیر کے بیٹھ گیا۔ سرسوتی اپنے شوہر کی خواہش سے اچھی طرح واقف تھی مگر وہ بیچاری بھی کیا کرتی بھلا؟ یہ اس کے ہاتھ میں تھوڑی تھا، پھر اس نے بھی بھگوان سے کم دعائیں تو نہیں کی تھیں مگر بھگوان کو شاید ترس نہ آنا تھا نہیں آیا اور اس بار بھی اس کی گود میں ایک اور بیٹی ڈال دی لیکن سرسوتی اپنے شوہر کی طرح مایوس ہرگز نہ ہوئی۔ جہاں بجرنگ نے اُمید کا دامن چھوڑ دیا وہیں سرسوتی نے اُمید اور یقین کی انگلی کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔

وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ سب تو بھگوان کے ہاتھ میں ہوتا ہے، چاہے تو کسی کی گود اولاد نرینہ سے بھر دے اور چاہے تو کسی کی کوکھ ہمیشہ کے لیے سونی اور ویران ہی رکھے۔

جہاں بجرنگ نے بیٹی کو پیار نہ دیا وہیں سرسوتی نے اپنی بیٹی کو سینے سے لگایا اور جس جس کی نظر کپاس کے پھول سے گوری اس کی نومولود بیٹی پر پڑتی وہ وہیں رطب اللسان ہو جاتا۔

سرسوتی نے اپنی بیٹی کا نام "بھاگ بھری" رکھ دیا۔ حالانکہ اس کے نام کا بڑی بہنوں سے کوئی میل ہی نہیں تھا مگر وہ یقین رکھتی تھی کہ نام کا اثر بھی بڑا گہرا ہوتا ہے۔

اسے یقین تھا کہ یہ بیٹی ان کے جھونپڑے میں "بھاگ" ہی لائے گی اور سچ میں ایسا ہی ہوا، اس کا یقین رنگ لے آیا اور بھاگ بھری کے بعد بجرنگ دو بیٹوں "سرچند" اور "ترچند" کا باپ بن گیا، تب وہ اپنی پھول سی بیٹی کو بھی پیار دینے لگا جو سچ میں اپنے پیچھے "بھاگ" ہی لائی تھی۔ بھاگوں بھری، بھاگ بھری کے بھاگوں کی بھی ایک مثال نہیں تھی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اس کی کہانی "بھاگوں" سے بھری پڑی تھی۔ اس کی پیدائش کے دوسرے ہی ماہ میں بجرنگ کو شہر سے کھیس اور دریوں کا ایک بڑا آرڈر مل گیا۔ اس سے پہلے بجرنگ کھیس اور دریاں بنا کر خود ہی اپنے اور ساتھ والے گاؤں جا کر بیچا کرتا تھا۔ بھاگ بھری نے دسویں سال میں قدم رکھا تو ساتھ والے گاؤں سے "لاج وتی" اور "پاروتی" کے لیے ایک گھر سے بہت اچھا رشتہ آگیا جو بجرنگ نے فوراً قبول کر لیا۔

بھاگ بھری بڑی ہوئی اور جب اس روپ سروپ کی رانی نے بچپن سے نکل کر جوانی کی دہلیز پر اپنا پہلا قدم رکھا تو بھی اس کا پہلا قدم سانول کے دل پر پڑا جہاں مندر نگر کے کئی گبرو جوان بھاگ بھری کی راہوں میں اپنی پلکیں بچھائے کھڑے ہوتے وہیں وہ خود ہر گزرتے دن کے ساتھ سانول کے پریم میں ڈوبنے لگی۔ یہ سوچے بغیر کہ بھلا آگ اور پانی کا ملاپ کب ہو پایا ہے؟

مگر یہ بات اس پاگل کے اکھڑ اور ضدی مزاج عشق کو کون سمجھاتا بھلا؟ اور اگر کوئی اللہ کا بندہ یہ مغز ماری کرنے پر آمادہ ہو بھی جائے تو عشق نے کب کسی کی سنی یا مانی ہے؟

عشق نے تو ہمیشہ اپنی ہی سنائی اپنی ہی منوائی ہے اور اپنی ہی کی ہے۔ عشق نے کب کسی سے ذات پات اور نام نسب پوچھا؟ عشق نے کب فرقوں اور مذہب میں فرق جانا ہے؟

عشق تو عجیب ہے، اناڑی ہے، اندھا ہے، بہرہ ہے، پاگل ہے، پہلے دن سے اپنی کرتا اور اپنی منواتا آیا ہے اور ہمیشہ اپنی منوا کے ہی رہتا ہے۔

☆—☆

یہ چولستان کے سینے میں آباد "مندر نگر" ہے۔ دل کی آنکھوں سے دیکھو تو اپنے نام کی طرح مندر۔ صحرا کی خوبصورتی بھی تو صرف دل والے ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ حد نگاہ تک پھیلی ہوئی ریت ہی ریت گویا اللہ نے ریت کا کوئی سمندر بچھا دیا ہو۔ ہوا چلتی تو چھاجوں چھاج ریت اٹھا کر گیتوں کی آنکھوں اور ان کے لٹو کی شکل میں بنائے گئے جھونپڑوں کے آنگنوں میں بھر دیتی۔

مگر وہ صحرا کے مکین تھے۔ ان صحرا واسیوں کو اپنی ریت اور صحرا سے اس قدر پیار تھا کہ وہ اس ریت کو اٹھا کے اپنی آنکھوں سے لگاتے گویا ریت نہ ہو کوہ قاف کا سرمہ ہو۔

یہ ساتول اور بھاگ بھری کا سندر نگر تھا۔ قریب پانچ سو نفوس پر مشتمل اس گاؤں کی تین چوتھائی سے زیادہ آبادی کا تعلق ہندو مذہب سے تھا باقی ایک حصہ مسلمان۔ مگر مجال ہے جو بھی کسی نے بیچ میں مذہب اور فرقوں کی دیواریں اٹھائی ہوں۔ سندر نگر کے زیادہ تر گھر کچے تھے اور کچھ لوگ ان کچے گھروں کی استطاعت سے بھی محروم تھے انھوں نے گھاس پھوس اور بڑی بڑی مضبوط لکڑیوں سے توی ٹیکل لوکی شکل کے جھونپڑے بنا رکھے تھے جو ان کو صحرا کی تپتی اور جھلسا دینے والی دھوپ میں ماں کے آنچل کی طرح چھپا کر ٹھنڈک اور سایہ فراہم کرتے۔

پورے گاؤں میں ایک ہی پکی حویلی تھی۔ حویلی کیا تھی پرانے مغلوں کے طرزِ تعمیر پر بنایا گیا دیو قامت سرخ قلعہ سا تھا۔ یہ سرخ قلعہ سردار رام لعل سائیں کا تھا۔

رام لعل سائیں سندر نگر کا سردار۔ جس کی پہنچ اس ریت سے پار مہذب دنیا کی اونچی فلک چھوتی عمارتوں میں رہنے والے شہری بابوؤں تک تھی مگر اتنی پہنچ اور پیسے کے باوجود بھی عاجزی رام لعل سائیں کی ذات کا حصہ تھی۔

پیسے اور جاہ و جلال کی فراوانی کے باوجود بھی نہ تو کبھی انہوں نے پیسے کی زبان استعمال کی اور نہ انہیں اپنے زر کا زعم رہا یہی وجہ تھی کہ سندر نگر کے واسی اپنے سردار کے گن گاتے نہ تھکتے تھے۔

وہ سب محبتوں سے گندھے ہوئے لوگ تھے۔ آپس میں ہمیشہ پیار محبت سے رہتے اور پیار محبت ہی بانٹتے آئے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹتے اور خوشیوں میں شریک ہوتے۔

یہاں اسکول کالج تو بہت دور، بنیادی تعلیم کے لیے چھوٹی سی درسگاہ تک نہ تھی مگر پیار محبت کے تمام سبق سندر نگر والوں کو زبانی یاد تھے۔ ہولی ہو یا دیوالی یا پھر عید وہ سب لوگ ایک دوسرے کی خوشیوں میں برابر شریک ہوتے۔ یہاں پیار تھا، محبت تھی، احترام تھا، خلوص تھا اگر نہیں تھا تو صرف "پانی"۔ سندر نگر کے باسی پانی کو ہمیشہ ترستے آئے تھے۔ یہاں محاورہ مشہور تھا کہ "وٹھو تہ تھر نہ تہ بر" (بارش ہو تو تھر اور چولستان گلستان ہیں نہیں تو ویران ہیں)

اگر زندگی کی علامت صرف پانی ہے تو وہاں زندگی نہیں تھی مگر وہاں زندگی تھی کیونکہ زندگی کی علامت صرف پانی نہیں ہے اور بھی لاتعداد علامتیں ہیں زندگی کی اور وہ تمام علامتیں وہاں بدرجہ اتم موجود تھیں اور وہ لوگ ہزاروں سالوں سے اسی طرح زندگی جیتے آ رہے تھے۔

ان کے لیے پانی کی بوند بوند قیمتی ہوتی تھی۔ سوکھے لبوں والے مرد اونٹوں کی لمبی لمبی قطاروں میں دور دراز کے "جوہڑوں" اور "ٹوبھوں" سے پانی بھرنے اور مویشیوں کو پانی پلانے جاتے تو وہاں کی عورتیں اپنے لمبے لمبے گھونگھٹ نکال کر اپنے سروں پر اوپر تلے گھڑے رکھے ٹولیوں کی شکل میں گاؤں کی سرحد پر بنے اکلوتے کنوئیں سے پانی بھرنے جاتیں اور پھر اس پانی کو اس قدر احتیاط سے استعمال کیا جاتا جیسے یہ "سونے" کا پانی ہو یا پھر "آبِ حیات" ہی ہو۔

اور پھر جب کئی سالوں بعد بادلوں کو سندر نگر والوں کی کالی امید بھری آنکھوں پر ترس آ جاتا اور تھوڑی دیر کے لیے ہی کسی بادل اپنا دامن نچوڑ دیتے تو اس دن وہاں سندر نگر میں اس قدر جشن منایا جاتا کہ کیا ہولی اور کیا عید۔ پھر برستی بارش میں وہاں بوڑھے بچے اپنے گھروں سے نکل کر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے خوشی سے بے ہنگم رقص کرتے اور رات کو ہونے والی محفلوں میں ساتول کا باپ "بھٹل" اونچے سروں میں شاہ لطیف کی کافیاں گاتا صرف مرد کیا پورے سندر نگر کی عورتیں بھی اپنے تمام کام کاج ایک طرف رکھ کے خاموشی سے بھٹل کے راگ ملہار سنتی رہتیں اور بھٹل کے سُر اپنے کانوں کے راستے دل میں اتارتی رہتیں۔

ایسا نہیں تھا کہ یہاں ہمیشہ سے اسی طرح پیاس رہی تھی۔ سندر نگر کے بوڑھے بزرگ اور کہنے والے کہتے ہیں کہ کبھی یہاں "دریائے ہاکڑہ" اور "دریائے سرسوتی" کی سرسبز و شاداب وادیاں ہوا کرتی تھیں اور یہ جو اب بڑے بڑے بھوت بنگلے بنے ہوئے ہیں پہلے ایسے نہیں تھے۔ پہلے جہاں تک نظر پڑتی قطار میں نوابوں اور سرداروں کے عالیشان قلعے ہوتے تھے جو فن تعمیر کی مثال ہوا کرتے تھے۔

یہی بھوت بنگلے کبھی چولستانیوں کی پہچان ہوا کرتے تھے جو دور سے دیکھنے پر کسی فاتح کی طرح اپنی چوڑی چھاتی پھیلائے کھڑے نظر آتے۔ لوگ دور دراز سے ان عالیشان قلعوں کو حسرت سے دیکھنے آیا کرتے۔ پہلے یہاں زندگی، پانی کو اس طرح نہیں ترستی تھی۔ دریاؤں کے ہوتے ہوئے پانی کی فراوانی تھی۔ درخت اور جڑی بوٹیاں بھی اس طرح اجڑے اور خشک نہ تھے بلکہ یہاں تو سبزہ ہوتا تھا۔

"ہند سندھ" کے پرندوں کے گیت چولستان کی فضاؤں میں سنائی دیتے تھے مگر خدا جانے کس تقدیر کی بددعا لگی کہ دھرتی کی پیاس بڑھتی چلی گئی۔ ریت نے دونوں دریا نچوڑ کر پی لیے۔ سرسبز درخت سوکھتے چلے گئے اور پرندوں

لے اپنے بچوں سمیت یہاں سے ہجرت کر کے دوسرے علاقوں کی طرف اڑنا شروع کیا تو واپس چولستان آنا ہی بھول گئے۔ سورج دن بدن زیادہ تیز اور جھلسا دینے والی دھوپ برسانے لگا۔ لوگ نقل مکانی پر مجبور ہو گئے چولستان خشک اور ویران ہوتا چلا گیا۔ اسی چولستان میں سندر نگر آباد تھا۔ یہی اس کی کہانی تھی اور اسی ریت کے ٹیلوں میں سانول اور بھاگ بھری کے عشق نے اپنی داستان خود لکھی تھی۔

☆—☆

"ابا بس میں نے نہیں چلنا تیرے ساتھ۔ مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب۔" سانول آج پھر شکل بنائے بیٹھا تھا۔ گلے میں گردن کے ساتھ ذرا تنگ کالی ڈوری والا تعویذ پہن رکھا تھا جو پچھلے میلے میں اس کا باپ بنوا کر لایا تھا۔

"او کیوں نہیں جائے گا تو؟ تیرے تو وڈے بھی جائیں گے، بڑا آیا تو، نہیں جاؤں گا۔" مغل نے اسے جھڑک کر حسب عادت آخر میں اسی کے انداز میں سانول کی نقل اتاری۔ سانول کا باپ مغل سندر نگر کا گائیک تھا پورے گاؤں میں یا دور و نزدیک کہیں بھی کوئی شادی خوشی، میلے ٹھیلے یا سنگیت کی محفلیں ہوتیں تو گانے کے لیے صرف مغل کو ہی بلایا جاتا تھا۔ سانول کو اپنے باپ کے پیشے سے چڑ تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ سانول کے ہزار انکار کے باوجود بھی اس کا باپ مغل اسے اپنے ساتھ شادی بیاہ کی محفلوں میں لے جانے میں کامیاب ہو ہی جاتا تھا اور اس کے سارے انکار دھرے کے دھرے ہی رہ جاتے تھے کیونکہ مغل کو سانول کے بغیر گانے میں لطف ہی نہ آتا تھا۔ مغل سمیت پورا گاؤں اس بات سے بھی واقف تھا کہ سندر نگر میں سانول سے سریلی بانسری اور کوئی بجا ہی نہیں سکتا۔

"مجھ سے نہیں ہوتا نا ابا۔ شرم آتی ہے مجھے پیسے وصول کرتے ہوئے۔ مجھ سے نہیں لی جاتیں ایک ایک بندے سے ویلیں۔ بس اب کل سے میں تیرے ساتھ نہیں چل رہا۔ سن لے تو۔" اس کی ضد برقرار تھی۔

"او نے بندے دا پتر بن..... اپنی روزی میں کیسی شرم۔ مجھے پتا تیرے "ڈاڈے" (دادا) نے سنگیت کا کھایا۔ تیرا "پیو" (باپ) سالوں سے یہی کام کرتا آ رہا ہے۔ تیری نک (ناک) اپنے پیو ڈاڈے سے بڑی ہو گئی ہے؟ اپنے پیشے سے اب تجھے شرم آنے لگی ہے ہیں؟ اور سن یہ جو اس جھونپڑے تلے بیٹھا ہے نا یہ بھی اسی سنگیت کی دین ہے۔ بڑا آیا پنے خان۔" مغل نے تو اس کی اچھی خاصی کلاس لے ڈالی۔ وہ ٹھہرا اسدا کا سنگیت سے عشق کرنے والا۔ اس کے نزدیک تو گانا یہی روح کی غذا سے بھی کہیں بڑھ کر تھی اور ابھی تو ان کی روزی روٹی کا وسیلہ تھی اور بھلا روزی روٹی کمانے سے کس بات کی شرم۔

"ابا میرا مطلب وہ نہیں تھا۔ ایویں ناراض ہونے کے بہانے ڈھونڈ لیتے ہو بس۔ معلوم بھی ہے تجھے ناراض کر لوں تو میرے حلق سے نوالہ تک نہیں اترتا۔" سانول سے کب برداشت ہوتی تھی بھلا اپنے باپ کی ناراضگی یہی وجہ تو تھی کہ مغل جس کا فائدہ ہمیشہ اٹھانا ضروری سمجھتا اور اسے اپنے ساتھ سنگیت کی محفلوں میں لے جانے میں کامیاب ہو ہی جاتا۔ بھلے سانول وہاں بے دلی سے بانسری بجاتا رہے مگر مغل کی ہمیشہ سے یہی خواہش رہی تھی کہ اس کے بعد سانول ہی اس کے فن موسیقی کو آگے بڑھائے۔ اسی بات کو لے کر دونوں باپ بیٹوں میں میٹھی میٹھی ناراضگی چلتی ہی رہتی۔

"ہاں جانتا ہوں میں جو میرے بغیر تمہارے حلق سے نوالہ نہیں اترتا۔ بتایا تھا مجھے "بتول" نے۔ پچھلے ماہ میں شہر گیا تو میرے پیچھے چار چار روٹیاں کھائی ہیں تم نے۔ سب سمجھتا ہوں میں تیرے ڈرامے، یہ پٹیاں کسی اور کو جا کر پڑھا۔ بچوں میں تیرا، تو میرا پیو نہیں ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے ابا۔ میں چلوں گا تیرے ساتھ سنگیت میں۔ پر میں "ویلیں" (پیسے) اکٹھی بالکل نہیں کروں گا بس۔ یہ مجھ سے نہیں ہوتا بس آج فیصلہ کر لے۔ مجھے شرم آتی ہے۔"

"تو کیا گاتے ہوئے میں خود اٹھ اٹھ کے ویلیں لینے جاؤں گا لوگوں سے؟ تجھے شرم نہیں آتی ایسا بولتے ہیں؟"

"ابا کبھی تو میری بھی مان لیا کر نا۔" سانول رونے والا ہو گیا۔ ہمیشہ ہی اپنے پیو سے ہار جاتا تھا۔ پر چونکہ ہونے والے اس طرح کے جھگڑوں میں جیت مغل کے نام ہی لکھی جاتی تھی۔

"نہیں سائیں مجھے تیری یہ فضول کی باتیں اور اب تیرے روز روز اسی ایک بات کا راگ الاپنے سے غصہ آ جاتا۔ مجھے نہیں ملنا تجھے اس فضول کی بحث سے۔" مغل اپنی بات اختتام کرتا اپنی مخصوص رنگ کی پگڑی سر پر دھرتا جھونپڑے سے باہر جانے لگا۔ گویا بات ہی ختم کر دی ہو جیسے۔ "ابا روٹی کا ٹیم (وقت) ہونے والا ہے۔ روٹی تو کھا کے جانا۔"

سانول نے پیچھے سے آواز لگائی۔

"اوئے نہیں کھانی مجھے تیرے ساتھ روٹی۔ کھا لینا خود پیٹ بھر کے۔" مغل کی اکڑ برقرار رہی اس نے پلٹے بغیر وہیں سے جواب دیا اور باہر نکل گیا۔ پیچھے سانول اپنی روہانسی شکل کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔

کیا کرتا بچارہ۔ اسے اپنے باپ سے پیار ہی اتنا تھا کہ وہ اسے زیادہ دیر ناراض نہ دیکھ پاتا۔ جانتا تھا کہ اس کی ماں نے تو پیدا کرتے ہی اسے باپ کی جھولی میں ڈالا اور اگلی دنیا میں جا بسی۔

یہ مغل ہی تھا جس نے سب کے بے پناہ اصرار کے باوجود بھی دوسری شادی نہیں کی۔ وہ تنومند جوان تھا، طاقتور تھا وہ دوسری بیوی لا سکتا تھا، اس کا خرچ بھی اٹھا سکتا تھا مگر اس نے سانول کے لیے خود کی خواہشوں کو قربان کر دیا اور سانول کو باپ کے ساتھ ساتھ ماں بن کے بھی پالا۔ اس کی پرورش کی۔ اپنی بیوی نہ رہی تو کھانا چھوٹے بھائی "خاتوں" کے گھر سے آنے لگا اور ابھی تک یہی ہوتا آ رہا تھا۔ تین وقت کا کھانا سانول کی چچی "بتول" ہی دے جاتی۔ مغل نے سانول کے لیے بڑی مشقتیں کاٹی تھیں، راتیں رات بھر جاگ کر اس کے آرام کا خیال رکھا، سنگیت کے لیے جاتا تو سن پیچھے "سانول" میں ہی اٹکا رہتا۔

محفلوں اور شادی بیاہ میں گانے گا کر، اپنی خواہشوں اور ضرورتوں کو محدود کر کے سر چھپانے کو یہ جھونپڑا تیار کیا۔ سانول کو ہمیشہ بیٹوں سے بڑھ کر رکھا اور "یاروں" کی طرح پال پوس کر بڑا کیا۔ سانول ان سب باتوں سے واقف تھا تبھی اس کے دل میں باپ کی عظمت کا ایک اونچا مینار قائم تھا مگر وہ دونوں اپنے بیچ اسی دوستی والے رشتے کو لے کر بیٹھا بیٹھا نخروں بھرا جھگڑا کرتے ہی رہتے تھے۔

مغل کے گلے میں اللہ نے سُر بھر دیے تھے۔ وہ سنگیت کا دیوانہ تھا۔ عقیدت تھی اسے موسیقی سے۔ سنگیت سے اپنی اولاد کے جیسی محبت رکھتا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کی اکلوتی اولاد کو ہی اس کے سنگیت سے چڑ تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ سانول سنگیت کو سرے سے ناپسند کرتا ہو بلکہ سُر تو اس کے اپنے گلے میں بھی تھے۔ اکثر چاندنی راتوں میں وہ اپنی بانسری اٹھا کر صحرا کی ٹھنڈی ریت پر بیٹھا آدھی آدھی رات تک بانسری بجاتا رہتا۔ بس اسے لوگوں سے پیسے وصولنا پسند نہیں تھا۔ اسی ایک بات کو لے کر دونوں باپ بیٹوں میں تکرار چلتی ہی رہتی۔ جس کا اختتام مغل کی ناراضگی پر ہوتا اور مغل بھی ہمیشہ جان بوجھ کے سانول سے ناراض ہوتا کیونکہ وہ بھی جانتا تھا کہ اگر وہ ناراض ہو جائے تو بیچ میں بھی سانول کے حلق سے ایک نوالہ تک نہیں اترتا جب تک کہ وہ اپنے بابو کو منا نہیں لیتا۔

☆---☆

"اماں سرمند بھا کی شادی کر دیں نا اب۔" مٹی کے کچے چولہے میں بیٹھی ناشتے میں اپنی ماں کی مدد کرتی بھاگ بھری نے لاڈ جتاتے ہوئے کہا۔

مٹی کی ٹانگ برابر دیوار پر مٹی سے ہی گل بوٹے نقش کیے گئے تھے اور چولہے کی دیوار میں ہوا کے گزر کے لیے جو چوکور شکل کے اوپر نیچے چار سوراخ بنائے گئے تھے جو سب بھاگ بھری کے سگھڑاپے کا ہی کمال تھا۔

اس کی صورت کے ساتھ ساتھ بھگوان نے اس کے ہاتھ میں بھی بہت نفاست رکھ چھوڑی تھی۔ کھانا ہو چاہے گھر کے دوسرے کام کاج ہر چیز سے اس کی ذات کی نفاست جھلکتی رہتی۔

"جھلی میں پہلے تیرا ویاہ کروں گی پھر تیرے بھا کا۔ تو بڑی ہے سرمند سے اور ویسے بھی دھی (بیٹی) کا فرض پہلے پورا کیا جاتا ہے۔" چولہے کے منہ سے چمٹے کے ذریعے آنچ تیز کرتے سرسوتی نے مسکراتے ہوئے بیٹی کو جواب دیا۔

"نا اماں۔۔۔ میرے ویاہ کا تو سوچ بھی مت۔ میں نے تو ویاہ کرنا ہی نہیں ہے۔ بس تو جلدی سے سرمند بھا کا رشتہ میری سکھی "رجو" سے پکا کر دے۔ بڑے ارمان سنبھال رکھے ہیں میں نے، سب پورے کروں گی بھا کی شادی پر۔" وہ جو کب سے اپنے بھا کے لیے اپنی پکی سکھی رجو کو سوچے ہوئے تھی۔ آج اپنے دل کی بات زبان پر لے ہی آئی۔

"اچھا تو تم نے سرمند کے لیے کنوار (دلہن) بھی ڈھونڈ رکھی ہے اور سرمند کو معلوم تک نہیں ہے؟" سرسوتی کو اپنی بیٹی کی بات سے خوشگوار حیرت ہوئی۔

"ہاں نا اماں کتنی سوہنڑیں تو ہے میری سکھی۔ دیکھنا بہت جچے گی سرمند بھا کے ساتھ۔"

"او میری بھولی دھی۔ سرمند کا بھی سوچ لیں گے پہلے تیرا رشتہ تو پکا کر لیں کہیں۔ تیرے لیے تو اتنے سارے رشتے ہیں پر کیا کروں میرا دل کسی پر راضی ہی نہیں ہو رہا۔ تم ہو ہی اتنی سوہنڑیں کہ جس گھر میں بھی جاؤ گی وہاں سوجھلا (روشنی) بھر دو گی۔" سرسوتی نے بھاگ بھری کو

جواب دیتے ہوئے دل ہی دل میں اس کی بلائیں لیں۔
"اماں میں نے کہا نا مجھے کچھ نہیں کرنا ویاہ۔" میرا توڑ سوچا کر۔ "بھاگ بھری اب اپنی ماں کو کیسے سمجھاتی کہ اس کا دل تو پچھلے سال سے کسی اور کے نام کے آنگن کا ہو رہا ہے۔ وہ جو اس کی قسمت میں لکھا ہی نہیں گیا تھا وہ جو اس کی زندگی میں تو شامل تھا پر شاید اس کے نصیب کے کسی بھی صفحے پر سانول کے نام کا ایک حرف تک نہیں تھا۔

"تو کیا ساری زندگی میرے کولے (گھٹنے) لگی بیٹھی رہو گی تم؟" بھاگ بھری کے دل میں اٹھتے مد و جزر اور دماغ میں ذہنی سوچوں سے بے خبر سرسوتی نے اسے جھڑکا۔

"او کیڑی (کون سی) گھسر پھسر ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی؟ ادھا دن چڑھ آیا ہے اور ابھی تک ناشتا نصیب نہیں ہوا۔" بیچ بچے سے تھوڑا فاصلہ کر کے زمین پر بیٹھے اپنے کام میں مگن "بجرنگ" نے وہیں سے بھوک کی دہائی دی وہ بھیڑ بکریوں کے بالوں سے کھیس اور دریاں بنانے کا کام کرتے تھے۔ یہی ان کا فن تھا اور اسی میں بجرنگ کو کمال حاصل تھا۔ اب بھی اپنے مخصوص طریقے سے وہ بکریوں کے سفید، بھورے اور کالے بالوں کو الگ کرتے میں لگے ہوئے تھے۔ ساتھ انہی بالوں کے گچھے تھا وہ جو ڈھیر سے بڑے گچھے بنے پڑے تھے جن کو الگ کرنا ابھی باقی تھا۔ بجرنگ کی شروع سے عادت تھی کہ وہ صبح اٹھتے ہی اپنے کام میں لگ جاتا پھر بیچ میں ناشتے کا وقفہ لے کر پھر سے کام میں جت جاتا۔ یہ کھیس دریاں بنانے کا کام اسے اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا بلکہ بجرنگ اس فن میں اپنے باپ سے بھی چار ہاتھ آگے نکل گیا تھا۔ وہ بھیڑ بکریوں کے بالوں کو کاٹ کر اس ہنر اور سلیقے سے کھیس دریوں میں تبدیل کرتا کہ دیکھنے والے اش اش کر اٹھتے۔ ان کا کام بہت مشکل تھا، وقت طلب تھا، بہت محنت لگتی تھی، ایک کھیس بنانے میں مہینوں لگ جاتے، مگر بجرنگ جیسا محنتی انسان بھی محنت کرنے سے کبھی کتراتا تھا یہی وجہ تھی کہ اسے اس فن میں ملکہ حاصل تھا۔

یہ اور بات تھی کہ وہ اپنا یہ فن اپنے دونوں بیٹوں میں منتقل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ ان دونوں کو بچپن سے سمجھا سمجھا کر اس کا آدھا سر سفید ہو گیا۔ بجرنگ نے دونوں بیٹوں کو پی انگلیاں توڑ توڑ کے سمجھایا اس کے باوجود بھی دونوں بھائی اس کام میں باپ کے جیسے طاق نہیں ہو پائے تھے۔ اب تو بجرنگ کو ہمیشہ یہی ارمان کھائے رہتا کہ اس کی آنکھیں بند کرتے ہی یہ فن بھی اسی کے ساتھ ہمیشہ کے لیے مر جائے"

ساشا

زندگی کے نشیب و فراز کی ایک عجیب داستان، کبھی پر خطر جزیروں، دائروں میں قید تو کبھی بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکے ہوئے راہی کے مانند، سنسنی خیز حالات سے نبرد آزما......

عمر عبداللہ کے سحر انگیز قلم سے

ایک نئے انداز، نئے رنگ، نئے ڈھنگ میں......

عشق کے دشوار گزار مرحلے...... حسن کے قافلے...... جذبات کا تلاطم......

دریاؤں کی روانی...... سمندر کے طوفانوں اور بھنور میں لپٹی خوبصورت داستان......

فروری 2020 سے سسپنس کے صفحات پر جلوہ گر

گا۔ بجرنگ کے لیے یہ ایک ایسا دکھ تھا جس کی دوا کسی بھی طبیب کے پاس میسر نہیں تھی۔

"ہاں بس تیار ہے۔ تو ہتھ (ہاتھ) دھولے تو میں لے آتی ہوں ناشتا۔" سرسوتی نے تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے شوہر کو جواب دیا۔

"اور بھاگ بھری تو جا کے دونوں بھائیوں کو اٹھا موئے ابھی تک کھٹولے (چارپائیاں) توڑ رہے ہیں۔" بجرنگ کو ہمیشہ سے بیٹوں کے دن چڑھے تک سوئے رہنے کی عادت سے چڑ تھی۔ اس کا ماننا تھا کہ بندے کو پو پھٹتے ہی چارپائی چھوڑ دینی چاہیے۔

"ہاں اٹھائی ہوں ابا۔ کاوڑ (غصہ) کیوں کرتے ہو۔ چھوٹے ہیں ابھی۔ سیکھ جائیں گے۔" بھاگ بھری کہاں سہہ پاتی اپنے بھائیوں کا گلہ۔

"ہاں ابھی تک گئے بوبے ہیں ناں۔ ان کی عمر کے لڑکے باپ کا ہاتھ بٹا کر گھر چلا رہے ہیں اور ان شہزادوں کو نندر (سونے) سے ہی فرصت نہیں ملتی۔" بجرنگ نے طنز سے بھرپور ہنکارا بھرتے ہوئے جواب دیا اور ہاتھ دھونے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆—☆

صحرا کا آسمان روشن ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ اپنے سر سے اوپر دیکھو تو ایسے لگتا ہے جیسے کسی نے آسمان کے دامن پر لاکھوں چھوٹے چھوٹے ستارے ٹانک دیے ہوں۔

جہاں صحرا کے دن سخت گرم اور جھلسا دینے والے ہوتے ہیں وہیں صحرا کی راتیں ٹھنڈی اور اس قدر پرسکوں ہوتی ہیں کہ دل چاہتا ہے انسان سارے دن بھر کی تھکن اتار کر اس وسیع و عریض ریت کے ٹھنڈے سمندر پر سوئے، صحرا کی پرسکوں رات کے سحر میں کھویا رہے اور اس رات کی طوالت سالوں تک بڑھ جائے۔ سالوں بعد جب اس سحر انگیز رات کا اختتام ٹھنڈی سی صبح پر ہو تو انسان زندگی بھر کی تھکاوٹیں جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہو۔

پھر سے جینے کے لیے، نئے عہد و پیمان باندھنے کے لیے، ایک نئی زندگی کی امنگ لیے، ایک نئی زندگی کے آغاز کے لیے۔ جہاں سب کچھ اچھا ہو جیسے اچھے اچھے خوابوں میں ہوتا ہے مگر ہر انسانی خواب کی قسمت میں تعبیر نہیں ہوتی اور نہ ہی ہر انسانی خواہش کی قسمت میں تکمیل ہوتی ہے۔ کچھ خواہشیں تمام عمر ایسے ہی نامراد رہ جاتی ہیں اور کچھ خواب ایسے ہی نامعبر بے تعبیر رہ جاتے ہیں۔

آج بھی صحرا کی رات نے ہمیشہ کی طرح اپنی تمام تر سحر انگیزی سے پورے سندر نگر کے باشندوں کو میٹھی نیند سلا رکھا تھا مگر گاؤں کے اکلوتے کنویں کی منڈیر سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھا ایک وجود ایسا بھی تھا جس کی آنکھوں میں نیند نام تک کو نہیں تھی بلکہ اس کی آنکھوں میں انتظار بھرا ہوا تھا۔ جس کا وجود انتظار یار کی تپتی ہوئی بھٹی میں جل رہا ہو اسے بستر کی راحتیں بھلا کیسے آرام دے سکتی ہیں؟

اس سایے کی آنکھیں گاؤں کو جاتی پگڈنڈی پر جمی ہوئی تھیں۔ جانے کیوں اس وجود پر رات کا سحر بے اثر ہو رہا تھا۔ وہ تو انتظار کی سولی پر لٹک رہا تھا۔ انتظار یار کی سولی پر اور جو انتظار یار کی سولی پر لٹکا ہو اس پر کیسے بھلا کوئی اور سحر اپنا اثر دکھا پائے گا۔

یہاں سے سیدھا سندر نگر کی پگڈنڈی پکڑو تو گاؤں کے بیچوں بیچ ایستادہ سفید مندر سے تھوڑے سے فاصلے پر مٹی سے بنائے گئے کچے گھر کے سارے مکین بھی باقی تمام گاؤں کی طرح اپنے دن بھر کی تھکن اتار کر سوئے ہوئے تھے مگر سرسوتی کے بائیں طرف پڑی چارپائی پر سویا ایک وجود ایسا بھی تھا جسے کنویں کے پاس بیٹھے وجود کی طرح سکون نصیب نہیں تھا۔ وہ نیند کا بہانہ بنائے کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا۔ کچے کمرے کی بیرونی دیوار سے لگی لالٹین کی لو بھی قطرہ قطرہ پگھلتی رات کے ساتھ ساتھ مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ تبھی وہاں نیند کا بہانہ کیے سائے کی آنکھیں کھلیں، بنا چاپ پیدا کیے وہ سایہ اپنی چارپائی سے اٹھا، لالٹین کی مدھم پڑتی ہوئی لو کی زندگی وہیں تمام کی، اپنے سارے وجود کو ایک بڑی سی کالی چادر میں لپیٹا اور سب مکینوں کی طرف سے مکمل اطمینان کر لینے کے بعد اپنے گھر کی دہلیز بھی پار کر گیا۔ تیز تیز قدموں سے چلتے اس سائے کی منزل اکلوتا گاؤں کا کنواں تھا۔

کچھ دیر بعد کنویں کے پاس انتظار کرتے وجود کو ٹھنڈی پروائیاں سی چلتی محسوس ہونے لگیں۔ دل گواہی دینے لگا کہ آمد یار نزدیک ہے تبھی اتنی دیر سے انتظار میں جلتے اس وجود کو قرار سا آنے لگا۔ دور سے آتے سائے کا فاصلہ قدم قدم کم ہونے لگا۔ دل کی دھڑکنوں کو جیسے پر لگ گئے۔ دھڑکن کی رفتار معمول سے کئی گنا بڑھ گئی۔ اس کا محبوب پہنچ گیا تھا۔ سالول کی بھاگ بھری اس سے ملنے کنویں کے پاس پہنچ گئی تھی۔

ابھی پچھلے سال کی ہی بات تھی جب ہولی کے رنگوں میں رنگی اور سب کو رنگ لگاتی بھاگ بھری کی نظریں سالول

سے پیار ہو گیا تو اسی لیے ان کے دل ایک ہو گئے تھے پھر اس کے بعد نہ تو بھاگ بھری کی آنکھ نے کسی اور کا خواب دیکھا اور نہ ہی سانول کا دل کسی اور کے نام پر دھڑکا۔ اسی رات بھاگ بھری کے دل نے ہولی اور سانول کے دل نے عید منائی تھی۔ اسی رات ان دونوں پر عشق اترا اور پھر اس کے بعد سندر نگر کا کنواں اور ستاروں بھری راتیں ان کی پاک محبت کی داستانیں لکھنے لگیں۔ یہی ان کی محبت کے گواہ تھے خاموش اور بے زبان گواہ۔

"اتنی دیر کر دی بھاگ بھری۔ جانتی بھی ہو میں یہاں کس سولی پر لٹکا رہتا ہوں؟" سانول کے دل سے پیار بھرا شکوہ نکلا تھا۔

"تجھ سے ملنا اتنا سوکھا (آسان) تھوڑی ہے سانول۔ جانتے ہو جس دن کسی کو خبر ہو گئی سب نے مل کر میرے ٹوٹے (ٹکڑے) کر دینے ہیں۔" سندری نے اتھل پتھل سانسوں میں تڑپ کر محبوب کے شکوے پر اپنی مجبوری سنائی۔

"ہاں جانتا ہوں بھاگ بھری۔ ہم دونوں بھاپانی (آگ پانی) کی مثال ہیں اور بھاپانی کا ملاپ ممکن ہی نہیں ہوتا کسی ایک کا تو فنا ہونا لازم ہے۔"

"اگر فنا ہونا ہی ہمارا مقدر ہے تو بھاگ بھری کی دعا ہے کہ یہ فنا اسی کے نصیب میں لکھی جائے۔ تم اپنی پوری زندگی جیو سانول۔"

"جھلی ہو گئی ہو کیا—— تیرے بغیر سانول جی پائے گا کیا؟ جا بھی نہیں اور یہ مرنے ورنے کی باتیں مت کیا کرو تم۔ جانتی بھی ہو سانول کا دل صرف تیرے نام پر دھڑکتا ہے اور اللہ نہ کرے تمہیں کبھی کچھ ہو گیا تو میرے دل نے بھی دھڑکنے سے انکار کر دینا ہے۔"

"جانتی ہوں سانول سب جانتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ بھاپانی کا ملنا ممکن نہیں ہے مگر اس دل بدھو کو یہ باتیں کون سمجھائے جو تیرے نام پر دھڑکنے پر بانکا رہتا ہے۔ تم اپنے اللہ سے دعا مانگا کرو میں تو روز صبح اٹھ کر بھگوان سے تمہیں مانگتی ہوں سانول۔"

"میں بھی مانگتا ہوں بھاگ بھری۔ میں تو صرف تمہاری سنگت مانگتا ہوں۔ خدا جانے ہمارا انجام کیا ہو گا مگر ہمارا انجام جو بھی ہو سانول کا خدا جانتا ہے کہ اس کے لیے تمہاری سنگت کے ان چند لمحوں میں ہی پوری زندگی ہے۔"

"بھاگ بھری بھی اپنا سب کچھ تمہیں مان چکی ہے سانول۔ بس دل کو ہمیشہ ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے تمہیں کھو دینے کا دھڑکا۔"

"ہاں ہمیں اپنے نصیب کی یہ کوڑ (تلخی) گھول کر پینی پڑے گی کہ ہمارے دونوں نے مل کر جو خواب دیکھے ہیں ان کا پورا ہونا ممکن نہیں ہے۔"

"ہاں شاید—— پر سانول مجھے تمہاری محبت کی سچائی کے علاوہ دنیا کی کسی چیز کی لوڑ (ضرورت) نہیں ہے۔ تمہاری محبت میں کوئی بھی کھوٹ (ملاوٹ) نہیں ہے پھر بھی بھاگ بھری کو آج کچھ وعدے دو۔" بھاگ بھری نے اپنی نرم و گداز ہتھیلی سانول کے آگے پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں کچھ وعدے مجھے بھی تم سے لینے ہیں بھاگ بھری۔" سانول نے بھی چاند کی ملگجی روشنی میں اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"وعدہ کرو کہ اندھے ہو جائیں وہ نین جو خواب دیکھیں کبھی کسی اور کے۔" بھاگ بھری نے پہلا وعدہ لیا۔

"پگلا جائے وہ دماغ جو خیال سوچے کبھی کسی اور کا۔" سانول نے اقرار کرتے ہوئے دوسرا وعدہ لیا۔

"بھا (آگ) لگے اس جیون کو جو گزارنا پڑے کسی اور کے سنگ۔" سندر نگر کی سندری نے تیسرا وعدہ لیا۔

"اور وہ آخری دن ہو میرا جب تو نہ رہے بھری۔" ریت کے بیٹے نے اپنا آخری وعدہ خود سے دیا اور سندری کے گرم ہاتھ سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا۔

دونوں نے چاند ستاروں کو گواہ بنا کر ایک دوسرے کو وعدوں کی کچی رسیوں میں باندھ دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ محبتوں کو اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے وعدوں کی کمزور بیساکھیوں کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوتی مگر محبت کرنے والے دلوں کو ہمیشہ انجان سے دھڑکے لگے ہی رہتے ہیں بلکہ ان کی تو ہر دھڑکن کے ساتھ ایک اندیشہ بھی دھک دھک کرتا ہی رہتا ہے۔

سندر نگر کے دونوں پریمیوں کو ایک دوسرے کو وعدوں کی کچی رسیوں سے باندھتے ہوئے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کاتب تقدیر نے ان کے مقدر کے صفحات پر ملن نام کا لفظ لکھا ہی نہیں ہے۔ اگر وہ جانتے ہوتے تو شاید کبھی اس طرح ایک دوسرے کو وعدوں کی بیڑیاں نہ پہناتے۔

رات آہستہ آہستہ بھیگتی رہی۔ دونوں کو وقت کا احساس تب ہوا جب پو پھٹنے میں کچھ ہی دیر باقی رہ گئی تھی۔

"چلتی ہوں سانول۔ بہت سمے (وقت) ہو گیا ہے۔ جب تمہارے ساتھ ہوتی ہوں تو وقت بھی بھاگنے لگ پڑتا

ہے۔"

"ہاں یہ وقت بھی تو ہمارے نصیب کی طرح ہمارا ہی ہے۔ آؤ تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔" سانول نے مسکراتے ہوئے بھاگ بھری کو جواب دیا وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چل پڑے۔ ان دونوں کے بہت اوپر سندر نگر کا پورا آسمان حیرت سے مسکراتے ہوئے انہیں دیکھ رہا تھا۔ لاکھوں ستارے اپنے منہ پر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ رکھے اپنی کھلکھلاہٹیں روکنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ صرف ایک چاند ہی تھا جو اداسی سے سانول اور بھاگ بھری کو جاتے ہوئے اوپر سے دیکھ رہا تھا۔ خدا جانے سندر نگر کا چاند آج اتنا اداس کیوں تھا۔

☆—☆

سندر نگر کی لال حویلی میں آج جشن کا سا سماں تھا۔ رام لعل سائیں کے اکلوتے بیٹے اور وارث موہن لعل سائیں نے چولستان جیپ ریلی میں دوسرا نمبر حاصل کیا تھا۔ رام لعل سائیں کے گبرو جوان بیٹے کی زندگی کی ایک ہی دیرینہ خواہش تھی چولستان جیپ ریلی جیتنا..... جو پچھلے چار سال سے پوری ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی اور آج وہ اپنی جیت کے بالکل قریب آ کر بھی یہ خوشی حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ آخری لمحات میں ہی اس کے مدمقابل کی جیپ اس سے آگے نکل گئی تھی۔ اس کی خوشی ادھوری رہ گئی تھی مگر اسے یقین تھا کہ وہ اگلی بار ضرور جیت آئے گا۔

پورے سندر نگر میں دو ہی تو گاڑیاں تھیں ایک رام لال سائیں کی دوسری ان کے بیٹے موہن لال سائیں کی بڑے بڑے اور موٹے ٹائروں والی جیپ۔ اسی خوشی میں آج لال حویلی میں رام لال سائیں نے گاؤں کے مردوں کو دعوت پر بلایا ہوا تھا۔ ہر چہرے پر اپنے سردار کی خوشی کی وجہ سے مسکراہٹ تھی۔ دور دور نزدیک سے لوگ رام لال سائیں کو مبارکباد دینے لال حویلی جمع تھے۔

کھانا کھانے کے بعد حویلی میں جشن منایا گیا۔ ڈھول پیٹے گئے رقص کیے گئے۔ دعائیں ڈالی گئیں اور جہاں موقع اس قدر خوشی کا ہو وہاں سنگیت کی محفل تو گڑ میں شیرے کے جیسی لازم ہو جاتی ہے سو پھر لال حویلی میں محفل نے آدھی رات تک وہ سُر جمائے کہ لوگ اپنے سر دھنتے رہ گئے اور محفل میں سرور آ گیا۔ سب لوگ رات گئے تک اپنے سروں پر بڑے بڑے پگڑ جمائے جھومتے رہے۔

"گیتا— آج میرے شیر نے میرا دل اتنا وڈا (بڑا) کر دیا ہے۔" رام لعل سائیں نے اپنے بیٹے کی پیٹھ تھپکتے ہوئے اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر کہا۔ رات گئے تک جاری رہنے والی محفل کے بعد اب وہ تینوں حویلی کے زنانے میں اندر آگ کالالا کر روشن کیے بیٹھے تھے۔

"خوش تو میں بھی بہت ہوں بابا سائیں۔ پر مجھے اصلی خوشی اس دن ہو گی جب میں جیپ ریلی جیت کے آؤں گا۔" چوڑی چھاتی اور گھنی مونچھوں والے ستائیس سالہ موہن لعل نے اپنی دیرینہ خواہش بتائی۔

"ہاں پتر تم ضرور جیتو گے مجھے یقین ہے میرے بیٹے کی خواہش اگلے سال ضرور پوری ہو گی پھر دیکھنا میرے پتر کی خوشی میں کیسا جشن ہو گا حویلی میں۔" رام لعل نے بیٹے کی ہمت بندھائی۔

"موہن پتر اب تو اپنی ضد چھوڑ دو نا۔ ماں کو بہت ارمان ہے تیرے سر پر سہرہ سجانے کا۔" موہن کی فریبی مائل ماں نے اسے سمجھایا جو پچھلے تین سال سے اپنی شادی اسی ضد پر ٹالتا آ رہا تھا کہ وہ تب تک شادی نہیں کرے گا جب تک وہ چولستان جیپ ریلی میں اوّل نہیں آ جاتا۔ ماں باپ اسے منتیں کر کر کے تھک چکے تھے مگر وہ اپنی ضد سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹا۔ آخرکار رام لعل سائیں نے اس کی ضد سے مجبور ہو کر شادی کے معاملے میں خاموشی اختیار کر لی مگر اس کی ماں گیتا اب بھی کبھی کبھی اپنے دل کے ارمان لے کر بیٹے کے دل کو موم کرنے کی کوشش میں لگی ہی رہتی تھی مگر اس کی ضد پہلے دن کی طرح آج بھی اسی طرح قائم تھی۔

"نا اماں میں پہلے بھی سو بار کہہ چکا ہوں اب بھی میرا جواب وہی ہے کہ جب تک میں یہ مقابلہ نہیں جیت جاتا آپ یہ ارمان اپنے دل میں نہ پالیں۔" اماں آج بھی ہار گئی تھی۔

"پتر تم اور محنت کرو لگن سچی ہو تو بھگوان کسی کی محنت ضائع نہیں جانے دیتا۔ تجھے جنون ہے اور مجھے یقین ہے میرا موہن اگلی ریلی ضرور جیتے گا۔" رام لعل سائیں نے کچھ لمحے پہلے در آنے والی کشیدگی کو دور کرتے ہوئے بیٹے کو حوصلہ دیا اور گیتا کو آنکھ کے اشارے سے مزید اس موضوع پر بات جاری رکھنے سے روک دیا۔

☆—☆

"بھاگ بھری اب چل نا۔ کب سے بلا رہی ہوں تمہارے کو۔ اب تو چھوریاں چلی بھی گئی ہیں۔" رجو نے کوئی آٹھ بار اسے آرام سے کہنے کے بعد اب جھنجلا کر کہا۔

رجو اسے کنویں پر پانی بھرنے کے لیے بلانے آئی تھی

اور وہ بھی کہ اس کے کام ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

''ہاں چلتے ہیں رجو۔ اب ایسی بھی کیا جلدی ہے بھلا۔ کھوہ (کنواں) کہیں بھاگا تھوڑی جا رہا ہے؟'' وہ اپنے آنگن میں تیزی سے جھاڑو پھیرتے ہوئے بولی۔ رجو کے آدھے گھنٹے کا انتظار اسے جلدی لگ رہا تھا۔

''آدھا گھنٹا ہو گیا ہے اور یہ آج کی بات تھوڑی ہے روز تمہارا یہی حال ہوتا ہے اور روز ہی اپنے ساتھ مجھے بھی دیر کروا دیتی ہو۔''

''کیا کروں رجو۔ تم تو جانتی ہو اماں اکیلی پورے گھر میں خوار ہوتی رہتی ہے۔ تمہاری تو بھینو (بہن) ہے پیچھے گھر سنبھال لیتی ہے۔ مجھے سارا کام کاج خود کرنا پڑتا ہے۔'' وہ اپنی چھجی سر پر سنبھالتی دو گھڑے اوپر نیچے رکھتے ہوئے بولی۔ اس کی بات بھی سچ تھی لاجو اور پارو تو اب سسرال سے آ کے کام نہیں کر سکتی تھیں انہیں اپنے گھر اور بچوں کے بکھیڑے ہی کافی تھے یہاں بھاگ بھری ان کے بعد اکیلی ہی تھی۔

اپنے گاؤں کے کنوئیں سے پانی بھرنے جانا سندر نگر کی عورتوں اور لڑکیوں کے روز کے معمولات میں شامل تھا۔ وہاں پیاس تھی، زمین خشک اور بنجر تھی بس یہی ایک کنواں ہی تھا جو ان لوگوں کے لیے خدائی نعمت تھا اور وہ لوگ اس خدائی نعمت [illegible] بھی [illegible] تھے مگر دل کے کونوں کھدروں میں کہیں یہ خوف بھی سوار رہتا کہ اگر کبھی یہ کنواں بھی خشک ہو گیا اور اس نے بھی پانی دینے سے انکار کر دیا تو کیا ہوگا؟

اس سوالیہ نشان کا جواب سندر نگر والوں کے پاس سوائے [illegible] کے کسی دور دراز کے ٹوبھے سے روز پانی بھر لانے کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا لیکن آج تک بھی ایسا ہوا نہیں تھا۔ یہ کنواں ہمیشہ سے سندر نگر والوں پر ایسے مہربان چلا آ رہا تھا جیسے ماں اپنے بچوں پر مہربان ہوتی ہے۔

''اب تو ساول بھی تمہاری ناگھ (انتظار) میں بیٹھا بیٹھا تھک چکا ہوگا۔ کیوں تڑپاتی ہو اسے اتنا؟''

''اچھا ہے نا رجو۔ جب تک ہانڈی کو بھا (آگ) پر نا رکھو وہ کہاں پکتی ہے بھلا۔ یہ محبت بھی ایسی ہی ہانڈی کی طرح ہووے ہے جس قدر ناگھ کی آنچ سیکھی (تیز) ہووے محبوب کی چاہ بھی اسی قدر زیادہ ہووے۔''

''بھاگ بھری کبھی کبھی جب تمہارا سوچتی ہوں تو دل ہول جاتا ہے ہمارا۔ کیا ہوگا تم دونوں کا؟'' اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چھجی سر پر دو گھڑے جمائے رجو نے سندری کو اپنے دل کا خدشہ بتایا۔

''انت (انجام) کی کس کو پروا ہے رجو؟ ساول کا چہرہ آنکھوں کے سامنے ہو تو رام قسم میں کھل کے (ہنستے ہوئے) سولی بھی چڑھ جاؤں۔'' وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اب آبادی سے دور نکل آئی تھیں۔ اب سامنے وسیع و عریض ریت کا سمندر پھیلا تھا۔ سورج کی روشنی سے چمکتی ہوئی ریت۔ سورج کے گرم تھال سے سنہری کرنیں ریت کے ذروں سے ٹکرا کر آنکھوں میں پڑتی تو ایک پل کو آنکھیں بھی چندھیا جاتیں۔ تھوڑے فاصلے پر کنواں سامنے نظر آ رہا تھا۔ گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں بالیاں چولستانی لباس زیب تن کیے اپنے اپنے گھڑے بھرنے کے بعد اب واپس گھروں کو پلٹ رہی تھیں۔

شریر ہوا سے اڑتے ہوئے ان کے رنگ برنگے آنچلوں کو دور سے دیکھو تو ایسے لگتا تھا جیسے کسی نے دنیا کے سارے رنگ آپس میں ملا کر کنوئیں سے سیدھ میں گاؤں کی طرف جاتی پگڈنڈی پر بکھیر دیے ہوں۔

دور سے موہن لعل سائیں کی موٹے ٹائروں والی جیپ ریت پر تیرتی ہوئی گاؤں کی سمت آ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کے کنوئیں تک پہنچنے سے بھی پہلے گاڑی کے ٹائر ان دونوں کے قریب آ کے چرچرائے۔ رجو اور بھاگ بھری اپنے سروں پر گھڑے دھرے آنچلوں کے کونے دانتوں میں دبائے حیرت سے رک گئیں کہ آج موہن سائیں کو بھلا ان سے کیا کام آ پڑا تھا۔

''بھاگ بھری۔ ترھو (تین) دن سے سریندر حویلی نہیں آیا نہ ہی باہر کہیں دکھا (نظر آیا)۔ خیر تو ہے؟ کہاں ہے وہ؟'' گاڑی ان کے قریب روکتے ہی موہن لعل نے تھوڑی سی گھبرائی بھاگ بھری سے اس کے بھائی کے متعلق استفسار کیا۔ گاڑی میں پچھلی سیٹ پر حویلی کا ملازم اور ساول کا چاچا خانوں بیٹھا ہوا تھا۔

''ہاں چھوٹے سائیں سب خیر ہے۔ سریندر بھا تو ترھو دن سے ابا کا آرڈر پہنچانے شہر گیا ہوا ہے کل تک آ جائے گا واپس۔''

''اچھا..... ول (واپس) آئے تو اسے میرا پیغام دینا۔'' آخری جملے کی ادائیگی تک جانے کیوں موہن لعل کے ساتھ ساتھ اس کی آواز کی فریکوئنسی تک بدل چکی تھی۔

سرجندو اور سوہن میں عمروں کے خاصے فرق کے باوجود بھی ذہنی ہم آہنگی ہونے کے باعث گاڑھی چھنتی تھی۔ ان دونوں کے خیالات اور مزاج مشترک تھے تبھی دونوں میں بڑی پکی یاری تھی اور سرجندو اکثر سوہن سائیں کے ساتھ حویلی میں ہی پایا جاتا تھا۔

بھاگ بھری جواب دے کر کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد رجو کے ساتھ آگے بڑھ گئی تھی مگر سوہن سائیں ابھی تک وہیں برف کی طرح جما بیٹھا تھا۔ وہ ابھی تک بھاگ بھری کے سندر مکھڑے میں الجھا ہوا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ سو بار بھاگ بھری کو دیکھ چکا تھا مگر آج تو اس کی صورت جیسے سوہن کی آنکھوں میں ٹھہر سی گئی تھی۔

بھاگ بھری کے کاجل کی تیز دھار اس کے سینے میں اتر گئی تھی یا پھر وہ اس کی لونگ میں کہیں اٹک گیا تھا۔

شاید کسی سے محبت ہونے کے بھی کچھ لمحے مخصوص ہوتے ہیں اور سوہن سائیں پر وہ لمحہ ابھی ابھی اترا تھا۔

"چھوٹے سائیں اب چلیں؟" ان دونوں کے چلے جانے کے کچھ دیر بعد بھی گاڑی اسٹارٹ نہ ہوتے دیکھ کر پیچھے بیٹھے خانوں کو یاد دلانا پڑا کہ انہیں حویلی بھی جانا ہے جہاں ریت پر جیسے گھوڑے کے تھیں بیٹھنا۔

کنویں پر پہنچ کر رجو اور بھاگ بھری نے اپنے سروں پر رکھے گھڑے اتارے۔ رجو ڈول سے گھڑوں میں پانی بھرنے لگی اور بھاگ بھری اپنے پیاسے نینوں کی سیرابی کے لیے آگے چل دی۔ تین ٹیلے چھوڑ کر چوتھے ریت کے بڑے ٹیلے کے پیچھے ساول اس کے انتظار میں بیٹھا ریت پر ہی نقش و نگار بنانے میں مصروف تھا۔

"آ گئی تم۔" ریت پر بیٹھے ساول کا انتظار ختم ہوا اور ہاتھ جھاڑ کر اس نے اپنے ہاتھ صاف کیے۔

"ہاں آ گئی ہوں۔" ریت کی رانی نے اپنی اتھل پتھل سانسوں پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہیں خبر (معلوم) ہے میں ہک ہک (ایک ایک) لمحہ گن کر رہتا ہوں یہاں۔ کیسے گزرتا ہے میرا وقت جانتی ہو تم؟" محبت نے معصومیت سے سوال پوچھا۔

"ہاں جانتی ہوں۔" ہوا کے ایک شریر جھونکے نے بھاگ بھری سے شرارت کی اور اس کی چنی سر سے ڈھلکا دی جسے وہ دوبارہ سر پر جوڑنے لگی۔ حسن قاتل ہوتا ہے اور خود سے بے خبر حسن بے رحم قاتل۔

"پھر بھی تڑپاتی رہتی ہو مجھے؟" محبت نے خود سے بے خبر حسن نے ایک اور سوال کیا۔

"کیا تمہارے سے دور رہ کر مجھے چین ملتا ہے ساول؟ سارا دن تیرے (جلتے ہوئے) انگاروں پر لٹکی رہتی ہوں۔ سارا پہر پور اور رواں رواں جل کر راکھ ہو رہا ہے۔ جب تک تمہارا مکھڑا دیکھ نہ لوں یہ آنکھیں، یہ دل ضدی بال (بچے) کی طرح مارے سے لڑتے ہیں۔ کیا کروں ــــ مجبور ہوں۔" سندری نے دکھ سے اپنے دل کا حال بیان کیا۔

اور ساول جو سننا چاہتا تھا اس نے سن لیا تھا۔ لبوں پر بے وجہ مسکان آ ٹھہری تھی۔ اس تپتی دوپہر میں اسے اپنے اندر بغیر بادلوں کے بارش کی بوچھاڑ سی محسوس ہونے لگی۔ بارش کی وہ خوشی جو سندر نگر والوں کو سالوں بعد نصیب ہوتی ہے وہ بھاگ بھری کے دو جملوں سے ساول کو محسوس ہونے لگی۔ دل کو تسکین مل گئی تھی۔

"ماری بے بسی پہ کھل (ہنس) رہے ہو ساول؟" سندری نے ایک ادا سے ناراضگی دکھائی۔

"نہیں لکھڑے (اچھے) دل کے انتخاب پر رشک کر رہا ہوں۔ پتا ہے جب تم مارے نال (ساتھ) ہوتی ہو میں اس تھوڑے سمے (وقت) میں بھی کتنی زندگیاں جی لیتا ہوں؟" ساول نے اپنا پسندیدہ سوال پوچھا جو اکثر پوچھتا تھا۔

"نہیں۔ اور مجھے جاننا بھی نہیں ہے۔ میں تو یہ سوچ کر روتی رہتی ہوں کہ ہماری زندگی میں یہ پل اتنے تھوڑے سے کیوں ہیں بالکل ہماری محبت کی کار (کی طرح)۔"

"ہماری محبت مختصر نہیں ہے بھاگ بھری۔ ہماری محبت کی زندگی (عمر) تو صدیوں سے بھی وڈی (لمبی) ہے۔ دیکھ لینا تم اور یاد رکھنا یہی ماری بات۔"

وہ اسے دیکھ کر ہی رہ گئی۔ اپنے انجام سے واقف ہو کر بھی کیسے اتنی گہری باتیں کر لیتا تھا وہ۔ جانے کتنے لمحے اسی طرح چپ میں سے گزر گئے۔ وہ کوئی بات کیے بغیر ساول کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے تکتی رہی اور ساول اس کے اس طرح دیکھنے پہ مسکراتا رہا۔ ہوش تب آیا جب رجو کی آواز دونوں کے کانوں سے ٹکرائی۔ جانے کتنی دیر وہ گھڑوں کو آدھے بھرے ڈول سے بھر بھر کر جان بوجھ کے دیر کرتی رہی اور اب ٹیلے کی اوٹ سے کب سے بھاگ بھری کو آوازیں لگا رہی تھی مگر بھاگ بھری اسے کیسے سمجھاتی کہ اس کے ساول کا چہرہ جب آنکھوں کے سامنے ہو تو اسے کائنات میں اور کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اسے ساول کی آواز سنائی دے رہی ہو تو باقی دنیا کی تمام آوازیں سنائی دینا بند ہو جاتی

گئی۔

☆……☆

دن آج بھی ہمیشہ کی طرح روشن اور عیاں تھا اور اپنی پوری طاقت سے سندر نگر پر گرمی برسانے کا فرض پورا کر رہا تھا۔ باہر نکلو تو سورج کی تیز شعاعیں جسم چیرنے لگتیں۔ مغل اپنے جھونپڑے کے آنگن میں سائے کی طرف چارپائی ڈالے اپنے بازو کا تکیہ بنائے بائیں کروٹ لیٹا سانول کو تکے جا رہا تھا جو پاس زمین پر بیٹھا اپنی بانسری صاف کرنے میں لگا تھا۔

"تمہاری چاچی (چچی) نے روٹی نہیں بھجوائی ابھی تک ہونئے آج مجھ (مجھے) زیادہ ہی بھوک لگے ہے۔" وہیں چارپائی پر سوتے سوتے مغل نے خاموشی توڑنے کی غرض سے بات کی۔ حالانکہ بھوک اتنی بھی شدید نہیں تھی جب سے سانول کی ماں نے ان دونوں کو چھوڑ کر اگلے جہان کا سفر پکڑا تھا تب سے تین وقت کے کھانے کی ذمہ داری ان کے چھوٹے بھائی خانوں کی بیوی جتول نے اپنے سر لے لی تھی۔

خانوں خود سالوں سے سائیں کی حویلی میں ملازم تھا۔ گھر میں کچھ بکریاں بھی پال رکھی تھیں جن کو چرانے کی ذمہ داری سانول کی ہوتی تھی۔ اسے اللہ نے ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم رکھا ہوا تھا۔ اب وہ عمر کے اس حصے میں تھے جہاں اولاد کی طرف سے انسان اپنی امیدوں کو لپیٹ کر کہیں دور پھینک آتا ہے سو اب خانوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ اور جتول اپنی اولاد کے حصے کا پیار بھی سانول کے نام لکھ دیتے۔ دونوں بھائیوں کے جھونپڑے جڑے ہوئے تھے سو صبح شام آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔

"پہلے کب تھوڑی بھک (بھوک) لگی ہے؟ تمہارے کو تو ہمیشہ ہی کھاتریں (کھانے) کی جلدی رہتی ہے ابا۔ کبھی پیٹ سے آگے کا بھی سوچ لیا کر۔" سانول نے باپ کی طرف دیکھے بغیر بانسری میں پھونک مارتے ہوئے طنز کا تیر پھینکا۔

"آگے تو بہت کچھ سوچ رکھا تھا پر کروں اللہ نے ہکا (اکلوتی) اولاد ہی نااہل دی ہے تو ساری سوچیں مجھ پر ہی پلٹ آئی ہیں۔" تیر کا جواب بھی پھول سے نہیں پتھر ہی سے آیا تھا۔

"ہاں…… تمہاری اسی نااہل اولاد کے گھن (گن) سارا سندر نگر گاتا پھرے ہے۔" سانول نے مسکرا کر کالر جھاڑتے ہوئے شیخی بگھاری۔

"سندر نگر والوں کے دیہڑ (دن) ابھی اتنے بھی برے نہیں ہوئے کہ وہ دنیا کو چھوڑ کر تمہارے گن گاتے پھریں اور گن بھی ایسے کے گاتے جاتے ہیں جس میں کچھ گن ہووئیں۔"

"ہاں اپنا تو تمہارا قصور ہی ہے۔ گھر کی مرغی دال برابر جو ہووے ہے۔" ایک اور شیخی ماری گئی۔

"پتر میں تو سنگیت کی کھاتا ہوں یہ مرغ مصالحوں اور روغنیات سے تو ہمارا ڈھڈ (پیٹ) سے ہی بھر چلا آوے ہے۔" ان دونوں کی میٹھی میٹھی جنگ اب اپنے نکتہ عروج کو پہنچ رہی تھی۔

"بس کرو ہتر (اب)۔ کب تک لڑتے رہو گے دونوں پیو پتر۔" سر پر کھانے کی چنگیر رکھے جتول بھی گھر میں داخل ہوئی۔ کھانے کی چنگیر کو سفید رنگ کے ٹکڑے رومال سے ڈھانپ رکھا تھا جس پر ہاتھ سے پھول کاڑھے ہوئے تھے۔ چارپائی پر سویا مغل اٹھ بیٹھا۔ کھانے کو دیکھتے ہی پیٹ میں اٹھتی مروڑیں کچھ کم ہوتی لگیں۔

"ہاں ہک (ایک) تیری ہی روٹی کی تھی جتول۔ شکر ہے وہ بھی پوری تھی (ہو) گئی۔ کر تو طنز تجھے وہی کرتے ہیں جب اپنی ہی اولاد ہی نافرمان ہووے تو اوروں سے کیا گلہ۔ اگر یہ اب تک ویاہ کر لیتا تو نہ تمہاری روٹی کھاتے اور نہ تمہارے طنز سہتے (سنتے) رہتے۔" توپ کا رخ اب تبدیل ہو کر سانول سے جتول کی طرف آ گیا تھا۔

"کیوں کرلوں ویاہ۔ تم تو چاہتے بھی ہو کہ ماری ڈال (بیوی) تمہارے واسطے روٹیاں پکا پکا کے کالی ہو جاوے۔ خود لیوں اس کیوں نہیں بنا لیتے ویاہ؟" مغل سیر تھا تو سانول سوا سیر لے۔۔۔ "اب ہمارا کون سا ٹیم (وقت) ہے بیاہنے کا؟ ہمتے کون دے گا دھی؟" باپ بیٹے کی میٹھی میٹھی تکرار سن کر جتول کے لبوں پر مسکراہٹ آ ٹھہری تھی۔ جانتی تھی یہ آج کا تماشا نہیں روز کا معمول ہے۔

"کیوں نہ دیوے ہیں بھلا؟ میں خود ڈھونڈوں گا اپنے پیارے پیو کے لیے رشتہ۔ آدھے بال ہی چٹے (سفید) ہوئے ہیں تو کیا ہوا کالی مہندی مل (لگا) لیں گے اور اگلے چار دو عد (دانت) ہی تو ٹوٹے ہیں صرف۔۔۔ چھوری ڈھونڈوں گا لہو سے پیو کو۔"

"واہ پتر واہ۔ میں تو خوامخواہ ہی تمہارے کو نااہل کہے ہوں تم تو بڑے لائق نکلے۔ بہت اپنے پیو کا ویاہ کرواتے شرم نہیں آتی کیا ہیں؟"

چلو مانو لیا کہ تمھارے کو پہلے وی بھی شرم نہیں آئی تو ہنڑ وی (اب بھی) نہیں آنوے (آنے) والی۔ پر اللہ بخشے تمھاری جنت واسی ماں کو میں اسے کیا منہ وکھاؤں گا اگلے جہاں؟"

"کیا وہ تمھاری جورو ہے تو میری بھی لگے ہے۔ مجھ منا لوں گا میں لاڈوی ماں کو۔ بس تم سہرا باندھنے کی تیاری پکڑو اب۔" وہ ہمیشہ یوسے دو ہاتھ آگے رہنے والا اب کیوں پیچھے رہتا۔

"بالکل لگے ہے۔ پر مارے بے شرم پتر وہ تیری ماں ہونے کے ساتھ ساتھ عورت ذات وی (بھی) ہے۔ لیٹڑیں سوتن کا سن کے ہنڑ اسے وہاں بھی (جنت میں) چین نہ آوے ہے۔"

"اللہ کے بندو ہنڑ بس بھی کر دوووا۔

مگر ٹھنڈا (کھانا ٹھنڈا) ہووے ہے۔ پتا نہیں کب ختم ہوگی تم دونوں کی جنگ۔ یوں چرتے ہوئے سوکھیں ہو گئیں۔ حد ہوتی ہے ہنڑ (اب) اس جنت واسی کو بھی نہیں بخشا۔"

بتول بچی کے خیال نے اپنے آخری ہندسے کو چھوا تو اس نے دونوں کو جھاڑ کے رکھ دیا اور فضل اپنی چھوٹی بھابی کی جھاڑ سن کر مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھ دھونے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆—☆

پچھلے ماہ سے چولستان میں گرمی کی حدت میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا تھا۔ اب تو پرندے بھی دن کے وقت اڑان بھرنے سے کتراتے تھے کہ سورج کی شعلہ برساتی شعاعیں کہیں ان کے پنکھ ہی نہ جلا ڈالیں۔

چولستانی کہیں بھی سارا سارا دن اپنے مٹی سے بنائے ہوئے گھروں اور جھونپڑوں میں دبکے پڑے رہتے۔ پانی کے ٹوبھے خشک ہونے لگے تھے۔ کچھ گھروں نے تو پانی کی تلاش میں نقل مکانی بھی شروع کر دی تھی پھر چیت کا مہینا آپہنچا تو چولستان کے چپے چپے میں زندگی کی رمق پہلے سے کچھ بڑھ گئی۔ زندگی کی یہی حرارت صدو گھر میں بھی نظر آنے لگی۔ اور کیوں نہ ہوتی بھلا؟

چولستان کی شان پیر چنن کا میلہ جو آگیا تھا۔ چنن پیر کا میلہ روہی واسیوں کے لیے زندگی کی فکرات کو ایک طرف ڈال کے خوش ہونے اور مسکراہٹیں بانٹنے کا تہوار سمجھا جاتا ہے۔ اس بار بھی یہی ہوا۔ سات ہفتوں تک جاری رہنے والے اس میلے کی پانچویں جمعرات سے ایک دن قبل ہی چولستان کے دوسرے تمام گاؤں کی طرح سندو گھر سے بھی لوگ قافلوں کی شکل میں اپنے اونٹوں کو سجائے ہوئے چل پڑے۔ کیا بچے، کیا بوڑھے، کیا جوان اور کیا عورتیں ہر کوئی اپنی قوم برادری یا دوستوں کے قافلوں میں خوشی کے گیت گاتے ہوئے چنن پیر کی طرف رواں دواں ہو گئے۔ قافلوں سے قافلے ملتے گئے اور چنن پیر کے ریتیلے میدان میں روہی واسیوں کا ایک جم غفیر سا بن گیا۔ کسی طرف بیل گاڑیوں کی ریس لگائی جا رہی تھی تو کسی طرف شیشوں، پھولوں اور صحرائی مالاؤں سے سجے اونٹوں کا رقص جاری تھا۔ کسی طرف خواجہ فرید کی کافیاں گائی جا رہی تھیں تو کسی طرف لوگ بڑے بڑے دائرے بنائے اپنا ثقافتی رقص پیش کرنے میں مصروف تھے۔

دن کا اختتام ہوا صحراء کی ڈھلتی ہوئی جادوئی شام اتری اور پھر شام نے جب رات کی کالی قبا اوڑھ لی وہاں پورے چاند کی رات میں پورا آسمان دودھیا چاندنی سے بھر گیا۔ نیچے ریت پر آگ کے الاؤ روشن ہو گئے اور بوڑھے قصہ گو اور داستان گو بزرگوں نے تو جوانوں کے دائرے میں بیٹھ کر لمبی لمبی لوک داستانیں چھیڑ دیں جن کے صبح سے پہلے ختم ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ کسی ٹیلے پر فقیرے بھگت کے گیت گاتے مٹھل کے سُر بکھرنے لگے تو کہیں سے سانول کی بانسری کی مدھر آواز کانوں میں رس گھولنے لگی۔ صحرا کی جادوئی رات کے سحر میں تمام چولستانی استطاعت بھر اضافہ کرتے رہے۔

صبح ہوئی تو لوگ اپنے ساتھ قدر کے جانور نیاز دینے لگے۔ کسی نے دوسری طرف پکوان چڑھا دیے۔ کہیں عورتوں نے اپنی کلائیوں میں چوڑیاں چڑھائیں تو کسی طرف لڑکیاں اپنے ہاتھوں کو مہندی سے رنگنے لگیں۔ سب چولستانیوں نے اپنے پیر کے وسیلے سے دعائیں مانگنا شروع کر دیں۔ گرم دین نے خشک ہوتے ٹوبھوں کا رونا رویا تو اللہ داد نے بارشوں کی دعا مانگی۔ کسی کوکو جلی نے بتول کی طرح اولاد کی دعا مانگی تو کسی نے رزق کی کشادگی کی۔ جہاں سب کے دلوں سے اتنی دعائیں نکل رہی تھیں وہاں سانول اور بھاگ بھری کے دل کہاں پیچھے رہنے والے تھے۔ سانول نے بھی چنن پیر کے آنگن میں لگے درخت کی ٹہنی پر اپنی منت کا دھاگہ باندھا جہاں پہلے سے درخت کی ساری شاخیں منت کے دھاگوں سے لدی ہوئی تھیں۔ خدا جانے یہ صرف دھاگے ہی تھے یا چولستانیوں کی دعاؤں، منتوں اور مرادوں کے سندیسے۔ سانول نے اپنا دھاگہ

باندھا۔ لب خاموش رہے مگر دھڑکنیں پھڑپھڑانے لگیں ایک ہی نام پکارنے لگیں۔ بھاگ بھری۔ بھاگ بھری۔

"او ہیرا... تو سچا ہے، خدا کا پیارا ہے، مارے دل کی عرضی بھی پہنچا دے اس سچے رب کی بارگاہ میں اور کسی طرح ہی سہی بھاگ بھری کو ماری زندگی کی طرح میرے نصیب میں بھی لکھ دے۔" اس کے ہاتھ دعا کو باندھے رہے اور دل سے دعا نکلتی رہی۔

وہ بھی اپنی باری پر رجو کے ساتھ اپنی منت کا دعا اٹھائے درخت کے پاس آ پہنچی۔ دھڑکنیں تو سندری کی بھی بے ترتیب تھیں مراد اس کی بھی وہی تھی۔ ساول۔ ساول۔ ساول۔

سندری نے پلکوں کے پردے گرائے، دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اوپر کی طرف اٹھایا۔ رجو نے بھی سندری کی مراد کی بر آوری کے لیے اپنی چنی کا پلو دعائیہ انداز میں اٹھایا۔ سندری کے لب آہستگی سے حرکت کرنے لگے اتنے آہستہ کہ پاس کھڑی رجو کی سماعتیں بھی سمجھنے سے قاصر ہو گئیں مگر رجو کے علاوہ کون تھا جو اس کی مراد جان سکتا۔ وہی اکیلی تو سندری کی ساری منتوں اور مرادوں سے واقف تھی۔

"چین ہیرا... او میل کرانے والے سائیں، کیا مانگوں؟ تم تو جانتے (جانتے) ہو سب۔ تم تو واقف ہو ماری ایک ہی مراد ہے ساول۔ ہمارا بھی میل کرا دے۔ مشکل ضرور ہووے ہے پر تماری سفارش ہووے تو کیا مشکل۔ دعا کا باندھ رہی ہوں۔ اگلے برس پھر آؤں گی کھولنے۔ ماری مراد پوری کرنا۔ اداس مت لوٹانا۔ جانتے ہو نا میرا دل بہت کچا ہے۔ ٹوٹ جائے گا۔ مراد پوری نہ ہوئی تو تیرے پر بھی دعا کا باندھنے نہ آؤں..."

مراد ختم ہوئی تو دونوں ہاتھوں کا پیالہ ٹوٹ کر شفاف چہرے کی طرف مڑ گیا۔

"مانگ لی مراد؟" رجو نے بھی دوپٹا درست کیا۔

"ہاں مانگ لی۔" لب ہلنے سے کھلے تو شفاف مسکان کی برآمدگی ہوئی۔

"کیا مانگا؟" رجو بھی مسکرا دی۔ جانتے ہوئے بھی انجانوں سا سوال کیا۔ سندری کو حیرت ہوئی۔

"تجھے خبر ہے ماری ایک ہی تو مراد ہے۔ پتا نہیں اب چین پوری بھی کرے گا یا نہیں۔" مسکان میں کھلی لبوں کی پنکھڑیاں ایک بار پھر سمٹ گئیں اور پلکوں کے پردے بے اختیار نیچے گر گئے۔ اداسی نے بھاگ بھری کے وجود پر اپنا قبضہ جما لیا۔

آغا شاعر دہلوی

(1871-1940ء)

اردو شاعر۔ آغا مظفر بیگ قزلباش نام، داغ دہلوی سے اصلاح لیتے تھے۔ تیس سال کی عمر میں تلاش معاش میں حیدرآباد دکن گئے اور داغ کی سفارش پر مہاراجہ سرکشن پرشاد کی ڈیوڑھی پر ملازم ہو گئے۔ وہاں سے کلکتے چلے گئے اور ناٹک کمپنیوں کے لیے ڈرامے لکھنے لگے۔ پھر ریاست جھالاواڑ کے درباری شاعر مقرر ہوئے۔ وہیں رباعیات عمر خیام کا منظوم ترجمہ کیا۔ پہلا دیوان "تیر و نشتر" کے نام سے 1906ء میں شائع ہوا۔ "قتل بے نظیر" ان کا مشہور ڈراما ہے۔ دوسری تصانیف آویزۂ گوش اور دامن مریم تھیں۔

مرسلہ: نگار محمد، کراچی

"تمہاری مراد ہی ایسی ہے۔ پر ایسے دل کچا نہیں کرتے بھاگ بھری۔ اداس نہ ہو تم۔" رجو کے دلاسے پر بھی سندری کی اداسی کم نہ ہوئی اور اداس لڑکی نے اپنا اداس چہرہ لوگوں کی جانب پھیر لیا۔

"تجھے پتا ہے کہ تم اداس ہو تو تنے بھی گھٹن ہونے لگے ہے ایسا لگے ہے جیسے ساری ہوا ایک دم سے چلنا بند ہو گئی ہو۔" رجو کے الفاظ دل سے نکلے تھے اس نے بھاگ بھری کا چہرہ اپنی جانب موڑا تو اس کے نین کٹورے موٹے موٹے آنسوؤں سے بھرنے لگے۔ بھاگ بھری نے چہرہ واپس موڑ لیا آنسو روکنے میں ناکام ہوئی تو چھپانا بہتر سمجھا۔

"نا بھاگ بھری ایسے رو نہیں۔" رجو نے اپنی چنری میں اس کے گالوں پر اترے آنسو جذب کر لیے۔ جانے سچ میں ہوا بند ہو گئی تھی یا صرف رجو کو ایسے لگنے لگا تھا۔ وہ اس اداس فضا کا بوجھل پن توڑنے کے لیے بھاگ بھری کا ہاتھ پکڑ کے وہاں سے دور لے آئی۔

میلے کی رونقیں اسی طرح جاری تھیں پھر شام ڈھلی تو لوگ جس طرح ٹولیوں اور قافلوں کی شکل میں آئے تھے اسی طرح واپس ریت پر اپنے پیروں کے نشان چھوڑتے اپنے گھروں کو کوچ کرنے لگے۔ رات کو تیز آندھی چلی اور بے رحم ہوا نے راستوں سے لوگوں کے پیروں کے تمام نشانات مٹا ڈالے۔ ریت کے ٹیلوں کو اٹھا اٹھا کر نئی جگہوں پر لا پھینکا۔ گویا کل کوئی اس راستے سے گزرا ہی نہ ہو ایسے لگتا جیسے کل کی ساری رونقیں قصہ پارینہ ہو گئی ہوں۔

☆...☆

اگلے مہینے میں بہار نے اپنی آمد کی نوید سنائی۔ [illegible] جن پر مانگی جانے والی سینکڑوں دعاؤں میں سے کسی کی دعا رنگ لے آئی۔ ابر کرم نے پچھلے دو دنوں سے آسمان پر اپنا قبضہ جمایا ہوا تھا۔

بادلوں کے دامن پانی کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہوئے تو چھلک پڑے۔ چولستانیوں کے سوکھے لبوں پر مسکراہٹیں کھل اٹھیں۔ بچے بوڑھے بارش کا استقبال کرنے کے لیے اپنے گھروں سے باہر بارش میں نہانے کے لیے نکل آئے۔ ڈھول اور گھنگرو کی تھاپ پر رقص ہونے لگے۔ دھوپ سے جھلسے ہوئے چہروں پر رونق آ گئی۔ رام لعل سائیں نے اپنی حویلی میں اور مندر کے آنگن میں دیگیں چڑھا دیں۔

قحط کا خطرہ ٹل گیا۔ پانی کے خشک ٹوبے بھرنے لگے، پچھلے ماہ نقل مکانی کر کے جانے والے خاندان واپس لوٹنے لگے۔

دو بارشوں کے بعد ہی چولستان کا نقشہ تبدیل ہو گیا۔ پوری فضا مہک اٹھی۔ چولستان کے کمہار، ماچھی، کسان، ہندو، مسلمان سب خوش ہو گئے۔ عورتوں کی کلائیاں چولستانی چوڑیوں سے بھرنے لگیں۔

رجو نے اپنے ہاتھ سے کشیدہ کیا ہوا دوپٹا بھاگ بھری کو تحفے میں دیا۔ اکثر تے مندر پر چڑھاوے چڑھائے جانے لگے۔ فضا میں پرندوں کی چہکاریں اور گیت سنائی دینے لگے۔ موروں کے سنہرے پر کھل گئے۔

بارشوں کے بعد چولستان نے سبز چادر اوڑھ لی۔ بنجر زمین کے دہانے کھلنے لگے۔ جنگلی خودرو پودوں اور جھاڑیوں نے سبز کپڑے پہن لیے۔ بارشوں سے پہلے جن مویشیوں کی پسلیاں انگلیوں پر گنی جا سکتی تھیں وہ اب فربہی مائل ہونے لگے۔ ان کے لیے چولستانی گھاس ہر طرف میسر آ گئی تھی۔

زندگی ہر طرف مسکرانے لگی اور زندگی سے محبت بڑھنے لگی۔ کھیتوں سے خودرو پودے اکھاڑ کر انہیں نئی فصل کے لیے تیار کیا جانے لگا۔ چولستانی سال میں خوشیوں کے یہی دو ماہ ہوتے ہیں اور وہ لوگ ان دو ماہ کو پورے دل سے جینے لگے۔ پورے سال کے دکھ بھلا کر شادیاں جو قحط کے خطرے سے رکی ہوئی تھیں انجام پانے لگیں اور شادی بیاہ کی محفلوں میں ڈھول کے سر بکھرنے لگے۔

موسم جہاں مسکراہٹوں اور کھلکھلاہٹوں کا تھا وہاں لال حویلی کی خوشیاں سب سے جدا تھیں۔ موہن سائیں نے خود اپنی منگنی کی عرضی رکھی تھی۔ گیتا اور رام لعل سائیں کے لیے یہ ایک غیر متوقع خوشی کی خبر تھی۔ کل تک شادی کے نام سے دور بھاگنے والا خود اپنے منہ سے شادی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ گیتا اور رام لعل سائیں دوسرے ہی دن مٹھائی کے ٹوکروں اور شگن کے تحائف سمیت بجرنگ کے جھونپڑے میں آوارد ہوئے۔ سرسوتی اور بجرنگ نے اپنے دانتوں میں انگلیاں داب لیں۔ آج بھاگ بھری کے بھاگوں پر مہر ثبت ہو گئی تھی۔ کہاں بجرنگ کا یہ جھونپڑا اور کہاں لال حویلی کی شان و شوکت۔

سب کو یقین ہو گیا کہ بھاگ بھری تو پیدا ہی محلوں میں راج کرنے کے لیے ہوئی تھی جانے بھگوان نے کیا سوچ کر اسے بجرنگ کی گود میں ڈال دیا۔ اتنی بڑی خوشی پر ماں باپ دونوں کے لبوں پر مسکراہٹ تو آنکھوں میں آنسو تھے۔ انکار کا تو سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جھٹ پٹ ہاں کر کے اگلے ماہ کی تاریخ رکھ دی گئی۔

بجرنگ کے جھونپڑے کی نسبت اب لال حویلی سے ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی منڈی پر بڑا سا پگڑ باندھنا شروع کر دیا۔ سریندر کے کندھے اونچے ہو گئے آخر کار اس کی بہن کا بیاہ لال حویلی میں موہن سائیں سے ہونے والا تھا۔

بجرنگ نے لاج وتی اور پاروتی تک یہ خوشی کی خبر بھجوائی تو اپنے سسرال میں ان کی ناک کچھ مزید اونچی ہو گئی اور سالوں سے بنا ان کا مقام و رتبہ اچانک سے تبدیل ہو گیا۔ سب انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ ہر طرف دکھ سکھ کے بسیرے تھے مگر دکھ کے ابر سیاہ چھٹ گئے تھے۔

جہاں سب اس قدر خوش تھے وہاں سندری کی آنکھوں کے دیپ بجھ گئے تھے۔ وہ قسمت کے اس پلٹے پر حیرت زدہ تھی۔ آن کی آن میں وہ موہن سائیں کی ہو گئی تھی اور اس کے سانول کو خبر تک نہیں تھی۔ جب سے رشتہ پکا کر کے حویلی کا وفد واپس چلا گیا تب سے سندری نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ جن آنکھوں میں کبھی سانول ڈوب ڈوب جاتا تھا اب وہ آنکھیں رو رو کر لال انگارہ ہو چکی تھیں۔

گیتا اور بجرنگ کے ہاتھ دروازہ پیٹ پیٹ کر تھک گئے مگر روپ کی رانی نے دروازہ کھول کے نہ دیا۔ رات آنکھوں آنکھوں میں کٹ گئی گیتا اور بجرنگ کی دروازہ پیٹتے ہوئے تو سندری کی اندر کمرے میں روتے ہوئے۔

وہ بھاگ بھری کی منتیں کرتے رہے سریندر نے ہر چند سب نے کوشش کر ڈالی مگر دروازہ نہیں کھلا۔

صبح ہوئی دروازہ کھلا تو سندری وہی سندری نہیں لگ رہی تھی۔ بال بکھرے تھے، آنکھوں کا سرمہ گالوں پر لڑھکا تھا۔ گیتا ابھی تک اپنے دکھتے سر پر دوپٹا باندھے چوکھٹ پکڑے بیٹھی تھی۔

اس نے باہر آتے ہی شادی سے انکار کا عندیہ دے دیا۔ سب حیران رہ گئے۔ ماں نے اس کی عقل پر ماتم کیا تو بزرگوں کو اس کے پگلا جانے کا شائبہ ہونے لگا مگر وہ بھری کھڑی تھی ایک ہی رات نے اسے کیا سے کیا کر ڈالا تھا۔ اس کا لہجہ، اس کی آنکھیں پہچان میں نہیں آ رہی تھیں۔

سرسوتی پہلے جو اس کا یہ ردعمل ماں باپ اور گھر سے جدائی کا خوف سمجھ رہی تھی اب وہ بھاگ بھری کی حالت اور لہجہ دیکھ کر حقیقتاً خوف کھانے لگی۔ پاس بٹھا کر سمجھایا کہ رشتے جڑے لوگوں سے سنگ جڑا ہے وہ کیا سوچیں گے؟ لوگ الگ تھو تھو کریں گے۔

مگر جس دل و دماغ میں عشق اپنے خیمے گاڑتا ہے وہاں وہ سب سے پہلے عقل و شعور کو دربدری کا پروانہ تھما دیتا ہے۔

یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ سندری کو کچھ سمجھ نہیں آتا تھا سو نہیں آیا۔ سرسوتی کے ہزار سمجھانے پر بھی اس کے لبوں پر انکار کی ایک ہی رٹ تھی سو قائم رہی۔

سرسوتی اپنی پیشانی پکڑ کے بیٹھ گئی۔ اس کی زمانہ ساز نگاہیں جان گئی کہ ضرور کچھ غلط ہے، ضرور کچھ غیر معمولی ہے، کہیں کچھ ایسا ہے جو بالکل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ شام میں انہوں نے رجو کو بلوا بھیجا، پوچھ تاچھ کی مگر وہ بھی سندری کی سکھی تھی پھوٹ کے نہ دی مگر جب رجو نے سندری کی حالت دیکھی تو اس کی اپنی آنکھیں ابل پڑیں۔ رجو کو جس بات کا خوف لگا رہتا تھا وہ خوف اب اپنے تیز اور نوکیلے دانتوں والا بڑا سا منہ کھولے اس کے سامنے قرار پا تھا۔ رجو کو اس کے ساتھ الگ کمرے میں بٹھا دیا گیا مگر وہ اسے کیا سمجھاتی بھلا؟ بس سارا وقت دیوار سے چپکی بیٹھی تصویر بنی بھاگ بھری کو تکتی رہی نتیجہ تبدیل نہیں ہوا، رنگ وہی کا وہی رہا۔

"رجو اسے سندریہ سمجھاؤ۔" اٹھنے سے پہلے رجو کو بھاگ بھری کے گلے سے آواز گھٹتی سنائی دی تھی۔

☆—☆

"یہ تجھے کیا ہو گیا ہے بھاگ بھری؟" وہ جو کبھی کوہ قاف کی پری لگتی تھی آج کسی اجڑی بستی کی بنجارن معلوم ہو رہی تھی۔ سانول کی بھاگ بھری ایسی تو کبھی نہ تھی۔

"تمہاری بھاگ بھری اجڑ گئی ہے سانول۔" اجڑی ہوئی بستی کی بنجارن کے لب تھرتھرائے تھے۔

"ہوا کیا ہے؟ خدارا مجھے کچھ بتاؤ ورنہ سانول ڈوب جائے گا۔"

"مجھے سوہن نام کی بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں سانول۔" سندری نے اپنے بیڑیوں سے آزاد خالی پاؤں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا تو بجلی چمکی، نہ ہی بادل گرجے مگر سانول کو اپنی سماعتوں میں دھماکے ہوتے سنائی دیے تھے۔ وہ وہیں سن بیٹھا رہ گیا۔ ان دونوں کے بیچ کتنے ہی پل خاموشی نے اٹھا کر اپنی نادیدہ زنبیل میں ڈال لیے۔

"یہ بیڑیاں تو کب نہ کب پڑنی ہی تھیں بھاگ بھری عشق ایسے قیدیوں پر اتنا زیادہ سمے (وقت) رحم نہیں کر سکتا ہے۔"

"میرا نام سوہن کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے سانول مجھے اپنا نام دے دو۔"

"ہماری تو روحیں آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ یہ جسموں کی بندشیں اور ناموں کی زنجیریں تو عارضی ہیں۔"

"نا سانول نا۔ میرے کو ایسے گلاں مت پڑھا۔ مجھے یہاں سے نکال لے جاؤ سانول ورنہ گھٹن سے مر جاؤں گی۔"

وہ جو سات گاؤں تک سندر گھر کی پہچان بنی جاتی تھی کہ گھر سے بھاگ جانے پر تا عمر لوگ اس کے گاؤں کو بھاگ بھری کے نام کے پتھر مارتے رہیں گے مگر سندری نے پھر بھی یہ انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے سب کچھ منظور تھا سانول سے جدائی نہیں۔

"ٹھیک ہے پھر بھاگ بھری۔ اگر ہماری قسمت کا یہی فیصلہ ہے تو یہی سہی۔ تجھ چاند کی ٹکلی کو میں یہاں تمہاری ناگھر رکھوں گا۔" سانول نے بھی طویل خاموشی کے بعد آخر کار فیصلہ کر لیا۔

سندری اپنے سانول کو وہیں چھوڑ کر گرتے پڑتے قدموں کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی واپس اپنے گھر آ گئی۔ وقت کی سوئی کی ٹک ٹک آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی۔ بوجھل پن سے بھرپور دن گزرنے لگے۔

پورے چاند کا حجم ہر گزرتی رات کے ساتھ کم ہونے لگا۔ راتوں کا اندھیرا گھنا اور مہیب ہونے لگا۔ سندری خالی خالی آنکھوں سے اپنے گھر اور ماں باپ کے چہروں کو تکتی رہتی۔ جو خاموشی سے اس کی شادی کی تیاریوں میں مگن تھے۔ سانول سے ملنے کے بعد بھاگ بھری نے پھر کوئی احتجاج نہیں کیا تھا بس ایک چپ سادھ لی تھی۔

گزرتے دنوں کے ساتھ اس کی اکیلی محرم راز رجو کے دل کی دھک دھک بھی تیز ہونے لگی۔ اسے محسوس ہوتا جیسے اس کے سینے میں دل نہیں دھڑک رہا بلکہ سینے کے اندر بیٹھا کوئی ہتھوڑے برسا رہا ہے۔ جانے کیوں فضا کا بوجھل پن اسے کسی انہونی کا خوف دلاتا رہتا۔

دوسری طرف مثمل کے جھونپڑے کا ماحول بھی بدل گیا تھا۔ سانول کو بھی سندری کی طرح چپ کی مہر لگ چکی تھی۔ باپ بیٹے کے بیچ آئے روز جاری رہنے والی میٹھی میٹھی تکرار بھی اب بند ہو چکی تھی مثمل کو سانول کی خاموشی کھلنے لگی۔ وہ بات بات پر سانول کو بولنے پر اکساتا مگر سانول کے لبوں سے چپ کی پٹی نہ کھلتی۔

"کیا مسئلہ ہے سانول کیوں اتنا چپ رہنے لگے ہو بولتے کیوں نہیں، ہمارے ساتھ پہلے کی طرح جھگڑا کیوں نہیں کرتے ہنہ!" مثمل جو باپ سے بڑھ کر اس کا یار تھا۔ کتنے دنوں سے اپنے اندر سوالات کی گٹھڑی اٹھائے پھر رہا تھا آج اس نے سانول کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے بٹھا کر گٹھڑی میں موجود سارے سوالات ایک ہی سانس میں نکال باہر کیے۔

"عشق کر بیٹھا ہوں ابا۔" نئے چاند سے تین دن پہلے سانول نے بھی چپ کا روزہ افطار کر لیا۔

"کس سے؟" مثمل کے خدشے سچ ثابت ہوئے مگر سانول کا جواب سنتے ہی وہ مسکرا دیا اس کے نزدیک تو یہ خوشی کی خبر تھی تاکہ سانول کی طرح بوتھی سجا کر بیٹھ جانے کی۔

"بھاگ بھری سے۔" سانول نے بغیر پلکیں جھپکائے زمین پر کسی نادیدہ نکتے کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

مثمل کے لبوں کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ چہرہ فق ہو گیا۔ وہ کچھ دنوں سے گاؤں میں موہن سائیں اور بھاگ بھری کی شادی کے نظارے سن رہا تھا۔ اگر وہ دنیا کے آخری کونے پر بیٹھی لڑکی کا نام بھی لیتا تو اس کا یاروں سے بڑھ کے باپ مثمل اس لڑکی کے آگے ہاتھ جوڑ کر بھی اپنے سانول کے لیے راضی کر لیتا مگر اس نے نام لیا بھی تو کس کا؟ جو ذات برادری دور اپنے مذہب سے بھی الگ تھی۔ اوپر سے موہن سائیں اور لال حویلی کا حوالہ۔

مثمل کی گرفت سانول کے ہاتھوں پر ڈھیلی ہوئی۔ اس نے سانول کے ہاتھ چھوڑے اور کسی روبوٹ کی طرح چلتا ہوا اپنی چارپائی پر اس طرح آ گرا جیسے زلزلے کے بعد کوئی فلک بوس عمارت کے مرکزی مینار زمین بوس ہوتے ہیں۔ اب وہاں صرف اکیلے سانول کی "بوتھی" نہیں بنی ہوئی تھی۔ باپ بیٹے دونوں کو چپ لگ گئی تھی اور سانول وہ ابھی تک وہیں زمین پر بیٹھا اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھنے لگا جہاں پر مثمل کے ہاتھوں کی گرمی اور لمس ابھی تک محسوس ہو رہا تھا۔

☆---☆

"ابھی شادی میں دس دن رہتے تھے مگر گیتا نے ابھی سے حویلی میں ڈھولک منگوا لی تھی۔ شام کو سندر نگر کی لڑکیاں جمع ہو جاتیں۔ ڈھولک بجتی جاتی ملہن کے گانے گائے جاتے۔ حویلی کی دیواروں کو رنگ برنگی روشنیوں اور پھولوں سے لاد دیا گیا۔ وہاں موجود ہر چہرے پر مسکان رہنے لگی۔ خدام کی ذمے داریاں اور کام پہلے سے کئی گنا بڑھ گئے۔

یہی مسکان ہر وقت موہن کے لبوں کا بھی احاطہ کیے رکھتی۔ وہ تصور کی آنکھوں سے ہر وقت گہنوں سے لدی بھاگ بھری کو اپنی حویلی میں یہاں وہاں گھومتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ کبھی بھاگ بھری اپنا بڑا سا چولستانی لہنگا سنبھالتی حویلی کے بڑے سے دالان میں پھر رہی ہوتی تو کبھی صحرائی چوڑیوں سے بھری اپنی کلائیوں اور مہندی لگے ہاتھوں سے اپنی ریشمی زلفیں سنوار رہی ہوتی۔ اسے یہاں وہاں ہر جگہ بھاگ بھری ہی دکھائی دیتی۔"

چاند اب کسی غریب کی بیٹی کے کانوں میں پہنی پتلی سی بالی کی طرح باریک ہو چکا تھا۔ اس میں اتنی ہمت باقی نہیں تھی کہ چودھویں کے چاند کی طرح پورے صحرا کو اپنی چاندنی سے بھر سکے۔

آج چاند کی پہلی آہٹ تھی بھاگ بھری نے اپنے تین جوڑے پہلے سے ہی ایک پوٹلی میں باندھ کر کمرے میں چھپا کر الگ رکھ دیے تھے۔ رات اتری تو سارے مکین اپنے دن بھر کی تھکن ایک طرف اتار کر سونے کی تیاریوں میں لگ گئے۔ آجکل گھر میں ویسے بھی سارا دن اودھم مچا رہتا۔ تین دن پہلے سرسوتی ساتھ والے گاؤں سے اپنی دونوں بڑی بیٹیوں کو چھوٹی بہن کی شادی کے لیے ان کے بچوں کی فوج سمیت لے آئی تھی۔ وہ سب لوگ بڑے چاؤ سے سارا دن شادی کی تیاریوں میں لگے رہتے اور سندری اپنی خالی خالی آنکھوں سے انہیں تکتی رہتی۔

اب بھی وہ نیند کا بہانہ کیے سرسوتی کے ساتھ والی چارپائی پر آنکھیں موندے لیٹی پڑی تھی۔ جب سارے سو گئے تو بھاگ بھری نے اپنی آنکھیں کھول لیں اور خاموشی!

اسے اپنے گھر کے دروازے کو تکنے لگی جسے کچھ دیر بعد اسے پار کر کے ہمیشہ کے لیے یہ گھر چھوڑ دینا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے گھر کے در و دیوار بھی حسرتی نگاہ سے اپنی نہ نظر آنے والی پلکیں جھپکائے بغیر گھر کے باقی افراد کو چھوڑ کر صرف اسے تک رہے ہوں۔

یہاں سے کافی دور گاؤں کے اگلوتے کنویں کے پاس سانول بیٹھا بے چینی سے سندری کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اپنے گھر سے اپنی محبوب بانسری کے علاوہ کچھ بھی نہیں اٹھایا تھا۔

بس سوتنوں کی طرح جھگڑا کرنے والے اپنے باپ پر ایک آخری الوداعی نگاہ ڈالتا دور سے اشارے سے اس کے پاؤں چھوتا اپنی دہلیز پار کر آیا تھا۔ وہ اب سندری کے انتظار میں مجسم بنا بیٹھا تھا۔

کافی دیر اسی طرح اپنے در و دیوار کو خاموشی سے تکتے رہنے کے بعد جب لالٹین کی مدھم سی لو بھی تیل ختم ہونے کے باعث بجھ گئی تو وہ اٹھی اور خاموشی سے اندر کمرے میں چھپائی اپنے کپڑوں کی پوٹلی اٹھالائی اور اسی خاموشی سے اپنے آنگن میں آ گئی جہاں اس کی بدقسمتی تاریکی کا بکل مارے اس کی منتظر تھی۔ وہ آنگن میں بنا چاپ پیدا کیے اندازے لگاتی چارپائیوں سے بچتی بچاتی آگے دروازے کی سمت بڑھنے لگی تھی کہ بجرنگ کی چارپائی کے پائے سے ٹکرا کر زمین پر آ گری جو دو دن سے گھر میں اپنی بیٹیوں کی بچوں سمیت آمد اور چارپائیوں کے بڑھ جانے کے سبب اپنی جگہ بدل کر سو رہا تھا مگر بھاگ بھری یہ بات بھول بیٹھی تھی۔ اب یہ بھاگ بھری کی بدقسمتی تھی یا بجرنگ کی خوش قسمتی کہ وہ ٹکرائی بھی تو اپنی باپ کی چارپائی سے۔ ہاتھوں میں پکڑی پوٹلی گرنے کے سبب دور جا گری۔ گھٹنے میں درد کی شدید ٹیس اٹھنے لگیں۔ درد کے باوجود بھی وہ گھٹنا پکڑے اٹھی پوٹلی اٹھائی اور دروازے کی سمت تیزی سے بڑھی مگر وہ دکھنا بھول گئی تھی کہ اس قدر زور کے جھٹکے سے بجرنگ کی آنکھ کھل گئی تھی اور اب وہ اپنے دونوں بازو وا کیے دروازے پر اس کے سامنے آ کھڑا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو بھاگ بھری؟" باپ کی ایک ہی گرج دار آواز سے اس کی ٹانگیں تھر تھر کانپنے لگیں اور دل بیٹھتا چلا گیا مگر اپنی کانپتی ٹانگوں کے ساتھ بھی وہ دروازہ عبور کرنے کے لیے آگے بڑھی۔

بجرنگ نے سندری کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اپنی

"1938ء میں غریب عوام کی جدوجہد کی شکل میں دو انقلابی تحریکیں اٹھیں۔ مفتی آباد تحصیل چارسدہ کا ایک گاؤں ہے۔ جہاں کسی کسان کے خلاف زمین کے مالک نے بے دخلی کا مقدمہ کیا اور مقدمہ جیتا لیکن کسانوں نے پھر بھی اپنے حقوق کی خاطر مزاحمت کی اور قبضہ برقرار رکھا۔ اس موقع پر ڈاکٹر خان صاحب کے بیٹے عبداللہ نے بھی کسانوں کا ساتھ دیا۔ پولیس نے عبداللہ کو اپنے ساتھیوں سمیت گرفتار کیا۔ اس گرفتاری کے خلاف ایک بھرپور تحریک اٹھی جو مفتی آباد تحریک کے نام سے موسوم ہوئی۔ اسی طرح تحصیل نوشہرہ کے گاؤں غلہ ڈھیر میں بھی زمین کے مالک نے کسانوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جس کی وجہ سے وہاں بھی کسانوں نے اپنے حقوق کی خاطر مزاحمت کی۔"

مرسلہ: انوار احمد۔ چوکی

پاکستان بننے کے بعد کاکا جی صنوبر ادب کی طرف بہت زیادہ مائل ہو چکے تھے۔ چونکہ آپ انگریزی، روسی، فارسی، عربی اور اردو کو بنظر غائر مطالعہ کر چکے تھے لہٰذا نئی ادبی اقدار سے بخوبی واقف تھے اور پسو ادب میں بھی نئی اقدار کو متعارف کرانا چاہتے تھے۔ پشتو زبان و ادب کی ترقی اور نئی ادبی اقدار کو پھیلانے کی خاطر انہوں نے روشن خیال اور ترقی پسند ادیبوں پر مشتمل ایک تنظیم "ادبی ادبی جرگہ" کے نام سے قائم کی۔ اس تنظیم کی تاسیس کا سن ہمارے محققین نے مختلف لکھا ہے۔ جناب ہمیش خلیل نے مارچ 1951 لکھا ہے۔

☆☆☆

سید آل رضا کی شاعری کا آغاز یوں تو پرتاب گڑھ کے دوران قیام ہو چکا تھا اور وہ بہ حیثیت شاعر مشاعروں میں شرکت بھی کرتے رہے تھے لیکن لکھنو آنے کے بعد ان کی شاعری نے بڑی ترقی کی۔ انہیں یہاں کے مشاعروں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ موصوف نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنے ادبی رتبے کو منوا لیا۔ اس زمانے میں لکھنو میں جتنی ادبی انجمنیں تھیں، سب میں وہ حصہ لیتے تھے۔ چونکہ آل رضا صاحب کا ادبی مرتبہ مسلم تھا اس کے اعتراف میں "انجمن محسن الادب" نے جس کے ارکان میں صفی لکھنوی اور ظریف بھی شامل تھے، انہیں نائب صدر کی حیثیت سے منتخب کیا۔ بعد ازاں صدارت کے فرائض بھی تفویض کر دیے گئے۔ اس انجمن کے متعلق سید ہاشم رضا صاحب نے بتایا "یہ لکھنو کی بڑی مشہور انجمن تھی۔ حفیظ جالندھری اور جگر مراد

(چارپائی پر لا پٹخا اور سرسوتی کو آواز دے کر جگایا۔ وہ روتے ہوئے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی مگر بجرنگ کی گرفت مضبوط تھی۔

وہاں سوئے ہوئے سارے مکین اچانک آ جانے والی کسی آفت کے خوف کی طرح آنکھیں پھاڑ کر اٹھ بیٹھے۔

"ابا مجھے شما کر دیو۔ بھگوان کے واسطے مجھے جانے دو ورنہ مر جاؤں گی میں۔" سندری کا کمزور سا احتجاج کسی کام نہ آیا تو وہ چیخ پڑی مگر اگلے ہی پل بجرنگ کے ایک ہی زوردار تھپڑ نے اسے خاموش کر دیا۔

"کہاں بھاگ رہی تھی تو۔ ہماری عزت مٹی میں رولنے کے لیے کس کے ساتھ بھاگ رہی تھی؟" اس کی آواز اپنے تھپڑ سے خاموش کرانے کے بعد بجرنگ دھاڑا۔

"مجھے جانے دے ابا سانول کے پاس۔ میں نہیں رہ سکتی اس کے بغیر۔ بھگوان کے لیے مجھے جانے دیں ابا۔" سندری روتے ہوئے منتیں کرنے لگی۔ سانول کا نام سنتے ہی سریندر اور نریندر بپھرے شیر کے جیسے دروازے کی سمت بڑھے مگر بجرنگ نے ان دونوں کو بھی روک دیا ان کے ابلتے خون پر عقل کی برف رکھی اور سمجھایا کہ ابھی یہ بات گھر کے اندر ہے اور صرف ان کے درمیان ہے اگر اس چار دیواری سے باہر نکلی تو وہ ہمیشہ کے لیے رسوا ہو جائیں گے۔ تمام رات بجرنگ، سرسوتی، لاجونتی اور پاروتی پہلے تھے اور پھر پیار سے سمجھاتے رہے اور وہ صرف سانول کے نام کی مالا جپتی رہی۔

پوری رات اسی کشمکش میں گزر گئی سرسوتی اس کملی کو سمجھاتی رہی کہ تین دن بعد اس کی شادی ہے اب وہ لوگ لال حویلی سے جڑ چکے ہیں اور اونچی شان والوں کی عزت کو ایک بار بٹہ لگ جائے تو قیامت برپا ہو جاتی ہے مگر وہ کہاں سن رہی تھی، اسے تو اپنے سانول کے پاس جانا تھا جو پہروں سے اس کے انتظار میں بیٹھا ہوگا۔ سانول سے جدائی کے تصور سے ہی بھاگ بھری کی روح کانپ جاتی تھی۔ تمام رات سارے گھر والے لال حویلی، رام لعل سائیں اور موہن سائیں کرتے رہے اور وہ سانول سانول کرتی رہی۔

پھر بھی بات نہ بنی تو وہاں بھی وہی آخری جذباتی حربہ آزمایا گیا جو اکثر و بیشتر ہی کامیاب ٹھہرتا ہے۔ سرسوتی نے اپنا دوپٹا تو بجرنگ نے اپنی پگڑی اتار کر بھاگ بھری کے پیروں میں لا کے رکھ دی۔

یہیں سندری کمزور پڑ گئی اور وہ جو سانول کے ساتھ بھاگ کر در حقیقت بھی یہی کچھ کرنے جا رہی تھی جب حقیقت میں بھی دونوں چیزیں اس کے پاؤں پر رکھی گئیں تو وہ ماں کے دوپٹے اور باپ کی پگڑی پر پیر رکھ کے آگے نہ بڑھ سکی۔ وہ وہیں گھٹنے زمین پر رکھ کے بیٹھتی چلی گئی۔ سندری ہار گئی اس نے اپنے سانول جو اس کی کل متاع تھا سے دستبرداری کا اعلان کر دیا اور یہیں پر سندر گڑھ کی بھاگ بھری کے بخت ہمیشہ کے لیے گہنا گئے۔

دور کنوئیں کے پاس بیٹھے سانول کی بے چینی میں گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کی بھاگ بھری نے آج سے پہلے ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔ اس کی سندری ایسی بالکل نہیں تھی۔ اس کی سندری وعدہ خلاف ہرگز نہیں تھی۔ سانول کو یقین ہو گیا کہ کہیں کچھ غلط ہوا ہے۔ اب اس کی بے چینی میں تفکرات بھی شامل ہو گئے تھے۔ سانول کے دل پر ایک بھاری پتھر سا آ پڑا تھا اور بے بسی اس قدر تھی کہ وہ وہاں جا کر معلوم بھی نہیں کر سکتا تھا کہ بھاگ بھری کے ساتھ ہوا کیا ہے آخر وہ اپنے سانول سے وعدہ کر کے آئی کیوں نہیں۔ ساری رات وہ بے چینی اور فکر کے ساتھ وہاں انتظار کرتا رہا پو پھٹنے لگی تو وہ بھی اپنے بے چین اور بوجھل دل کے ساتھ اپنے گھر کی طرف چل دیا جہاں مشعل اب بھی ان سب سے بے خبر سویا پڑا تھا۔

☆.....☆

"اسے دل سے نکال دو سانول۔ بھول جاؤ سب کچھ۔ بھاگ بھری نے ہاتھ جوڑ کر اپنی بے وفائی پر معافی مانگی ہے۔" رجو نے جانے کس دل سے سندری کا آخری سندیسہ اس تک پہنچایا۔

کل دونوں کے بیچ ہونے والی طویل بحث کے بعد آج وہ اس کا آخری پیغام لے کے آئی تھی۔ بیچ سفر میں ہاتھ چھوڑنے کا پیغام، سانول کے ساتھ اپنے سفر کے اختتام کا پیغام، مطلب پیار کی کہانی تمام شد۔

"یہ کوئی (کیسے) ممکن ہے رجو، میں کیسے مان لوں میں کیسے یقین کر لوں کہ بھاگ بھری کا دل سانول کے بغیر دھڑک پائے گا؟" اسے کیسے یقین آتا بھلا کہ بھاگ بھری نے خود ہمیشہ کے لیے بھول جانے کا سندیسہ بھیجا ہے جب کہ اس سے بہتر کون جان سکتا تھا کہ بھاگ بھری سانس لینا تو بھول سکتی ہے مگر اپنے سانول کو نہیں رجو کے پاس الفاظ تھے اور نہ ہی سانول کی آنکھوں میں بجھتے ہوئے دیپ دیکھنے کی ہمت۔ وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی مڑ کر جانے لگی۔

"اسے کہنا کہ ساتول نے یقین نہیں کیا۔ ایک بار آ کر ساتول کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خود یہ سب بول دے۔" ساتول نے اسے جانے سے پہلے اپنی عرضی پکڑائی۔ وہ لفظ "بھول جانا" کہہ ہی نہیں سکا۔

ساتول کی عرضی لے کر رجو واپس آ گئی تھی بھاگ بھری کے پاس۔ اسے جس بات کا خدشہ تھا اب اسی خدشے کا سامنا تھا۔ سندری اپنی زندگی کے مشکل ترین امتحانوں میں آ گھری۔ وہ خود کو دنیا کے کسی ایسے دہانے پر کھڑا محسوس کرنے لگی جس کے آگے پیچھے آگ کے بڑے بڑے الاؤ اور گہری گہری کھائیاں تھیں۔ بچاؤ کا کوئی راستہ بچا ہی نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے ایک بار بھی ساتول کی آنکھوں میں دیکھ لیا تو اپنے ماں باپ کو دی گئی تمام قسموں سے منحرف ہو جائے گی۔ وہ پھر سے بے اختیار ہو جائے گی مگر بھاگ بھری نے پھر بھی فیصلہ کر لیا۔ اپنے ساتول سے ایک آخری بار ملنے کا فیصلہ۔ مطلب اپنے لیے اپنے ہجر کا نصاب خود لکھنے کا فیصلہ۔

لیکن اب اس کے پاس ساتول سے ملنے کی کوئی صورت باقی نہیں بچی تھی۔ دو دن بعد اس کی شادی تھی۔ کنویں سے پانی بھرنا بند ہو چکا تھا رات کو بجرنگ اور سرسوتی اٹھ اٹھ کر اس کا پہرہ دیتے۔

سندری کی نگرانی کرتے رہتے۔ اس پر ساتول سے ملنے کے تمام راستے بند کر دیے جا چکے تھے۔

وہ اپنی ماں کے پاس آ گئی ایک آخری ملاقات کی التجا لیے۔ سرسوتی کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول لینا نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ عورت ذات کے بے اختیار ہونے میں وقت نہیں لگتا اور اگر ایسا ہو جاتا تو وہ ساری زندگی کے لیے قصوروار ٹھہرائی جائے گی پھر آگے سوال اپنی عزت کے ساتھ ساتھ رام لعل سائیں اور لال حویلی کا تھا۔ بہت بڑا فیصلہ تھا مگر اس نے اپنے وجود سے نکالی بچی کی قسموں پر اعتبار کر لیا۔ سرسوتی نے اس کے آنسوؤں کی لاج رکھ لی اس شرط پر کہ بھاگ بھری بھی اس کے اعتبار اور عزت کی لاج رکھے گی۔ سرسوتی نے بھاگ بھری کو دن کے اجالے میں ایک آخری ملاقات کی اجازت دے دی۔

اگلے دن وہ خود کو بڑی سی چادر میں لپیٹے رجو کے ساتھ ساتول کو ملنے آ پہنچی۔ وہ اپنے ساتول کو آخری بار ملنے آئی تھی جانے قیامت کیوں برپا نہیں ہوئی اور نہ ہی موت

ٹریڈ مارک

رجسٹری شدہ الفاظ یا نشان جو بنانے والا اپنی مصنوعات کے لیے مقرر کرتا ہے۔ یہ نشان یا علامت ایک ہی قسم کی مختلف مصنوعات میں تمیز پیدا کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ رجسٹری کرا لینے سے نقل کا اندیشہ نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ ٹریڈ مارک مال کی تشہیر میں بھی مدد دیتا ہے۔ کارخانے کی شہرت کے ساتھ ساتھ یہ نشان مصنوعات کی عمدگی اور نفاست کا بھی ضامن ہوتا ہے اور اس طرح تجارتی شہرت کا ایک اہم جزو تصور کیا جاتا ہے۔ ٹریڈ مارک کے مالکانہ حقوق اس ادارے کو ملتے ہیں جو سب سے پہلے حکومت کے متعلقہ محکمے سے اس کی اجازت حاصل کرے۔

ٹریڈ یونین

کسی صنعت کے مزدوروں کی انجمن جو ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے قائم کی جائے، اسے لیبر یونین بھی کہتے ہیں۔ اس کا مقصد مزدوروں کی اجرت بڑھانا اور کام کے حالات درست کرنا ہے۔ یہ صحت، تعلیم، بیمے، اوقات کار، حالات کار اور دیگر سہولتوں اور مراعات کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ ٹریڈ یونین مختلف شکلوں میں قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ ازمنہ وسطیٰ کے گلڈ دراصل ٹریڈ یونین ہی تھے۔ شروع میں اس قسم کی مزدور انجمن کی رکنیت کو سیاسی طور پر بہت خطرناک سمجھا جاتا تھا اکثر عمر قید اور موت کی سزا دی جاتی تھی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں صنعتی انقلاب کے رونما ہونے کے بعد حالات بدل گئے اور ٹریڈ یونین نے رفتہ رفتہ صنعتی ممالک کی معاشی ترقی میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ پاکستان میں بھی مختلف ناموں کے ساتھ ٹریڈ یونین اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

مرسلہ: احمد کمال، مریدکے

وہ خود جانتی تھی کہ اس کے اندر آتش فشاں پھٹ رہے تھے۔ وہ زلزلوں کی زد میں تھی وہ جانتی تھی کہ اس کے اندر برپا ہونے والے زلزلے نے اس کے وجود کی عمارت کو زمین بوس کر دیا تھا۔ اتنے بڑے زلزلے میں دل کا چھوٹا سا گھرا کیسے خود کو قائم رکھ پاتا۔ وہ اپنے دل سمیت اپنے ہی ملبے تلے دب چکی تھی۔

وہ آج آخری بار اپنے سامنے بیٹھی اپنی بھاگ بھری کو دیکھ رہا تھا جس کی دو دن بعد سندر نگر کے سردار موہن سائیں سے شادی تھی مگر اس کے بال بے رونق تھے، اس کی کلائیاں چوڑیوں سے خالی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں کاجل نہیں تھا۔ سندری کا سارا حلیہ اس کی کہانی سنا رہا تھا پھر وہ اس سے کیوں پوچھتا کہ بھاگ بھری ایسے کیوں کر رہی ہو میرے ساتھ؟ کیوں تم نے اتنی جلدی وہ تمام وعدے بھلا دیے؟

سندری نے بھی سانول سے صرف معافی مانگی تھی اپنی مجبوری نہیں سنائی تھی۔ بے وفائی کی وجہ نہیں بتائی تھی اور نہ ہی سانول اسے کرید کر مزید شرمندہ کرنا چاہتا تھا۔ وعدے تو وہ بھی نہیں بھولی تھی۔

اسے سب کچھ یاد تھا۔ اپنا ایک ایک لفظ، ہر لفظ کا ایک ایک حرف، سانول سے کیا گیا ایک ایک وعدہ۔ مگر سندری نے اپنے ماں باپ اور حویلی کے لیے اپنی زندگی اور اپنے سانول کو دان میں دے دیا تھا۔ بھلا بھاگ بھری سے بڑھ کر بھی کوئی شے ہو سکتا تھا جو اپنی زندگی ہی دان میں دے دے۔

سانول اپنی... بے یقین آنکھوں سے اپنے سامنے ہاتھ جوڑے گھٹنے ٹیکے گردن جھکائے بیٹھی بھاگ بھری کو دیکھ رہا تھا۔ تو سچ میں وہ آخری پیغام سندری کا ہی تھا جو کل رجو لے کے آئی تھی۔

مطلب زندگی تمام شد۔ سانول کی کہانی تمام شد۔ وہ اس کی پوری زندگی ہی تو تھی یا شاید اگر زندگی سے بھی آگے کچھ بڑھ کر ایسی کوئی شے ہے تو سانول کے لیے بھاگ بھری وہی تھی۔ جانتا تھا کہ وہ آج اپنی زندگی کو آخری بار دیکھ رہا ہے اور زندگی اس کے سامنے ہاتھ باندھے لب پہ معافی کی طلب گار تھی۔ سر جھکا ہوا تھا۔ نینوں کے پیالوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے ریت میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ بھلا سندری کی یہ حالت کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ وہ کیسے دیکھ پاتا سندری کو اس حال میں؟ سانول کے لیے دنیا میں اس سے بڑھ کر کرب ناک منظر اور کیا ہو سکتا تھا بھلا کہ اس کے دل کے تخت پر بیٹھ کر حکمرانی کرنے والی بھاگ بھری یوں اس کے سامنے مجرموں کی طرح سر جھکائے معافی کی طلب گار تھی۔

سانول نے اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو کھولا۔ اپنے ہاتھ سے اس کے سندر مکھڑے کو اوپر اٹھایا۔ اپنا سر نفی میں ہلا کر اسے رونے سے منع کیا۔ اس کے علاوہ سندری کی آنکھوں سے گرتے سفید موتیوں کی قیمت اور کون جان سکتا تھا۔ جب سے وہ آئی تھی پہلی بار سانول کی آنکھوں سے آنکھیں ملی تھیں۔ وہ پھر سے بے اختیار رونے لگی۔ دل پانی ہونے لگا۔

"تم واپس چلی جاؤ بھاگ بھری۔ میں تمہارے کو اس حال میں نہیں دیکھ سکوں۔ تم جاؤ سانول نے تمہارے کو اپنے نال کیے گئے ہر وعدے سے آزاد کیا ہے۔" وہ کہہ کر وہاں رکا نہیں تھا۔ رک بھی کیسے سکتا تھا بھلا؟ وہ اپنی کل متاع کو اپنے ہاتھوں سے لٹا کر واپس چلا گیا اور بھاگ بھری اپنے ہاتھوں سے اپنی دنیا گنوا کر وہیں دوزانو بت بنی بیٹھی تھی۔ سانول نے کتنی آسانی سے سندری کے پاؤں کی ہر بیڑی کو کھول دیا تھا۔ رجو نے آ کر اس بت کو کھڑا کیا اور اس کے بے جان وجود کو اپنے سہارے چلاتی واپس اس کے گھر لا پہنچا۔

☆.....☆

کوئی نہیں جانتا کہ بیچ کے تین دن کیسے اور کس طرح گزرے مگر وہ دونوں جانتے تھے کہ کس طرح ایک ایک قدم اپنی موت کی طرف بڑھایا جاتا ہے۔ کس طرح ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ اپنی زندگی کا ہاتھ چھوڑا جاتا ہے۔

سرسوتی اور بجرنگ خوش تھے وہ رام لعل سائیں کی نظروں میں سرخرو ہونے والے تھے۔ سندری نے خاموشی اوڑھ لی تھی ایک بار بھی سانول کا نام نہیں پکارا تھا۔

شادی کا دن آن پہنچا۔ رجو نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کی سونی سونی کلائیوں میں چوڑیاں بھریں، اس کے خشک ہونٹوں کو لال رنگ سے رنگا، ویران آنکھوں کو کاجل سے بھرا، روکھے پڑتے بالوں کو کنگھی سے سنوارا۔ رجو نے بھاگ بھری کی بے جان لاش کو سجا سنوار کر دلہن بنا دیا مگر ابھی تک وہ خود بے رونق بیٹھی تھی۔ رجو کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا سجنے کو۔ وہ بھلا اپنی جان سے پیاری سکھی کے اجڑنے پر کیسے خود کو سنوار سکتی تھی۔ وہ کیسے تماش بینوں میں شامل ہو جاتی بھلا؟

"رجو مارا دل گھبرا رہا ہے۔ سانس بند ہو رہی ہے میری۔ جاؤ تم سانول کو دیکھ کے آؤ۔" مین منڈپ میں

جانے سے پہلے بھاگ بھری نے رجو سے التجا کی اور وہ ساتول کو دیکھنے آ گئی۔

آج سندر نگر کی تمام گلیاں سنسان پڑی تھیں سب لوگ موہن لعل سائیں کی خوشی میں شریک ہونے لال حویلی جمع تھے۔ وہ تیز تیز چلتی ہوئی گلیوں سے نکل کر کھلے ریت کے صحراء میں آ گئی۔

دور سے نظر آتے کنویں کی منڈیر کے اوپر ساتول اپنے ہاتھوں میں اپنی محبوب بانسری پکڑے کھڑا تھا۔ منڈپ میں بھی کنیادان کے بعد اب پھیروں کا وقت ہو گیا تھا۔ اس کے لال دوپٹے کو موہن سائیں کی شال کے ساتھ گرہ لگا کر جوڑ دیا گیا تھا۔ وہ آگ کے الاؤ کے اردگرد اپنے سرتاج کے ساتھ اپنے بے جان قدموں سے پھیرے لینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بالکل نہیں جانتی تھی کہ اس کے قدموں نے اس کی بے جان لاش کا بوجھ کیسے سہار رکھا ہے۔

"اندھے ہوں وہ نین جو خواب دیکھیں کبھی کسی اور کے" یہاں منڈپ سے دور کنویں کی منڈیر پر چلتے ہوئے ساتول نے آہستہ قدموں سے ایک پھیرا مکمل کیا۔ سندری شاید بھول بیٹھی تھی کہ ساتول نے صرف اسے وعدوں کی زنجیروں سے آزاد کیا ہے خود کو نہیں۔ وہ تو ابھی تک اپنے وعدوں پر قائم تھا۔

مندر کا پجاری سات پھیروں کے سات وعدے پڑھ کر سنا رہا تھا۔ دائرے میں کھڑے لوگوں کے چہروں پر مسکان سجی ہوئی تھی۔ آج سندر نگر والوں کے لیے مسرتوں بھرا دن تھا۔

"پگلا جائے وہ دماغ جو خیال سوچے کبھی کسی اور کا" ہاتھوں میں بانسری تھامے ساتول کا تیسرا چکر مکمل ہوا۔ لوگ دلہا دلہن پر پھول پھینک رہے تھے۔ رام لعل سائیں کے سر پر گلابی رنگ کی کلاہ والی پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ گیتا نے آج اپنی شادی کے تمام زیورات نکلوا کر پہنے ہوئے تھے۔

(بھاڑ میں جائے اس جیون کو جو سنگ گزرے کسی اور کے)

منڈیر پر چلتے ہوئے ساتول کے پانچ پھیرے مکمل ہوئے۔ ساتول کی آنکھوں میں وہ چاندنی بھری رات کا منظر تھا جب دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وعدے دیے تھے۔

رجو تیز تیز قدموں سے چلتی اب کنویں سے کچھ میٹر کے فاصلے پر آ پہنچی تھی۔ اسے منڈیر پر چلتا وجود اب پہچان میں آ رہا تھا جو دور سے ایک ہیولا سا لگ رہا تھا۔ رجو کا دل بیٹھنے لگا۔ وہیں سے ساتول کو زور سے پکارا۔ اسے آواز لگائی مگر منڈیر پر چلتا وجود شاید آج اپنی سماعت کی حس کھو چکا تھا۔ اسے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ رجو اسے پکارتے ہوئے کنویں کی طرف دوڑنے لگی۔

منڈپ میں ساتواں پھیرا مکمل ہو گیا تھا۔ موہن سائیں نے بھاگ بھری کی مانگ میں سندور بھر کر اس کے گلے میں منگل سوتر پہنایا۔ ہر طرف سے مبارک سلامت کا شور اٹھنے لگا۔

رجو اب ریت کا سمندر عبور کر کے بھاگتے ہوئے کنویں کی منڈیر کے بالکل قریب آ پہنچی تھی۔ بیچ میں صرف چند قدم کا فاصلہ حائل تھا۔

"آخری دن ہو وہ ہمارا جب تمہارا نام لکھا جاوے کسی اور کے سنگ" ساتول کا بھی ساتواں پھیرا مکمل ہوا۔ اس نے اپنی بانسری پر گرفت مضبوط کر کے آنکھیں بند کیں اور کنویں میں چھلانگ لگا دی۔

رجو نے وہیں سے ساتول کے نام کی چیخ ماری۔ اگلے پل وہ کنویں کی منڈیر پر جھکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے کنویں کے پیندے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اسی تیزی سے واپس گھر کی طرف بھاگنے لگی۔

بھاگ بھری کو موہن سائیں کے بڑے اور موٹے ٹائروں والی جیپ میں بٹھا کر لال حویلی کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔ برات واپس چلی گئی تھوڑی دیر پہلے لوگوں سے بھرا بجرنگ کا گھر اب خالی ہو چکا تھا۔

بھاگ بھری کو موہن سائیں کے سجے سجائے کمرے میں لا کر بٹھا دیا گیا۔ رجو گھر پہنچی تو برات نکل چکی تھی وہ اٹھی قدموں سے ہانپتی ہوئی لال حویلی کی طرف بھاگی۔ کمرے میں وہ گھونگٹ اوڑھے بیٹھی تھی جب رجو نے سب کو ایک طرف کر کے سندری کے کانوں میں روتے ہوئے سیسہ انڈیلا تھا "ساتول نے اپنے سارے وعدے پورے کر دیے ہیں بھاگ بھری"۔ شور تھم گیا تھا ہر طرف خاموشی چھا گئی تھی۔ اب رجو کی آنکھیں بھاگ بھری کے بے جان وجود کو دیکھ رہی تھیں کہ ابھی تک اس بت میں ایک شکن تک کیوں نہیں آئی تھی مگر وہ سندری کے اندر کی توڑ پھوڑ نہیں دیکھ پا رہی تھی جہاں دراڑیں پڑنا شروع ہو چکی تھیں۔ رجو اسے جھنجھوڑ رہی تھی وہ ابھی تک بت بنی بیٹھی تھی۔ وہ ہوش میں ہوتی تو جواب دیتی۔ وہ تو عقل و شعور کی دنیا سے کہیں بہت دور

دور جا چکی تھی۔ شام کو سوہن اپنے کمرے میں آیا تو وہاں سندری نہیں تھی بلکہ ہوش اور عقل سے ماورا ایک پاگل لڑکی دلہن بنی بیٹھی تھی۔ وہی سندری کی شادی کا آخری دن تھا جب سندر نگر والوں نے اپنے گاؤں کی سندری کو اپنے ہوش میں دیکھا تھا۔ اس کے بعد بھاگ بھری اپنے ہوش میں نہیں رہی تھی۔ جس کی دنیا ہی لٹ جائے وہ بھلا کیسے اپنے حواسوں میں رہ سکتا ہے؟ اسے واپس اپنے ماں باپ کے گھر پہنچا دیا گیا مگر وہ بھاگ جاتی تھی کنویں کے پاس، اپنے سانول کا پوچھنے اپنے سانول کو دیکھنے۔ کنویں پر اپنی کلائیاں مارتی رہتی تھی، کنویں کا طواف کرتی رہتی۔ اس کی منڈیر پکڑے بیٹھی رہتی، کپڑے سے بنی گڈی گڈے کی شادی کرواتی رہتی۔ ہوا کے جھکڑ آتے، تیز بگولے آتے اس کے دلہے اور دلہن کو اڑا کے لے جاتے بھاگ بھری صحراء میں بھاگ بھاگ کر انہیں پکڑتی، تلاش کرتی نہ ملتے تو پھر سے رونے بیٹھ جاتی نئی گڑیاں بناتی پھر سے ان کی شادی کرواتی پھر سے روتی پھر ہنستی پھر روتی اور اپنے ساتھ بیٹھے مٹھل کے درد فراق بھرے گیت سنتی رہتی اور روتی رہتی۔

لوگوں نے کنویں سے سانول کی لاش کو نکال کر دفنا دیا تھا لیکن اب گاؤں کی عورتوں نے کنویں سے پانی بھرنا چھوڑ دیا۔ کوئی پیاس سے تنگ آ کر پانی بھرنے جاتا تو پانی سے خون کی بو آتی۔

عورتوں کو کنویں سے ڈر لگنے لگا مگر بھاگ بھری کو ڈر نہیں لگتا تھا۔ عورتوں نے اس طرف آنا ہی ترک کر دیا آہستہ آہستہ کنواں بھی خشک ہو گیا اس نے پانی دینا بند کر دیا مگر دو لوگوں نے اس قاتل کنویں کو اپنا مسکن بنا لیا۔ مٹھل اور بھاگ بھری اس دن کے بعد مٹھل کو کبھی کسی نے شادی بیاہ یا خوشی کی محفلوں میں گاتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ اب وہ کنویں کے پاس بیٹھا گاتا رہتا اور بھاگ بھری سنتی رہتی۔ سندری کنویں کی منڈیر کی ٹیک لگے مٹھل کے درد بھرے گیت سنتی رہتی۔ روتی رہتی۔ گھر والے آتے اسے پکڑ کے لے جاتے وہ پھر آ جاتی اپنے سانول کے پاس پھر پکڑ کے لے جاتے وہ پھر آ جاتی۔ مارتے پیٹتے وہ پھر لیتی۔

گھر میں باندھ دیتے وہ کسی نہ کسی طرح چھڑوا کے پھر آ جاتی۔ گھر والے تھک گئے مگر بھاگ بھری نہ تھکی۔

سالوں کے سال گزر گئے کئی جنن پیر کے میلے آئے گزر گئے۔ پورا گاؤں جنن پیر کی طرف قافلے بنا کے چلا جاتا گاؤں خالی ہو جاتا۔ دو لوگ کنویں کے پاس بیٹھے رہتے۔ مٹھل گاتا رہتا سندری سنتی رہتی۔

سانول کے بعد نہ تو کبھی مٹھل جنن پیر پر گانے کے لیے گیا تھا نہ ہی بھاگ بھری پھر کبھی دھاگا باندھنے گئی تھی۔ چولستان وہی تھا، ریت وہی تھی، پیاس وہی تھی، لوگ وہی تھے، زندگی وہی تھی، سب کچھ وہی تھا مگر وہ انسان وہی نہیں تھے مٹھل وہی نہیں تھا بھاگ بھری وہی نہیں تھی۔

وقت بدل گیا وہ بوڑھی ہو گئی، کمر جھک گئی، آنکھوں میں موتیا آ گیا، بالوں میں چاندی اتر آئی مگر نہ تو ریت کی پیاس ختم ہوئی نہ ہی سندری کے آنسو تھمے۔ کچھ سال بعد مٹھل کا بھی انتقال ہو گیا۔

وہ بھی بھاگ بھری کو کنویں کے پاس اکیلا چھوڑ کر اپنے سانول کے پاس چلا گیا اور وہ وہیں بیٹھی رہ گئی۔ اس کی بوڑھی سہیلی رجو آ جاتی اسے کھانا کھلانے گھر چلنے کے لیے کہتی مگر وہ نفی میں سر ہلاتی رہتی، آنسو بہاتی رہتی۔ رجو روتے ہوئے واپس چلی جاتی سندری وہیں منڈیر پکڑے بیٹھی رہتی۔ اسے سانول کی ایک بات بار بار یاد آتی تھی سانول سچ کہتا تھا "ہماری محبت مختصر نہیں ہے بھاگ بھری۔ ہماری محبت کی عمر تو صدیوں سے بھی لمبی ہے"

کہانیوں میں ایک کہانی کا اضافہ ہوا۔ سندر نگر کی سندری اور ریت کے بیٹے کی محبت کا قصہ تمام ہوا۔ اب جنن پیر میلے پر راتوں کو سنائے جانے والے داستان گو بزرگوں اور قصہ گو بوڑھوں کے قصوں میں سانول اور سندری کا قصہ بھی شامل ہوتا۔

سندر نگر میں اب بھی سب کچھ وہی تھا مگر پھر کبھی کسی نے مٹھل کے گیت نہیں سنے، پھر کبھی کسی نے روپ سروپ کی رانی کو اپنے ہوش میں نہیں دیکھا پھر کبھی کسی نے چاندنی راتوں میں سانول کی بانسری نہیں سنی۔

اور پھر جب بوڑھی رجو اپنی بوڑھی سہیلی کو کھانا کھلانے جاتی تو اس کے پوتے پوتیاں اس سے سوال کرتے کہ کون ہے وہ پاگل بوڑھی جسے آپ روزانہ اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلانے جاتی ہیں؟

تو وہ ان بچوں کو بتاتی تھی کہ سندر نگر میں ایسا کون تھا جسے رجو کے جواب سے اختلاف ہوتا کہ

"وہ اکیلی اداس بنجارن
اپنے گاؤں کی اپسراؤں میں
خوبصورت ترین لڑکی تھی۔"

سفر پہلا پہلا

ندیم اقبال

احساسات، جذبات، فہم و فراست، حکمت و تدبر اور مشاہدے کو الفاظ کا پیرہن دینا۔ اندازِ بیان کے مختلف قرینوں، سلیقوں سے ناسٹلجیائی کیفیات اور عصری صورتِ حال کو اپنی اظہاری صلاحیت کے ذریعے قارئین کی نذر کرنا، اس طرح پیش کرنا کہ پہلی سطر سے آخری سطر تک قاری اسیر رہے۔ یہ کمال ہے ندیم اقبال کا۔ "نانگا پربت کا عقاب" اور "شمشال سے ٹورنٹو" کے بعد ان کا یہ تیسرا سفر نامہ جو جوانی کے ابتدائی ایام کا احوال ہے اور ایک نئے انداز سے لکھا گیا ہے، قارئین کو پسند آئے گا۔

ایک نوجوان کے احساسات و جذبات میں گندھی سفر کہانی

تہمینہ کی پیشانی کو میں نے چوما تھا اس لیے کہ اس نے بھی ایثار اور قربانی کی مثال قائم کی تھی۔ اپنی بہن کی وجہ سے اس نے مجھ سے دوری اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جب میرے ہونٹ تہمینہ کی پیشانی کو چھو رہے تھے تو دور بیٹھا ننھا شیطان بلو دیکھ رہا تھا۔ تہمینہ کے جاتے ہی میرے پاس آ گیا۔ آتے ہی بولا۔ "بھائی جان یہ کیا تھا؟"

"یہ عقیدت کا اظہار تھا۔ آج وہ میری نظروں میں بہت بڑی ہو گئی ہے۔"

"تب ٹھیک ہے، چلے گا۔" اس کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ تھی۔ میں اسے گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ لے آیا۔

اگلے دن میں فتح مندی کے احساس میں لپٹا دریا کنارے اسٹیمر پر اسی جگہ کھڑا تھا جہاں غزالہ ایک بار گئی تھی۔ میرے اندر سرتاسر سا گئی تھی۔ ہلو پیچھے دریا کنارے درخت تلے بیٹھا اپنے بالوں میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔ دریا کے سارے منظر کو گرمیوں کا گدلا پانی بہا کر کہیں دور لے جا چکا تھا۔ نہ تلی مچھلیاں تھیں، نہ سنہری ریت کے ناؤ۔ میرے اندر کسی کو کھو دینے کا غم بھی تھا اور بہت کچھ پالینے کی خوشی بھی تھی۔ دریا کے پانیوں سے اٹھ کر آتی ہوا میرے چہرے کو چھوتی تھی۔ میں ریلنگ سے لگا یہی سوچ رہا تھا کہ واقعی شادی ایک انسانی فعل ہے اور محبت تو فرشتوں کا وصف ہے۔

دریا کنارے سے لوٹنے کے بعد اس رات میں بستر پر لیٹا کافی دیر تک گزرے واقعات کو ذہن کی اسکرین پر دیکھتا رہا۔ خود سے سوال جواب کرتا رہا اسی ادھیڑ بن میں چار بج گئے تھے۔

ویسی ہی بے چینی میں اتنے دنوں بعد فوراً پر محسوس کر رہا تھا۔ صبح بستر چھوڑنا مشکل ہو رہا تھا۔ رات کو سوتے سوتے ہمیں چار بج گئے تھے۔ رات دیر تک لطیف کو غزالہ کے بچھڑنے کی داستان سناتا رہا تھا۔ پھر جیسے اداسی جنگل سے دبے پاؤں نکلی اور آ کر مجھے دبوچ لیا۔ تب سے کوئی تڑپ مجھے بے چین کیے ہوئے تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ٹرپ کے خوشگوار لمحوں سے بھرا دامن خالی رہ گیا ہے۔ کنول جو غزالہ بن کر اسی کی جدائی کے زخم بھرنے آئی تھی وہ بھی گم ہو گئی تھی۔ ٹرپ کے دن تمام ہوئے، غزالہ سدا کے لیے پرائی ہو گئی اور کنول ایک فرحت بخش جھونکے کی طرح آئی اور پیچھے سناٹا چھوڑ کر اپنی راہ چل دی۔ مجھ پر لٹ پٹ جانے کا احساس چھایا رہا۔

اندر کا دکھ رستا تو رہتا ہے مگر رستا اندر ہی ہے۔ کبھی اسے مکمل بے کل کر دیتا ہے اور کبھی یادوں سے کھیلنے لگتا ہے مگر جب میں نے لطیف کے سامنے اپنی ساری باتیں کھول کر رکھ دیں تو ہواؤں فضاؤں نے، درختوں اور پھولوں نے آسمان و زمین، چاند اور تاروں نے سب نے سن لیا۔ اب وہ میرا قصہ زبان زد عام کرتی پھرتی تھیں۔ ہر جانب مجھے اپنی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ جتنا زیادہ سنتا اتنا ہی زیادہ بے تاب ہو جاتا۔ میں بجھ سا گیا تھا۔

ادھر سائیں نے شور مچا رکھا تھا۔ ہر ایک کی رضائی اٹھا کر کہہ رہا تھا۔ "اٹھو جلدی کرو، ایبٹ آباد پہنچنا ہے، پھر پنڈی وہاں سے ٹرین نے کراچی صبح دریا خان اور وہاں سے ڈیرہ۔ لمبا فاصلہ ہے، سونے سے نہیں ٹھہرتے ہے (چلنے سے) کٹے گا۔"

شہزاد نے آواز لگائی۔ "سائیں چپ بھی کر جا۔ کیوں ٹرپ کا مزہ کرکرا کر رہا ہے۔ کہاں باڑہ گلی کی ٹھنڈی ہواؤں میں تھے اور تم نے ڈیرہ سے دریا خان کی تپتی ریت یاد دلا دی۔"

امتیاز نے آواز لگائی۔ "صبح صبح تو نہیں تیرا جن جاگا ہوا ہے۔"

ہر ایک نے سائیں سے سر کھپایا مگر سائیں پھر بھی باز نہ آیا۔ مجبوراً اٹھنا پڑا۔ سب اٹھے، تیار ہوئے اور ناشتا کر کے باڑہ گلی سے بس لی اور گیارہ بجے ایبٹ آباد میں تھے۔

تمام راستے میں اگلی سیٹ کی پشت پہ سر ٹکائے بیٹھا رہا۔ میں خاموش اور اکیلا رہنا چاہتا تھا۔ چاہتا تھا اپنے اندر اور باہر میں ہی بیٹھا رہوں۔ خود سے کچھ پوچھوں اور خود کو کچھ بتاؤں۔ گلے شکوے بھی خود سے کروں اور خود سے ہی جھگڑا کروں۔ خود کو تسلی دوں اور خود کی حوصلہ افزائی کروں۔ خود سے روٹھوں، خود کو مناؤں۔ خود کو کوسوں، خود کو رلاؤں اور خود کو چپ کراؤں۔ جو کچھ کسی سے کہنا تھا وہ سارا خود سے ہی کہوں۔ جو کچھ کسی سے سنا وہ خود کو یاد دلاؤں۔ جہاں جہاں چوک ہوئی اس کی معافی خود سے مانگوں۔ ملزم بھی خود مدعی اور جج بھی خود۔ خود کو سزا دوں اور خود کو سولی چڑھاؤں۔ بس اپنی دنیا اپنے اندر سجا کر اسی میں آوارہ پھرتا رہوں۔

مگر اندر کی دنیا صرف دو گھنٹے ہی بچی تھی کہ بس نے ایبٹ آباد اڈے پر اپنے پہنچنے کا اعلان کر دیا۔

ہم باہر کھڑے اپنے سامان کے اترنے کا انتظار کر رہے تھے مگر کنڈیکٹر تحمل و محنت سے کام لے رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہم اسٹوڈنٹس کارڈ دکھا کر آدھے کرائے پر یہاں پہنچے تھے۔ باڑہ گلی میں تکرار ہوئی تھی مگر ڈرائیور نے تحمل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو پیچھے کر لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ اسٹوڈنٹ طبقہ بسوں کے شیشے توڑنے سے گریز نہیں کرتا۔

سائیں نے کنڈیکٹر کو نرمی سے کہا۔ "چنڈی! ہمارا سامان جلدی سے اتار۔ پانچ بجے سے پہلے پنڈی پہنچنا ہے

ہے۔"

کنڈیکٹر نے تیکھی نظروں سے سائیں کو دیکھا۔

"استاد صاحب...... ذرا صبر......"

سائیں کو اس کا لہجہ نامناسب لگا۔ اس کے چہرے کے آگے ہاتھ لہرا کر بولا۔ "ناں...... ناں...... آگے کوئی بات نہیں جنڈری، ہمارا سامان اتار اور وہ بھی فٹافٹ۔" یہ کہہ کر سائیں کندھا جھٹکتا ہماری جانب آیا اور کنڈیکٹر بڑبڑاتا ہوا چھت پر چڑھ گیا۔ "اسٹوڈنٹ تو اسٹوڈنٹ۔ اب ان کے استاد بھی بدمعاشی دکھاتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد ہمارے بیگ اور بستر زمین پر پڑے تھے۔ فیصلہ ہوا کہ دوپہر کا کھانا پنڈی اسٹیشن پر جا کر کھائیں گے کیونکہ ایبٹ آباد سے فوری نکل جانا چاہتے تھے کہ کہیں ٹرین نکل نہ جائے۔ پنڈی کی بس قریب ہی کھڑی تھی۔ اپنا سارا سامان ہم نے اپنے اوپر لادا اور ہمیشہ کی طرح اسٹوڈنٹس ڈسکاؤنٹ پر بس والے سے جھگڑا کیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ پانچ سے زیادہ اسٹوڈنٹس کو ڈسکاؤنٹ نہیں دے سکتے۔ بات اس کی ٹھیک تھی مگر ہم ڈٹ گئے۔ ایک شور سا بپا تھا۔ میں اپنے آپ کو اس ہنگامے سے دور رکھ کر ایک فاصلے پر کھڑا تھا۔ ایبٹ آباد میں مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ گلیات کے سہانے موسم سے نکل کر قدرے تیز رفتار شہر میں آیا تو لگا کہ سارے مناظر چھن گئے ہوں۔ ہم بارہ گلی کے سناٹے سے نکل کر ایک دم رواں شہر میں چلے آئے تھے، جس کا موسم بھی وہاں کی نسبت گرم تھا۔ یہاں کی ٹریفک، رش، شور اور ہنگامہ طبیعت پر گراں گزر رہا تھا۔ ذہن یہاں کی فضا سے ہم آہنگ نہیں ہو رہا تھا۔ دل میں خیال جاگا کہ کاش ایسا ہو جائے کہ اپنے دوستوں سے چھپ کر ارد گرد گھیرا ڈالے کھڑے ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر اکیلا چڑھ جاؤں۔ وہاں چلا جاؤں جہاں یخ بستہ ہوائیں چلتی ہوں۔ جہاں صرف میں ہوں دوسرا کوئی نہ ہو۔ ایک خاموشی ہو جو چہار سو چھائی ہو۔ میں پہاڑوں سے دور ہو کر واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔

☆......☆

ہمارے دوست بس والے سے مباحثہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ اس تماشے میں دوسری بسوں والوں کے علاوہ عام لوگ بھی شامل ہو گئے۔ ویسے بھی لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جہاں چار لوگ اکٹھے دیکھے وہیں مجمع لگا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ تو ویسے بھی مصروف بس اڈا تھا جہاں متعدد بسیں کھڑی تھیں۔ ہر بس کا کنڈیکٹر اپنی آواز لگا رہا تھا۔

قریب ہی کسی دوسری بس کا کنڈیکٹر کاغان، کاغان کے نعرے بلند کر رہا تھا۔

کاغان، ناران، جھیل سیف الملوک، ملکہ پربت، دریائے کنہار، پہاڑ، زمین، آسمان، بادل، چاند، پھول، پرندے، ہوائیں اور خاموشیاں یہ سب میرے خوابوں کے مختلف نام تھے۔ مجھے ایبٹ آباد حسین نظر آنے لگا جہاں سے ایک راستہ کاغان اور ناران کو جاتا ہے۔ ایک راستہ گلگت، ہنزہ اور اسکردو جاتا ہے۔ ایک کشمیر کو اور ایک نتھیا گلی کی جانب جاتا ہے۔ میں خیالوں میں منازل طے کرتا کاغان میں پہنچ گیا۔ مجھے لگا میرے خواب اسی راستے سے ہو کر پورے ہوں گے۔ میں نے سامنے کھڑے شہزاد کی طرف دیکھا جو کنڈیکٹر کے ساتھ جھگڑے میں اپنا حصہ ڈال رہا تھا۔ اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے آیا۔

"گولے! روزے شروع ہونے میں بڑے دن پڑے ہیں۔ چھٹیاں بھی ہیں اور پاس رقم بھی ہے، پھر اس گرمی میں اتنا جلدی جا کر ہم نے کیا کرنا ہے؟"

عینک درست کرتے ہوئے وہ بولا۔ "تو نتھیا گلی واپس چلیں؟"

"ادھر نہیں یار! ادھر چلتے ہیں ناران، نہ تم نے دیکھا ہے نہ میں نے۔ یہ موقع اللہ جانے پھر کب ملے گا۔"

"تیری بات تو ٹھیک ہے مگر ہم دونوں اکیلے بور ہو جائیں گے۔"

"میں سب کی بات کر رہا ہوں۔ کوئی چکر چلا یار!"

اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ "دوسرے تو لگتا ہے راضی ہو جائیں گے مگر مسئلہ گلو کا ہے۔"

میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "تو اس کی فکر چھوڑ۔ مائیک نے تو ویسے ہی انکار کرنا ہے ادھر اس نے انکار کیا اور ادھر گلو راضی ہو گیا۔"

"اور یہ سارا سامان بھی ساتھ لیے پھریں گے؟"

"دونوں چیچا ای واپس جا رہے ہیں۔ ان کو کچھ پیسے دے کر کہیں گے کہ سامان بھی لیتے جائیں۔ وہ ہمارے گھروں میں بھی بتا دیں گے۔"

شہزاد بولا۔ "چل ایمرجنسی میٹنگ بلاتے ہیں۔ تیرا گلو کو راضی کرنے والا آئیڈیا مجھے بہت پسند آیا ہے۔"

☆......☆

کچھ لمحوں بعد ہی ہم اسی اڈے پر سامان کے ساتھ کھڑے ایمرجنسی میٹنگ کر رہے تھے۔ گلو کی موجودگی میں ہم

شہزاد نے مائیک سے پوچھا۔ "تو خود کو بہت عقل مند سمجھتا ہے۔ رہتا ہمارے ساتھ ہے مگر ہم سے بولتا بھی نہیں۔ گلو کے بارے میں تیرا ذاتی خیال ہے کہ یہ بندہ دو ٹکے کا بھی نہیں اگر گلو یہ کہے کہ میں سب کو ناران لے کر جا رہا ہوں۔ اب تو یہ بتا کہ پھر بھی ساتھ چلے گا؟"

اب مائیک اس سوال کی نوعیت پر غور کر رہا تھا۔ گلو کچھ سمجھے بغیر مائیک پر لال پیلا ہونا شروع ہو چکا تھا۔ میں اندر سے مسکراتا ہوا شہزاد کو اس کے بچھائے گئے جال پر خراج تحسین پیش کر رہا تھا۔

توقع کے عین مطابق مائیک بولا۔ "انتہائی نان سینس آئیڈیا ہے۔ مجھے جن کپڑوں میں فوٹو گرافی کرنی تھی وہ میں کر چکا ہوں اور اب نہ میرے پاس نئے کپڑے ہیں اور نہ میں نے جانا ہے۔"

دوسرے تمام دوست حیران کھڑے تھے کہ یہ میٹنگ کس بات پر تھی؟ ناران کون جا رہا ہے اور مائیک کیا کہہ رہا ہے؟ اس سے پہلے دوست ہم سے کچھ پوچھتے کہ گلو مکمل طور پر بھڑک چکا تھا۔

"تجھ کو نئی پینٹ تو میں اپنی پہناتا ہوں اور وہ بھی اس اڈے پر۔ میں نان سینس ہوں اور تو کیا ارسطو کا پوتا ہے یا ڈاکٹر قدیر نے تم کو پالا ہے؟" گلو اس کے بعد سائیں سے بولا۔ "پیرا! کنڈیکٹر سے کہو ہمارا سامان نیچے اتارے اور کالے انگریز کا بستر چھت پر پڑا رہنے دے، ہاں تو میں نان سینس ہوں۔ تو پنڈی جا رہا ہے اور ہم سب جا رہے ہیں ناران۔"

میں اور شہزاد ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیے۔ پھر شہزاد نے گلو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سب سے کہا۔ "بات تو گلو کی ٹھیک ہے۔ چند دن ناران میں رکتے ہیں۔ دوستوں کا گروپ پھر کبھی اس طرح سے اکٹھا نہیں ہوگا۔ ہمارے کون سے بچے رو رہے ہیں۔"

گلو بولا۔ "بچے رو بھی رہے ہوتے پھر بھی میں نے ناران جانا تھا اور میں دیکھتا کہ تم میں سے کون ساتھ نہیں چلتا۔"

میں اور شہزاد تو پہلے ہی تیار کھڑے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب تیار ہوتے چلے گئے۔ مائیک منہ بسورے کھڑا تھا۔ سائیں سے بولا کہ میں نے بھی ساتھ جانا ہے۔ گلو تسمیں کھا رہا تھا کہ اسے ساتھ لے کر نہیں جاؤں گا۔ مائیک نے سائیں کی جانب دیکھا تو سائیں بولا۔ "جنڈی! گلو زبان کا کڑوا ہے مگر دل کا برا نہیں۔ مان جائے گا۔ اب تو کھڑا کیا ہے چھت سے اپنا سامان اتار۔"

☆.....☆

میں اور شہزاد اپنے پلان میں کامیاب رہے تھے۔ ملازم زیادہ پیسے لینے کے بعد ہمارا سامان اپنے ساتھ لے جانے پر راضی ہو گئے۔ وہ کہتے تھے کہ ہمارا عید کا خرچا نکل آیا ہے۔

طارق نے مشورہ دیا کہ ایک دو دن یہاں رک کر آرام کرتے ہیں۔ کچھ گھوم پھر لیں گے۔ اس کے بعد ناران چلیں گے۔ اس بات پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

ستار نے چٹکی لی۔ "دنیا میں انہونی ہوتی رہتی ہے۔ کیا معلوم کشمیرن طارق کو ادھر ہی مل جائے۔"

طارق آسمان کی جانب دیکھ کر بولا۔ "بس دعا کرو۔ مل گئی تو ناران میں کڑاہی گوشت میری جانب سے۔"

امتیاز نے طارق سے کہا۔ "اگر مل گئی تو لگے ہاتھوں ہم سب مل کر تیری منگنی کی بات بھی چلا دیں گے۔"

"یار! اسے برا تو نہیں لگے گا؟" اس نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

لطیف نے کہا۔ "اگر یونیورسٹی میں یہ بات کرتے تو یقیناً برا لگتا۔ یہاں برا کیوں لگے گا۔ رشتہ مانگ رہے ہیں۔ راضی نہیں تو انکار کر دیتے مگر برا نہیں لگے گا۔"

میں نے جملہ اچھالا۔ "تو صرف رقم نکال۔ ہوٹل میں سامان رکھ کر میں اور طیفا دونوں جا کر انگوٹھی لے آتے ہیں۔"

میری بات سن کر وہ بھڑک گیا۔ "فور ختم ہو گیا مگر تیری بکواس نہ رکیں۔ سری میں مجھے دھوکا دیا کہ کشمیرن یہاں گھوم رہی ہے۔ بعد میں ستار نے مجھے سچ بتایا۔ میں خاموش رہا کیونکہ بے عزتی میری اپنی ہونی تھی۔ اب تو نے کشمیرن کی بات کی تو آخری بار بتا رہا ہوں فساد پڑ جائے گا۔"

☆.....☆

پنڈی کی بس کو روانہ کر کے ہم اب یہ سوچ رہے تھے کہ ایسا ہوٹل ہمیں مل جائے جو نہ تو مہنگا ہو اور نہ بہت سستا مگر ایسا ہوٹل کہاں ملے گا، ہمیں معلوم نہ تھا۔ دو رات گزارنے کا مسئلہ تھا جس پر بحث جاری تھی۔ میں اور سائیں سامان کے ساتھ کھڑے تھے۔ میں سائیں سے مخاطب ہوا۔

"استاد جی کسی گہری سوچ میں مبتلا لگتے ہیں؟"

"جنڈی! پروگرام کہاں کا ہوتا ہے اور چلے دوسری طرف جاتے ہو۔ تم لوگ نہیں جانتے مجھے پھر سے کیا کیا کرنا پڑے گا۔"

"استاد جی! آپ ہوٹل کی فکر نہ کریں۔ وہ جو سامنے کھڑے آپس میں لڑ رہے ہیں وہ کچھ نہ کچھ کرلیں گے۔"

"ہوٹل کا انتظام تو میں ابھی چٹکی بجاتے کرلوں مگر دوسرے انتظامات بھی تو ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے سوچوں میں چلا گیا۔ چند پل گزرنے کے بعد کہنے لگا۔ "مرشد کو ساری خبر دے کر ناران تک کے علاقے کا حلقہ بنانا پڑے گا۔ اب زیادہ لچ لچ نہیں کرنی، ذرا سوچنے دے۔"

"استاد جی ابھی اپنے حلقے سے باہر نکل کر ہوٹل کا انتظام ہی کروادیں۔ یہاں سے تو ہمیں نکالیں۔"

اتنے میں ایک لڑکا سامنے سے آیا اور ہم دونوں کے پاس کھڑا ہوگیا اور سائیں سے کہنے لگا۔ "سر! اسٹوڈنٹس کا ٹرپ لے کر کہاں جارہے ہیں؟"

یہ انجان آدمی سائیں کو ہمارا لیڈر سمجھتا تھا۔ سائیں نے کبھی تردید نہ کی اور نہ برا منایا۔ وہ سوال کرکے ہماری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے سائیں سے کہا۔ "استاد جی! اجازت ہو تو میں بات کرلوں؟"

سائیں نے گردن ہلا کر اجازت دے دی۔ میرے پوچھنے کے بعد اس لڑکے نے جب بتایا کہ وہ یہاں کا مقامی ہے تو میں نے بات آگے بڑھائی اور اس کو مختصر طور پر اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد گزارش کی کہ ہمیں دو رات کے لیے کوئی اچھا اور مناسب ہوٹل چاہیے۔"

بات میری سنی اور مخاطب دوبارہ سائیں سے ہوا۔ "سر! ہوٹل تو مل جائے گا، اگر آپ کہیں تو اسکول میں بھی رہائش کا انتظام ہوسکتا ہے۔"

سائیں میری جانب دیکھ کر مسکرایا اور تیزی سے اپنی سوچوں کو اوجھل کرتے ہوئے نظروں ہی نظروں میں کہنے لگا۔ "دیکھا چٹکی بجانے سے پہلے ہی کس طرح سے ہوٹل کا انتظام کروالیا ہے۔"

میں نے اس لڑکے سے کہا۔ "ہم کو اسکول نہیں صرف دو رات کے لیے ہوٹل چاہیے۔" وہ پھر سائیں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "سر! آپ لوگ میرے ساتھ چلیں۔ اچھا ہوٹل ہے مین شاہراہ پر ہے اور رعایت بھی کروادوں گا۔"

اب سائیں نے مجھے حکم دیا۔ "سب لڑکوں سے کہو کہ سوزوکی کر کے سامان رکھیں۔ ہوٹل کا انتظام ہوگیا ہے۔"

اس کے بعد کچھ ہی دیر میں ہم سب اپنے مختصر سامان سمیت ایک سوزوکی میں سوار ہوئے۔ ڈرائیور ہم کو اڈے سے ذرا پرے مین شاہراہ پر واقع ایک ہوٹل میں لے آیا۔ کاؤنٹر پر کھڑا شخص اس لڑکے کا جاننے والا تھا۔ ہمیں دو بڑے کمرے مناسب کرائے پر مل گئے۔ کمروں کے ساتھ متصل غسل خانے تھے۔ کھڑکیاں ان کی سڑک کی جانب کھلتی تھیں اور ایک مدھم سا شور ہر لحظہ کمروں میں ٹھہرا رہتا تھا۔ ہر کمرے میں چار چارپائی بچھے تھے اور ہوٹل والے نے ایک گدا زمین پر بچھا کر پانچ لڑکوں کا انتظام کردیا۔ ایک کمرے میں میرے علاوہ مائیک، لطیف، سائیں اور ستار تھا۔ باقی پانچ دوسرے کمرے میں سما گئے۔

اس لڑکے کو میں نے اپنے ناران جانے کا بتایا تو وہ بولا۔ "ناران میں میرے کزن اکرم کا ہوٹل ہے۔ میرا خط لیتے جائیں اگر اس کا ہوٹل پسند آئے تو اسے خط دے دینا۔ وہ آپ سے پوری رعایت کرے گا۔"

"شوگران میں کوئی کزن ہے؟" فرید نے پوچھا۔

"وہاں کوئی نہیں۔" وہ ہنس کر بولا۔ "مگر آپ شوگران ضرور جائیں۔ ایک رات ٹھہریں تو بھی بہت ہے۔ آپ بہت انجوائے کریں گے۔"

ٹرانسپورٹ کے بارے میں اس نے بتایا کہ صبح آٹھ بجے گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی بس کاغان کے لیے نکلتی ہے۔ کاغان سے ناران آپ کو ڈائسن لے جائے گی۔ اگر شوگران جانا ہو تو بالاکوٹ کے بعد کیوائی اتر جائیں، شوگران اوپر پہاڑ پر ہے اور آپ کو جیپ وہاں تک لے جائے گی۔"

ستار نے پوچھا۔ "آپ ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئے ہیں۔ ہم سب آپ کے بے حد شکر گزار ہیں۔"

"شکریے کی کون سی بات ہے۔ میں نے سر کو پریشان کھڑے دیکھا تو چلا آیا۔"

گلو نے پوچھا۔ "کس کی بات کررہے ہیں؟"

اس نے سائیں کی جانب اشارہ کرکے کہا۔ "میں سر کی بات کررہا ہوں۔"

گلو ہنسنے لگا۔ "یہ کوئی سر شر نہیں، ہمارا کلاس فیلو ہے سائیں ہے۔"

وہ لڑکا منہ کھولے حیران کھڑا سائیں کو دیکھنے لگا۔ اسے حیران پریشان دیکھ کر فرید نے کہا۔ "اس نے میٹرک کے بعد روحانی علم میں بھی میٹرک کیا۔ دوسرے میٹرک کے!

بعد چند سال جنات کے ساتھ کھیل کود کرتا رہا۔ پھر ایم اے تک کی تعلیم اس نے بنگال کے ساحروں سے حاصل کی۔ اس کے بعد مرشد نے کہا کہ فارمیسی کر لو۔ تو اس نے ایف ایس کیا اور اب ماشاء اللہ فارمیسی کے دوسرے سال میں ہے۔ فارمیسی کے بعد کالے جادو میں پی ایچ ڈی کرنے کوہ قاف جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

اس وقت سائیں کا چہرہ دیکھنے لائق تھا۔ وہ کچھ بولتا کہ میں نے بات سنبھال لی اور یہ کہا۔

"سائیں پریشان تھے کیونکہ انہیں سارا انتظام دوبارہ سے کرنا پڑ رہا تھا۔ سائیں کے منہ سے نکلا ہی تھا کہ ہوٹل کا انتظام ابھی ایک لڑکا آ کر کر دے گا اور ادھر یہ آ گیا؟"

سائیں میری زبان سے اپنی بڑائی سن کر پھر سے لیٹ گیا۔

وہ لڑکا ہنس کر کہنے لگا۔ "میں بھی حیران تھا کہ استاد ہیں مگر علیحدہ کمرا نہیں لیا۔ شاگردوں کے ساتھ دوسرے پلنگ پر لیٹے ہوئے ہیں۔ میں تو یہ دیکھ کر بھی حیران تھا کہ اسٹوڈنٹس آگے آگے جا رہے ہیں اور استاد صاحب ان کے پیچھے اکیلے چلے آ رہے ہیں۔" پھر مجھ سے سرگوشی میں بولا۔ "مجھے بھی لگتا ہے کہ یہ کوئی کالا علم والا ہے۔"

شکر ہے یہ جملہ سائیں نے سنا نہیں ورنہ قیامت آ جاتی۔

جانے سے پہلے وہ سب سے گلے ملا اور جب سائیں کی باری آئی تو کشمکش و پیچ میں کھڑا تھا۔ آخرکار ان سے مصافحہ کر کے نکل گیا۔ ہم نے نیچے جا کر ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا اور کمرے میں آ کر دھیمی رفتار سے پنکھا چلا کر سو گئے۔

میں زمین پر بچھے گدے پر لیٹا تھا۔ ناران کے بے انتہا ٹرپ نے سب کے اندر چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ دوڑا دیا تھا۔ آج صبح تک جو لڑکے بجھے بجھے تھے، دیکھتے دیکھتے وہ چہکنے لگے۔ پھر سے آپس میں چھیڑ خانی اور ہنسی مذاق شروع ہو گیا۔ ٹرپ کے اندر سے ٹرپ نکلا تو ہر لڑکا کھلا کھلا تھا۔ اس عمر میں کس نے تھکنا تھا جو تھک جاتا۔ ہم تو ہرن تھے گویا چراگاہوں میں چوکڑیاں بھرتے پھرتے تھے۔

میں ناران کے مناظر کو اپنے ذہن کے اندر کوئی شکل دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ برف سے ڈھکے پہاڑ اور ان کا سایہ جھیل میں پڑتا دیکھ کر بچپنا من رہا تھا۔ دریائے کنہار مجھے پہاڑوں کو چیرتا ہوا آتا دکھا دیتا تھا۔ اس کے تیز دھارے ایک دوسرے سے سر پٹخ رہے تھے۔ میں دریا، پہاڑ، برف کے بارے میں سوچتا گیا اور مجھ پر چھایا بوجھل پن اور اداسی کم ہوتی گئی۔ ناران جانے کا فیصلہ ایک لمحے میں ہوا اور اسی لمحے نے میری سوچ کی سمت بدل دی۔ وہیں میں نے سیکھا کہ ایک لمحہ آپ کی زندگی کے بڑے بڑے فیصلے کر دیتا ہے۔

زمین پر سونے سے زمین کے ساتھ منسلک ہونے کا احساس جاگتا ہے۔ اداسی ہو تو وہ بھی گہری ہوتی ہے اور خوشی ہو تو دوگنی ہو جاتی ہے۔ کیمپنگ سے میرا لگاؤ اس وجہ سے بھی ہے کہ ہر رات زمین پر نہیں بلکہ نئی زمین پر ملتی ہے۔ میں لیٹا یہی سوچتا سوچتا نیند میں چلا گیا۔

☆......☆

بیدار ہوا تو میری نظریں آہستگی سے چلتے پنکھے کے پروں پر تھیں۔ میری سوچ بھی ان کی طرح دائروں میں گھومنے لگی۔ بہت کچھ کھو بیٹھا تھا مگر ناران کا ٹرپ ہاتھ لگا تو اسی میں خوشیاں تلاش کرنے لگا۔ ہر دکھ میں خوشی کی کوئی نہ کوئی وجہ تلاش کر لینی چاہیے۔ پیار کا دن گزر جائے تو غم کی رات بھی ڈھل جاتی ہے۔ ہم اپنے ذہن کے تابع ہوتے ہیں۔ ایک بار ذہن کو اپنا تابع کر کے دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ زندگی کم مایہ چیز نہیں جسے کسی طوفان کے انتظار میں بیٹھ کر گزارا جائے۔ یہ کیوں سوچا جائے کہ آنے والا دن کوئی مصیبت لائے گا۔ خوف کے مارے زندگی گزارنا اس طرح ہے کہ کوئی کال کوٹھری میں دن گزارے۔ اپنے ذہن کو بدل کر دنیا کو کسی مختلف زاویے سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ میری زندگی تو اس بارش کے انتظار میں ہے جس میں مجھے بھیگنا ہے۔ میں نے ساون کی بارشوں میں آنکھیں موند کر ہر گرتے قطرے کو روح میں اترتے محسوس کیا ہے۔ میں نے نہیں دیکھنا کہ یہ بارش میرے لیے پریشانی بھی لا سکتی ہے۔ ہم نہ بارش کو روک سکتے ہیں اور نہ اس کی بدولت آنے والی پریشانی کو۔ تو کیوں نہ اس میں خود کو بھگو کر کچھ مثبت سوچ لیں۔

اس کے علاوہ ہم خوش ہونے کے لیے اپنے آپ پر کتنی زیادہ شرائط رکھ لیتے ہیں؟

اصل خوشی تب ملے گی جب نیا گھر بناؤں گا۔ یہ نوکری مل جائے تو زندگی کا لطف آ جائے گا۔ اس لڑکی سے شادی ہو جائے تو دنیا جنت بن جائے گی۔ جب سب ذمے داریوں سے سبکدوش ہوا تو پھر آرام سے حج کروں گا۔ ابھی دولت اکٹھی کر لوں تو ریٹائرمنٹ کے بعد دنیا گھومنے نکلوں گا۔

گا۔ کتابیں جمع کر رہا ہوں اور جب زندگی کے ہنگاموں سے فرصت ملی تو پڑھوں گا۔

کتنی ناجائز شرائط ہم اپنی خوشیوں پر رکھ دیتے ہیں۔ خوشی سامنے پڑی ہوتی ہے مگر اس جانب نہیں بڑھتے بلکہ کہتے ہیں کہ چکر کاٹ کر واپس آئیں گے تو ہمارا انتظار کر رہی ہوگی۔ ایسا نہیں ہوتا۔ پالینے کا لمحہ ہوتا ہے۔ ہاتھ سے نکل گیا تو واپس نہیں آئے گا۔ آسمان پر بدلتے رنگ دیکھ رہے ہیں تو آج دیکھ لیں، کل آسمان پر کوئی رنگ نہ ہوگا۔ آج جو چڑیا شاخ پر بیٹھا چہچہا رہا ہے، اسے سن لیں۔ یقین کریں کل وہ آپ کے انتظار میں بیٹھا نہیں رہے گا۔

خوشی کو ذائقوں سے مت جوڑیں، اسے آنکھ سے پرکھیں۔ دنیا بھی اصل رنگ میں نظر آنے لگے گی اور تب سرخیاں آپ کے ذہن میں حسین یادیں بن کر جمع ہوتی جائیں گی۔

بیدار ہو کر میری نظر سائیں پر پڑی جو تیار ہو کر سفید لٹھے کا جوڑا پہنے کرسی پر بیٹھے تھے۔

''استاد جی! بڑے تیار شیار نظر آرہے ہیں، کہیں باہر گئے تھے کیا؟''

''جندڑی! چکر لگا کر ابھی آیا ہوں۔''

''اڈے پر گئے تھے؟''

''اڈے پر میری ریڑھی ہے جو وہاں گیا تھا؟''

''بازار کا چکر لگانے گئے ہوں گے؟''

''نہیں جندڑی! سندھ گیا تھا۔ پروگرام بدل کر میرا کام بڑھا دیا تم لوگوں نے۔''

سندھ کا سن کر میں حیرت سے منہ کھولے کھڑا تھا۔

''استاد جی! سندھ؟ یہ اپنا صوبہ سندھ؟''

قدرے جھڑک کر بولے۔ ''کوئی اور بھی سندھ ہے دنیا میں؟ مرشد سے بات کی تو اس نے بلا لیا۔ دائرے سے دریا خان نکال کر دوسرا حلقہ بنایا ہے۔ یہاں سے ناران تک کا علاقہ اب محفوظ ہے۔ چاہو تو اب سیف الملوک پر چڑھ جاؤ کوئی خطرہ نہیں۔''

''استاد جی! سیف الملوک جھیل ہے، کوئی پہاڑ نہیں۔''

''تم نے تو کہا تھا وہاں پہاڑ بھی ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟''

''ملکہ پربت۔''

''یہ کیا نام ہے؟ پربت مردانہ اور ملکہ زنانہ۔ مرشد نے اس پر چڑھنے کی اجازت نہیں دی۔''

''اور چیتا کیا وہی باڑہ گلی والا ہوگا؟''

''نہیں کم از کم وہ والا نہیں ہوگا۔ کہاں سے ہوگا اس کا فیصلہ مرشد ایک آدھ دن میں کر لیں گے۔''

''استاد جی! مرشد نے کیا کوئی گورنر لگانا ہے جو فیصلہ بعد میں کریں گے۔ مرشد کے پاس کتنے چیتے ہوں گے، ان میں سے کسی کو بھی بھیج دیں۔ اگر کوئی فارغ نہیں تو لاہور چڑیا گھر والا ہی بھیج دیں۔'' میں نے مزہ لیتے ہوئے گڑگڑانے کے انداز میں کہا۔

سائیں ہاتھ اٹھا کر مجھے چپ کراتے ہوئے بولا۔ ''بات کا پتا نہ ہو تو چ چ نہیں کرتے۔ چڑیا گھر کا چیتا سدا کا بھوکا ہوتا ہے۔ فارسی کی ایک مثل ہے کہ بھوکا چیتا سب سے پہلے مالک کو کھاتا ہے۔ مرشد میرے کہنے پر چڑیا گھر والا بھیج دے گا۔ اس نے سب سے پہلے مجھے پھڑکانا ہے اور ڈکار تک نہیں لینی۔'' پھر سر کا اشارہ کر کے بولا۔ ''تم جلدی سے غسل خانے جا کر تیار ہو۔ میں دوسرے آلیسوں (مست الوجود) کو اٹھاتا ہوں۔''

☆—☆

کپڑے ہم ہوٹل والے کو لانڈری کے لیے دے چکے تھے اور جو تن پر تھے وہی پہنے تیار ہو کر چائے پی رہے تھے۔

شہر اور اس کے بازاروں سے ہم بہت دن دور رہے تھے لہٰذا ہر ایک کا دل ایبٹ آباد کی سیر کے لیے مچل رہا تھا۔

مری بسانے کے ساتھ ساتھ ایبٹ آباد کو بھی اسی دوران سر جیمز ایبٹ نے آباد کیا تھا۔ 1853ء میں جب واپس انگلستان گیا تو وہ بہت دکھی تھا۔ اسے ایبٹ آباد سے محبت ہو گئی تھی۔ سنا ہے کہ مرتے دم تک وہ اسے یاد کرتا رہا تھا۔ ایبٹ آباد شروع سے اب تک آرمی کے حوالے سے مشہور رہا ہے، گویا فوج یہاں رہی۔ انہوں نے یہاں بہترین تعلیمی ادارے اور چرچ بنائے۔ برن کالج بھی لارنس کالج مری کی طرح یہاں کا ایک بہترین تعلیمی ادارہ ہے۔ ہمارے جیسے متوسط طبقے کے لوگوں کی تو ایک خواہش ہی تھی کہ یہاں سے تعلیم حاصل کریں۔ کاکول اکیڈمی تو دنیا کی بہترین فوجی آفیسرز کی تربیت گاہ ہے۔

آزادی کے بعد بہت سے گورے واپس نہیں گئے تھے جو یہاں پیدا ہوئے، پلے بڑھے تو انہیں یہاں کی زمین سے انس ہو گیا تھا۔ کچھ کی ہڈیاں اس زمین میں دفن تھیں اور ان کی یادیں ان کے پاؤں کی زنجیر بن گئی تھیں۔

جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو ڈیرہ کے بازار میں یا سرکلر روڈ پر ایک بوڑھی انگریز خاتون کو اکیلے گھومتے دیکھا کرتا تھا۔ رنگین گھگری جیسی پہنے، سر پر ہیٹ رکھے اور ہاتھ میں سودا سلف کے لیے ٹوکری اٹھائے کہیں جا رہی ہوتی۔ آخری بار میں نے اسے سرکلر روڈ پر نواب کی کوٹھی کے قریب کھڑے دیکھا۔ پورا شہر اس کو مس گوڈین کے نام سے جانتا تھا۔ اس کی کمر جھک گئی تھی مگر اس نے ڈیرہ نہ چھوڑا۔ نہ ہم لوگوں نے کبھی اس کو اجنبی نظروں سے دیکھا اور نہ کبھی اس نے ڈیرہ کے باسیوں کو غیر سمجھا۔ اس دور میں ہوتی تو خدا جانے کون اسے کافر قرار دے کر مار دیتا یا وہ واپس جا چکی ہوتی۔ میرے اندر ایک حسرت ہے کہ کاش اس کا میں انٹرویو کر کے اس کی کہانی قلم بند کرتا۔ اس دور میں لڑکیاں کسی شادی یا کالج کے فنکشن کے لیے کچھ فیشن کر لیتیں تو بڑی بوڑھیاں ان کو یہی طعنے دیتیں کہ بڑی مس گوڈین بنی پھر رہی ہے۔

ایبٹ آباد صاف ستھرا شہر تھا۔ معلوم نہیں اب اس کی کیا حالت ہے۔ یہ سطح سمندر سے 4100 فٹ بلند ہے۔ مری 7500 اور نتھیا گلی 8000 فٹ بلند ہے۔ اس کا درجہ حرارت باقی دو کی نسبت معتدل رہتا ہے۔ سنا ہے کسی زمانے میں یہاں باقاعدہ برف باری ہوتی تھی۔ پنکھے بھی بمشکل چلتے تھے مگر اب تو اے سی بھی عام ہیں۔ ایک بارش اس شہر کو دھو دھلا کر اجلا کر دیتی ہے۔ پہاڑ پر ہونے کی وجہ سے پانی فوراً کہیں بہہ جاتا ہے۔

ایبٹ آباد مجھے بہت پسند رہا ہے۔ کئی بار یہاں آیا۔ یہاں کی گلیوں اور کوچوں میں مہمان بن کر بھی رہا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس پہاڑی شہر کے اندر تنگ گلیاں اور کوچے بھی ہوں گے۔ وہاں نہ تو کسی گھٹن کا احساس ہوتا ہے اور نہ کوئی حبس ہوتا ہے۔ گرمی سے پناہ لینے کا بہترین مقام ہے۔ دوسرے شہروں کے کئی خاندان یہاں آ بسے ہیں۔ تعلیم اور صحت کے علاوہ بڑے شہروں کی ساری سہولتیں یہاں موجود ہیں۔ اس شہر کی جانب مناسب توجہ دی جائے تو یہ کسی طرح سے یورپین قصبوں سے کم نہیں ہے۔ ملک کے دوسرے چھوٹے شہروں کی طرح اسے بھی نظر انداز رکھا گیا۔ پہاڑوں کے درمیان پھیلی وادی اور ڈھلوانوں پر بسا یہ شہر بہت خوب صورت منظر پیش کرتا ہے۔

ہم اس کے چھوٹے چھوٹے بازاروں میں گھوم رہے تھے۔ ہر دو جانب صاف ستھری دکانیں تھیں۔ خاص بات یہ تھی کہ یہاں فضائی آلودگی بالکل نہ تھی۔ خریداری تو ہم نے کوئی خاص کرنی نہ تھی، بس گھوم پھر کر اپنی ذہنی کیفیت بدلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر ایک دکان میں جھانک کر ایسے دیکھتے جیسے پہلی دفعہ دیکھ رہے ہیں۔

گگو ہر دکان پر ہمیں ساتھ لے جاتا اور "سلاجیت" کا پتا کر رہا تھا۔ دکان چاہے جنرل اسٹور ہو، بیکری یا سبزی کی دکان ہو۔ وہ ان سے پوچھتا۔ "خالص سلاجیت ملے گی؟"

ایک دکاندار نے جواب دیا۔ "ایک کو چاہیے یا سب کو؟"

گگو ہاتھ کھڑا کر کے بولا۔ "میں نے خریدنی ہے۔"

وہ دکاندار بولا۔ "تو باقی سب نیچے اتر جاؤ۔"

فرید نے کہا۔ "خریدنی ایک نے ہے مگر استعمال سب نے کرنی ہے۔"

دکاندار ڈانٹ کر کہنے لگا۔ "تم لوگوں نے اس کا کیا کرنا ہے؟"

جواب آیا۔ "یونیورسٹی میں پریکٹیکل کرنا ہے۔"

"لاحول ولاقوۃ، اترو میری دکان سے۔ میرا عصر کا وقت ہو رہا ہے۔"

ایک جنرل اسٹور والے نے پچھلے خانوں میں ہاتھ ڈال کر کوئی ڈبیا نکال ہی لی۔ اس پر پڑی گرد جھاڑتے ہوئے بولا۔ "پکی رسید کے ساتھ دوں گا۔ اصلی نہ ہو تو واپس لے آنا۔ خود گلگت کے پہاڑوں سے اتاری تھی۔ یہ آخری بچی بچ گیا ہے۔"

سائیں نے ڈبیا اس کے ہاتھ سے لے لی۔ کسی ماہر جینا سی کی طرح اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ معلوم نہیں کیوں۔ سکے کی طرح انگلی سے فضا میں اچھالا۔ وہ دکاندار ڈبیا کو فضا میں اچھلتے پل پل دیکھ رہا تھا۔ سائیں نے ڈبیا کو فضا ہی میں دبوچ کر دکاندار سے قیمت پوچھی۔ جو اس نے قیمت بتائی تو ہم حیران ہو کر کبھی ڈبیا کو دیکھتے اور کبھی دکاندار کے چہرے کو۔ اس کے بعد ہر ایک اس قیمتی ڈبیا کو اپنے ہاتھ میں لے کر تولنے لگا کہ اس کے اندر کوئی سونا ہے یا چاندی ہے یا کہ صرف خالی ٹِش پٹِش ہے۔ سائیں ہم سے ڈبیا واپس لے کر دکاندار کو لوٹاتے ہوئے بولا۔ "یہ سستی والی ہم نہیں لیتے۔ اصلی دکھا اصلی۔"

اب دکاندار پوچھنے لگا۔ "پھر سائیں! آپ ہی بتا دیں اصلی کون سی ہوتی ہے؟"

پھر سائیں دکاندار کو تفصیل سے بتانے لگا۔

”وہ جو قطری شہزادہ میرا دوست ہے۔ ایک بار سلاجیت کا سوال کر بیٹھا۔ میں نے اپنا بندہ ہنزہ بھیجا اور وہ خود پہاڑ پر چڑھ کر سلاجیت اتار لایا۔ قطری کو بھیجی تو کچھ عرصے بعد اس نے وہ ڈبیا مجھے واپس بھیج دی۔ حیران ہوا اور کھول کر دیکھا تو اس میں ہیرے بھرے تھے۔ اندر ایک رقعہ بھی پڑا تھا۔ لکھا تھا۔ ”سائیں وہ ڈبیا اور بھیجو۔ ایک دانے کے لیے اور ایک بڑے دانے کے لیے۔“

وہ دکاندار ہم سے بہت خفا نظر آتا تھا۔ اسے منانے کے لیے آدھ پاؤ میں نے لیمن گراس خرید لی۔ سوچا ناران کے خنک موسم میں اس کا قہوہ دریائے کنہار کے کنارے بیٹھ کر پیوں گا۔

سائیں گلو سے بولا۔ ”اصلی سلاجیت اب میں تم کو ڈھونڈھ کر دیتا ہوں۔ مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ ایسی نایاب چیزیں کہاں ملتی ہیں۔“

یہ کہہ کر سائیں ایک سبزی کی دکان پر رک گیا۔ ”خالص، اصلی اور تازہ سلاجیت چاہیے۔ انگریزی نہیں دیسی۔“

سبزی والا بھی ہماری طرح کا کوئی لڑکا تھا، وہ بولا۔ ”سلاجیت تو میرے پاس نہیں لیکن بینگن ہیں۔ وہی لے جاؤ دونوں کی ایک ہی تاثیر ہے۔“

میں نے سائیں سے پوچھا۔ ”استاد جی! یہ انگریزی سلاجیت کون سی ہوتی ہے۔“

بولے۔ ”یہ بتاؤ، کیا انگریزی مرغی ہوتی ہے؟“

”جی ہوتی ہے۔“

”تو انگریزی سلاجیت کیوں نہیں ہو سکتی؟“

پہلے تو میں حیران رہ گیا مگر پھر بولا۔ ”یہ بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا۔“

مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولے۔ ”بات پلے پڑی؟“

”جی ہاں استاد جی۔ یہ سبق بھی کبھی نہیں بھولے گا۔“

ایک کپڑے کی دکان پر فرید چڑھ کر فوراً اتر آیا کیونکہ وہاں بیٹھے ایک بزرگ نے لوہے کا گز ہاتھ میں تھاما ہوا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”اتر کیوں آئے؟“

بولا۔ ”بزرگ کو دیکھ کر لگتا تھا کہ سلاجیت کھائے بیٹھا ہے۔“

ہم اسی طرح سے بازاروں میں گھوم پھر رہے تھے کہ مقصد صرف تفریح لینا تھا۔ کسی کو ذرا سا چھیڑ کر ہنس پڑے، قہقہے لگائے اور ہماری تفریح ہو گئی۔ خواتین نظر آتیں تو احتیاط کرتے، ہم خاموش ہو جاتے۔

اسی طرح چلتے چلتے ہم سلک روڈ پر لیڈی گارڈن میں آ بیٹھے۔ سڑک کے درمیان بنے اس پارک میں مخمل کی طرح دبیز گھاس بچھی تھی جس پر درخت سایہ کر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ گورے یہاں اپنی فیملیز کے ہمراہ آیا کرتے ہوں گے۔

1903ء میں ایبٹ آباد کی کل آبادی دس ہزار تھی جس میں زیادہ تر فوجی تھے۔ فوجی مرکز ہونے کی وجہ سے ایبٹ آباد ہمیشہ پرامن رہا ہے۔

ضلع ہزارہ نے ایوب خان، ایئر مارشل اصغر خان اور خان قیوم خان جیسے نامور لوگ پیدا کیے۔

کوئی گھاس پر بیٹھا اور کوئی لیٹا ہوا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھا رہے تھے۔ ہلکورے لیتی ہواؤں میں خنکی تھی۔ لگتا تھا نتھیا گلی میں بارش ہو رہی ہے۔ یہاں آسمان پر سورج اور بادلوں نے آپس میں کھیل شروع کر رکھا تھا۔ سورج جب بادلوں میں چھپ جاتا تو ارد گرد کے پہاڑ سائے میں آ جاتے۔ بادل ہٹتے تو سائے پہاڑوں سے نیچے کھسکنا شروع کر دیتے۔ سڑک پر رش کم تھا۔ کبھی کبھی سلک روڈ پر کوئی کار، سوزوکی یا بس گزر رہی تھی۔ ہواؤں نے درختوں کو چھیڑ دیا اور ان کے پتے گنگنانے لگے تھے۔ صبح جو تھوڑی بہت گرمی تھی وہ خنک ہواؤں نے اڑا کر رکھ دی۔ میں گھاس پر لیٹا اونچے درختوں سے نیلے آسمان کو دیکھتا جہاں کہیں کہیں بادل لہرا رہے تھے۔

ہماری گفتگو میں اگر سائیں کی شمولیت نہ ہوتی تو محسوس ہوتا کہ کچھ کمی سی ہے۔ سائیں دور کھڑے نہ جانے کیوں ہر درخت کے تنے کو زمین سے لے کر بلندی تک آنکھوں سے ناپ رہے تھے۔ جو لیٹے تھے وہ اونگھ رہے تھے جو بیٹھے تھے وہ جمائیاں لے رہے تھے۔ ہیڈ فون مائیک کے سر پر ہمیشہ کی طرح فٹ تھا اور وہ سب کو تنقیدی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ سب سے اونچی آواز بلند بولا۔ ”آج تم لوگ جب سو رہے تھے تو معلوم ہے سائیں کہاں گیا تھا؟“

سائیں نے بھی میرا سوال سن لیا تھا اور وہ بھی خراماں خراماں چلتا محفل سجانے آ بیٹھا۔ اب سب پوچھنے لگے کہ سائیں کہاں گیا تھا۔

میں نے کہا کہ سائیں اجازت دے تو بتاؤں گا۔ سائیں نے اشارہ کیا کہ بتا دوں۔ تو میں بولا۔ ”ایبٹ آباد کے

سے ناران تک کے علاقے کے گرد دائرہ لگا دیا گیا ہے۔ جو مرضی آئے کرتے پھرو۔ کسی قسم کا خطرہ نہیں۔"

سائیں میری بات کی درستگی کرتے ہوئے بولا۔ "ہری پور بھی دائرے میں ہے۔"

میں نے ہری پور بھی دائرے میں ڈال کر اپنا اعلان دہرایا۔

فرید بولا۔ "دائرہ تو نقشے پر میں بھی کھینچ سکتا ہوں۔"

"یہ دائرہ تو کیا یہ تو سائیں بھی نہیں کھینچ سکتا۔" میں نے حقارت سے کہا۔

"تو یہ دائرہ کس نے لگایا ہے؟"

"یہی تو بتا رہا تھا۔ جب ہم سب سوئے تھے تو سائیں اپنے مرشد کے پاس سندھ گیا تھا۔ وہیں سے دائرہ لگوا کر آیا ہے۔"

ستار ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ "تاں تاں کیا کہہ رہے تھے؟ ہم سو رہے تھے آج دوپہر تو سائیں سندھ ہو آیا؟"

میں ناراض ہو کر بولا۔ "کتنی بار کہوں کہ سائیں آج دوپہر سندھ سے ہو کر آیا ہے۔"

شہزاد بولا۔ "تمہارا مطلب ہے ڈیڑھ گھنٹے میں گیا اور لوٹ بھی آیا۔"

"ڈیڑھ گھنٹا؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "سائیں تو آدھے گھنٹے میں یہاں تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے میں تو یہ قطب شمالی پر تعویذ رکھ کر آ جاتا ہے۔"

کسی نے کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں سائیں سے بولا۔ "استاد جی آپ خود اپنی زبان سے انہیں بتائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو یہ لڑکے میری بات کا اعتبار نہ کریں۔"

سائیں نے میرے فقرے پر توجہ نہ دی اور بتانے لگے۔ "تم لوگوں نے ٹرپ سے دوسرا ٹرپ نکال لیا اور سائیں کو خیر اڈے پر دی۔ یہ سارا انتظام جلدی جلدی مجھے کرنا پڑا۔ مرشد مجھے حفاظتی حصار کے بغیر کہیں جانے کی اجازت نہیں دیتا۔"

"مگر سائیں یہ بتائیں گے کیسے؟ کیا بیٹھے بیٹھے غائب ہو گئے۔"

سائیں نے جواب دیا۔ "یہ خاکی جسم ہماری پرواز کے آگے رکاوٹ نہیں۔ ہماری روح ہی ہمیں لیے پھرتی ہے۔ جسم یہیں بستر پر پڑا تھا۔ ساتھ پلنگ پر لطیف سو رہا تھا کہ میں ہو بھی آیا۔"

لطیف چونک کر بولا۔ "کچھ دیر کے لیے تمہارے خراٹے بند ہو گئے تھے۔ اسی وقت گئے ہوں گے۔"

سائیں نے سب کو کہا۔ "دیکھا؟ ایک گواہ تو یہیں بیٹھا ہے۔ روح نکل جائے تو خراٹے بند ہو جاتے ہیں کیونکہ خراٹے ہمیشہ روح لیتی ہے۔"

گلو بولا۔ "مگر سائیں سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی، روح جسم سے نکل کر چلی جائے اور پھر واپس بھی آ جائے۔ کوئی انہونی بات لگتی ہے۔"

"چندڑی! یہ بتا کہ جب سانس لیتے ہو تو پتا چلتا ہے ہوا کیسے آئی اور کیسے نکلی۔"

"سائیں یہ تو معلوم ہے، فضا سے آئی ہے، ناک سے پھیپھڑوں میں اور پھر منہ سے واپس نکل جاتی ہے۔"

سائیں بولا۔ "میرا سوال تو سمجھا ہی نہیں میرا مطلب ہے کبھی ہوا کو آتے جاتے دیکھا ہے؟"

"وہ تو نہیں دیکھا۔"

"تو روح کے آنے جانے کو تم کیسے دیکھ سکتے ہو؟" یہ کہہ کر سائیں نے تائیدی نظروں سے ہمیں دیکھا۔

گلو نے احتجاج کیا۔ "تم دو چیزوں کو ملا کر کنفیوژ کر رہے ہو۔"

"چلو ایک اور مثال دیتا ہوں۔ یہ تو جانتے ہو کہ ہاتھ پاؤں کو حرکت کرنے کا حکم دماغ دیتا ہے؟"

"ہاں دیتا ہے۔"

"اسے کبھی حکم دیتے دیکھا؟"

"نہیں۔"

"پھر تم روح کو کیسے آتے جاتے دیکھ سکتے ہو؟"

ہم کچھ دیر تو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ جب ہمیں ذرا برابر بھی بات سمجھ میں نہ آئی تو سب مل کر واہ واہ کرنے لگے۔ گلو یہ آواز بلند کہنے لگا۔ "اب یہ ساری بات میری سمجھ میں آئی، ورنہ ایسے پیچیدہ معاملے کو ایسی مثالوں کے بغیر کون سمجھ سکتا تھا؟"

تب سائیں نے کہا۔ "بار بار یہی بولتا ہوں کہ میری بات مان جایا کرو۔ جو چیز سمجھ میں نہ آئے وہیں چپ۔ اگر تم لوگوں کی یہ بیچ بیچ کی عادت پھر کہاں جائے گی؟"

ہم ہنسنے لگے اور سائیں خلاؤں میں گھورتا کچھ سوچنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ "استاد جی اب کیا سوچ رہے ہیں؟"

"سوچ رہا ہوں سامنے پہاڑ کے پیچھے ہی تو اپنا کشمیر ہے۔ کیوں نا وہاں کا بھی ٹورا (چکر) لگا آؤں؟"

ستار نے پوچھا۔ "وہاں کوئی دوسرا مرشد ہے؟"

"جذی وہاں مرشد نہیں مرید ہیں۔ تمہاری طرح کے نہیں جان دینے والے مرید ہیں۔"

میں بولا۔ "استاد جی! رہنے دیں، پہلے ہی تھکے ہوئے ہیں اور اب کشمیر۔۔۔"

"نہیں سوچ رہا ہوں وہاں بھی مریدوں کو کوئی ہوٹل وٹل بنا کر دے دوں۔ ہر وقت تھانوں سے شکایتیں مجھے آتی رہتی ہیں۔ کوئی ڈھنگ کا کام تو کرنے لگیں گے۔"

میں نے کہا۔ "آئیڈیا تو بہت اچھا ہے۔ یہیں سے پرواز لیں گے یا کمرے سے؟"

"نہیں جذی! کشمیر سڑکوں سڑک جاؤں گا۔ جیپ کرائے پر کرلوں گا۔"

میں نے گھاس پر منہ پھلائے لیٹے طارق کی جانب دیکھ کر کہا۔ "کشمیر تو ویسے ہی جا رہے ہیں ایک ہمارا بھی کام کرتے آئیں۔"

"ہاں ہاں بول۔"

"کشمیرن ملے تو اسے بہلا پھسلا کر لے آئیں۔ اب طارق کا دکھ کسی سے بھی نہیں دیکھا جا رہا۔"

"جذی اوہ تو اپنی بھرجائی ہے۔ مل گئی تو اگلی سیٹ پر بٹھا کر لاؤں گا۔"

طارق نے سنا تو اٹھ بیٹھا اور مجھ سے کہا۔ "تو پھر اس بے چاری کے خلاف بول رہا ہے؟"

"خلاف کہاں بول رہا ہوں۔ عزت و آبرو سے اگلی سیٹ پر دلہن بنا کر سائیں اسے لائے گا۔"

فرید نے بتایا۔ "اور تیرا نکاح پڑھوا کر کہے گا چل جذی عیش کر۔"

طارق، سائیں سے بولا۔ "تو اپنے کام سے کام رکھ۔ میرے معاملات مجھ تک رہنے دے۔ کوئی ضرورت نہیں اسے اپنے ساتھ لانے کی۔"

"جذی! میرے ساتھ ٹرٹر کی تو گردن سے پکڑ کر کشمیر لے جاؤں گا اور کشمیرن کے سامنے فٹا کر ڈالوں گا۔ اگر تو اس سے بات نہیں کر سکتا تو میں ہی کوئی راستہ نکالتا ہوں۔ دنیا کے کام کرتا رہتا ہوں اور یار کا کام نہیں کروں گا کیا؟"

طارق نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔ "اس سے کیا کہو گے؟"

"کیا مطلب، کیا کہوں گا۔ تمہیں لکھ کر بتاؤں یہ بات کروں گا؟ دم رکھ کر سیدھی سادی بات کروں گا۔ دیکھنا کیسے نہیں مانتی۔ تیری اس سے وہ شادی کرواؤں گا کہ پورا ڈیرہ دیکھے گا۔ ڈھول کی تھاپ دریا خان تک نہ گئی تو کہنا لعنت ہے تیری فقیری پر سائیں۔"

"دیکھ لے، کہیں معاملہ خراب نہ ہو جائے۔" طارق نیم رضامند لگ رہا تھا۔

"معاملہ تو تیرے ہاتھ سے پہلے ہی خراب ہو چکا ہے۔ مجھے پہلے سمسٹر میں بتا دیتا تو دیکھتا کہ کیسے اس کا ہاتھ پکڑ کر تمہارے ہاتھ میں دیتا ہوں۔"

میں نے سائیں کی منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔ "چھوڑ کشمیرن کو، ایم پی اے والی لڑکی سے بات کرا دے۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھما دے۔ وعدہ کرتا ہوں ہاتھ نہیں چھوڑوں گا۔"

"جذی پھر یوں کرتا ہوں کہ فارمی چھوڑ کر یہی دھندا شروع کر دیتا ہوں۔ یہ بتاؤ تم لوگوں نے میرے بارے میں کس قسم کے خیالات رکھے ہوئے ہیں، یہیں لیڈی ہاتھ میں چیر کر رکھ دوں گا۔"

طارق پل میں تولہ پل میں ماشہ ہو جاتا تھا کہیں وہ آؤٹ آف کنٹرول نہ ہو جائے۔ سائیں بھی جلال میں آ رہا تھا شاید اسی لیے کسی نے کہا کہ یہاں سے نکلیں۔ شملہ پہاڑی چلتے ہیں۔ شملہ پہاڑی ظاہر ہے ایک پہاڑی ہے جو ایبٹ آباد کے مغربی سمت میں واقع ہے۔ یہ ایک تفریحی پارک ہے۔ ایک جنگلی پارک ہے، جہاں جھولے، سلائیڈز وغیرہ ہیں۔ کینٹین ہیں۔ درخت اور سبزہ ہے۔ اس کے علاوہ پھول ہیں۔ چلنے کے لیے ٹریکس ہیں۔ چند سال پہلے میں یہاں آیا تھا۔ مجھے سب چیزوں سے جو چیز سب سے زیادہ پسند آئی تھی وہ غروبِ آفتاب کا منظر تھا۔ سفیدے کے اونچے درختوں کے پیچھے جب سورج غروب ہوا تو آسمان شہابی ہو گیا تھا۔ شام ابھی دور تھی اور یہی وقت شملہ پہاڑی پر جانے کے لیے موزوں ترین تھا۔ ہم نے سوزوکی کرائے پر لی اور شملہ پہاڑی کو چل پڑے۔ ٹیپ ریکارڈر جو ابھی تک خاموش تھا اسے چلا دیا گیا۔

میں پل دو پل کا شاعر ہوں
پل دو پل میری کہانی ہے
پل دو پل میری ہستی ہے

پل دو پل میری جوانی ہے

ٹیپ ریکارڈر کسی کے بھی ہاتھ میں ہو مگر آواز سب تک پہنچ رہی ہوتی ہے مگر جب کوئی گیت دل کے تار چھیڑ دیتا ہے تو ہر ایک اسے اپنی گود میں رکھ کر سننا چاہتا ہے۔ یہ ایک بہت خوب صورت نفسیاتی عمل ہے جس میں سامع یہ محسوس کرنا چاہتا ہے کہ یہ گانا کبھی میں نے، دھن بھی میں نے بنائی اور گائیکی بھی خود کی۔ اسے اپنی تخلیق سمجھ کر اس کا لطف اٹھاتا ہے۔ ہم بھی اسی طرح ٹیپ ریکارڈ پر لڑتے جھگڑتے شملہ پہاڑی جا رہے تھے۔

نوے کی دہائی تک ٹیپ ریکارڈ تقریباً ہر گھر میں موجود تھا۔ موسیقی سے لگاؤ نے ٹیپ ریکارڈ کو ہماری زندگی کا لازمی حصہ بنا دیا تھا۔ ان دنوں زندگی کا ہر لمس دلکش تھا۔ گانے کا ہر مصرعہ یادوں کو جگا دیتا۔ انہی یادوں کو تازہ رکھنے کے لیے اپنی پسند کے گانے TDK یا سونی کی کیسٹ پر ریکارڈ کروائے جاتے۔ بیس روپے کی جاپانی کیسٹ ملتی اور دس روپے میں میوزک سینٹر والا گانے بھر دیتا۔ بھری بھرائی کیسٹ بھی دستیاب تھی مگر اس میں چند گانے ہی پسند کے ہوتے۔ کہیں ٹرپ پر جاتے تو ٹیپ ریکارڈ ساتھ ہوتا۔ اکیلے جاتے تو واک مین اور اپنی پسندیدہ کیسٹس شاپر میں ڈال کر ساتھ رکھتے۔ گھر کے اندر یہ کیسٹس شیلف یا الماری میں ترتیب سے سجی ہوتیں۔ کوئی بغیر پوچھے کیسٹس اٹھا لیتا تو اس کی شامت آ جاتی۔ گانے ختم سے پہلے میوزک سینٹر پر رش ہوتے تھے۔ اکثر تو ایسا ہوتا کہ کہیں جا رہے ہیں اور کسی دکان پر ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈ پر اپنا کوئی پسندیدہ نغمہ گونج رہا ہے۔ سائیکل ادھر ہی روک کر میں وہیں کھڑا ہو جاتا۔ ڈوب کر وہ گانا سنتا اور ختم ہونے کے بعد جہاں جا رہا ہوتا اسی طرف چل پڑتا۔ کیسٹس ایک دوسرے سے سننے کے لیے مانگی جاتیں۔ دوستی اسی طرح موسیقی سے پروان چڑھتی تھی۔ کیسٹ دینے والی یہ تاکید ضرور کی جاتی کہ چلانے سے پہلے ٹیپ ریکارڈ کے ہیڈ کو صاف ضرور کر لینا۔ پچھلی بار بھی ریل (Tape) پھنس گئی تھی۔ کئی لوگ ٹیپ ریکارڈ کو رنگین ریشمی کپڑوں کے غلاف میں ڈھانپ کر رکھتے۔ ہر ہفتے اس کو اچھی طرح سے چمکاتے۔ رات سوتے وقت ٹیپ ریکارڈ کو کان کے قریب آہستگی سے سنا جاتا۔ دن کو دھوم دھڑکے سے بلند آواز گانے سنے جاتے۔ اپنی کیسٹ کا گانا سنتے ہوئے خواہش ہوتی کہ میری طرح دوسرا بھی اس گانے کو پسند کرے۔ اس کے چہرے کی جانب بغور دیکھا جاتا۔ اس کے تاثرات ناپے جاتے۔ سننے والا اگر یہ کہہ دیتا کہ ذرا آواز اونچی کرو تو دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا۔ پیار کرنے والے اپنے دل کی آواز دوسرے تک پہنچانے کے لیے انہی کیسٹوں کا موثر استعمال کرتے۔ اگر خوف نہ ہوتا تو کیسٹ کے کور کے اندر محبت نامہ بھی ڈال دیتے۔ اپنی پسند کے گانے ریکارڈ کروا کر محبوب کو سننے کے لیے دیے جاتے۔ محبوب اگر قسمت سے گرفت میں آ جاتا تو وہ بھی اپنی پسندیدہ کیسٹ بھجوا دیتا۔ اس کیسٹ کو تو درجنوں بار سنتے اور اس لیے بھی کہ وہ خاص گانا کون سا ہے جو وہ ہمیں سنوانا چاہتا ہے۔ موسیقی ایک خاص قسم کی زنجیر تھی جس سے پیار کرنے والے ایک انوکھے انداز سے بندھے ہوتے تھے۔

دلبری کے انداز مختلف تھے مگر دلبری وہی تھی۔ ہر گانے کے ہر بول میں اپنے پیار کو بٹھا کر سنا جاتا۔ کوئی روٹھ جاتا تو گانوں سے بھی منایا کرتے۔

کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے

کسی شادی یا محفل میں شرمایا بیٹھا ہوتا تو یہ نغمہ سنوایا جاتا۔

یہ جھکی جھکی نگاہیں انھیں میں سلام کر دوں
تمھیں اپنی صبح کر دوں تمھیں اپنی شام کر دوں

وہ ذرا اکھڑے اکھڑے دکھائی دیتا ہوتا تو

ہمیں تم سے پیار کتنا یہ ہم نہیں جانتے
مگر جی نہیں سکتے تمہارے بنا

میرے ایک دوست نے اپنے پیار کو دھوپ میں بیٹھے گیلے بال سکھاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ یہ گانا سنتے ہوئے رو رو کر ہلکان ہو جاتا۔

نہ جھٹکو زلف سے پانی یہ موتی ٹوٹ جائیں گے۔

محبوب جب بچھڑ جاتا تو خود کو تسلی دینے کے لیے یہ سنتے

ہم سے دل گیا ہے نگاہیں تو کیا ہوا
زندہ ہیں کتنے لوگ محبت کیے بغیر

وہ یاد آ رہا ہوتا تو یہ گانا بھی اکثر سنا جاتا۔

ہماری سانسوں میں آج تک وہ حنا کی خوشبو مہک رہی ہے

آنکھوں کی تعریف مقصود ہوتی تو

پیار بھرے دو شرمیلے نین

دل غم سے پھٹ رہا ہوتا تو یہ گانا سنتے

مرجھائے ہوئے پھولوں کی قسم

اس دیس میں پھر نہ آؤں گا

محبوب جب کندھے پر سر رکھے یہ پوچھتا کہ تم کو یہ سب کیسا لگ رہا ہے تو اس گانے کا حوالہ دیتا۔

تم سے بچھڑیں گے تو سوچیں گے
ہم نے کیا کھویا ہم نے کیا پایا

اگر محبوب کی کہیں اور شادی ہو رہی ہے۔ وہ کہتا ہے

میرے خط جلادو

تیرے خوشبو سے بھرے خط میں جلاتا کیسے
تیرے پیار سے لکھے خط میں جلاتا کیسے
تیرے خط آج میں گنگا میں بہا آیا ہوں
آگ بہتے ہوئے پانی میں لگا آیا ہوں

کچھ گانے نیچی آواز میں سنے جاتے تاکہ کوئی بزرگ سن کر بھڑک نہ جائے جیسے

یہ تیرا نازک بدن ہے یا کوئی مہکا گلاب

یا پھر

تیرے بھیگے بدن کی خوشبو سے لہریں بھی ہوئیں
مستانی سی

کچھ گانے موت کے کنویں، سرکس یا چلتے پھرتے چڑیا گھروں کے لاؤڈ اسپیکروں پر بجتے بھلے لگتے تھے۔

پری وی لیل دی قمیص اج پھاٹ گئی اے

جب پیار کے دو کرداروں میں سے ایک کردار اپنی راہ بدلنا چاہتا تو کیسٹ میں یہ گانے بھر کر بھیجے جاتے

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

اور

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
اس کے بعد کسی گلے شکوے کی حاجت بھی باقی نہ رہتی۔

وہ دور بھی کیا دور تھا، اب تو بس یادیں، بس یادیں رہ گئی ہیں۔ اس دور کی یادوں کو چھوڑ کر ہم واپس اپنے ٹور کے ذکر پر چلتے ہیں۔

ہم اسی طرح گاتے بجاتے شملہ پہاڑی جا اترے۔ راستے میں پہاڑی سے دائیں جانب دیکھا تو شہر وادی میں بچھا تھا۔ یہاں سے وہاں تک پھیلا تھا۔ سوزوکی اپنا پورا زور لگا کر ہمیں اوپر چوٹی پر لائی تھی۔ نیلے آسمان پر چمکتا سورج مغربی جانب جھک رہا تھا۔ کچھ بادل تھے جن سے ہوائیں کھیل رہی تھیں۔ بے شور سے چند سیاح گھومتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ ہم ادھر ادھر تکتے دھیرے دھیرے چل رہے تھے۔ چین ہی چین تھا۔ آسودگی ہی آسودگی تھی۔ جو درد دل سے جڑے تھے وہ دل میں دفن ہو چکے تھے۔ کھلے نیلے آسمان اور لپٹ لپٹ کر چلتی ہوا نے زخموں پر مرہم رکھ دیا تھا۔ کھلی فضا تھی اور خوب صورت راستے تھے۔ میں ان ہواؤں میں جیسے اڑتا پھر رہا تھا۔ پیاس محسوس ہوئی تو کینٹین سے کولڈ ڈرنک پی لی۔ بھوک لگی تو سموسے کھا لیے۔ تھک گئے تو بیٹھ گئے۔

میں اور لطیف بھی چلتے چلتے سب سے علیحدہ ہوئے اور مغربی سمت منہ کیے گھاس پر بیٹھ گئے۔ ہم بیٹھ کر نیم دراز ہوئے تو سورج تیزی سے افق کی جانب چل پڑا۔ ہم ایک ڈھلوان پر نیم دراز تھے۔ آسمان رنگ بدل رہا تھا۔ چند دوسرے لوگ بھی اس منظر میں بیٹھ کر ہمارے ساتھ آ شامل ہوئے۔ درختوں کے سائے لمبے ہونے لگے۔ شعاعیں ٹہنیوں اور پتوں سے منعکس ہو کر چہار جانب پھیلنے لگیں۔ آسمان دھانی ہوا تو کرنیں سنہری ہوتی گئیں۔ رنگ اور روشنیوں کا کھیل آسمان پر شروع ہو گیا۔ سورج بادلوں میں چھپا تو زمین پر سنہرا اور گہرا دکھائی دینے لگا۔ بادل ہٹے تو شعاعیں تیرتی ہوئی کہیں سے کہیں جا نکلتیں۔ میں ایک خوشنما منظر اور حسین لمحوں میں بیٹھا تھا۔ جو اداسی کل سے دل پر چھائی تھی وہ ختم ہو رہی تھی۔

میں آسمانی رنگوں میں رنگا بیٹھا تھا کہ اچانک چونک پڑا۔ عقب سے آواز آئی تھی۔ ”کنول! یہاں دیکھو۔“

آواز پھر آئی۔ ”وہی ایم بیہ والے ہیں مگر ادھر کیسے آ گئے؟“

میں مڑ کر پیچھے دیکھنا چاہتا تھا مگر حیرت سے گم اپنی جگہ منجمد بیٹھا رہ گیا۔ وقت کا دھارا اس منظر میں ٹھہر گیا۔ ساری فضا ساکت ہو گئی اور ہوائیں تھم گئیں۔ سورج رک گیا اور نیلے آسمان کے اڑتے پنچھی اپنی جگہ جم گئے۔ لمحے خاموش ہوئے اور پھر ہوا کے دوش پر سریلی، تھرتھراتی اور جادو جگاتی مترنم آواز میرے کانوں میں رس گھولتی چلی گئی۔

”کنول! آہستہ بولو۔ اگر سن لیا تو کیا کہیں گے؟“

اس آواز کو میں ہزاروں کیا لاکھوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ بقول وارث شاہ ”ہیر اکھی گے ہزار وچوں“ وہ ہزاروں میں اپنی ہیر کو پہچان سکتا ہے تو کیا میں ہزاروں میں کنول کو نہیں پہچان سکتا؟ یہ وہی تھی کیونکہ اس جیسی آواز کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ جیسے زبان سے نہیں نظروں سے نغمہ چھیڑ رہی ہو۔ اس کے چھوٹے بھائی اطہر نے پوچھا کہ باجی کہاں!

بیٹھیں گے؟ تو جواب دیا کہ ادھر ہی بیٹھ جاتے ہیں۔

لطیف ان سے بے خبر مزے سے سگریٹ کے کش لیے جا رہا تھا۔

میرے دل کی دھڑکنیں بڑھ گئی تھیں۔ پورا بدن کسی خمار میں ڈوبتا چلا گیا۔ ہر جانب راگنیاں بجنے لگیں۔ زمین آسمان رنگین ہو گئے۔ اس کا شملہ پہاڑی پر اس وقت آنا اگر اتفاق تھا تو میرے عقب میں آ کر بیٹھنا اتفاق نہ تھا۔ وہ کسی کشش کے زیر اثر یہاں آئی تھی۔ اس کی قربت کے گلاب مجھے معطر کر گئے۔ مجھے لگنے لگا کہ اس کی سجائی گئی بزم کا میں اکیلا ہی خاص مہمان ہوں۔ میں جو بے سول ہو چکا تھا مجھ پر نوازشات کی بارش کر دی۔ میرے پہلو میں بیٹھ کر مجھے ادنیٰ سے اعلیٰ کر دیا۔ ایسا لگا غزالہ ساری رکاوٹیں پھلانگ کر میرے پیچھے آ بیٹھی ہے۔

میں ایسا کچھ پڑھ کر پیچھے دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ خواب نہ ہو۔

میں اس وقت پیچھے دیکھنا چاہتا تھا جب تک مجھے پکا یقین نہ ہو جائے کہ یہ خواب نہیں۔ مجھے خوف تھا کہ مڑ کر دیکھوں تو وہاں کوئی دوسرا ہو۔ میرے اندر اسے دیکھنے کی طلب تو تھی پر تاب نہ تھی۔ میرے اندر ایک خیال زور پکڑ رہا تھا کہ یہ غزالہ ہے جو پیچھے بیٹھی ہے۔ تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہیں چھوڑ گئی؟ وہ تو راستہ بھول گئی تھی۔ دیکھو وہ پلٹ آئی ہے۔ تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے کہاں سے کہاں تک چلی آئی ہے۔ دیکھو کہیں مایوس ہو کر واپس نہ لوٹ جائے۔ اس کا چہرہ تو دیکھو کتنی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ اسے ابھی شک ہے یہ تم ہو۔ اسے یقین دلا دو واقعی یہ تم ہو۔ اس کو پلٹ کر دیکھنا بے وفائی نہیں غزالہ سے وفاداری ہے۔ کیا غزالہ کو تم نے بھلا دیا جس کی معصوم اور بے ضرر باتوں پر تم ہنس دیا کرتے تھے۔ وہ ہاتھ، وہ مہندی، وہ کلائیاں، وہ چوڑیاں، وہ آنکھیں، وہ آنسو، وہ ہونٹ وہ سرا ہنیں، وہ چہرہ، وہ حقیقتیں وہ فسانے کیا تم کو کچھ بھی یاد نہیں؟ تمہارا انتظار، تمہاری جانب اس کا دھیان، اس کی ساری توجہ یہ سب اس کی محبت تھی۔ پیچھے دیکھو وہی سب تم کو لوٹانے آئی ہے۔

مجھے سب یاد تھا۔ مجھے یہ خبر بھی تھی کہ کنول کو میں چاہنے لگا ہوں، اس لیے نہیں کہ وہ حسین لڑکی ہے بلکہ اس لیے کہ وہ غزالہ کا عکس ہے۔ اسے دیکھ کر وہ نہیں بلکہ غزالہ یاد آنے لگتی ہے۔ اس کے ہاتھ، آنکھیں، چہرہ، ناک اور ہونٹ، گردن کا خم اور گیسو وہی ہیں جو غزالہ کے تھے۔ دیکھتی ہے تو اسی طرح سے کہ آنکھوں میں پیار اور ہونٹوں پر جملے رکھے ہیں۔

سارا حوصلہ جمع کر کے میں نے کندھے کے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کی توجہ میری جانب تھی، گھٹنوں کو بازوؤں کے گھیرے میں لیے بیٹھی تھی۔ اس کی مسکراتی آنکھوں میں سورج اپنے تمام رنگ لیے غروب ہو رہا تھا۔ میں کھو کر اسے دیکھے جا رہا تھا۔ میری نظریں اس سے ہٹتی نہ تھیں۔ وہ ایک خاص اہتمام سے میرے پہلو میں آ بیٹھی تھی۔ مجھے بھی اس سے بڑھ کر اس کا استقبال کرنا تھا۔ اس کے انداز میں ہچکچاہٹ نہیں دلآویزی تھی۔ اس جھٹ پٹے کے وقت زمین پر سب سے چمکتا اس کا چہرہ تھا۔

لمحوں میں آنکھوں نے آنکھوں کو کوئی پیام دیئے۔ کسی نے سوال پوچھے، کسی نے جواب دیئے، دونوں جانب اعترافات ہوئے، عہد و پیماں باندھے گئے اور وہ لمحے امر ہو گئے۔ یہ کچھ پل تھے جو ہم دونوں کو جوڑ گئے۔ یہ ہی وہ پل ہوتے ہیں جہاں زندگی کے راستے ایک سمت اختیار کرتے ہیں۔ ان ہی پل میں کئی بنتے ہو جاتے ہیں۔ میری نظریں اس سے پوچھتی تھیں کیا یہ دیکھنے آئی ہو کہیں تم کو بھول تو نہیں گیا؟ کیا تم مجھے اپنی یاد دلانے آئی ہو؟ مجھے دیکھ کر بتاؤ تمہیں کیا لگا۔ بتاؤ کیا تم کو بھول گیا ہوں؟ بتاؤ میری آنکھوں میں تمہارے علاوہ کوئی اور ہے؟ میں تب سے آج تک تمہاری یاد کو سینے سے لگائے بیٹھا ہوں مگر ایسا کیوں کر رہی ہو کہ کبھی ایک ادا سے چلی آتی ہو اور پھر کوئی ادا دکھا کر چلی جاتی ہو۔

میں بھی کبھی کبھی میں پھنس جاتا ہوں کہ تم کون ہو۔ کنول ہو کہ غزالہ ہو؟ میں لاکھ تم دونوں کو ایک دوسرے سے دور کروں مگر مجھے ایک نظر آتی ہو۔ میرے باہر تم خاموشی محسوس کر رہی ہو گی مگر میرے اندر ایک شور برپا ہے۔ میں سمجھنا چاہتا ہوں جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کیا تم اور میں کسی دائرے میں سفر کر رہے ہو جو بار بار ایک دوسرے کے سامنے آ جاتے ہیں۔ کیا ہم دونوں کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے دوسرا کس سمت گیا ہے۔ کیا ہمیں بچھڑ جانے کا کوئی خوف نہیں ہوتا کیونکہ ہم ایک دوسرے کے راستے جانتے ہیں۔ مجھے میرے سوالوں کے جواب دو کنول۔ میرا ہر سوال میرے ہر جواب سے الجھ رہا ہے۔ میرے انتشار کو سلجھا دو۔

تم تو مری میں میرے لیے چاند بن کر طلوع ہوئی

تھیں۔ آج سورج غروب ہونے کے ساتھ اگر بچھڑنا ہے تو اپنی اگلی منزل بتاتی جانا۔ مجھے خوف ہے میری آوارگی مجھے کہیں تم سے ہمیشہ کے لیے دور نہ کردے۔ آج موقع ہے کہہ دو مجھے کہ تمہارے اندر جدائی کا تاریک خلا بھرنے آئی ہوں کہہ دو میں راہ بدلنے تمہاری راہ میں نہیں آئی۔ ایک راہ پر چلنے تمہارے پاس آئی ہوں۔

جس لمحے اس کو دیکھا تھا۔ وہی لمحہ میرے سارے سوالات اس سے کر گیا تھا۔ اس لمحے اس کی بھی بدلی دنیا میں دیکھ رہا تھا۔ وہ چہرہ دیکھ رہا تھا جو قوس وقزح کے سارے رنگوں سے منور تھا۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں میرے سوالوں کے تمام جوابات جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتے تھے۔

قریب یا دور بیٹھے میرے دوستوں نے ٹیپ ریکارڈ پر یہ غزل لگائی تھی۔

دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے
مگر چہ بولتا کوئی نہیں ہے
رکوں تو منزلیں ہی منزلیں ہیں
چلوں تو راستہ کوئی نہیں ہے

میں اسے لمحوں میں پاگراب سامنے افق کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ان چند لمحوں میں اسے میں نے دریافت کرلیا تھا۔

پھر وہ میرے عقب سے ایک مدھرتان میں بولی۔

"لوگوں کا سارا دھیان سورج کی طرف ہے۔ وہ تو ڈوب کر کل دوبارہ نکل آئے گا۔ ہم چلے گئے تو پھر کہیں خوابوں میں ملیں گے۔"

یہ سن کر میں تڑپ گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ہم مل رہے تھے تو یہ ایک حسین اتفاق تھا۔ اگر ہم آج صبح پنڈی کی بس پر سوار ہو جاتے تو کہانی ختم تھی۔ مگر یہ ہے کون؟ یہ سوال مسلسل ذہن پر ہتھوڑے برسانے لگا کیونکہ ابھی کہانی تو آج بھی ختم ہونے والی تھی۔ پیار سے بھی اس بزم نے کچھ دیر میں ٹوٹ جانا تھا۔ اس کے ٹوٹتے ہی ہم بھی فضا میں دھواں بن کر تحلیل ہو جاتے۔ جب ادھورے خواب لے کر ہم بچھڑتے تو پھر خوابوں میں کیا ملتے؟ اس کی بات سن کر میرا دل، میرا حوصلہ سب کرچی کرچی ہو گئے۔ دکھ سے میرا سینہ بوجھل اور بدن شل ہو گیا۔ لمحوں میں لگی اور لمحوں سے بھی یہ محفل چند لمحوں بعد اجڑ جاتی اور پیچھے لمحوں کے بکھرے پر فضا میں اڑتے پھرتے۔

میں بھی کیا احمق تھا کہ جن لوگوں نے بچھڑ جانا تھا انہی سے دل لگا بیٹھا مگر یہ بات کب اپنے اختیار میں تھی۔ دل ہے کسی سے جا جڑا اور کسی سے جڑ نہ سکا۔

میں بے قرار ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ پہلے تو مسکرائی اور پھر میرے تواتر سے دیکھنے پر اپنی نظریں جھکا لیں۔ لرزتی پلکوں کے گہرے سائے اس کے چہرے پر چھائے تھے۔ وہ میری جانب دیکھتے دیکھتے کہیں ڈوب گئی۔ شاید میری طرح اس پر بھی بچھڑ جانے کی اداسی چھا گئی تھی۔

جب اس نے اپنی اداس نظریں اٹھائیں تو ان میں محبت کا واضح پیغام تھا۔ اجلا، دھلا ہوا، تازہ تازہ مہکتا ہوا پیغام۔ میں نے سوچا جب محبت کی اتنی عنایتیں مجھ پر ہو رہی ہیں تو کیوں نہ خوشی خوشی ان پھولوں سے اپنی جھولی بھر لوں۔ بچھڑنے سے پہلے بچھڑ جانے کا ماتم کیوں کروں۔ محبت تو جزا ہے، ملے تو وصول کرلو۔ میرے دل میں اس کی محبت کا دیپ جلا تو پیار کی آنچ میں جلنے لگا۔ میری آگ نے اس کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ بھی میری طرح درد سے تڑپی تو اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ ہماری محبت نے لمحوں میں ایک دوسرے کو زیر کر دیا۔

پیار ایک لطیف احساس ہے۔ اس میں کوئی غرض، کوئی مہم جوئی نہیں ہوتی۔ کسی کو خیال میں رکھنا اور کسی کے خیال میں رہنا پیار ہے۔ کسی سے مسکرا کر بات کرنا پیار ہے۔ کسی کے غم میں اپنی آنکھیں نم کرلینا پیار ہے۔

میں اپنے احساسات میں ڈوبا سورج کے کرشمے دیکھنے لگا تھا۔ افق پر سنہرا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ رنگ شوخ ہوتے چلے گئے۔ ہواؤں نے درختوں پر مسرتوں کا طوفان برپا کر دیا۔ ٹہنیاں خوشی سے دُہری ہوئی جاتی تھیں۔ کرنیں جب پتوں کو گدگدی کرنے لگتیں تو وہ کھلکھلا اٹھتے۔

وہ لوگ کچھ کھا رہے تھے۔ چند بھرے شاپر ان کے سامنے پڑے تھے۔

اچانک اس کا بھائی اطہر اٹھ کر ہمارے پاس آیا۔ ہاتھ میں شاپر پکڑا تھا جس میں پکوڑے سموسے تھے۔ وہ لطیف کے سامنے شاپر بڑھائے کھڑا تھا اور وہ پریشان بیٹھا اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو کنول اپنے بھائی کو اشارے کر رہی تھی کہ اس کو نہیں دوسرے کو دو مگر اطہر سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی

ہے۔لطیف شاپر میں جھانک کر بولا۔ ''کیا ہے یہ؟''

''سموسے ہیں۔باجی نے دیئے ہیں۔''

لطیف شدید حیرت میں ڈوب گیا۔ ''باجی؟ کون باجی؟''

''کہتی ہیں اتنا لمبا ٹرپ ہو تو بھوک لگ جاتی ہے۔ ہمارے ساتھ آپ بھی کھالیں۔''

لطیف حیرت سے کبھی اطہر کے چہرے کو دیکھتا اور کبھی کر پھر شاپر میں جھانکتا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر شاپر اس سے لے لیا۔ وہ چلا گیا تو ہمارے پیچھے دبی دبی ہنسی کی آوازیں آنے لگیں۔ لطیف نے مجھ سے پوچھا کہ یہ لڑکا کون تھا۔ دیکھا بھالا لگتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''پیچھے مڑ کر دیکھ لے تو جان جائے گا۔'' یہ کہہ کر میں سموسہ نکال کر کھانے لگا۔

اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے یقین نہیں آیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے اسے ٹہوکا لگایا تو سامنے دیکھنے لگا۔ سگریٹ کا کش لگا کر خاموش بیٹھا فضا میں نامعلوم چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ میں نے اسے شاپر دیا تو وہ اسے ہاتھ میں پکڑے چپ بیٹھا رہا۔

جس طرح میں کنول کو یہاں دیکھ کر حیران ہوا تھا اسی طرح وہ بھی مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی ہو گی۔ سوچتی ہو گی مری میں مجھے مال روڈ پر نظریں پھر کر دیکھ رہا تھا۔ کیوں مجھے آشنا نظروں سے دیکھتا ہے۔ کیا مجھے پہچانتا ہے۔

میں نے مڑ کر اس سے کہا۔ ''بہت شکریہ، بہت بھوک لگی تھی۔''

اطہر بول اٹھا۔ ''اور لے آؤں؟ آپی کے پاس برگر بھی پڑے ہوئے ہیں۔''

''تم تو خاموش بیٹھو۔'' اسے ڈانٹتے ہوئے کہا اور ہنس دی۔ ہلکی تو گالوں میں گڑھے پڑ گئے۔ مجھ سے پوچھا۔ ''اگر آپ کہیں تو کینٹن سے کچھ اور لے آتی ہوں۔''

''نہیں میں مذاق کر رہا تھا۔ یہی ہم دونوں کے لیے بہت ہیں۔''

لطیف نے آہستگی سے کہا کہ ان سے معلوم کرو یہاں سے وہ کہاں جائیں گی مگر میں نہیں پوچھنا چاہتا تھا۔ مجھے اُمید تھی وہ مجھے ناران میں ملے گی۔ اگر واپس گھر جا رہی ہے تو پوچھ کر ملنے کی اُمید نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ بھلے ہی وہاں نہیں ملتی مگر مجھے اس کے ملنے کی آس تو رہے گی۔

ہم دونوں خاموش تھے۔ دل میں کتنے سوال تھے جو اس سے کرنے تھے مگر سب سوال گم ہو گئے۔

پھر سورج کچھ رنگ پیچھے چھوڑے افق کے پار ڈوب گیا۔ میرا دل اچانک بوجھل ہونے لگا۔ میرے حصے میں کوئی ایک رنگ بھی نہ آیا تھا۔ پیلے، بنفشی، دھانی اور آتشیں سارے رنگ کنول نے سمیٹ لیے۔ وہ ابھی کچھ دیر میں سب رنگ لپیٹے چلی جائے گی۔ اس کی ہمت افزائی کے باوجود میں یہ پوچھنے سے قاصر رہا کہ پھر کب اور کہاں ملو گی۔ اجنبیت کے تمام مراحل طے کرنے سے پہلے وہ پھر سے بچھڑنے والی تھی۔ کیا میرے سارے سوال ہمیشہ کے لیے میرے اندر دفن ہو جائیں گے۔ یہ کیسی قربت تھی جو مجھے اداس کر گئی۔ جدائی کے برچھے میرا سینہ چیر رہے تھے۔

وہ اس کی والدہ کی آواز تھی۔ ''بچو اب چلو، ہمیں اندھیرا پھیلنے سے پہلے نکلنا ہے۔''

وہ اٹھی تو میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنی چوڑیاں درست کر رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر دیر کر رہی تھی۔ جیسے تھکی ہوئی اور مضمحل ہو۔ مجھے اداس پایا تو مسکراتی مسکراتی خود بھی دل گرفتہ ہو گئی۔ شکستہ لہجے میں اللہ حافظ کہا اور چل دی۔ ایک خوشبو بھرا نرم و گرم جھونکا اس سے آیا جیسے وہ کنول نہیں صندل کی آگ ہو۔ بھاری قدم اٹھائے سب سے پیچھے پیچھے جا رہی تھی۔ چھتری کے قریب مڑ کر دیکھا اور پھر چند لمحوں بعد اندھیرے میں تحلیل ہو گئی۔

☆.....☆

ہوٹل پہنچے تو اداسی کی کیفیت پہلے سے بھی بڑھ گئی تھی۔ دوست قہقہے لگاتے خوش تھے اور میری نظریں خلا میں بھٹک رہی تھیں۔ غزالہ سے بچھڑنے کے کئی سال بعد کنول میرے دل سے آ جڑی تھی۔ اس نے میرے دل کی دیوار پر آہستگی سے اپنی ہجرت کا ہاتھ رکھا تھا۔ لاکھ دل کو سمجھاتا کہ اس کے ملنے پر کوئی وقتی جذبہ مجھ پر غالب آیا ہو گا اور نہ وہ کبھی پہلے میرے لیے کوئی حقیقت تھی اور نہ اب ہو سکتی ہے مگر دل سمجھتا ہی نہ تھا۔ گزرے سالوں کے بھولے بچھڑے لمحے پھر سے روح میں گونجنے لگے تھے۔ بار بار شک ہوتا کہ یہ غزالہ ہی ہے۔

میری اور لطیف کی آپس میں اس پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ اس کا دماغ بھی میری طرح معمے سلجھا رہا ہو گا جب کہ میرا ذہن سوالوں اور جوابوں کی کیفیت میں نہ تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ کنول سے بار

بار ملنے کو ہم کوئی قطعی رنگ دے کر اس کا سحر ختم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر ذہن الجھا ہوا تھا کہ وہ بار بار مجھ سے کیوں ٹکرا رہی ہے۔ کھانا بھی مجھ سے نہیں کھایا گیا۔ ہم دونوں ہوٹل کے دروازے کے قریب سڑک پر آ بیٹھے۔ وہاں اکا دکا ٹریفک چل رہی تھی۔ چاند بھی بادلوں کی باہوں میں چھپ جاتا اور کبھی ان کا گھیرا توڑ کر باہر نکل آتا۔

لطیف نے کہا تھا۔ ''یہ اتفاق نہیں ہو سکتا۔ صحیح جگہ اور صحیح وقت پر دونوں کا بار بار ایک دوسرے سے ملنا۔ یہ اتفاق کیسے ہو سکتا ہے اگر یہ اتفاق ہے تو ایسے اتفاقات آگے بھی ہوتے ہیں۔''

میں کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ خاموش آسمان کے فراخ سینے پر تیرتے چاند اور لہراتے بادلوں کو دیکھ رہا تھا۔ سیاہ ہیولوں کی مانند کھڑے پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا جہاں پیلی پیلی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ میری سوچوں کے دائرے صرف ایک چہرے پر مرتکز تھے اور وہ چہرہ کنول کا تھا۔ میں چاند کو دیکھ کر مسکراتا کیونکہ آج غزالہ کسی بھولی یاد کی طرح کنول کے روپ میں میرے پاس چلی آئی تھی۔ پہلے تو صرف بار بار ملتی رہی مگر آج ملنے میرے پاس آ گئی تھی۔ اس کا ملنا کئی خواب دکھا جاتا اور بچھڑنا سارے خواب توڑ جاتا۔ یہ کیسا چھپن چھپائی کا کھیل تھا جس میں چھپتی بھی وہی اور ڈھونڈتی بھی وہی تھی۔

لطیف نے پوچھا۔ ''غزالہ کے بعد کسی اور لڑکی سے پیار ہوا؟''

''غزالہ کے بعد غزالہ ہی سے ہوا۔''

''تمہارا مطلب جو میں سمجھ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ کنول سے ہوا؟''

''ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''غزالہ کی ہمشکل ہونے کی وجہ سے اس کا پسند آ جانا فطری ہے مگر وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ دولت مند بھی ہے۔ بڑی گاڑی ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے تم غزالہ کو جواز بنا کر ایک امیر زادی کو اپنانے کے خواب دیکھ رہے ہو۔''

مجھے اس کی بات بالکل اچھی نہیں لگی مگر مجھے معلوم تھا وہ صرف مجھ کو کریدنا چاہتا ہے۔ میں اس سے بولا۔ ''میں نے غزالہ سے محبت کی مگر وہ تو امیر زادی نہ تھی۔ دولت سب کی طرح مجھے بھی اچھی لگتی ہے مگر اس کے لیے میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اگر مقصد صرف کنول کو اپنانا تھا تو مجھے غزالہ کو بیچ میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟ سیدھی طرح سے ڈائریکٹ اس کے پیچھے پڑ جاتا اور پیچھے تو میں اب بھی نہیں پڑا ورنہ اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔ جس طرح سے ہم دونوں مل رہے ہیں وہ تمہارے سامنے ہے۔''

''اگر کنول کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی۔ وہ بھی غزالہ جیسی ہوتی تو اسے بھی یونہی چاہتے؟''

میں نے فوراً جواب دیا۔ ''یہ میں نہیں جانتا کہ اس وقت کیا ہوتا۔ ضروری نہیں کہ وہ میری جانب اسی طرح راغب ہوتی جس طرح کنول ہوئی تھی۔ یہ بھی بہت ممکن ہے وہ بھی مجھے اسی کی طرح پسند نہ آتی۔ تمہارے سوال کے ساتھ بہت سی شرائط جڑی ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ کنول اب چلی گئی ہے۔ دنیا ایک اسٹیج ہے۔ اداکار بدلتے رہتے ہیں اور کردار وہی رہتے ہیں۔ آگے کیا ہوتا ہے کوئی نہیں جانتا۔''

ان دنوں میں مختلف ذہنی کیفیت میں گھرا تھا۔ میری صرف یہی سوچ تھی کہ غزالہ نے مجھے کہا تھا میں کسی نہ کسی انداز میں تم سے ملتی رہوں گی۔ کنول ہو یا کوئی اور جو بھی دل میں اتر گئی وہی غزالہ ہوگی۔

لطیف نے پوچھا۔ ''اگر کنول کی جگہ کوئی اس سے زیادہ خوب صورت لڑکی آ جائے تو؟''

''خوب صورت وہ ہوتی ہے جو خوب صورت لگتی ہے۔ اس وقت آسمان سے کوئی حور بھی اتر آئے وہ میرے لیے قطعاً خوب صورت نہ ہوگی جتنی کنول تھی مگر پتا نہیں کیوں کنول کا بار بار ٹکرانا میری سمجھ سے باہر ہے۔ کیوں وہ ہر اس جگہ پہنچ رہی ہے جہاں میں پہنچتا ہوں۔''

☆.....☆

صبح آنکھ کھلی تو سورج کی روشنی کھڑکی کے راستے کمرے میں آ رہی تھی۔ چھت پر لگا پنکھا آہستگی سے گھوم رہا تھا۔ وقت ٹھہرا ٹھہرا تھا۔ کچھ دیر میں اسی طرح لیٹا رہا۔ مانک، ستار اور لطیف تو سو رہے تھے مگر سائیں بیدار ہو کر پلنگ پر لیٹا چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ میں غسل خانے میں گھس گیا۔ نہا دھو کر باہر نکلا تو سائیں اسی حالت میں پڑا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''استاد جی! طبیعت تو ٹھیک ہے جو آج اتنا سوچ رہے ہیں؟''

لطیف نے جملہ کسا۔ ''ویرانے جن بیٹے کا کھنڈر والی چھتری سے عشق چل رہا ہے۔ کل تک وہ دوپہر میں بوہڑ کے

درخت پر ملتا ہے یا یہ کہ جن کی چھوٹی بیٹی رو رہی ہے۔ اس کے ہولڈر کی نب ٹوٹ گئی ہے اور کل آخری پرچہ ہے۔"

ہم دونوں سائیں کو جواب دینے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔ میں پوچھنے لگا۔ "جن کی زنانی پوچھ رہی ہے آج رات سالن میں کیا بناؤں؟ استاد جی انسانوں کے تو بڑے دھندے ہوتے ہیں۔ کیا یہ جن ویلے ویلے رہتے ہیں۔"

سائیں نے ہم دونوں سے پوچھا۔ "سوال ختم ہو گئے ہوں تو میں کچھ بولوں؟"

"استاد جی! یہ بھی بتا دیں کہ ان کی کوئی مردم شماری بھی ہوتی ہے کہ اس شہر میں جن کم ہیں اس میں زیادہ ہیں۔ ان کی آبادی ہمارے ملک میں زیادہ ہے یا ساتھ والے دشمن ملک میں۔"

"جنڈی! کوئی اور سوال۔"

"یہ بھی کہ ان کا نظام حکومت کیا ہے۔ صدارتی، پارلیمانی یا بادشاہت ہے؟"

لطیف بولا۔ "ان کا اسلامی نظام ہوتا ہے یا سوشلزم ہے؟"

"بس استاد جی، یہ بتا دیں کہ جن انڈے دیتے ہیں یا بچے جنتے ہیں؟"

سائیں فکر میں بیٹھا سوچ رہا تھا، سوچتے سوچتے ہی بول پڑا۔ "بڑے بچے کی باتیں تم دونوں نے پوچھی ہیں۔ بہت اہم سوال ہیں۔ کوئی عام بندہ ایسے سوال نہیں پوچھ سکتا۔" پھر آنکھیں موندھے داڑھی میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ "ایمان کی بات کروں تو یہ ہے کہ مجھے کچھ بھی پتا نہیں۔ مرشد سے پوچھا تو وہ بولا کہ آرام سے بیٹھ اور ٹرٹر نہ کر۔ اس نے کہا کہ میں جنات کا کونسلر لگا ہوا ہوں کہ ان کی ساری خبریں رکھوں۔ بس جنڈی میری زبان پر پھر کوئی ایسا سوال کبھی نہ آیا اور ادب کا تقاضا ہے کہ تم بھی مجھ سے کوئی ایسا سوال نہ پوچھو۔"

تب میں نے سائیں کے کان میں آہستگی سے پوچھا۔ "جوان ادھر گھوم رہا ہے کہ چلا گیا؟"

"کس کی بات کر رہے ہو؟"

"اپنا بازہ گلی والا چیتا۔"

"وہ اپنے حلقے میں ہے۔ اسے نہیں چھوڑ سکتا۔"

"استاد جی! حلقہ کہاں سے کہاں تک ہے؟"

"مری، نتھیا گلی، بازہ گلی، ایبٹ آباد اور تھوڑا سا کشمیر بھی ہے۔"

"اور مقبوضہ کشمیر؟"

"اس کا اپنا چیتا ہے، سری نگر سے لداخ تک۔"

"یہاں کا کوئی نہیں؟"

"کیوں نہیں ہے۔ ایبٹ آباد سے ناران اور پھر بابو سر ٹاپ تک۔ مرشد نے کل مجھے بتایا تھا۔"

"استاد جی یہ حلقہ ذرا بڑا نہیں ہو گیا۔"

"جنڈی! آج کل چیتے شارٹ ہیں۔"

"مگر یہاں والا ابھی تک ملنے نہیں آیا؟"

گھڑی دیکھ کر بولا۔ "لگتا ہے لیٹ ہو گیا۔ کسی کام سے راستے میں رک گیا ہوگا۔"

"پھر اپنی کا بھی ہے۔"

"نہیں وہاں نہیں ہے۔"

"کوئی کتا وغیرہ بھی نہیں ہے۔"

سائیں نے میرے چہرے کا جائزہ لیا مگر میں بالکل سنجیدہ بیٹھا تھا۔ "جنڈی! کتا چیتے والا کام نہیں کر سکتا۔"

میں نے پھر پوچھا۔ "ویسے چیتے کا حلقہ کتنا بڑا ہوتا ہے۔ اپنے قومی اسمبلی کے حلقے کے برابر کہ صوبائی اسمبلی کے؟"

"جنڈی! مجھے شک پڑ رہا ہے کہ تو چسکے لے رہا ہے۔" پھر ڈانٹ کر بولا۔ "میں پٹواری ہوں کہ اس کے حلقے ناپتا پھروں۔"

"سوال استاد سے نہیں تو کس سے پوچھوں؟"

سائیں گلے بھرے انداز میں بولا۔ "بڑا آیا استاد ماننے والا۔ بازہ گلی میں میری مٹی پلید ہوتی رہی اور تو بھی سب کے ساتھ ہنس رہا تھا۔"

"استاد جی! وہاں صرف حزار ہی کی تو بات کی تھی۔ معلوم نہیں گاؤں والے شک میں کیوں پڑ گئے۔"

لطیف نے ٹکڑا لگایا۔ "حزار بازہ گلی میں کیوں۔ انشاء اللہ ڈیرہ میں بنے گا۔" پھر تائیدی انداز میں سائیں کو دیکھا۔ "کیوں ٹھیک کہا ناں؟"

سائیں تو خاموش رہا مگر میں نے آنکھیں تر ہو کر لطیف سے پوچھا مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ "آخر تم لوگ استاد جی کے حزار کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو۔ کیا کرنا ہے تم نے حزار کا؟"

لطیف نے پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔ "ارے اتنا بھی نہیں سمجھے، چڑھاوے چڑھائیں گے۔ منتیں مانگیں گے۔ گناہ بخشوائیں گے اور اپنا گھر بھریں گے۔"

سائیں بھڑک کر بولا۔ ''ان سب باتوں کے لیے میرا مرنا کیا ضروری ہے؟ زندہ بیٹھا ہوں، کوئی فائدہ اٹھالو۔'' پھر منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔ ''تمہیں ان کو تو مرا ہوا سائیں چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''استاد جی! سنا نہیں کہ ہاتھی مرے تو سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔''

''اور زندہ لاکھ کا تو ہوتا ہے مگر تم لوگ مجھے ٹکے کا بھی نہیں سمجھتے۔''

''استاد جی!''

وہ بات کاٹ کر گرجا۔ ''چپ بھی کر جا، استاد جی، استاد جی، گھنٹے بھر سے رٹ لگا رکھی ہے۔ استاد سے سوال بھی کیا پوچھ رہا ہے کہ جن انڈے دیتے ہیں کہ بچے پیدا کرتے ہیں؟ ان کا نظام حکومت کیا ہے؟ پھر اپائی کا چیتا ہے کہ کتا؟ استاد جی کا مزار کہاں بنے گا؟ میرا دماغ چاٹ کھایا تم دونوں نے۔ چل اٹھ یہاں سے ورنہ ایبٹ آباد میں فنا کر کے رکھ دوں گا۔'' پھر سائیں نے مجھ سے کہا۔ ''نیچے جا کر کچھ کر کرے میں ایک کڑک چائے تو بھیجیں۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔''

میں مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

☆......☆

جو سیر کرنے ایبٹ آباد آتا ہے اسے الیاسی مسجد دیکھنے ضرور جانا ہوتا ہے۔ الیاسی مسجد تمام مساجد کی طرح ایک مسجد ہے۔ جس کا کوئی تاریخی پس منظر نہیں۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ ہے جو مدتوں سے جاری ہے۔ اس پانی سے وضو کے لیے حوض بنے ہیں اور نہانے کے لیے غسل خانے۔ گرمیوں میں اس کے پانی سے نہانے کے بعد فرحت و تازگی کا جو احساس ملتا ہے اس کا کوئی جوڑ نہیں۔ ساتھ جو کپکپی شروع ہو جاتی ہے اس سے نہانے کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ ٹھنڈے ٹھار ہو کر گرم پکوڑے کھانے کا اپنا علیحدہ ہی لطف ہے۔ اسی بنا پر الیاسی مسجد کے پکوڑے پورے ایبٹ آباد میں شہرت رکھتے ہیں۔

وہاں پہنچے تو سیاحوں کا جم غفیر تھا۔ بچے، عورتیں اور مرد پانی کے نیلے کولر اٹھائے مسجد سے ملحق چشمے کی جانب جاتے نظر آئے۔ ان کولروں میں اکثر نے آم رکھے تھے جس کو چشمے کے پانی سے ٹھنڈا کرنا مقصود تھا۔ مسجد کے دائیں جانب ایک گھنے درخت تلے کڑاہی میں گرم پکوڑے تلے جا رہے تھے۔ پہلے وہی ایک چھپر تلے چھوٹی سی جگہ تھی جہاں پکوڑے ملتے تھے۔ اب تو متعدد دکانیں بن چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک سیر گاہ بھی بنا دی گئی ہے۔ چھوٹی سی جھیل بنا کر اس میں بچوں کو کشتیوں میں سیر بھی کرائی جاتی ہے۔

ہم حوض کے گرد کھڑے غسل خانوں میں اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ لوگ حوض میں وضو کر رہے تھے اور کچھ ایسے ہی ہاتھ ڈالے بیٹھے تھے۔ میرے نہانے کی باری آئی تو یخ پانی نے ایک بار مجھے جھنجوڑا اور پھر تازگی اور سرشاری سے بھگوتا رہا۔ میں غسل خانے میں اپنی چارپائی ڈال دیتا مگر نکلنا پڑا کیونکہ سب اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے اور گلوتو اندر کودنے پر تل گیا تھا۔

ہم تو نہا کر فارغ ہو چکے تھے مگر سائیں غائب تھا۔

ہبل

عرب کا دور جہالت میں سب سے بڑا بت جو کعبہ کی چھت پر نصب تھا۔ 8ھ میں فتح مکہ کے وقت رسول مقبولﷺ نے اسے پاش پاش کر دیا تھا۔ یہ سرخ عقیق کا بنا ہوا تھا اور شکل شباہت میں انسان کے جیسا تھا۔

ملرڈ فلمور

(1874-1800ء)

امریکا کے 13 ویں صدر 1850ء تا 1853ء وہ سمرہل، نیو یارک میں پیدا ہوئے۔ ماں باپ غریب تھے اس لیے عالم شباب میں اپنی روزی کمانے کے لیے بہت سے کام کیے۔ خود ہی تعلیم حاصل کی۔ اپنے فالتو اوقات میں قانون کی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ 1823ء میں بار میں داخل ہوئے اور تھوڑا عرصہ پریکٹس کرنے کے بعد بفیلو منتقل ہو گئے۔ 1828ء میں انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز نیو یارک اسمبلی کا رکن منتخب ہو کر کیا پھر کانگریس کے رکن بنے۔ 10 جولائی 1850ء کو زیچری ٹیلر کے انتقال پر صدر کا عہدہ سنبھالا۔ اپنے دور صدارت میں 1850 کی مصالحت پر دستخط کیے۔ خارجہ تنازعات میں عدم مداخلت کی تائید کی۔ اس معاہدے کو منظور کیا، جس سے جاپان مغربی تجارت کے لیے کھول دیا گیا۔ شمالی اور جنوبی ریاستوں کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ تحریک تجاہل پسنداں میں شمولیت اختیار کی اور اسی کے ٹکٹ پر 1856ء میں صدارتی امیدوار بنے، بفیلو میں انتقال کیا۔

کسی نے کہا۔ ''گلو، مائیک غائب ہے۔''

یہ سن کر گلو بے چین ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ''کہاں گیا کالا انگریز۔ آج میرے ہاتھ لگے اسے کڑاہی میں ڈالتا ہوں۔''

ہمارا گروپ جب کہیں تھک جاتا، اکتانے لگتا یا کرنے کو کوئی خاص کام نہ ہوتا تو گلو کو مائیک سے بھڑا دیتا۔ یہ کام بھی آسان تھا اور فائدہ یہ ہوتا کہ گھنٹے آدھ تک گلو خاموش نہ ہوتا اور ہم آنکھیں موندے مزے لیتے رہتے۔

اب گلو آستینیں چڑھائے مائیک کو ڈھونڈ رہا تھا۔ دوسرا کام ستار یا فرید کے ذمے تھا کہ گلو کا ہاتھ پکڑ کر مائیک کے نزدیک چھوڑ دے اور ستار یہ کام کر کے دیوار سے ٹیک لگائے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اب گلو مائیک سے مخاطب تھا۔

''یہ تو نے ستارے کوڑے (جھوٹے) سے کیا کہا ہے کہ ان غسل خانوں میں نہانا گھچڑ لوگوں کو Suit نہیں کرتا اور نہانے کے بھی Mannars (آداب) ہوتے ہیں۔''

''تو پر آنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ جہاں پانی بھر رہا ہو وہاں ڈبکیاں لگانے لگ جائیں۔ یہ شاور لگے ہیں، نہ ڈھنگ کے دروازے لگے ہیں۔'' یہ مائیک تھا جو اپنے انجام سے بے خبر بول رہا تھا۔

''مطلب یہ ہوا کہ تیری نظر میں ہم سب بدتمیز، جاہل اور گنوار ہیں؟''

''یہ تمہارے اپنے بارے میں خیالات ہو سکتے ہیں میں ایسے الفاظ اپنے منہ سے نہیں نکالتا۔''

اب گلو کا پارہ چڑھ گیا یعنی اپنی Peak پر جا پہنچا۔ کڑک کر بولا۔ ''تیرا بٹوہ کہاں ہے؟''

''وہ کیا ہوتا ہے؟''

''میرا مطلب ہے پرس، کیا وہ بھی نہیں سمجھتا؟''

''نہیں پرس بھی نہیں سمجھتا۔''

''تو پیسے کس میں رکھتا ہے؟''

کندھے اچکا کر بولا۔ ''اپنے والٹ میں۔''

''وہی نکال کر دکھا۔''

''نہیں دکھاتا۔ جو کرتا ہے کر لے، اب میں پہاڑوں پر نہیں شہر میں ہوں۔ قسم سے پولیس بلا لوں گا۔''

گلو تپ کر بولا۔ ''تو پولیس کیا، کالوں سے فوج بلا لے۔ آج تیرا حساب کتاب کرتا ہوں۔''

پھر گلو نے جب اسے بازوؤں میں جکڑا تو وہ پھڑپھڑا بھی نہ سکا۔ اسے ایک طرح سے باندھ کر پینٹ کی جیب سے بٹوہ، پرس یا والٹ جو بھی تھا وہ نکال لیا اور کھڑکا دے کر اپنے سے علیحدہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے ساتھ رہنا ہے تو آدھا گھنٹا اسی غسل خانے میں نہائے گا۔ ورنہ ہمارے راستے الگ الگ۔ اب بھیک مانگ کر اپنا کرایہ پورا کر اور نکل یہاں سے۔''

فرید آگے بڑھا اور ایک روپے کا کڑکڑاتا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''پہلی سیلری میری طرف سے۔''

اب مائیک منہ بنائے اور واک مین لگائے کھڑا تھا۔ پھر سائیں ہمیشہ کی طرح ٹہلتا ٹہلتا اس کی طرف گیا۔ مائیک کو آنسو پونچھنے کے لیے رومال دیتے ہوئے بولا۔ ''رو مت، گلو کی باتوں کا برا کیوں مناتا ہے۔ اب لکھ کر دوں کہ دل کا بہت اچھا ہے۔''

''کہاں دل کا اچھا ہے، میرا والٹ چھین لیا۔ اب کہتا ہے آدھا گھنٹا اس گندے غسل خانے میں نہا۔ نہیں نہایا تو بھیک مانگ کر کرایہ پورا کر اور واپس جا۔''

''جھوڑی نہا لے ناں، ذرا خود کو ایک بار تو سونگھ۔ قسم مرشد کی بڑی گندی بو آ رہی ہے۔''

''کہاں آ رہی ہے۔ روز تو پرفیوم لگاتا ہوں۔''

''جھوڑی پرفیوم ہمیشہ نہا کر لگاتے ہیں۔ جس طرح خالی پیٹ اسپرین نہیں کھائی جاتی، اسی طرح میلے بدن پر پرفیوم نہیں لگایا جاتا۔ دیکھ پچھلے دس دن سے نہیں نہایا تو۔ غسل خانے صرف چہرہ دھونے جاتا ہے۔''

دراصل مائیک کو نہانے سے چڑ تھی۔ بہانہ تھا کولڈ (ٹھنڈ) لگ جائے گی۔

پھر سائیں اسے پچکار کر لے گیا اور غسل خانے میں بند کر دیا۔ گلو نے گھڑی میں ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آدھا گھنٹا یہیں کھڑا ہوں۔ مر بھی جاؤ تب بھی پہلے نہیں نکلنا۔''

نہانے کے بعد سردی سے کانپے جا رہا تھا۔ کہتا تھا کہ مجھے کرائے کے پیسے اور واک مین واپس کرو۔ میں آج ہی ڈیرہ واپس جاتا ہوں۔ سب نے پھر اسے منایا، گھچڑ کا لقب دیا۔ گلو کو جنگلی کے علاوہ بہت سی گالیاں بھی دی گئیں تو تب جا کر راضی ہوا۔ راضی ہوتے ہی واک مین لگائے کڑاہی کے پہلو میں آگ سینکنے بیٹھ گیا۔

☆—☆

نہانے کے بعد بھوک نے ستانا شروع کر دیا۔ اس

بھوک نے ہمیں پکوڑوں کی کڑاہی کے گرد جمع کر دیا۔ جب پکوڑے کھانا شروع کیے تو ہمارے ہاتھ نہیں رک رہے تھے۔ سائیں کچھ دیر بعد پکوڑے والے سے کہتا۔ "ایک کلو ذرا سرخ کر کے اور بنانا۔" جب وہ اخبار پر پکوڑے رکھ کر دیتا تو سائیں فرمائش کرتا۔ "جدڑی! تمہارے مہمان ہیں۔ کھٹائی ذرا اور ڈالنا اور تندور والے سے کہنا گرم روٹی اتار کر ہمیں دے۔"

ستار نے کہا۔ "سائیں اندر سے روٹی جب اترتی ہے ہمیشہ گرم ہی ہوتی ہے۔"

"میری بات تندور والا سمجھ گیا۔ تمہیں سمجھے تو صرف تم نہیں سمجھے اسی لیے ہر بار یہی کہتا ہوں کہ سائیں سے بات کرنے سے پہلے بات کو تول لیا کرو۔"

مائیک حالانکہ پکوڑے کھانا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا مگر وہ بھی اپنا حصہ کاغذ پر رکھے دور پرے کہیں اکیلا بیٹھا کھا رہا تھا۔

مسجد کے پیچھے ایک پہاڑی ہے، ان دنوں سیر کو آئے ہر مرد و عورت اس پر چڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس پر چڑھنا اترنا اتنا مشکل نہ تھا مگر ہر ایک جان بوجھ کر پھسلتا، گرتا اور کبھی رک کر تصویر بناتا سب خوش ہو رہے تھے۔ ان دنوں اس پر چڑھنا تو الیاسی مسجد کی سیر کا لازمی جزو تھا۔ میں انہیں اوپر چڑھنے پر اکسا رہا تھا کہ دیکھیں وہاں سے منظر کیسے نظر آتا ہے؟

دوسرا کنارہ ہمیشہ ہر کسی کو راز و اسرار میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ جھیل کے ایک کنارے پر بیٹھے لوگ دوسرے کنارے کے رومانس میں ڈوبے بیٹھے ہوتے ہیں۔ سمندری سفر میں دور پرے کا کوئی جزیرہ اپنی طلسمی کشش سے اپنی جانب کھینچتا ہے۔ ایسے ہی کوئی بلندی دیکھنے والے کو چیلنج کرتی ہے کہ میری گردن پر پاؤں رکھ کر باقی دنیا کو دیکھو کہ کتنی مختلف نظر آتی ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ دنیا کو وہاں سے دیکھنا چاہتا ہے جہاں سے دوسرے نہیں دیکھ سکتے۔ انفرادیت ایک جیت کی طرح ہے چاہے جھیل کے دوسرے کنارے پر جا کر ملے، یا کسی ویران جزیرے پر قدم رکھ کر ملے یا پھر اس چھوٹی سی پہاڑی پر جا کر ملے۔ یہ تو بچے کی بھی فطرت ہے کہ مٹی باریت کا ڈھیر ملے تو اسے بھی سر کرنا چاہتا ہے۔

لیکن یہاں پر انفرادیت سے زیادہ کشش وہ چند خوبرو لڑکیاں تھیں جو اوپر قدم اٹھاتیں، پیچھے سرکتیں اور پھر اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اسی دوران وہ کھلکھلا کر

نیند بھی اہمیت رکھتی ہے

امریکا میں ایک ہزار افراد کے سروے سے معلوم ہوا کہ بالغ افراد سات گھنٹے سے کم سوتے ہیں۔ کیا اتنی نیند کافی ہے؟ ڈاکٹر رونالڈ کے مطابق ضرورت سے کم نیند ہمارے اعصابات کو بہت نقصان پہنچاتی ہے۔ اگر کوئی پریشان کن بات ہو جاتی ہے تو اس پر قابو پانے میں ہمیں شدید دشواری ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تھکے ہوئے بچے اسی صورتِ حال میں پریشان ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے خود اپنے اسپتال میں اپنے اور اپنے ساتھی ڈاکٹر پر تجربہ کیا اور نیند سے محروم رکھنے کے بعد ان کے رویے میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا اور کہا۔ "میں نے انتہائی خوش مزاج اور بااخلاق نوجوان ڈاکٹروں کو نرسوں اور مریضوں پر غصے میں دھاڑتے ہوئے پایا۔ ان علامات کا سبب نیند سے محرومی اور تکان کے سوا کچھ نہ تھا۔"

خوب صورت گفتگو کا فن

موثر گفتگو آپ کی شخصیت کو دوسروں کے لیے زیادہ پُرکشش بناتی ہے اور آپ کے سماجی روابط اور تعلقات پر بھی بے حد اثر انداز ہوتی ہے۔ کسی بھی فرد کی گفتگو نہ صرف اس کی شخصیت، دلچسپیوں اور محرکات کی آئینہ دار ہوتی ہیں بلکہ اس کے سماجی طور پر پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونے کا بھی تعین کرتی ہے۔ آپ کے لفظ آپ کا قیمتی ترین خزانہ ہے۔ اس خزانے کو سلیقہ مندی سے خرچ کر کے آپ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا سکتے ہیں۔ ان کی توجہ، ہمدردی، ستائش، محبت اور خلوص سب حاصل کر سکتے ہیں۔ یاد رکھیے اس خزانے کی فضول خرچی آپ کو سماجی طور پر کنگال بھی کر سکتی ہے۔ گفتگو کرتے وقت دوسروں کی دلچسپی کا خیال رکھیے، آپ کی ذمہ داری ہے کہ انہیں اپنے نکتۂ نظر کو پیش کرنے کا موقع دیں۔ دورانِ گفتگو محض اپنی ذات کو ہی نہ مقدم رکھیے بلکہ دوسروں کو بھی گفتگو میں شامل ہونے کا پورا موقع فراہم کریں۔

مرسلہ: سلطانہ بھٹو، لاڑکانہ

قسمیں پڑ چکی تھیں۔ میرے ساتھی اس مقابلہ حسن کے جج بنے کھڑے تھے۔ اب انہیں اوپر چڑھ جانے کے لیے مجھے کوئی اور ترغیب دینے کی ضرورت نہ تھی۔

جب ہم چڑھنے لگے تو خوشی سے مسکراتی کلیاں مرجھا گئیں اور ہمیں گھورتی کوستی نیچے اترنے لگیں۔ کچھ نے کہا بھی کہ اب اوپر کیا رکھا ہے۔ واپس اترتے ہیں مگر جند نے اس بات کو مردانہ غیرت کا مسئلہ بنا لیا۔ ایک نے کہا کہ مر جائیں گے مگر پسپائی اختیار نہیں کریں گے، پھر کسی نے پسپائی اختیار نہ کی اور آخر کار خود کو کوستے ہم سب اوپر پہنچ گئے۔

اوپر سے عین نیچے مسجد کا صحن نظر آ رہا تھا۔ مختلف زاویوں سے میں مسجد اور گرد و نواح کا علاقہ دیکھ رہا تھا۔ مغربی سمت چٹیل پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ میں حسرت بھری نظروں سے ان پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ دل میں ارادہ کر لیا تھا کہ ایک شام یہاں سے غروب آفتاب کا منظر دیکھوں گا۔

پھر میری شادی جب ہوئی تو ہنی مون پر گھومتے گھومتے ہم ایبٹ آباد آئے تھے۔ میرے ذہن پر ایک ہی بات چھائی تھی کہ سورج کے غروب ہونے کا منظر یہاں سے دیکھنا ہے۔ اپنی نئی نویلی دلہن کو اس پہاڑی پر چڑھا لایا تھا۔ میرا ہاتھ تھامے بمشکل وہ اوپر پہنچی تھی۔ اس شام ڈوبتے سورج کے بہت سارے رنگ ہم دونوں نے وہیں بیٹھ کر دیکھے تھے۔ سب رنگ وہی تھے جن کا تصور دس سال پہلے میں نے کیا تھا۔ ہم دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔ میرے لبوں پر اب مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ جب میری بیوی نے سو فیصد والی خفگی دکھا کر کہا تھا کہ اتنی مشکل سے میں آپ کے لیے اوپر گئی اور آپ سارا وقت سورج دیکھتے رہے۔ میں نے جب یہ کہا کہ سارا وقت میں تمہارے چہرے پر سورج کی رقص کرتی کرنیں دیکھتا رہا تو اور زیادہ خفا ہو گئی تھی۔ اب بھی میں اس کو وہاں کی تصویر دکھاتا ہوں تو مجھے ہنسی آ جاتی ہے۔ شادی کے اتنے سالوں بعد وہ میرے لیے کچھ بدل گئی مگر میں نہ بدل سکا۔ کیونکہ رب کی بنائی گئی کائنات کا حسن...... کہیں بھی ہو میں اس میں کھو جاتا ہوں۔

اوپر ہم سب آلتی پالتی مارے دائرہ بنا کر بیٹھے تھے۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ ہمیشہ کی طرح محفل کی جان سائیں تھے۔ ان کی باتیں اور ہمارے فراخ قہقہے تھے۔ سب ان کے پیچھے پڑے تھے کہ اپنے پیار کی داستان سنائیں۔ وہ انکاری تھے کہ کبھی کسی سے مجھے پیار ویار نہیں ہوا۔ شہزاد نے کہا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے تمہیں کسی لڑکی سے محبت نہ ہوئی ہو۔ ہمارا دوست ٹھیک ٹھاک بندے سے سائیں بن گیا اور کہتا ہے کسی سے عشق نہیں ہوا۔ بات نہیں بن رہی سائیں۔ آج بتا ہی دو۔''

وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے سر جھکائے مسکرائے جا رہا تھا۔

گھمو نے اپنے جوتے اتارے اور سامنے رکھ کر پیروں کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس کا نام کیا تھا سائیں؟''

''اقبال اا اقبال نام تھا اس کا۔'' سائیں نے نظریں اٹھا کر جواب دیا۔

فرید بولا۔ ''اس کا نام بتا۔ باپ کے نام کو ہم نے چاٹنا ہے؟''

''اس کا نام بتایا ہے جنڈی۔ پیار سے بالی بالی کہتے تھے۔''

''اس کا کوئی والی وارث بھی تھا کہ یونہی رہتی تھی۔''

''ہاں علاقے کی تھی۔ زمینوں پر گیا تو وہیں جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے باپ کی علاقے میں زمین ہے۔ ایسے ویسے نہیں، دشمن دار لوگ ہیں۔''

''بڑی دشمنیاں پالی تھیں بالی نے؟''

''ہمارے علاقے میں بندے گرتے رہتے ہیں یہ معمولی بات ہے۔''

''سائیں! جھگڑا بالی کی وجہ سے ہوا تھا۔''

''کون سا جھگڑا۔'' سائیں حیران ہو رہا تھا۔ ''بات بالی کی ہو رہی تھی اور تم لوگوں نے گھڑ کر بالی کی وجہ سے قتل بھی کروا لیے۔ جنڈی اس کے پردادے کو سوروکھوں نے پھڑکایا تھا۔ وہیں سے دشمنی چلی آ رہی ہے۔''

لطیف نے کہا۔ ''سائیں تو بھی ٹوٹے ٹوٹے کر کے نہ سنا۔ تو اپنی کہانی جاری رکھ۔''

''مجھے بولنے دو گے تو سناؤں گا۔ سفر میں نے بولی اور تم لوگوں نے بیچ شروع کر دی۔''

پھر ہم مسکرا کر خاموش بیٹھ گئے۔ کچھ لمحے سائیں سب کی جانب ایک ایک کر کے دیکھتا رہا اور پھر بتانے لگا۔

''بالی کو سائیں نے دیکھا اور بالی سائیں کو بھا گئی۔ یہ سرو جتنا قد، ہنڈانے کھسن جیسا رنگ، پنڈے میں ایسی جان کہ کھاڑی منڈھ (درخت) پر مارے تو چیر کر رکھ دے۔ وہ دھڑی گھڑا سر پر رکھ کر چلے تو مجال ہے قدم ڈگمگا جائے۔ چل کر آئے تو پتا ہے شیرنی چلی آ رہی ہے۔ چل کر جائے تب

''جنڈری! تو اپنے کان صاف کروا۔ وہی تو بتا رہا ہوں۔ آنکھ اس کی بالکل ہرنی جیسی۔ دانت ایسے کہ قندھاری انار کے دانے، بال ایسے کہ چھائے کالے بادل، گردن کونج کی اور پاؤں بھی بہت اچھے تھے۔''

لطیف نے پوچھا۔ ''پاؤں نازک تھے؟''

''جنڈری! دیہاتی عورت کی نازکی نہیں مضبوطی دیکھی جاتی ہے اگر مضبوطی کے ساتھ ساتھ حسین بھی ہو تو وہ ہیر کہلاتی ہے۔''

''مگر کتابوں سے رٹا رٹایا سبق نہیں اصلی خوب صورتی بتا۔'' ستار نے گردن نیچے کر کے نیچی آواز میں کہا تا کہ سائیں سمجھ نہ سکے کہ کس نے کہا ہے۔ نتیجہ بھی نکلا سائیں چونک کر ایک ایک کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اسے پھر سے گھیرنے کے لیے ستار نے بلند آواز میں پوچھا۔ ''اور کمر کیسی تھی؟''

''ایسی کہ دو دو گھڑے اٹھا لے۔''

''اور رنگ کیسا تھا؟''

''جنڈری! رنگ ایسا جیسے دودھ میں پتی ڈال کر دو ابالے دیئے گئے ہوں۔''

فرید زچ ہو کر بولا۔ ''کوئی لڑکیوں والی خوبی بتا کہ ہمارا ذہن تو اس طرف جائے۔ ہماری سوچ کو ہوشیں دے سائیں۔''

ستار بولا۔ ''تیری کسی مثال سے بھی جسم میں تھرتھری پیدا نہیں ہو رہی۔ یہ جانوروں پرندوں کے ساتھ اسے نہ جوڑ۔ جوڑنا ہے تو کسی فلمی اداکارہ سے جوڑ تا کہ سانس میں گرمی تو آئے جیسے یہ کہے کہ آنکھیں رانی جیسی، قد انجمن والا، جسم زینت امان کی طرح، گردن زیبا جیسی، کمر شبنم والی، ہونٹ دیبا جیسے، چال جیسے بابرہ شریف چوٹی باندھ کر چلتی ہے اور بچی نیلو والی......''

''جنڈری تو بالی کی تعریف کر رہا ہے یا فلمی رسالہ چرالی دیکھ رہا ہے۔ گردن مروڑ کر اسی پہاڑی پر دفن کر دوں گا اگر زیادہ ٹرٹر کی تو......''

شہزاد نے کہا۔ ''سائیں تو آگے سنا مگر کہانی کو ذرا گرم رکھ......''

سائیں بتانے لگا۔ ''ایک دن میں اپنے نئے سائیکل

پر علاقے میں گیا۔ دیکھا کہ بالی سر پر ٹوکرا اور ہاتھ میں ودانتی لیے چلی آرہی ہے۔ اسے روک کر بولا کہ تیرے سے آج بات کرنی ہے۔

بولی۔ ''آج شام مسجد میں دیا جلاؤں گی۔ شکر ہے تجھے بھی بات کرنے کا خیال آہی گیا۔''

''بالی تو جانتی ہے سائیں اپنی سوچ میں رہنے والا بندہ ہے۔ نہ تیری میں نہ میری میں۔ ہاشم کی شادی پر تجھے پچھلے سال دیکھا تھا۔ اس ایک سال میں تیرا وہ روپ چڑھا ہے کہ اتنا تو چودھویں کے چن کو نہیں چڑھتا۔ سائیں سے سنگت گنڈھ (جوڑ) لے۔ رانی بنا کر تجھے رکھے گا۔''

وہ بولی۔ ''رانی تو میں اپنے گھر میں بھی ہوں۔ سائیں مجھ سے کوئی وکھری بات کر۔''

''تو بتا بالی۔ کیا ڈالوں تیرے قدموں میں کہ تجھ پر تیرا یقین ہو؟''

بولی۔ ''سو یا میں نے تیرے سے کسی کی جان لینی ہے۔ بس تو سے کا ٹکا بنا دے۔''

''میں نے اسے بنا دیا اور پھر ہماری ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ کھوں کی دیوار پیچھے بوڑھے پیپل تلے بیٹھے ہم دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے۔''

''باتیں کیا ہوتی تھیں۔'' طارق نے کریدا۔

فرید بیچ میں بولا۔ ''زیادہ سے زیادہ کیا باتیں ہوں گی؟ یہی کہ باجرے کا ریٹ کیا چل رہا ہے۔ تجھ (بھینس) نے کل کتنا دودھ دیا۔ بالی کی باری کب ہے۔ سائیں بابے کی کھانسی کی دوا لائے ہو۔ سائیں پچھلی گرمیاں اناز کو کیڑا لگ گیا ہے۔ دیکھیں اس سال کیا ہوتا ہے۔ بالی ذرا نزدیک تو آ۔ سائیں دل کرتا ہے اس ڈنڈے سے تیرا سر کھول دوں۔ بالی اپنے پاؤں تو دھویا کر۔ سائیں تو پورا دن سائیکل کا پہیا (پہیا) صاف کرتا رہتا ہے۔ یہ نہیں کہتا بالی تیرے لیے گرگابی (بند جوتی) لے آتا ہوں۔ اچھا بالی، کش لگا لیا ہے تو سگریٹ ادھر کر۔''

سائیں نے فرید کی بات سنی اَن سنی کر دی۔

میں نے پوچھا۔ ''سائیں! وہ تجھے کس نام سے پکارتی تھی؟''

''جنڈری! جنڈری کہتی تھی۔''

''سائیں وہ زندہ ہے؟''

زمین سے تیلا اٹھا کر کان میں گھماتے ہوئے بولا۔ ''ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ جنڈری ہماری شادی پہلے ہو یا نہ ہو گھر میں جان اس دن دوں گی جب تیرے مرنے کی خبر مجھے آئی۔ بالی تیری موت سہہ نہ سکے گی۔''

''استاد جی! مطلب یہ ہوا کہ حیات ہے؟''

''جنڈری اور وہ آسانی سے مرنے والی چیز نہیں۔''

لطیف نے پوچھا۔ ''خاطر مدارت کرتی تھی؟''

''ہاں بڑی خاطر مدار۔ ستھرے گھی (دیسی گھی) کی ایسی خوشبودار چوری بنا لاتی کہ کٹوری پر لپٹا کپڑا جب کھولتی تو خوشبو کی وجہ سے آس پاس کے درخت پنچھیوں سے بھر جاتے۔ بالی مجھ سے کہتی کہ سائیں اپنے سر کا صدقہ بھی اتار دو اور میں کچھ کھا کر باقی چوری پرندوں کو ڈال دیتا۔''

ستار نے پوچھا۔ ''کبھی چمپی یا مالش تمہاری کی اس نے؟''

''وہ بڑی جی دار گھوڑی تھی۔ سر میں اکثر تیل وغیرہ ڈال دیتی تھی۔ کبھی چٹائی لے آتی۔ لٹا کر پاؤں سے کمر دابتی۔ کیا لیلنڈ تھی۔ ایک بار بولی واڑھی تیری بڑھی ہوئی ہے چل شیو بناتی ہوں۔ میری سنی بھی نہیں اور بھاگ کر گھر سے استرا اٹھا لائی۔ میں نے کہا شرم کر بالی، یہ شیو تو نائی بھی بنا دے گا۔ وہ بس وہ کام کر جو تجھ پر واجب بنتا ہے۔ ایسا حیا والی تھی پھر بھی نہیں شرمائی۔''

ستار نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''پھر تم دونوں کی شادی کیوں نہیں ہوئی؟''

''جنڈری! اس کی تو ہو گئی ہے صرف میری نہیں ہوئی۔''

''مطلب ہے دونوں کی آپس میں کیوں نہیں ہوئی؟''

سائیں کان والا تیلا الٹا چباتے ہوئے بولا۔ ''ایک بار ٹالی تلے بیٹھے تھے۔ بڑا اچھا موسم تھا۔ کڑاکے کی گرمی تھی۔ وہ اس دن نمکین لسی بنا لائی تھی۔ ساتھ میں باجرے کی روٹی تھی۔ لسی کے ساتھ باجرے کی روٹی اور وہ بھی ساون میں۔ سواد آ گیا تھا۔ روٹیاں چھ بنا کر لائی تھی۔ میں نے دو ہی کھائیں تھیں اور وہ چار کھا گئی۔ کہتی تھی کہ روٹی اللہ کی نعمت ہے، اسے انتظار نہیں کرانا چاہیے پھر ڈکار مار کر بولی۔ ''سائیں بہت ہو گئی۔ اب سیدھی طرح رشتہ بھیج۔ باپ کو بھیجتا ہے اماں کو یا خود آتا ہے۔ بس دیر نہ کر۔'' میں نے کہا۔ ''بالی! ابھی چوبیس کا ہوا ہوں۔ صرف دو سال ٹھہر جا۔ مجھے چھبیس کا ہونے دے۔ تیرا ہاتھ پکڑ کر تجھے دلہن بنا کر لے جاؤں گا۔ جب پوچھا کہ چھبیس کا ہونے سے پہلے

کیوں نہیں تو اسے بتایا کہ میرا باپ کہتا ہے کہ لڑکا جب چھبیس کا ہو تو سمجھ دار ہوتا ہے اور لڑکی سولہ کی ہو جب سیانی ہوتی ہے۔ اس پر بالی نے جواب دیا کہ چاچے سے کہہ دے کہ بالی اٹھارہ کی ہو گئی ہے جو سیانی تو ماں لگتا ہے وہ تو چودہ ہی میں ہو گئی تھی۔ چاچے کو میرا پیغام دے دے کہ تو سائیں کی بالی سے شادی کرا۔ اگر ایک مہینے میں چوبیس سے چھبیس کا نہ کر دوں تو بالی میرا نام نہیں۔"

لطیف نے کہا۔ "بڑی چالو تھی تیری بالی۔"

سائیں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "دیہاتی لڑکیاں ایسی بہت کھاتی ہیں۔ لہٰذا گول لپٹی باتیں نہیں کرتیں جو منہ میں آیا وہی بول دیا۔"

"اچھا پھر کیا ہوا؟" گلو جو بڑے اشتیاق سے سن رہا تھا وہ بولا۔

"کبھی کبھار میں ان کے گھر کی چھت پر رات کو اس سے ملنے جاتا تھا۔ دیہاتوں میں گھروں کی چار دیواریاں چھوٹی ہوتی ہیں۔ ان کے گھر کے پیچھے بڑا بھینسوں کا باڑا تھا اور اس کے ساتھ کھیت جڑے تھے۔ میں باڑے کی دیوار سے چھت پر کود جاتا۔ سردیوں کی رات تھی اور گندم کی بوائی شروع تھی۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ میں نے کالی چادر اوڑھ رکھی تھی اور باڑے کی دیوار سے چھت پر کود گیا۔ وہ بھی سیڑھیاں چڑھ کر آہستگی سے وہیں آ گئی۔ بڑی خوفناک رات تھی۔ سردی کی وجہ سے تمام لوگ کمروں میں بند تھے۔ بستی کے آوارہ کتوں نے شور مچایا ہوا تھا۔ دور پرے بھگاڑوں (بھیڑیوں) کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بغل میں نے بینے میں رکھا تھا۔ وہ ایسے آئی جیسے دلہن تیار ہو کر آتی ہے۔ بنی سنوری مگر گرم شال کی بکل ماری تھی۔ وہ چاندنی میں چھم چھم کر رہی تھی۔ کھلے بال کمر پر ناگوں کی طرح جھول رہے تھے۔ بڑی بڑی کالی آنکھوں میں حرام ہے جو خوف کا سایہ بھی ہو۔ چھت پر چٹائیاں بچھی تھیں، ایک چٹائی جھٹک کر دیوار کے قریب بچھا دی اور بولی۔ "ادھر میرے پاس بیٹھ جا۔"

میں جا کر بیٹھ گیا پھر اس سے بولا۔ "آج تو غضب ڈھا رہی ہے بالی۔ اپنے جنڈی کے لیے کاجل بھی لگا آئی ہے۔ جان لینی ہے کیا؟"

وہ بولی۔ "آج کوئی ٹھرک نہ مار۔ ہر وقت تیری بک بک بھی کام کی بات بھی کرنی ہوتی ہے۔"

"رات بڑی ہے بالی، کام کی بات بھی ہوتی رہے گی۔ تیرے حسن کا دیدار تو دل بھر کر کر لوں۔"

وہ بولی۔ "بڑا کمینہ ہے سائیں۔ اپنا مطلب تجھے ہر وقت نکالنا ہوتا ہے۔ کبھی بالی کے دل کا بھی سوچا ہے۔ بڑا اپنے آپ کو پریمی سمجھتا ہے۔ کل بالی بیاہ کر کہیں اور چلی گئی تو ٹمن بجاتا پھرے گا۔"

میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "بالی! میری آنکھوں میں آنکھیں رکھ کر بات کر۔ یہ پہیلیاں مجھ سے نہ بجھوایا کر۔"

وہ بولی۔ "میرے چاچے نے بڑے لڑکے کا رشتہ بھیجا ہے۔ اماں کہتی ہے تجھے منہ زور جوانی چڑھی ہے اور اس دن تیرا باپ بھی کہہ رہا تھا کہ کچھ ہی دنوں میں اونٹ کی طرح قد نکال لیا ہے۔ اماں نے بتایا کہ بالی اب وہ تجھے بیاہنا چاہتا ہے۔"

میں یہ سن کر پریشان ہو گیا۔ وہ بولی۔ "سائیں دیکھ لے میرا بابا ہاں کرنے کی سوچ رہا ہے۔"

میں اس سے بولا۔ "ایسا نہ کر بالی، چیر کے رکھ دوں گا تیرے اگلے پچھلوں کو۔"

وہ بولی۔ "جنڈی! تین راستے ہیں تیرے پاس۔ ایک یہ کہ اپنا رشتہ کل ہی کل بھیج دے، دوسرا یہ کہ راستے سے ہٹ جا۔"

میں نے پوچھا۔ "بالی تیسرا راستہ کیا ہے؟" تو اس نے اپنے بینے میں اڑسا ریوالور نکال کر میرے سامنے پھینک دیا اور بولی۔ "دیکھ لے چھ کی چھ گولیاں ہیں۔ تیسرا راستہ ہے کہ اسے اٹھا اور ساری گولیاں میرے سینے میں اتار دے۔"

میں اس سے بولا۔ "بالی یہ کیا کہ ساری کہانی ایک رات میں ختم کرنے پر آ گئی ہو۔"

کہنے لگی۔ "سائیں تو بھی تو سولہ چھبیس کی کہانی لے کر بیٹھ گیا تھا۔ بالی اپنی خوشی سے تو شادی نہیں کر رہی مگر اپنے باپ کی بک بھی نیچے نہیں کر سکتی۔ تیرا کیا بھروسہ جنڈی! تجھے باپ بولے گا اور تو کل گھر میں چوڑیاں پہن کر بیٹھ جائے گا۔"

سوچ کر اس سے بولا۔ "بالی مجھے دس دن دے۔"

اس نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

میں نے بتایا۔ "دس دنوں کا حلقہ کرتا ہوں اور پھر دیکھنا سب اپنی مٹھی میں ہوگا۔"

اس نے جب یہ سنا تو بڑے آرام سے سامنے پڑا

ریوالور اٹھا لیا اور بولی۔ ''بک بک نہ کر، ایسا نہ ہو سارا پستول تجھ پر ہی خالی کر دوں۔ اب تو دس دن کے حلقے میں بیٹھ اور بالی تین دن بعد سوہا جوڑا پہن رہی ہے۔'' پھر میں اٹھا اور کوٹھا ٹپ کر اتر آیا۔ پھر بالی کی تین دن بعد شادی ہو گئی۔''

''پھر کبھی وہ ملی؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''ہاں سال پہلے ٹکرائی تھی۔ کہیں جا رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے مجھ پر لعنت بھیج کر بولی تھی کہ اب تو چھبیس سے اٹھائیس کا ہو گیا ہے۔ اب تیرا باپ کیا کہتا ہے۔''

''سائیں رشتہ تو بھیج دیتا۔''

''کیسے بھیج دیتا۔ بابا چھبیس کے چکر میں پڑا تھا۔ اب کہتا ہے تو جواب دیا کہ چھبیس کے چھتیس کرنے کے بعد سائیں سہرے باندھے گا۔''

پھر جو سب کا مشترکہ قہقہہ گونجا تو آواز دور تک گئی مگر سائیں کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

☆—☆

ہم ہوٹل واپس آ کر لیٹے آرام کر رہے تھے۔ امتیاز آ کر اعلان کر گیا تھا کہ شام کے بعد ٹھنڈیانی جا رہے ہیں۔ ٹھنڈیانی ایبٹ آباد کے قریب چار ہزار فٹ بلند اپنے نام کی طرح ٹھنڈا ٹھار مقام ہے۔

ٹھنڈیانی جانے پر اعتراض ہمیشہ کی طرح مائیک کو تھا۔ اتنے Tired ہیں کہ Body ساری کی ساری Pain سے بریک ہو رہی ہے۔ پہلے Hill کو Climb کروایا اور اب ٹھنڈیانی کی thinkings چلی آ رہی ہیں۔''

لطیف نے کہا۔ ''ٹور پر تھکاوٹ تو ہوتی ہے۔ آرام کرنے تو ٹرپ پر نہیں جاتے۔''

بولا۔ ''تھوڑے کی بھی ایک Limit ہوتی ہے۔ یہاں تو ہر وقت Go ہر وقت Go۔''

ستار نے اس سے کہا۔ ''ہم ذرا دیر اردو والا آرام کرتے ہیں اور تم انگریزوں والا ریسٹ کرو۔ اگر تم جاگ گئے تو تم Go ہوتا۔ ہم تو چلے جائیں گے اور تم ادھر Room میں Sit کر کے اپنی Luck پر دو دو Tears مزے سے Flow کرتے رہنا۔''

اتنے میں فرید ہمارے کمرے میں آ گیا۔ صورتِ حال معلوم کر کے بولا۔ ''مجھے تو Dream نے زور کیا ہوا ہے۔ کچھ دیر Sleep کروں گا تو Come Come ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''مائیک نہا لو تو تھکاوٹ دھل جائے گی۔''

''ابھی مسجد میں تو Bath لیا تھا۔ اب Again Shower لوں؟''

سائیں نے بستر پر لیٹے لیٹے مجھے آواز لگائی۔ ''جدڑی! اسے کچھ نہ کہہ۔ آج نہایا ہے تو چار دن اس کا دماغ نہائے گا۔ دو چار دن بعد میلا ہو گا تو یہ اپنی بدبو سے چل پڑے گا۔''

مائیک خدانخواستہ ایسا انسان نہ تھا کہ صفائی پسند نہ تھا۔ یہ بھی ہرگز نہ تھا کہ ہر ایک اس سے دور بھاگ رہا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو نہ وہ ہمارے ساتھ رہتا اور نہ ہم اس کو ہمراہ رکھتے۔ ہمارا بہت اچھا دوست تھا۔ ہر انسان کی طرح اس میں کچھ خامیاں تھیں اور ہم نے انہی خامیوں کو پکڑ رکھا تھا۔ اسے اکساتے، خفا کرتے اور پھر اکثر سائیں اسے منا لیتا تھا۔

ہمارے کپڑے لانڈری سے واپس آ گئے تھے۔ سب نے شاور لیا اور خوب بن ٹھن کر تیار ہوئے۔ یہ تیار ہونا بھی عجیب چیز ہے۔ کسی خوب صورتی سے انسانی نفسیات کی عکاسی کرتی ہے۔ عورتیں تیار ہو رہی ہوں تو ان کی بل بل کی ویڈیو بنا کر دیکھیں تو ان کی اپنی ہنسی بھی نہیں رکے گی۔ کوئی شادی ہو یا کہیں کھانے پر جانا ہو۔ کپڑے اپنے علاوہ بچوں کے بھی استری کر کے بیڈ پر پھیلائے رکھے ہوتے ہیں۔ جو بھی زیور پہننا ہے وہ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا ہوا ہے۔ خود بھاگی بھاگی پھر رہی ہوتی ہیں۔ ایک کمرے سے دوسرے میں، کچن میں اور پھر صحن میں۔ چھوٹوں کو ڈانٹ کر اور بڑوں سے ملامت سے بات کرنا۔ چیز عموماً سامنے پڑی ہوتی ہے مگر کسی کی منت کر کے کہہ رہی ہوں گی ذرا ڈھونڈ کر تو دو۔ کبھی ہاتھ کانوں پر..... کیونکہ بندے وغیرہ پہنے جا رہے ہیں۔ ہر چیز پہن کر خود کا شیشے میں باریک بینی سے جائزہ لینا ہوتا ہے۔ پھر میک اپ کا مرحلہ ہوتا ہے جو سب کے علاوہ خود بے چاری پر بھی کٹھن گزرتا ہے۔ ارد گرد کوئی نہ ہو تو ہر لمحے پر شیشے میں خود سے اپنے بارے میں رائے مانگتی ہیں۔ اپنی رائے پر تو کبھی تسلی نہیں ہوتی تو بہنی سے پوچھتی ہیں کہ کیسی لگ رہی ہوں۔ اس بے چاری نے تو ہاں ہی کرنی ہوتی ہے۔ میک اپ کے مرحلے تک آتی ہیں تو بہت جلدی میں ہوتی ہیں کیونکہ وقت سے ایک گھنٹا پہلے ہی لیٹ ہو چکی ہوتی ہیں۔

چہرے کو آخری ٹچ دیتے ہوئے بیٹی وغیرہ سے کہہ رہی ہوتی ہیں ذرا میری جوتی تو نکال کر رکھ دو۔ اپنے علاوہ بیٹیوں کو بھی ساتھ ساتھ تیار کرنا ہوتا ہے اور ان کی اپنے سے زیادہ فکر ہوتی ہے۔ آپ خود اندازہ کر لیں کہ کمرے کا ماحول اور حلیہ کیسا ہو گا۔ دوسری جانب شوہر شلوار قمیص یا جو بھی پہن کر کب سے تیار بیٹھا ہوتا ہے اور کب سے بیٹے کے ہمراہ ٹی وی کے سامنے بیٹھا چینل تبدیل کرتے کرتے کڑھتا رہتا ہے اور سب سے آخر میں ایک سخت مرحلہ آتا ہے جب بیوی تیار ہو کر شوہر کے سامنے آتی ہے تو اس وقت زبان بندی جیسے کفر ہوتی ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب شوہر سے اپنے حسین و جمیل ہونے کی رائے مانگی جاتی ہے۔ یہ دھیان رہے کہ حسن کے اوپر والے دو درجوں میں سے ایک درجے کا نام لینے کی گنجائش آپ کے پاس ہوتی ہے۔

ہم بھی اسی طرح سے تیار ہو کر ٹھنڈیانی جانے کے لیے سوزوکی کا انتظار کر رہے تھے۔ امتیاز اور شہزاد دونوں سوزوکی لینے گئے تھے۔ سائیں نے لٹھے کا سفید بے داغ شکن جوڑا پہنا ہوا تھا۔ ٹھنڈیانی کا نام سن کر ہم نے اپنی جیکٹس بھی ساتھ اٹھائی تھیں کیونکہ ہمیں بھوک نے ستایا ہوا تھا مگر طے یہ پایا کہ ٹھنڈیانی ٹاپ پر کچھ کھائیں گے۔

شام سے پہلے ایبٹ آباد سورج کی کرنوں سے سنہری ہو رہا تھا۔ کل جو کچھ بادل آئے تھے وہ بن برسے رخصت ہو چکے تھے۔ ہمیں کل یہاں سے صبح جی ٹی ایس کی بس لے کر کیرالی تک جانا تھا۔ کیرالی بالاکوٹ سے آگے ایک مقام ہے جہاں سے سیدھی اوپر شوگران تک جاتی ہیں۔ شوگران میں ہمارا دو راتوں کا قیام تھا۔ شوگران کے بعد ہم نے آگے ناران میں کچھ دن گزارنے تھے۔

سوزوکی آئی اور ہم ٹھنڈیانی کے لیے روانہ ہو گئے۔ شام کا گجگجا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ پہاڑ سیاہی مائل ہو رہے تھے۔

سوزوکی گھومتی گھماتی ایک اونچے پہاڑ پر چڑھنے لگی۔ راستہ یوں گول چکر کھا کر اوپر اٹھ رہا تھا کہ محسوس ہوتا سوزوکی موت کے کنویں میں کرتب دکھا رہی ہے۔ ادھر گاڑی کا انجن زور لگاتا تو سیاہ گاڑھا دھواں نکل کر ہماری جانب اندر داخل ہو جاتا۔ دوسری جانب میرا ایبٹ بھی خالی تھا لہٰذا دو تین موڑ اس نے اور کاٹے تو قے کی کیفیت مجھ پر طاری ہو گئی۔ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ سارا کا سارا معدہ منہ کے راستے باہر نکل آئے گا۔ سر چکرا رہا تھا اور دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑے تو بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ سائیں میرے قریب آ بیٹھا اور میری پیٹھ سہلانے لگا۔ اگلے موڑ پر میں نے قے کی تو سامنے بیٹھے طارق کی گود ہری ہو گئی۔ میں نے ادھر قے کی اور دوسری جانب سب کے جی متلانے لگے۔ دوسری قے کرنے کے بعد سوزوکی رکوا دی گئی۔ باہر کھڑے ہو کر تازہ ہوا کے گہرے گہرے سانس لینے کی کوشش کی مگر اندر معدے کے ساتھ جڑا سارا نظام تتر بتر ہو چکا تھا۔ دل پہلو میں سرعت سے دھڑکے جا رہا تھا اور آنتوں نے ریورس گیئر لگا لیا۔ پھر سب باہر نکل کر ادھر ادھر گرے پڑے تھے۔ کوئی قے کر رہا ہے اور کوئی اپنا سینا مسل رہا ہے۔ سائیں اور طارق قے سے بھری اپنی قمیص اتارے کھڑے تھے۔ ہم سڑک کنارے لیٹے تھے۔ کسی کو بھی اپنا ہوش نہ تھا۔ تقریباً آدھا گھنٹا ہم وہاں پڑے رہے۔ پھر حالت آہستہ آہستہ بہتر ہونی شروع ہوئی۔ سوزوکی کو کنڈیکٹر نے صاف کر دیا تھا مگر ناگوار بدبو اٹھ رہی تھی۔ ہم دوبارہ روانہ ہوئے تو قے نہیں آئی مگر کیفیت طاری رہی۔ ہم جیسے جیسے بلند ہو رہے تھے ویسے ہی ٹھنڈ کا احساس ہونے لگا تھا۔ ٹھنڈیانی پہنچے تو شام کے سرمئی رنگوں پر رات کا سیاہ رنگ پڑ چکا تھا۔

چھلانگیں مار کر باہر نکلے تو خوشگوار خنکی نے ہمارا استقبال کیا۔ ہوا چلنے سے درختوں کی شاخیں جھوم رہی تھیں۔ یہ ماحول ملا تو خنکی والی کیفیت ختم ہوتی چلی گئی۔ پہاڑ کی چوٹی پر بہت زیادہ درخت تھے، ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ تھا جس کے باہر کرسیاں رکھی تھیں۔ ساتھ دو نیلے رنگ کے خیمے لگے تھے۔ چند گنے چنے لوگ وہاں گھوم رہے تھے۔

میرے لیے سرسراتی اور جھوم کر آتی ہواؤں، نیم تاریک ماحول اور شور مچاتے پتوں سے زیادہ سب سے پرکشش وہ دو خیمے تھے۔ میں ان کے اندر کی زندگی میں جھانک کر دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ باہر سے کٹ کر اندر کی دنیا کتنی مختلف ہے۔ میٹریس اور تکیے کے علاوہ اس کے اندر کیا کیا احساسات سمائے ہوئے ہیں۔ خیمے اور دنیا کے بیچ ایک باریک پردہ وہ کون سی جداگانہ سوچیں اندر والوں کو دیتا ہے جو باہر والوں کا نصیب نہیں بنتیں۔ میں چند منٹ اس کے اندر بیٹھ کر اپنے سوالوں کے جوابات پانا چاہتا تھا۔

میں ایک خیمے کے نیلے پردے کو ایسے چھو رہا تھا جیسے کوئی بندہ متبرک چیز کو ہاتھ لگاتا ہے۔ اتنے میں اندر سے سائیں کی عمر کا ایک لڑکا نکلا۔ بے ساختگی میں بوکھلا کر میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ کوئی

تھی لیلیا کے نغمے میں بولا۔ "کتنے نصیب والے ہیں آپ کہ اتنی خوب صورت مقام پر کیمپنگ کر رہے ہیں۔"

وہ بولا۔ "لگتا ہے تم کو کیمپنگ کا بہت شوق ہے۔"

پھر میں نے اپنے شوق کی انتہا اسے بتائی تو وہ مسکرانے لگا اور مجھ سے کہا۔ "اس شوق میں میلوں لمبے اور خطرناک ٹریکس پر چلنا پڑتا ہے۔"

وہ لوگ نتھیا گلی سے ٹھنڈیانی کا ٹریک کر کے کچھ دیر پہلے پہنچے تھے۔ وہ بہت کچھ اور بھی مجھے ٹریکنگ کے بارے میں بتاتا رہا۔ میں نے اندر سے ٹینٹ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے ٹینٹ کی زپ کھول کر کہا۔ "ہاں بھائی اندر آ جاؤ۔"

میں نے جوتے باہر اتارے اور پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا تو اپنے آپ کو ایک نئے اور مختلف ماحول میں پایا۔ ایک باریک میٹرس پر دو سلیپنگ بیگ بچھے تھے۔ منہ سے ہوا بھرے جانے والے تکیے تھے۔ اندر ٹینٹ کی پاکٹس میں واک مین، گیس، لالٹین اور پانی کی بوتلیں رکھی تھیں۔ کونوں میں بیگ رکھے تھے۔ واکنگ اسٹکس تھیں۔ میں ہر چیز کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر اس کے ساتھ بیٹھا اپنی معلومات بڑھاتا رہا۔ واپس نکلنے سے پہلے اس سے ایڈریس لیا کہ شاید اگلی مہم میں ان کی ٹیم کا حصہ بن سکوں۔ پھر اس سے ہاتھ ملا کر اپنی دنیا میں واپس آ گیا۔

☆......☆

دیکھا کہ طارق اور سائیں اپنی قمیصیں دھو رہے ہیں۔ دونوں نے بنیانیں پہنی ہیں اور الٹی کے داغ مٹا رہے ہیں۔ طارق غصے میں مجھے دیکھ کر بولا۔ "ہمارے کپڑے خراب کر کے خود ٹینٹ میں بیٹھا شوق پورے کر رہا ہے۔ یہ تمہیں کہہ رہے میں قمیص دھو رہا ہوں۔"

میں نے منہ پھیر کر کہا۔ "یہ گندی قمیص مت دکھاؤ۔ پھر سے الٹی آ رہی ہے۔"

وہ بولا۔ "نخرے دیکھو اس کے۔ ڈیرہ میں کہتا تھا سارا کچھ باندھوں گا۔ ہار کی رواگی تو بے حال کیا ہے۔" پھر لطیف سے سگریٹ لے کر ایک گہرا کش لگایا اور اس سے بولا۔ "یہ سگریٹ پیتا ہے؟"

لطیف کے جواب دینے سے پہلے میں... اشارہ کر کے بولا۔ "درمیان میں بس ایک پہاڑ ہے اور آگے کشمیر ہی کشمیر ہے۔ چھوڑو یاران کو۔ کشمیر چلتے ہیں۔ کیا معلوم وہ گھومتی پھرتی ہوئی ہمیں مل جائے۔"

وہ ہنس پا ہو کر لڑنے مرنے پر اتر آیا مگر درمیان میں سائیں نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے طارق سے کہا۔ "تو ہی بڑا ہے۔ بڑوں میں ہمیشہ حوصلہ زیادہ ہوتا ہے۔ دیکھ تم سے زیادہ کشمیرن کا وہ خیال رکھ رہا ہے۔"

"مت رکھے پرایا اس کا خیال۔ ہم دونوں کو ہمارے حال پر چھوڑ دے۔ میں اس سے محبت کروں یا وہ مجھ سے نفرت کرے۔ میں اس کی عزت کروں یا مجھے وہ جوتے کی نوک پر رکھے مگر اس کو آج منع کر دو کہ آئندہ سے وہ اس بے چاری کا نام نہیں لے گا اور یہ جو بھائی بھائی کی اس نے رٹ لگائی ہوئی ہے اسے بھی بند کر دے۔"

"چوہدری! رشتے سے تو اس کی بھابی ہوئی یہ تو کہے گا۔"

طارق اس سے بولا۔ "سائیں تو خود دیکھ ابھی ہماری محبت ابتدائی مراحل میں ہے۔ آگے بڑھے گی تو کئی دشمن نکل آئیں گے۔ مجھے دشمنیاں بھی بھگتانی ہیں اور اس منہ پھٹ کو دیکھو ابھی سے بھابی بھابی کہنا شروع کر دیا ہے اور سائیں تم کو تو معلوم ہے نظر بھی لگ جایا کرتی ہے۔"

"چوہدری! اس مسئلے کا ایک ہی علاج ہے۔ کشمیرن بھابی ہے تو رشتے کی بات کرتا ہوں۔ تیرا اور مدعم کا یہ جھگڑا ہی ختم ہو۔"

میں بولا۔ "استاد جی! یونیورسٹی کھلتی ہے تو میں سب سے پہلے بھابی کا ہاتھ تھام کر اس کے ہاتھ میں دیتا ہوں تو اس کے لیے کنگن لا اور میں اس کے لیے انگوٹھی لاؤں گا۔ پہلے دن ہی کیمسٹری کی لیبارٹری میں ان کی منگنی کی رسم ادا کرتے ہیں۔"

"چوہدری! کشمیرن بھابی کو سونے میں نہ تول دوں تو استاد جی کی بجائے پھر سے سائیں سائیں کہنا شروع کر دینا تو بس یونیورسٹی کھلنے تک یہ بھابی بھابی ذرا بند کر دے۔"

"استاد جی! آخری بار کہنے کی اجازت تو دے دیں۔"

"چوہدری کہہ دے اپنی حسرت پوری کر۔ ایک بار نہیں دو بار کہہ۔"

"کشمیرن بھابی! لال جوڑا پہن کر چمکے گی۔"

طارق سن کر بری طرح سے شرمانے لگا۔

اتنے میں بہ آواز بلند "السلام علیکم" کسی نے کہا۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو میں ششدر کھڑا رہ گیا، آنکھیں چندھیا گئیں اور زمین گھومتی محسوس ہونے لگی۔ میں گرنے والا ہو گیا تھا۔

(جاری ہے)

انوکھے پیشے

کشمالہ حسن

پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے لوگوں نے کیسے کیسے پیشے اپنا رکھے ہیں۔ ایسے پیشے جو ناقابل یقین ہیں مگر رائج ہیں۔ ان پیشوں سے وہ اپنے گھر چلا رہے ہیں۔لوگوں کو حیران کررہے ہیں۔

ان پیشوں کا تذکرہ جو عقل میں نہ آئے

انسان کی تاریخ کے ساتھ ہی پیشوں کی تاریخ بھی شروع ہوجاتی ہے۔

انسان پہلے جانوروں کا شکار کر کے پیٹ بھرا کرتا تھا۔ بس ایک ہی کام تھا۔ شکار کرنا اور خود بھی کھانا اور اپنے بچوں کو بھی کھلانا۔

اس کے بعد زراعت کی ابتدا ہوئی یعنی ایک اور کام سامنے آگیا۔ اس سے وابستہ کچھ اور کام سامنے آنے لگے جیسے فصلوں کی کٹائی چھٹائی یا اوزاروں کو بنانا یا ان کی مرمت وغیرہ۔

جب تعمیر کا مرحلہ شروع ہوا تو پھر اور کام سامنے آگئے۔

اس کے بعد یہ سلسلہ چلتا چلا گیا۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ دور میں کروڑوں پیشے ہیں۔ ہر پیشے کی ہزاروں شاخیں ہیں اور ان سے وابستہ افراد ہیں۔ کچن ہی کو لے لیں۔ ہوٹل کا کچن، کھانے بنانے والے شیف، ان کی مدد کرنے والے سینکڑوں افراد، پیاز کترنے سے لے کر برتنوں کی صفائی کرنے والے لوگ۔

اب سے ہزار سال پہلے تک تو پیشے اتنے وسیع نہ تھے۔ مثال کے طور پر وکیلوں کا پیشہ۔ قاضی حضرات ضرور ہوں گے لیکن یہ وکلاء کی بھرمار۔ وکیل صفائی۔ وکیل استغاثہ۔ پیشکار گواہان اور نہ جانے کیا کیا لیکن جیسے جیسے معاشرہ ترقی کرتا چلا گیا۔ پیشے بڑھتے رہے۔ اب تو ڈاکٹرز کے بھی سینکڑوں حصے ہو گئے ہیں۔ ذرا ایک نظر ڈالیں تو سہی کہ میڈیکل کے شعبے سے وابستہ کتنے کام ہیں۔

ایک ڈاکٹر جو پورے جسم کا علاج کرتا ہے۔ جس کو جنرل فزیشن کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد سینے کا ڈاکٹر، آنکھ، سر کا ڈاکٹر، کان کا ڈاکٹر، آنکھوں کا ڈاکٹر، دانتوں کا ڈاکٹر، گردوں اور پھیپھڑوں کے ڈاکٹر.....!! خدا جانے یہ فہرست کتنی طویل ہو گئی ہے۔

خواتین کی طرف آجائیں تو وہ بھی مردوں سے کم نہیں رہیں۔ دنیا بھر کے بیوٹی پارلرز، اسپا، بیڈی کیور، میڈی کیور اور آرائش گیسو کی ماہرین خواتین کی فہرست الگ ہے۔

دلہنوں کے میک اپ کے ماہرین کچھ اور ہیں۔ پارٹی ماہرین کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔

خواتین کو چھوڑیں۔ بے چارے بچوں کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ ان کی دیکھ بھال کی فہرست الگ ہے۔

یہ کہانی تو ان لوگوں کی ہے جو عام پیشوں سے وابستہ ہیں۔ ہر کوئی جانتا ہے لیکن اس دنیا میں کچھ انوکھے پیشے بھی ہیں ایسے جو حیران کر دیتے ہیں۔ میں نے خود ایسے کئی لوگ دیکھے ہیں جو عجیب و غریب کام کرتے ہیں۔

میں ایک دفعہ انڈیا گیا۔ وہاں میری ایک آبائی حویلی ہے۔ اس میں ابھی بھی بہت سے لوگ ہیں۔

وہاں ایک آدمی سے ملاقات ہوئی جو بے چارہ حویلی کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ میں نے ایک دن اس سے پوچھا۔ ''بھائی تم کوئی کام بھی کرتے ہو؟''

''جی جناب! میری نوکری ہے۔'' اس نے فخر سے بتایا۔

''واہ! اچھی بات ہے۔ کیا نوکری ہے؟''

''جناب! ایک بوڑھی عورت ہے۔ وہ ان دنوں بیمار ہے۔ میں اس کی دوائیں لے کر آتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''کیا!'' میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ''بھائی! یہ تو کسی بیمار کی خدمت کرنی ہوئی۔ میں تمہاری نوکری پوچھ رہا ہوں۔''

''یہی تو نوکری ہے۔'' اس نے خوش ہو کر بتایا۔ ''روزانہ کے دس روپے ملتے ہیں۔'' (اس زمانے میں دس روپے بھی بہت ہوتے تھے)

''اللہ کے بندے یہ کیسی نوکری ہے خود سوچو وہ عورت کب تک بیمار رہے گی۔ کبھی تو ٹھیک ہو گی۔ اس کے بعد کیا ہو گا اگر وہ مر گئی تو اس کے بعد کیا کرو گے؟''

''نہیں صاحب! میں نے ابھی یہ نہیں سوچا۔'' تو ایسے بھی لوگ ہوتے تھے اور ایسی نوکری ہوتی تھی۔

یہ بات تو پرانی تھی لیکن تیمارداری بھی آج کل ایک پیشہ بن گیا ہے جس کے مختلف نام ہیں۔ نرس، میل نرس وغیرہ۔

بہت سے لوگوں کا پیشہ فراڈ ہوتا ہے۔ بہت کامیاب پیشہ ہوتا ہے۔ میں آپ کو مشورہ نہیں دے رہا۔ بس اطلاع کے لیے بتا رہا ہوں کہ بہت سے لوگوں کی روٹی روزی اسی سے وابستہ ہے۔

پیشے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق براہ راست ہماری زندگی سے ہوتا ہے۔ یعنی جو ہمارے لیے بہت ضروری ہوتے ہیں۔ جیسے نان بائی جو ہمارے لیے روٹیاں بناتا ہے۔ حجام جو ہمارے بال کاٹتا ہے۔ سبزی فروش جو ہمیں سبزیاں لا کر دیتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے برعکس کچھ پیشے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا ہماری روزمرہ زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ صرف ہماری تفریح کے لیے ہوتے ہیں۔ ان کی بھی ایک طویل فہرست ہے۔

آپ اپنے ملک ہی میں دیکھ لیں۔ کیسے کیسے روزگار ہیں۔ بندر نچانے والے، مختلف کرتب دکھانے والے مداری۔ ایک ایک ہفتہ سائیکل چلا کر دکھانے والے۔ سرکس میں کام کرنے والے۔ جوکر حضرات وغیرہ۔

یہ وہ پیشے ہیں جو اگر نہ بھی ہوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن یہ اس لیے بھی ضروری ہیں کہ یہ سب مل کر ایک سماج اور ایک معاشرہ بناتے ہیں۔

آپ نے ایسے بھی پیشے دیکھے ہوں گے جو نوکری

میں سانپ لیے گھومتے رہتے ہیں اور بین بجا کر لوگوں کو محظوظ کرتے ہیں اگر وہ نہ ہوں تو کیا ہوگا۔ کچھ بھی نہیں۔ لیکن یہ لوگ ہمارے کلچر کا حصہ ہوتے ہیں۔

ہم ہنسانے والے جوکرز کی حرکتوں پر جی بھر کر ہنستے ہیں۔ پھر اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔

اس قسم کے بے شمار پیشے ہمارے یہاں بھی ہیں جو روزی روٹی کا سہارا بنے ہوئے ہیں۔

اب آجائیں ان پیشوں یا روزگار کی طرف جو حیران کرنے کے لیے کافی ہیں۔

دھکا مار بندے

جی ہاں یہ ایک جاب ہے۔ یعنی کسی کو دھکا دے کر آگے بڑھانا۔ ہمارے یہاں دھکا دے کر خود آگے بڑھ جانے کی روایت تو ہے لیکن یہ بندے خود نہیں بڑھتے۔ اوروں کو بڑھاتے ہیں۔ ہے نا دلچسپ کام؟

اس کی تفصیل بھی سن لیں۔ یہ انوکھا کام جاپان میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

جاپان کی زندگی کے بارے میں سب جانتے ہیں۔ محنت، مسلسل محنت، کسی فیکٹری میں یا کسی دفتر میں لیٹ ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاتا۔ وہاں یہ سمجھا جاتا کہ دس منٹ لیٹ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی دوڑ میں دس منٹ برباد ہو گئے! اسی لیے ہر شخص وقت پر پہنچنے کی جان توڑ کوشش کرتا ہے۔ اسی کوشش نے دھکا مار کارکن یا مزدور پیدا کیے ہیں۔

وہاں بسوں یا میٹرو ٹرین وغیرہ میں جگہ حاصل کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ بے انتہا رش، دھکے سے کھوا چھلنا اسی کو کہتے ہیں۔ سانس تک لینے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں یہ دھکا مار بندے بہت کام آتے ہیں۔ یہ مسافر کو اٹھا کر بسوں میں ٹھونس دیتے ہیں۔ باقاعدہ ٹھونسا جاتا ہے اور اس کام کا انہیں معاوضہ ملتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ کارکن اچھے خاصے صحت مند ہوتے ہیں۔ ورنہ یہ کام اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔

کیا خیال ہے کیا ہمارے شہر کی ٹریفک میں اس قسم کی مزدوری کی گنجائش نہیں ہے؟

قطار اندر قطار اور سہولت کار۔

میں نے کراچی میں اس قسم کے بہت تماشے دیکھے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سینما ہال میں قطاریں لگا کرتی تھیں۔

تماش بین حضرات عام طور پر بہت پہلے سے قطار میں جا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اب اگر کسی کو کسی کام سے جانا ہوتا تھا تو وہ برابر والے سے التجا کر لیتا۔ ''بھائی دس منٹ کے لیے دیکھتے رہنا میں ایک کام کر کے آتا ہوں۔''

وہ چلا جاتا۔ بہت سی جگہ تو جانے والا اپنی جگہ کوئی اینٹ رکھ جاتا تھا، پھر واپس آ کر اینٹ ہٹا کر لائن میں کھڑا ہو جاتا لیکن یہ سب بغیر کسی معاوضے کے ہوا کرتا تھا۔ نہ تو دوسرا بندہ۔۔۔ قطار میں لگنے کے پیسے مانگتا تھا اور نہ ہی بے چاری اینٹیں کوئی احتجاج کرتی تھیں۔

لیکن اب یہ کام پیسوں سے ہونے لگا ہے۔ جی ہاں باقاعدہ اتنی دیر کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔

یہ کارنامہ بھی جاپان ہی میں انجام دیا جاتا ہے۔ آپ کو اگر کسی قطار میں لگنا ہے۔ چاہے وہ کسی تھیٹر کی قطار ہو یا کوئی فارم لینا ہے یا کوئی ٹوکن ملنے والا ہو تو پروا مت کریں۔ لگ جائیں لائن میں؟ اور جب کھڑے کھڑے تھک جائیں تو آپ کی جگہ قطار میں لگنے کے لیے فری لانسر کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ ایک خاص معاوضہ لے کر آپ کی جگہ خود لائن میں

ڈاکٹر آفتاب اصغر

ماہر تعلیم اور مصنف، گجرات میں یکم مارچ 1940ء میاں محمد اصغر کے ہاں پیدا ہوئے۔ بی اے آنرز، ایم اے اردو، ایم اے فارسی (پنجاب)، ایم اے فارسی (تہران) کے امتحانات پاس کیے۔ تہران یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ درس و تدریس کے علاوہ پاکستان ٹیلی ویژن لاہور سینٹر سے مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی کی شرح پر مبنی پروگرام بھی کیے۔ مختلف رسائل و جرائد اور اخبارات میں فکر انگیز مقالات لکھتے رہے۔ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں تدریسی خدمات انجام دیا۔ تصانیف میں شامل ہیں۔

1۔ مجموعہ مقالات اردو فارسی۔ 2۔ کتاب جدید فارسی جماعت نہم و دہم۔ 3۔ تاریخ مبارک شاہی۔ اردو ترجمہ۔ 4۔ کتاب جدید فارسی ہشتم۔ 5 منظرہ مرگ تاریخ مظفر شاہی۔ 6۔ تاریخ نویسی فارسی در ہند و پاکستان 1986ء، تاریخ مبارک شاہی کا ترجمہ کرنے پر انہیں 1976ء میں حبیب بینک ادبی انعام ملا۔

مرسلہ: احمد یار خان، لاہور

لگ جائیں گے۔

آپ اتنی دیر میں اپنا کام نمٹا کر واپس آجائیں۔ یا کام نہیں ہے تو سامنے والے کسی ریسٹورنٹ میں جا کر کافی یا کسی مشروب کے ساتھ دل بہلائیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ بچپن میں آپ کے اور ہمارے اسکولوں میں بھی یہی ہوا کرتا تھا۔ کوئی طالب علم آیا نہیں ہے۔ استاد صاحب حاضری کا رجسٹر لیے ہر ایک کا نام پکارتے جارہے ہیں۔

"نسیم خان!"

"یس سر!"

"عارف جمال!"

"یس سر!"

اب فیروز الدین غیر حاضر ہے لیکن اس نے اپنے دوست کو تھوڑی رشوت دے رکھی ہے اسی لیے جب اس کا نام پکارا جاتا تھا تو فیروز کی جگہ اس کا دوست یس سر کہہ کر اس کی حاضری لگوا دیا کرتا تھا۔ اسے پراکسی کہتے تھے۔

ہمارے یہاں ابھی بھی یہ کام ہوتا ہے لیکن اب اس کی نوعیت بہت سنگین ہوگئی ہے۔ اب حال یہ ہے کہ اصل بندے کی جگہ کوئی اور معقول معاوضہ لے کر امتحان تک دے آتا ہے۔

مجھ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ بہر حال یہ سارے کام روزگار کے ضمن میں آنے لگے ہیں۔

خواب زادے یا زادیاں۔

جی ہاں! یہ بھی ایک کام ہے۔ روزگار ہے۔ روزی روٹی کا سلسلہ ہے۔

اس میں کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ بس جا کر سو جائیں اگر یہ جاب ہمارے یہاں ہوتی تو کتنوں کا بھلا ہو جاتا جو زیادہ تر وقت سوئے ہی رہتے ہیں۔ آرام کا آرام اور سونے کے پیسے الگ سے مل جاتے۔ جتنی دیر تک سوتے رہیں اتنا ہی معاوضہ۔

ہے نا دلچسپ روزگار؟

اب یہ دیکھیں کہ یہ کام ہوتا کہاں ہے۔

یہ کام سائنس والوں کی تجربہ گاہوں میں ہوتا ہے۔ وہ اس تجربے سے بے شمار نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ یعنی سوتے وقت انسان کس کروٹ یا پوزیشن میں سونا پسند کرتا ہے۔ اس کی سانس کیسی ہوتی ہیں۔ اس کی بے خوابی کی وجوہات کیا ہوتی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

یعنی یہ کام یوں ہی تفریحاً نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے تحقیقی عنصر ہوتا ہے لیکن سونے والے کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ سائنس دان کیا ریسرچ کر رہے ہیں۔ اسے تو اس بات سے دلچسپی ہوتی ہے کہ اسے اتنی دیر تک سونے کا اچھا خاصا معاوضہ مل رہا ہے۔ ان کی بلا سے چاہے دن بھر سلائے رکھو۔ بس وقت پر معاوضہ دے دیا کرو۔

کیا خیال ہے؟ کیسا کام ہے۔ آرام کا آرام اور روزگار کا روزگار۔ اگر ہمارے یہاں ہو تو کتنوں کا بھلا ہو جائے۔

ہمارے یہاں اگر کوئی اتنی دیر تک سوتا رہے تو اسے منحوس کا خطاب مل جاتا ہے۔ بھائی اس نے تو پورے گھر میں نحوست پھیلا رکھی ہے۔ جب دیکھو سوتا ہی رہتا ہے۔ اب اعتراض کرنے والوں کو کیا معلوم کہ یہی خواب آور نوجوان اگر باہر چلا جائے تو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے۔

پریم پتر (love letter)

اب سے چودہ پندرہ برس پہلے تک یہ روزگار ہوا کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی بھی کہیں کچھ بے روزگار اس پیشے سے منسلک ہوں۔

آپ کی بھی یادداشت میں ہوں گے۔ یہ حضرات عام طور پر ڈاک خانوں کے باہر ایک چھوٹی سی صندوقچی لے کر بیٹھے رہتے تھے اور پردیسیوں کے خطوط لکھا کرتے تھے۔ کوئی اپنے گھر والوں کو خط بھیج رہا ہے کوئی اپنے دوست کو یا کسی کا کہیں لین دین ہے۔ یہ لوگ منشی کہلاتے تھے۔

کیسے کیسے خواب ہوا کرتے تھے۔ اس موضوع پر ایک چھوٹا سا گیت سن لیں۔ "ایک ہیں راجا جی کہ جن کو دیکھا بوجھ اٹھائے، راجا جی کی بات انوکھی کرتے ہیں مزدوری، ٹھیلا کھینچیں رکشا کھینچیں...... کیسی ہے مجبوری۔ کاغذ لے کر لکھوانے کو پاس وہ میرے لائے، ایک ہیں راجا جی کہ دیکھا جن کو بوجھ اٹھائے۔"

"رانی جی کو لکھنا بابو کہ ہمت وہ نہ ہاریں بتاؤں گا واپس آکر سونے کی دیواریں پیسا پیسا جوڑ رہا ہوں تاکہ دن وہ آئے، چٹھی لکھ کر راجا پائے خوشیوں کی سوغات، آنکھیں میری سوچے بیٹھیں جانے کیسی بات، شاید ایسی بات نہ کوئی راجا کو سمجھائے ایک ہیں راجا۔ قطرہ قطرہ" دریا بنتا دنیا کی ہے ریت لیکن دریا بنتے بنتے جاتے جگ ہیں بیت، راجا تیری رانی آخر کب تک آس لگائے کب تک آس لگائے۔"

بہر حال موضوع کچھ اور ہے... یعنی پریم پتر۔ اب ڈاک خانوں کے باہر بیٹھے لوگ بہت کم نظر آتے ہیں۔

اب تو موبائل اور انٹرنیٹ نے گاؤں کی گوری سے لے کر شہروں کی میم تک کو ایک کر دیا ہے۔

پریم پتر یعنی لو لیٹر اسی قسم کی ایک مزدوری تھی جو کچھ لوگ کیا کرتے تھے۔ وہ صرف محبت نامے معاوضہ لے کر لکھا کرتے تھے۔ چاہے کوئی بھی لکھوا لے۔ عام طور پر یہ لوگ ادبی زبان کی چاشنی کے ساتھ خطوط لکھا کرتے تھے۔ خطوط مطلوب تک پہنچانے کی ذمے داری ان کی نہیں ہوتی تھی۔

اب تو ڈاکیے بھی بہت کم رہ گئے ہیں۔

کرائے کے عاشق

جی ہاں۔ یہ بھی ایک جاب ہے۔ میں مذاق نہیں کر رہا۔ جاپان میں بہت سے بے روزگار نوجوانوں کا یہ روزگار ہے۔ اس میں لڑکیاں بھی ہوتی ہیں اور لڑکے بھی۔

ایک شعر سن لیں۔ اندازہ ہو جائے گا کہ تنہائی کتنی جان لیوا ہوا کرتی ہے۔ "ہاتھ سے ناپتا ہوں درد کی گہرائی کو.....

یہ نیا کھیل ملا ہے میری تنہائی کو۔"

تو اس قسم کے رضا کاروں کی ضرورت تنہائیوں کے ماروں کو پیش آتی ہے۔

جاپان مشرق میں ہونے کے باوجود مغرب میں ہے۔ بہت سی ایسی باتیں بھی اس معاشرے میں در آئی ہیں جن کا پہلے تصور بھی نہیں تھا۔ اب اسی کو لے لیں۔ یعنی کرائے کے عاشق۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

تنہائیوں نے اگر آپ کو اداس کر رکھا ہے۔ آپ کہیں ویرانے میں جا کر رونا چاہتے ہیں۔ آپ کو کوئی ایسا چاہیے جس کے سامنے آپ جی بھر کر یا تو رو سکیں یا اپنی زندگی کے دکھڑے رو سکیں۔ ظاہر ہے اتنے مصروف معاشرے میں ایسا کون ملے گا جس کے شانے پر سر رکھ کر رو دیا جائے۔ تو پریشان نہ ہوں۔ اس کام کے لیے ایجنسی موجود ہے۔ اپنی ریکوائرمنٹ لکھوا دیں۔

مطلوبہ معیار کی لڑکی یا لڑکا آپ کے پاس پہنچ جائے گا یا پہنچ جائے گی۔ اب اسے لے کر ہوٹل جائیں یا ساحل پر چلے جائیں یا کسی پارک یا تھیٹر میں جائیں۔ وہ آپ کے ساتھ رہے گا یا رہے گی۔

لیکن ان تمام مراحل کی ایک شرط بھی ہے کہ ایک دوسرے کو ٹچ نہیں کریں گے۔ یعنی اپنی اوقات میں رہیں گے۔ اب بتائیں یہ کام مشکل ہے یا آسان؟

کرائے کے آنسو

میں یہ بتا چکا ہوں کہ میں نے اس موضوع پر کہانی بھی لکھی تھی جس کا عنوان ہی کرائے کے آنسو تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ کرائے کے آنسو بھی دستیاب ہیں اور یہ المیہ مغرب کا ہے۔ جہاں لوگوں کو اپنے مرنے والوں کی موت پر آنسو بہانے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ میں ہر مغربی شخص کے لیے نہیں کہہ رہا لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہے۔ یہ کرائے کے لوگ میت پر جا کر باقاعدہ دھاڑیں مار مار کر رویا کرتے ہیں۔ (ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے)۔ اور یہ المیہ مغرب کا ہے۔ لیکن ٹھہریں، یہ پیشہ راجستھان میں رائج تھا۔ مرنے والے پر رونے کے لیے کرائے پر عورتیں بلوائی جاتی تھیں جو گھر میں داخل ہوتے ہی دھاڑیں مارنا شروع کر دیتیں۔

ہم لوگ تو اپنے مرنے والوں کو خود ہی رو دھو کر فارغ ہو جاتے ہیں اور یہ بھی وہاں ایک روزگار ہے۔ "روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر۔ اب یہ نہیں معلوم کہ ان کے معاوضے کتنے ہوتے ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ وقت کے حساب سے ملتے ہوں۔ ایک گھنٹے کا رونا۔ تین گھنٹوں کا رونا وغیرہ۔ موسم اور دن رات کے فرق کا بھی الگ معاوضہ ہوتا ہوگا۔

اب یہ بتائیں کہ یہ سارا ماحول کتنا جھوٹا اور مصنوعی لگتا ہوگا۔ یعنی کچھ لوگ کسی کی موت پر ایک طرف بیٹھے یوں ہی

کراچی میں حمیدی نسبت رکھنے والے گھرانے کی فاطمہ ثریا بجیا (ڈراما نگار) ان کے برادران احمد مقصود حمیدی (سیکریٹری اطلاعات سندھ) انور مقصود (ڈراما، انٹری وی، کمپیئر) اور ہمشیرگان زہرہ نگاہ، سارہ نقوی نے شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ اسی گھرانے کے ایک فرد آفتاب حمیدی بدایونی 1921ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا اصل خاندانی نام ضیاء الحسن تھا۔ قیام پاکستان سے قبل بھی اور کراچی آنے کے بعد بھی آپ کو بدایوں کی ممتاز علمی و ادبی شخصیت کی حیثیت سے احترام و عقیدت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ محشر بدایونی، منظر ایوبی اور انور مقصود حمیدی وغیرہ کے اصرار پر کبھی کبھی شعری نشستوں میں بھی شریک ہوتے تاہم باقاعدہ طور پر شاعری کا مجموعہ مرتب نہ کیا اور جو کلام سنایا اسے بھی محفوظ نہیں رکھ سکے۔ 19 فروری 1991ء کو آفتاب حمیدی نے کراچی میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی اور خفتگانِ خاک کراچی قرار پائے۔

مرسلہ: محمد اشرف۔ لاہور

روتے چلے جارہے ہیں جن کا اس بندے سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

ان لوگوں کو رونے کی باقاعدہ پریکٹس کرنی پڑتی ہو گی۔ ہوسکتا ہے کہ رونے کے لیے گلیسرین کا استعمال بھی کرتے ہوں لیکن گلیسرین سے وہ فطری پن سامنے نہیں آتا ہوگا۔

جان نہ پہچان۔

جی ہاں یہ بھی ایک روزگار ہے۔ ایک جاب ہے۔ اور بہت مزے کی جاب ہے۔

ایک زمانے میں ہم دوستوں کا یہ مشغلہ ہوا کرتا تھا۔ اس میں ہوتا یہ تھا کہ کسی کی بھی شادی یا ولیمے میں اس وقت شامل ہو جاتے تھے جب کھانا لگ رہا ہو۔ اس افراتفری میں کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ بھائی آپ کون ہیں۔ کہاں سے آئے ہیں۔ دولہا یا دلہن سے رشتہ کیا ہے۔ بس ہال سے یا شامیانے سے کھاپی کر باہر نکل آتے تھے۔

اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا تھا کہ مہینے میں چار پانچ دن مزے مزے کے پکوان کھانے کو مل جاتے تھے لیکن یہ سب ایک مشغل کے طور پر ہوتا تھا۔ کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ یہ ایک روزگار بھی ہے۔ بہت سے لوگ اسی پر زندہ ہیں۔

جی ہاں جاپان کی جہاں بہت سی باتیں ہمیں حیران کرتی آئی ہیں۔ وہاں یہ بھی ایک حیرت میں ڈالنے والا رواج اور رسم یا پیشہ ہے۔ یہ کرائے کے آنسو بہانے والوں کی طرح کرائے کے مہمان ہوا کرتے ہیں لیکن یہ مہمان صرف وقت گزارنے کے لیے یا اچھا کھانا کھانے کے شوق میں بن بلائے مہمان نہیں بن جاتے بلکہ ان کو معاوضے پر بلایا جاتا ہے۔ بے حد مزے کی جاب۔

تنہائی کا روگ ہمارے اس مہذب (نام نہاد) معاشرے کو گھن کی طرح کھا رہا ہے۔

یہ تماشے مغرب یا جاپان جیسے ملکوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شادی درپیش ہے تو اچھا نہیں لگتا کہ لڑکا یا لڑکی اکیلے ہی چرچ میں پہنچ جائیں۔ دوستوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ پتا چلے کہ دولہا یا دلہن بالکل ہی اکیلے نہیں ہیں۔

ہمارے یہاں تو خدا کے فضل سے مہمانوں کی کمی نہیں ہوتی بلکہ سوچنا پڑتا ہے کہ کس کو بلایا جائے اور کس کو گول کردیا جائے۔ پورا خاندان مدعو ہوتا ہے۔ یہ ایک معاشرتی اور سماجی ضرورت ہوتی ہے۔

اگر کوئی شریک نہ ہو تو اسے طعنے سننے کو ملتے ہیں کہ فلاں کی شادی میں تم نہیں آئے اور فلاں کے ولیمے میں تمہارا پتا نہیں تھا۔

یہ ہماری تہذیب ہے۔ ہماری قدریں ہیں۔ ہم سماج سے کٹ کر نہیں رہ سکتے اور رہنا بھی نہیں چاہیے۔

لیکن یہ روزگار جس معاشرے کا ہے۔ وہاں انسان تنہا ہوگیا ہے۔ موت ہو جائے تو رونے والے نہیں ملتے اور جب خوشی کی تقریب ہو۔ تو مبارک باد دینے والے نہیں آتے۔ ایک جان لیوا تنہائی کا سناٹا ہوتا ہے۔

ایسے میں یہ کرائے کے لوگ بہت کام آتے ہیں۔ دولہا یا دلہن ان کو معاوضے پر ہائر کرتے ہیں۔

دیکھیں کیسا روزگار ہے۔ ایک طرف تو پیسے ملتے ہیں دوسری طرف طرح طرح کے کھانے کو ملتے ہیں۔

ہوتا یہ ہے کہ ایجنسی کو فون کردیا جاتا ہے کہ بھائی میری شادی ہو رہی ہے۔ چالیس مہمانوں کو بھیج دو۔ معاوضہ اسی وقت دے دیا جائے گا۔ اس ایجنٹ کا معاوضہ یہاں سے کریں۔ شادی کا کارڈ بانٹنے کے لیے ایک ہفتہ درکار ہوتا ہے۔ فہرست بنائی جاتی ہے۔ دیکھو کوئی رہ نہ جائے۔ فلاں کی شادی میں فلاں کو بھول گئے تھے۔ اب ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

بغل گند

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پیشے کو کیا نام دیا جائے؟

یہ ایک حیرت انگیز اور کراہیت آمیز روزگار ہے لیکن اس کا وجود ہے۔ اسی لیے اس کا ذکر بھی ہو رہا ہے۔

یہ کام بڑی بڑی وہ کمپنیاں لیتی ہیں جو خوشبوؤں کا اسپرے بنا کرتی ہیں۔

خاص طور پر "ڈیوڈرنٹ" جو ہمارے یہاں عام طور پر مل جاتا ہے۔ جن کو بغلوں کے پسینے کی بو دور کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں کی بغلوں کو سونگھیں جنہوں نے یہ ڈیوڈرنٹ استعمال کیا ہوا ہوتا ہے۔ ہے نا کتنا واہیات۔ اس کے بارے میں تفصیل سے کیا لکھا جائے بس اتنا جان لیں کہ یہ بھی ایک کام ہے۔

اس پیشے سے مرد اور عورت دونوں وابستہ ہوتے ہیں۔

خطروں کے کھلاڑی

بیٹھے ہوئے لوگوں پر سناٹا طاری ہو گیا تھا۔

ایک مجرم ایک لڑکی کو اپنی گاڑی میں زبردستی بیٹھا کر

بھاگ رہا تھا۔ اس لڑکی کا دوست ایک بائیک پر مجرم کی گاڑی کا پیچھا کر رہا تھا۔

مجرم کی گاڑی ریلوے پھاٹک کو کراس کر کے دوسری طرف چلی گئی تھی۔ اسی وقت سامنے سے ایک ٹرین آنے لگی اور پھاٹک بند ہو گیا۔ اس نوجوان نے پھاٹک کے پاس آ کر اپنی بائیک کو اور تیز کیا اور وہ بائیک ہوا میں اڑتی ہوئی بند پھاٹک اور ٹرین کو کراس کرتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔

سینما ہال میں بیٹھے لوگوں نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔

یہ ایک فلم کا سین تھا۔ اس کو اسٹنٹ کہتے ہیں۔ اس قسم کا کارنامہ انجام دینے والے اسٹنٹ مین کہلاتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دیکھا اس فلم کا ہیرو کتنا بہادر ہے۔ ہیرو تو سوائے گانا گانے کے اور کچھ نہیں کرتا۔ اصل بہادری تو ان بے چاروں کی ہوتی ہے جن کو جانتا بھی کوئی نہیں ہے۔

یہ ایک جان جوکھوں کا پیشہ ہے لیکن کیا کیا جائے۔ روزگار ٹھہرا۔ روٹی تو کسی طور کمانا ہے مچھندر۔

یہ لوگ کیمرے کے سامنے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ آگ میں چھلانگ لگائی، ہوائی جہاز سے کود جانا۔ بسوں کے آگے لیٹ جانا۔ کچھ بھی ان لوگوں کی ایک طویل فہرست ہے جو بے چارے اس قسم کا اسٹنٹ دکھاتے ہوئے ہلاک ہو چکے ہیں لیکن کون دیتا ہے داد ناکامی...... خون فرہاد بر سر فرہاد

اس کو اب ایک پیشے کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔

یہ لوگ سرکسوں میں کام آتے ہیں۔ کسی جادوگر کے خطرناک شو میں ان سے کام لیا جاتا ہے اور دیکھنے والے ان کو سراہا کرتے ہیں جو سامنے ہوں۔

لیموں نچوڑ

یہ کسی قسم کا پیشہ تو نہیں ہے اور نہ ہی اسے زیادہ لوگوں نے استعمال کیا ہے۔

لیکن لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح میں ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو لیموں نچوڑ تھے۔

یہ ایک دلچسپ پیشہ تھا اور بے روزگار قسم کے لوگ اس شغل سے وابستہ تھے۔ یہ ایسے لوگ تھے جن کا کوئی کام نہیں تھا۔ دن بھر گھروں میں رہتے اور شام ہوتے ہی نہا دھو کر مناسب لباس پہن کر ارد گرد کے ہوٹلوں میں پھیل جاتے۔

اب ہوتا یہ تھا کہ یہ اپنے پاس کٹے ہوئے لیموں رکھتے تھے۔ اب کسی گاہک نے کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانا اس کے سامنے آیا اور اس نے کھانا شروع کیا اسی وقت وہ لیموں نچوڑ ان کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ "ارے صاحب! کیا ستم کر رہے ہیں۔ اتنے اچھے سالن کو بغیر لیموں کے تڑکے کے کھا رہے ہیں۔ یہ آپ جیسے باذوق کے لیے مناسب نہیں ہے۔ یہ لیں اب کھا کر دیکھیں۔" اتنا کہہ کر وہ کٹے ہوئے لیموں سے چند قطرے اس کے سالن میں ٹپکا دیتے تھے۔ کھانا کھانے والا مروت میں آ کر ان کو بھی اپنے ساتھ کھانے میں مدعو کر لیتا تھا۔ اب یہ کھانا کھاتے جاتے اور اس کی تعریف کرتے رہتے۔ بہر یہ تھا کہ بے انتہا چرب زبان ہوتے تھے۔

ہے نا مزے کی جاب؟

آرام طلب

جی ہاں یہ بھی ایک جاب ہے۔ باقاعدہ روزگار ہے۔

اس میں صرف اتنا کرنا ہوتا ہے کہ کسی آرام دہ صوفے پر لیٹ کر سو جائیں۔

یہ جاب مغرب میں بہت عام ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ فرنیچر کمپنیاں آرام دہ صوفے بنایا کرتی ہیں۔ اب ان صوفوں کی پائیداری اور آرام دہ ہونے کی گارنٹی کے لیے کسی کو اس پر سلا دیا جاتا ہے۔ وہ اس پر دراز یا نیم دراز ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد سو جاتا ہے اور تین چار گھنٹوں کی نیند لینے کے بعد کھڑا ہوتا ہے اور اپنی فیس یا مزدوری لے کر چلا جاتا ہے۔

یہ ایسی جاب ہے، جس کے لیے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات۔

اس قسم کے مزدوروں کی باتیں بھی کچھ ایسی ہوتی ہوں گی۔ "مسٹر! کل بھی آ جانا۔ ایک دوسرے مارک کے صوفے کی ٹرائیل لینی ہے۔"

"نو سر! کل تو اسٹار والوں نے بک کر رکھا ہے۔ وہ بھی اپنا نیا فرنیچر مارکیٹ میں لانچ کر رہے ہیں۔"

تو کیسی مزدوری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایسی مزدوری بہت کم کو نصیب ہوتی ہوگی۔

بہر حال یہ تھے چند ایسے پیشے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے انوکھے ہیں۔ سن کر یا دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ہمارے یہاں بھی ایسی آرام دہ جاب موجود ہو لیکن ہمارے علم میں نہیں ہے۔

دوسرا حصہ

روسیاہ

عاطر شاہین

وہ ایک معصوم سا سیدھا سادا نوجوان، غربت کی گود میں پلا بڑھا، خوابوں کی دنیا ہی اس کا مسکن تھا کہ اسے سبق سکھانے کے لیے اس کی بہن کو اغوا کرلیا گیا اور تب اسے آنکھیں آہن پوش کرنی پڑیں۔ مصائب کے دلدل کو پار کرتا ہوا وہ آگے بڑھا تو اس پر آشکار ہوا کہ تقدس کے ملمع چڑھے چہروں کے عقب میں مکروہ چہرے ہیں۔ وہ ان کے چہروں سے نقاب ہٹانا چاہتا تھا مگر بھول گیا تھا کہ زمینی خدا بن بیٹھے مقدس ظالمین کی قوت ناقابل شکست ہے۔

پل پل بدلتے چہروں کی طویل سرگزشت

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

اس کا نام علی حسن تھا۔ وہ ہوم ٹیوشنز پڑھاتا تھا۔ باکسر تھا اور اسے ہیرو بننے کا شوق تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دے جس سے وہ بطور "ہیرو" پہچانا جائے۔ ایک روز وہ گھر کی طرف جا رہا تھا کہ اسے ایک کار کے نیچے ایک پرس پڑا دکھائی دیا۔ آئی ڈی کارڈ سے اسماعیل نامی لڑکی کا تھا۔ اس نے وہ پرس لڑکی تک پہنچا دیا۔ عذرا اسماعیل کے والد اسماعیل شاہد سرکس چلاتے تھے۔ انہوں نے علی حسن کو اپنی سرکس میں بطور کیشئر کی جاب دے دی۔ ایک رات علی اپنے دوست سے مل کر گھر آ رہا تھا کہ اسے ایک گلی میں دو لڑکے مل گئے۔ ایک لڑکی کو اغوا کر رہے تھے۔ علی نے اس لڑکی کو ان دونوں لڑکوں کے چنگل سے بچایا اور اس لڑکی کو بحفاظت اس کے گھر تک پہنچا دیا۔ شانی نے اسے کافی دھمکیاں دی تھیں۔ چند روز کے بعد علی کی بہن روزینہ اغوا ہو گئی۔ علی نے شانی کی نگرانی شروع کر دی اور ایک روز وہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے ایک کوٹھی میں پہنچا جہاں علی نے شانی پر تشدد کر کے اپنی بہن کے بارے میں پوچھا۔ علی نے اعتراف کر لیا کہ اس نے اس کی بہن کو اغوا کر کے چوہدری ساجد نامی شخص کو فروخت کر دیا ہے پھر شانی نے چالاکی سے علی کو اپنے کمرے میں بند کر دیا۔

(اب آگے پڑھیں)

میں جانتا تھا مجھے شانی نے ہی دھکا دیا تھا جس کی وجہ سے میں کمرے کے وسط میں آ گرا تھا۔ اس وقت کوٹھی میں میرے، شانی اور ادھیڑ عمر ملازمہ کے علاوہ کوئی چوتھا ذی روح موجود ہی نہیں تھا۔ سنبھلتے ہی میں بلا خیزی سے دروازے کی طرف بڑھا اور ہینڈل پکڑ کر اسے گھما کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن باہر سے کنڈی لگا دی گئی تھی اس لیے میری کوشش ناکام گئی۔

"شانی..... دروازہ کھولو۔" میں نے چیختے ہوئے کہا لیکن شانی نے میری بات کا کوئی جواب دیا اور نہ ہی دروازہ کھلا۔ شاید اس نے میری بات نہیں سنی تھی یا وہ نظر انداز کر رہا تھا۔ میں نے ایک بار اسے پکارتے ہوئے کہا۔ "شانی! میں کہتا ہوں دروازہ کھولو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

میری آواز کمرے میں ہی گونج کر رہ گئی۔ غصے سے میرا حال برا ہو رہا تھا۔ جب مجھے کچھ اور بجھائی نہ دیا تو میں نے دروازے پر باکسنگ شروع کر دی۔ میں دروازے پر تابڑ توڑ وار کر رہا تھا۔ دروازہ مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا اس لیے میرے مکوں کا اس پر ذرا بھی اثر نہ ہو رہا تھا۔ وہ ہنوز بند ہی تھا۔

"شانی، کیا تم سن رہے ہو۔ دروازہ کھولو۔" میں نے تھکے ہوئے جواری کی طرح بے بس ہوتے ہوئے ایک بار پھر شانی کو پکارا تھا۔ شاید وہ وہاں موجود نہیں تھا یا میری بات کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے دروازے سے کان لگا کر دوسری طرف سے کچھ سننے کی کوشش کی لیکن دوسری طرف گہری خاموشی، گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کمرے کا طائرانہ جائزہ لیا۔ کمرے کی کھڑکی چھت کی دوسری طرف کھلتی تھی۔ ایک خیال کے تحت میں تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھا۔ پردہ ہٹایا تو میرے چہرے پر مایوسی کے تاثرات بکھر گئے کیونکہ کھڑکی پر لوہے کی مضبوط گرل لگی ہوئی تھی اور ان سے پہلے صاف و شفاف شیشہ میرا منہ چڑا رہا تھا۔ جیسے دونوں مل کر کہہ رہے ہوں کہ یہاں سے کیسے نکلو گے۔

میں شیشہ تو توڑ سکتا تھا لیکن لوہے کی گرل توڑنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں باکسر ضرور تھا، مدمقابل کو چند لمحوں میں چت کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا لیکن میرے داؤ پیچ ان سلاخوں کے سامنے ہیچ تھے۔ اگر سلاخیں پتلی ہوتیں تو شاید میں انہیں توڑ سکتا۔

مجھے وہ سین اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے ایک انڈین فلم دیکھی تھی جس میں ہیرو جیل کا لوہے کا دروازہ لات مار کر توڑ دیتا ہے۔ مجھے وہ سین آج تک سمجھ نہیں آیا تھا کہ ہیرو نے کیسے لات مار کر لوہے کا دروازہ توڑا تھا۔ شاید دروازے کی ویلڈنگ ہی ناقص ہوگی۔ بہرحال میں فلمی ہیرو نہ تھا اگر میں لات مار کر لوہے کی سلاخیں توڑنے کی کوشش کرتا تو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ فلم کی دنیا تھی اور میں حقیقت کی دنیا میں موجود تھا۔

میں چکرا کر رہ گیا تھا۔ ذہن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو رہا تھا۔ سونی مونی گرل کو دیکھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ میں اب کیا کروں۔ جو کچھ بھی کرنا تھا جلدی کرنا تھا کیونکہ شانی سے اچھائی کی توقع عبث تھی۔

جب کچھ سمجھ نہ آیا تو میں جھنجلاتا ہوا ایک بار پھر دروازے کی طرف بڑھا اور ہینڈل پکڑ کر دروازہ زور زور سے جھنجوڑنے لگا۔ ساتھ ہی میں شانی کو بھی آوازیں دے رہا تھا لیکن میری آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ہی ثابت ہوئی۔ شانی

میرے ساتھ کیا کرنا چاہتا تھا مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے میں نے بھی تو اس کا بہت برا حشر کر دیا تھا۔ شاید وہ بھی میرے ساتھ برا کرنے والا تھا۔

میں خود کو اس پرندے کی مانند تصور کر رہا تھا جسے پنجرے میں قید کر دیا جاتا ہے اور وہ باوجود کوشش کے پنجرے سے نہیں نکل پاتا۔ روشندان بھی چھوٹا تھا جس سے میرا وجود نہیں گزر سکتا تھا۔ میں نے ہینڈل کو چھوڑا اور کمرے میں زخمی شیر کی طرح چکر لگانے لگا۔ آخر کار وہی ہوا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں کمرے میں چکر لگا رہا تھا کہ یکلخت مجھے فاروق سے رابطہ کرنے کا خیال آیا۔ اس سے پہلے کہ میں پتلون کی جیب سے سیل فون نکالتا، اچانک مجھے چوہدری باسط کی آواز سنائی دی۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ میں... فون نکالنے کی بجائے جلدی سے دروازے سے کان لگا کر سننے لگا۔

"کہاں ہے وہ؟" چوہدری باسط کی گرجدار آواز سنائی دی۔

"بابا! میں نے اسے کمرے میں بند کر دیا ہے۔" یہ شانی کی آواز تھی۔

چوہدری باسط نے پوچھا۔ "کیا یہ وہی لڑکا ہے جس نے تم پر اپنی بہن کے اغوا کا الزام لگایا تھا؟"

شانی نے جواب دیا۔ "ہاں بابا۔"

"کیا اس نے تم پر تشدد بھی کیا ہے؟" چوہدری باسط نے پوچھا۔

"ہاں بابا۔"

"میں اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔"

شاید چوہدری باسط جارحانہ انداز میں کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا تھا لیکن مجھے شانی کی آواز سنائی دی۔ "رک جائیں بابا!"

"کیوں؟"

"میں نے پولیس کو کال کر دی ہے... آتی ہی ہوگی۔"

"پولیس کو.....؟"

"ہاں بابا! میں نے پولیس کو یہی بتایا ہے کہ کوئی چور یہاں آ گیا ہے جسے میں نے کمرے میں بند کر دیا ہے۔" شانی نے جواز بتایا تو اس کی بات سن کر میرے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھی۔ میں ہینڈل پکڑ کر ایک بار پھر دروازے کو جھنجوڑنے لگا۔

"شانی! دروازہ کھولو۔ میں تمہارے باپ کو تمہارا مکروہ چہرہ دکھانا چاہتا ہوں۔" میں نے چیختے ہوئے کہا۔

"خاموش رہو بدبخت۔" چوہدری باسط کی تحکم آمیز آواز آئی۔ "تم نے میرے بیٹے کا جو حشر کیا ہے دل چاہتا ہے تمہارا اس سے بھی برا حشر کروں لیکن میں قانون پسند انسان ہوں۔"

"چوہدری صاحب۔ آپ ایک بار میری بات سن لیں۔" میں نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ "پھر آپ ——"

"خاموش۔" چوہدری باسط بھڑکا۔ اس نے میری بات مکمل نہ ہونے دی۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ چوہدری باسط تو اپنے بیٹے کے متعلق کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھا۔

"چوہدری صاحب، آپ کو میری بات سننی ہوگی۔" میں کہاں چپ رہنے والا تھا۔ "میں آپ کو آپ کے بیٹے کے کرتوتوں کے بارے میں بتاتا ہوں کہ آپ کا بیٹا کیا کرتا ہے۔ اسی نے ہی میری بہن کو اغوا کیا تھا۔ اس نے خود اعتراف کیا ہے۔"

لیکن چوہدری باسط نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید وہ دونوں باپ بیٹا وہاں سے چلے گئے تھے۔ میں نے دروازے سے کان لگا کر سن گن لینے کی کوشش کی لیکن دوسری طرف اب خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔

"چوہدری صاحب۔" میرے پکارنے پر کوئی جواب موصول نہ ہوا۔

"چوہدری صاحب۔ میری بات سنیں۔" میں نے پھر چوہدری باسط کو آواز دی لیکن ہنوز خاموشی طاری تھی۔ میں نے زور زور سے دروازہ بجانا شروع کر دیا لیکن کوئی رسپونس نہ ملا تو میں نے سیل فون نکال کر اسے آن کرنے والا بٹن پریس کر دیا لیکن کئی لمحے گزر گئے سیل فون آن نہ ہوا۔ شاید بیٹری ختم ہو گئی تھی اس لیے فون آن نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے جھنجلاتے ہوئے فون واپس پتلون کی جیب میں رکھا اور پھر دروازہ بجانے لگا۔ ساتھ ہی میں نے چوہدری باسط کو آوازیں بھی دینا شروع کر دیں لیکن مجال ہے چوہدری باسط نے دروازہ کھولا ہو یا کوئی جواب دیا ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد مجھے چوکیداروں کی آوازیں سنائی دیں تو میں سمجھ گیا کہ پولیس پہنچ گئی ہے۔ چند لمحوں میں میرا شبہ درست نکلا۔ دروازہ کھلا تو میں نے دیکھا کہ میرے سامنے چار پولیس کانسٹیبل موجود تھے۔ ان کے پیچھے چوہدری باسط، شانی اور ان کے گارڈز بھی کھڑے ہوئے تھے۔ چوہدری باسط غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ اس کی انگارہ آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں جیسے وہ مجھے آنکھوں سے جلا کر بھسم کر دے گا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ بھوکے بھیڑیے کی مانند مجھ پر جھپٹ

تا اور مجھے چیر پھاڑ کر رکھ دیتا۔ یہی حال اس کے گارڈز کا بھی تھا۔ وہ بھی مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر دو کانسٹیبلوں نے آگے بڑھ کر مجھے قابو کیا۔ میں نے مزاحمت نہیں کی کیونکہ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ وہ مجھے کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لائے تو چوہدری باسط نے رکنے کا اشارہ دیا وہ کچھ کہتا کہ میں نے کہا۔ "چوہدری صاحب۔ آپ پہلے میری بات سنیں۔"

"کیا سنوں؟" چوہدری باسط کا لہجہ تیکھا تھا۔

"میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کے بیٹے شانی نے ہی میری بہن کو اغوا کیا ہے۔ اس نے اسے چوہدری ساجد کو بیچ دیا ہے۔ پوچھیں اس سے۔"

"بکواس بند کرو بدبخت۔" چوہدری باسط گرجا۔ "میرا بیٹا ایسا نہیں کرسکتا۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"خاموش۔" چوہدری باسط گرجا۔

"اس نے خود اعتراف کیا ہے۔ آپ اس سے پوچھیں یہ آپ کو بتائے گا۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ پھر میں نے شانی کی طرف دیکھا۔ "شانی اپنا ڈیڈ بابا کو۔"

"مجھ پر الزام لگاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔" شانی نے زہرخند لہجے میں کہا پھر وہ چوہدری باسط سے مخاطب ہوا۔ "بابا! یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ آپ اس کی بات کا یقین نہ کریں۔"

"میں جانتا ہوں بیٹا۔" چوہدری باسط مکاری سے بولا۔ "یہ جھوٹ بول رہا ہے۔"

شانی کے جھوٹ بولنے پر مجھے کوئی حیرانی نہ تھی البتہ میں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا تھا۔ چوہدری باسط بھی میری بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے اپنے بیٹے پر اندھا اعتماد ہے۔ ظاہر ہے وہ اس کا بیٹا تھا، اس کا خون تھا۔ وہ اسی پر اعتماد کرے گا۔

"چوہدری صاحب۔ یہ مکر رہا ہے۔ اس نے اعتراف کیا ہے کہ اس نے میری بہن کو اغوا کر کے چوہدری ساجد کو فروخت کیا ہے۔ آپ کو یقین کرنا ہوگا چوہدری صاحب۔" میں نے ملتجیانہ انداز میں کہا لیکن چوہدری باسط میری بات سننے پر تیار ہی نہیں تھا۔

"میرا بیٹا جھوٹ نہیں بولتا۔"

"یعنی میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" میں نے تنگ کر کہا۔

"ہاں۔" چوہدری باسط نے کہا۔ "تم یہاں جس مقصد سے آئے تھے تمہیں اس کی سزا تو ضرور ملے گی۔"

"میں سمجھ گیا ہوں۔ آپ بھی اپنے بیٹے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔" میں نے چیخ کر کہا تو چوہدری باسط کا غصہ عروج پر پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے ساتھ کچھ کرتا اسی لمحے ایک کانسٹیبل نے جارحانہ لہجے میں کہا۔

"اے۔ خاموش ہو جاؤ اب۔ بہت سن لی تمہاری بکواس۔"

"جناب! یہ بکواس نہیں سچ ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کو انصاف کا ساتھ دینا چاہیے۔ شانی نے میری بہن کو اغوا کیا ہے۔ اس نے خود اعتراف......"

"تو بہت بولتا ہے۔" کانسٹیبل نے میری بات قطع کرتے ہوئے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔ "اب زیادہ بکواس کی تو میں زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔ چوہدری صاحب کہہ تو رہے ہیں کہ ان کے بیٹے نے تمہاری بہن کو اغوا نہیں کیا پھر تم کیوں بضد ہو۔"

میرے بولنے سے پہلے ہی چوہدری باسط نے کہا۔ "اسے تھانے لے چلو۔ میں ایس ایچ او صاحب سے بات کرتا ہوں۔ اسے سخت سے سخت سزا ملنی چاہیے۔"

دونوں کانسٹیبل مجھے گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے جانے لگے۔ میں نے کافی منت سماجت کی لیکن کسی نے بھی میری بات نہ سنی۔ پولیس کانسٹیبل مجھے کھینچتے ہوئے کوٹھی سے باہر لے آئے اور اٹھا کر ڈالے میں یوں پھینک دیا جیسے میں گوشت پوست کا انسان نہیں پلاسٹک کا گڈا ہوں۔ پھر پولیس اہلکاروں کے بیٹھتے ہی ڈالہ تھانے کی طرف بڑھ گیا۔ ایک پولیس اہلکار نے مجھے کالر سے پکڑ کر سیٹ پر بٹھا دیا تھا۔ میرے دماغ میں لاوا سا پک رہا تھا۔ مجھے شانی پر بے کم و کاست غصہ آ رہا تھا جو اپنی باتوں سے مکر گیا تھا اور مجھے مورد الزام ٹھہرا دیا تھا۔

بیس منٹ کے بعد ڈالہ تھانے میں داخل ہوا۔ چوہدری باسط بھی اپنے گارڈوں اور شانی کے ساتھ تھانے میں موجود تھا۔ ڈالے کے رکتے ہی انہی کانسٹیبلوں نے مجھے انتہائی تذلیل کے ساتھ اتارا اور گھسیٹتے ہوئے حوالات کی طرف لے جانے لگے۔ چوہدری باسط اور شانی بھی طمطراق سے چلتے ہوئے ایس ایچ او کے کمرے میں داخل ہو گئے جبکہ ان کے گارڈز تھانے کی پارکنگ میں پجارو کے پاس کھڑے ہو گئے تھے۔ دونوں کانسٹیبل مجھے حوالات کے پاس لے آئے اور وہاں پہلے سے موجود ایک کانسٹیبل اپنی پتلون کی جیب سے چابی نکال کر حوالات کا تالا کھولنے لگا۔

"جناب! میری بات سنیں۔ میں چور نہیں ہوں۔" میں نے کانسٹیبلوں سے مخاطب ہو کر منت سماجت والے انداز میں کہا۔

"خاموش رہو۔ جو بھی کہنا ایس ایچ او صاحب کے سامنے ہی کہنا۔" ایک کانسٹیبل نے تحکمانہ لہجے میں جواب دیا۔

"تو پھر مجھے ایس ایچ او کے پاس لے چلیں۔ حوالات میں کیوں بند کر رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"کیا تو کوئی بہت وڈا افسر ہے کہ تجھے حوالات میں بند کرنے کی بجائے ایس ایچ او کے سامنے پیش کر دیں۔" دوسرے کانسٹیبل نے جھڑک دیا پھر اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔

"شوکے اس کی زبان قینچی کی طرح تیز تیز چلتی ہے۔"

"ہاں بشیر۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" کانسٹیبل شوکے نے تائیدی انداز میں جواب دیا۔

"دیکھو اوئے اب اگر بولے تو میں زبان کاٹ دوں گا۔" کانسٹیبل بشیر نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ پھر اس کے اشارے پر اس کے ساتھی نے مجھے بازو سے پکڑ کر حوالات میں دھکیلا اور تیسرا کانسٹیبل تالا لگانے لگا۔

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ میں تو شانی کو تھانے لے کر آ رہا تھا لیکن اس نے مجھے یہاں پہنچا دیا تھا۔ شور مچانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا اس لیے میں مڑا اور بوجھل قدموں سے چلتا ہوا چٹائی پر جا کر بیٹھ گیا۔ حوالات میں آٹھ قیدی اور بھی موجود تھے۔ ان کی عمریں بالترتیب بیس سے تیس سال کے لگ بھگ تھیں۔ کچھ قیدی تو شکل و صورت سے جرائم پیشہ ہی دکھائی دیتے تھے لیکن ان میں ایک نوجوان معصوم اور سیدھا سادا سا دکھائی دیتا تھا۔ وہ کونے میں الگ تھلگ بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے سرسری نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر میں نے اپنے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس وقت مجھے صرف اپنی پرواہ تھی اس لیے میں نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی اور گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ چوہدری باسط اور شانی وہاں آ گئے۔ ان دونوں کے چہروں پر مکروہ مسکراہٹیں تھیں جیسے وہ مجھے حوالات میں دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں۔ انہیں دیکھتے ہی میرے چہرے پر غم و غصے کے تاثرات ابھر آئے۔ میں تیزی سے اٹھ کر سلاخوں کے پاس آ گیا۔

"شانی! یاد رکھنا، میں تمہیں اس کی سزا ضرور دوں گا۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا تو چوہدری باسط کے چہرے پر غصے کے تاثرات ابھر آئے۔

"اپنی اوقات مت بھولو۔" شانی کی بجائے چوہدری باسط نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔ "تم جانتے نہیں ہو کہ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ اب مزہ جیل میں، دیکھتا ہوں تمہاری کون ضمانت کراتا ہے۔"

"اللہ نے چاہا تو میں جیل سے باہر آ جاؤں گا۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "کیونکہ اللہ جانتا ہے کہ میرا دامن صاف ہے اور وہ مجھے ضرور انصاف دے گا۔ وہ دن آئے گا جب تم اور تم جیسے سیاہ چہرے والے نیست و نابود ہو جائیں گے۔"

میں نے احترام کی ساری حدیں بالائے طاق رکھ دی تھیں۔ میرے دل میں چوہدری باسط کے حوالے سے جو احترام، عزت اور خلوص تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اسے آپ کی بجائے تم کہہ کر پکارا تھا۔ میری بات نے چوہدری باسط کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہذیان بکتا ہوا میری طرف بڑھا اور سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر میری گردن پکڑنے کی کوشش کی لیکن میں بروقت پیچھے ہٹ گیا تھا۔ شانی نے آگے بڑھ کر چوہدری باسط کو پکڑ لیا۔

"بابا! اگنور کریں اسے۔" وہ چوہدری باسط کو کاندھوں سے تھامتے ہوئے بولا۔ "کیوں اپنا خون جلا رہے ہیں۔"

"میں اس کا خون پی جاؤں گا۔" چوہدری باسط ہذیانی انداز میں بولا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو جیل میں موجود قیدی بھی اٹھ کر میرے قریب کھڑے حیرت اور دلچسپ نظروں سے ہمارے درمیان ہونے والی تلخ کلامی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"کیوں، تم پاگل ہو گئے ہو۔" میں نے چوہدری باسط کو طیش دلاتے ہوئے کہا۔ "میرا خون کڑوا ہے، پی کر مر جاؤ گے۔"

میری بات پر قیدی بے ساختہ ہنس پڑے البتہ چوہدری باسط کا غصہ تو حدوں کو چھونے لگا۔ اس کا انداز دیدنی تھا۔ وہ بے بس دکھائی دے رہا تھا۔ اگر میں جیل سے باہر ہوتا تو شاید اس نے واقعی میری تکہ بوٹی کر دینی تھی۔ اس کی زبان نے نان اسٹاپ ہذیان بکنا شروع کر دی تھی۔ مجھے لاتعداد دھمکیاں دیں لیکن میں اس کی دھمکیوں سے نہیں ڈرا تھا۔ شور کی آوازیں سن کر کانسٹیبل وہاں آ گئے تھے اور چوہدری باسط کو سمجھاتے ہوئے وہاں سے لے گئے جبکہ میں ہنکارہ بھرتے ہوئے چٹائی پر بیٹھ گیا۔

"کون تھا یہ؟" ایک قیدی نے مجھ سے پوچھا۔ وہ سب بھی میرے اردگرد ایسے جمع ہو کر بیٹھ گئے جیسے میں مداری ہوں

اور انہیں تماشا دکھانے لگا ہوں۔

"خود کو طرم خان سمجھنے والا چوہدری باسط۔" میں نے غصیلے بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"اس سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟" ایک اور قیدی نے پوچھا تو میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انہیں بتایا کہ چوہدری باسط اور اس کے بیٹے شانی کا تعلق لڑکیوں کی اسمگلنگ کرنے والے ایک بین الاقوامی گروہ سے ہے۔ اس کے بیٹے نے میری بہن کو اغوا کیا ہے۔ اس نے میری بہن کو اغوا کرنے کا اعتراف بھی کر لیا ہے لیکن بڑے باپ کا بیٹا ہے ناں اس لیے پولیس میری بات سننے پر تیار نہیں ہے۔

میری بات سن کر ان سب قیدیوں نے مجھ سے افسوس کا اظہار کیا۔ اسی طرح باتیں کرتے ہوئے رات ہو گئی۔ ہمیں کھانے میں دال اور روٹی دی گئی۔ ہم سب کھانا کھا کر ادھر اُدھر پھیل کر لیٹ گئے۔ وہ بدبودار اور میلے کچیلے کمبل تھے۔ مجھے تو کمبل خود پر لیتے ہوئے کراہیت ہو رہی تھی لیکن بحالتِ مجبوری اسے خود پر لینا پڑا۔ جیل کا کمرا قدرے بڑا تھا اور وہاں قیدیوں کی تعداد بھی کم تھی اس لیے ہمیں لیٹنے میں مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

مجھے اپنے گھر والوں کی بھی پریشانی ہو رہی تھی۔ کسی سے رابطے کا ذریعہ بھی نہیں تھا۔ پولیس والوں سے بھی مجھے کوئی اُمید نہیں تھی کہ وہ فاروق یا مریم سے میری بات کرا دیتے لہٰذا خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑتے ہوئے میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆......☆

ایس ایچ او کی آمد صبح نو بجے ہوئی تھی۔ اس کا نام اللہ بخش تھا۔ وہ بھی ارشد وڑائچ کی طرح پکی عمر کا تھا اور اپنی وضع قطع سے انتہائی سخت مزاج اور رعب و دبدبے والا دکھائی دیتا تھا۔ سب سے پہلے مجھے اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ کانسٹیبل بشیر اور شوکت مجھے ایس ایچ او اللہ بخش کے سامنے لے آئے تھے۔ میں نے ایس ایچ او اللہ بخش صاحب کو سلام کیا لیکن انہوں نے میرے سلام کا جواب تو نہ دیا البتہ جائزانہ نظروں سے میرا جائزہ لینے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"جی...... علی۔"

"پورا نام بتاؤ۔"

"علی حسن۔"

"والد کا نام؟"

"حسن نواز۔"

"ہوں تو۔ کس جرم میں آئے ہو؟"

میں کہنا ہی چاہتا تھا کہ کانسٹیبل بشیر مجھ سے پہلے ہی بول پڑا۔

"جناب! یہ وہی مجرم ہے جس کے بارے میں چوہدری باسط صاحب نے آپ سے بات کی تھی۔"

ایس ایچ او اللہ بخش صاحب ٹھٹک گئے۔

"اچھا۔ تو یہ وہی نوجوان ہے جس نے چوہدری صاحب کے بیٹے پر گھناؤنا الزام لگایا ہے۔"

"جی جناب۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "جناب! میرا الزام سچ ہے۔ شانی نے میری بہن کو اغوا کیا ہے اور اسے کسی چوہدری ساجد نامی آدمی کو فروخت کر دیا ہے۔ شانی نے خود اعتراف کیا ہے۔ آپ اس سے......"

اللہ بخش صاحب نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو میں بولتے بولتے رک گیا اور استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"جانتے ہو کسی پر گھناؤنا الزام لگانا کتنا بڑا جرم ہے؟"

"جی جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں الزام نہیں لگا رہا۔ یہ سچ ہے۔"

"کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے؟"

"ثبوت......" میں نے ہونٹ بھینچے اور پھر کہا۔ "نہیں۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن اگر آپ شانی سے پوچھ گچھ......"

"بغیر ثبوت کے میں کوئی کارروائی نہیں کرتا۔" اللہ بخش میری بات قطع کر کے بولے۔ "چونکہ تم نے ان کے گھر میں داخل ہو کر شانی پر تشدد کیا ہے اور ان کے گھر سے پانچ لاکھ روپے چوری کیے ہیں اس لیے اس کی تمہیں سزا ضرور ملے گی۔"

اپنے بارے میں یہ الزام سن کر میں انگشت بدنداں رہ گیا۔ میں نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا لیکن اللہ بخش صاحب تو میری بات سننے پر ہی تیار نہیں تھے۔ انہوں نے کانسٹیبل بشیر اور شوکت کو حکم دیا کہ مجھے ٹارچ سیل میں لے جا کر باندھ دیں تاکہ مجھ سے پانچ لاکھ روپے برآمد کرائے جا سکیں۔ میں نے احتجاج کرنا چاہا لیکن اللہ بخش صاحب نے میری کوئی بات نہ سنی اور مجھے ٹارچ سیل میں لے جا کر کرسی کے ساتھ باندھ دیا گیا۔

میں بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ ایسا سب کچھ چوہدری باسط کے ایماء پر کیا جا رہا تھا۔ اللہ بخش صاحب ٹارچ سیل میں لے گئے اور مجھ پر تشدد کی انتہا کر دی۔ وہ مجھ سے ناکردہ گناہ کا اعتراف کرانا چاہتے تھے جو میں نے کیا ہی نہیں تھا۔ تشدد کے باوجود جب میں نے "اعتراف جرم" نہ کیا تو اللہ بخش صاحب کی حالت دیدنی ہو گئی تھی۔ شاید انہیں یہی گمان تھا کہ میں تشدد سے اپنے ناکردہ گناہ کا اعتراف کر لوں گا۔

مجھے تین روز حوالات میں رکھا گیا اور مجھ پر خوب تشدد کیا گیا لیکن میں نے کسی ناکردہ گناہ کا اعتراف نہ کیا کیونکہ میں حق پر تھا۔ اگر میں اعتراف کر لیتا تو قصوروار کہلاتا۔ تشدد سے میرے چہرے، کمر اور پیروں پر نیل پڑ گئے تھے جس کی وجہ سے مجھ میں چلنے کی زیادہ سکت نہیں تھی۔

تشدد کے بعد مجھے ایک الگ حوالات میں پہنچا دیا جاتا تھا جہاں میرے علاوہ اور کوئی قیدی نہیں ہوتا تھا۔ بھوکا اور پیاسا الگ رکھا جا رہا تھا لیکن میں نے نہ ہمت ہاری تھی اور نہ ہی میرا حوصلہ پست ہوا تھا بلکہ میرے اعصاب پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو گئے تھے۔

چوتھے اور پانچویں روز مجھ پر تشدد نہ کیا گیا اور نہ ہی میری حالت دیکھنے کوئی حوالات میں آیا البتہ چھٹے روز مجھے حوالات سے نکال کر ایس ایچ او اللہ بخش کے سامنے پیش کیا گیا تو میری حالت دیکھ کر ان کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

"کیا تمہاری طبیعت سیٹ ہو گئی ہے؟" اللہ بخش صاحب نے طنزاً پوچھا۔

"آپ کے سامنے موجود ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

میں نے دیکھا، اللہ بخش صاحب نے ہونٹ بھینچ لیے تھے پھر وہ بولے۔ "ویسے تم خاصے ڈھیٹ واقع ہوئے ہو۔"

"تمہاری جوانی پر ترس کھا کر میں نے چوہدری صاحب سے بات کی ہے۔ ایف آئی آر درج نہیں کی تھی اس لیے میری بات کان کھول کر سن لو۔ میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں لیکن اس شرط پر کہ آئندہ تم چوہدری باسط صاحب یا ان کے بیٹے شانی کے اردگرد نظر نہیں آؤ گے۔"

میں خاموش رہا تو انہوں نے ایک پیپر اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس پر دستخط کر دو۔"

"یہ کیا ہے؟" میں نے پیپر لیتے ہوئے کہا۔

"پڑھ لو۔" اللہ بخش نخوت سے بولے۔

میں نے پیپر پر لکھی عبارت پڑھنی شروع کی۔ بلاشبہ وہ "حلفیہ نامہ" تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ میں آئندہ چوہدری باسط یا اس کے بیٹے شانی کے اردگرد نظر نہیں آؤں گا اور نہ ہی میں انہیں کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ اگر میں نے ایسا کیا یا میں ان کے گھر کے آس پاس دکھائی دیا تو مجھ پر دہشت گردی کا ایکٹ لاگو کیا جائے۔

عبارت پڑھنے کے بعد میں نے اللہ بخش صاحب سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور پیپر پر دستخط کر دیئے۔ اللہ بخش صاحب نے پیپر لینے کے بعد بغور اس کا جائزہ لیا پھر مجھے تھانے سے جانے کی اجازت دے دی۔ مجھے میرا سیل فون بھی دے دیا گیا۔

میں نے اللہ بخش صاحب کو سلام کیا اور تھانے سے نکل کر آہستہ آہستہ پیدل چلتا ہوا اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ پیدل چلنے سے پیروں میں ٹیسیں اٹھتی تھیں لیکن میرے پاس پیسے نہیں تھے کہ میں آٹو رکشے میں سوار ہو کر گھر جاتا۔ فون کی بیٹری ڈیڈ تھی اس لیے کسی کو کال نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اپنی موٹر بائیک کی بھی فکر تھی۔ میری موٹر بائیک اسی کالونی میں رہ گئی تھی جہاں شانی کی کوٹھی تھی اور میں اس کے تعاقب میں گیا تھا۔ نجانے میری موٹر بائیک وہاں موجود بھی تھی یا چوری ہو گئی تھی۔

میں ابھی تھوڑی ہی دور پہنچا تھا کہ مجھے سامنے سے فاروق بائیک پر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا اس لیے اس نے موٹر بائیک میرے قریب آ کر روک دی۔ وہ قدرے خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔ بائیک سے اتر کر وہ تیزی سے میری طرف بڑھا۔

"بھائی! تم اتنے دنوں سے کہاں تھے...... اور...... یہ تمہاری بری حالت کس نے کی ہے...... تمہاری...... موٹر بائیک کہاں ہے؟" اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"باقی سوالات بعد میں پہلے یہ بتاؤ تم ادھر کیسے آ نکلے؟"

"اتفاق کہہ لو، میں ایک ذاتی کام سے نکلا تھا ورنہ اس روڈ پر کم کم ہی آتا ہوں۔"

"چہرے سے بھوکے لگ رہے ہو چلو پہلے ناشتا کرتے ہیں۔" وہ مجھے ساتھ لیے سامنے والے چائے خانے کی جانب بڑھا۔ وہاں ایک کرسی پر خود کو تقریباً گرا کر بولا۔ "جلدی سے کچھ منگواؤ واقعی میں بھوکا ہوں۔"

اس نے آملیٹ اور پراٹھے منگوائے۔ پیٹ بھرنے کے بعد میں نے اسے مختصراً بتا دیا کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں اور میرا یہ حال کس نے کیا ہے۔ چونکہ میرے پیروں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اس لیے میں نے فاروق سے درخواست کی کہ وہ

مجھے جلد از جلد گھر لے جائے چنانچہ اس نے مجھے بائیک پر بٹھایا اور ہم گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ فاروق پڑوسی ہی نہیں بچپن کا دوست بھی تھا۔

گھر پہنچے تو میں نے مرینہ کو فکر مند پایا۔ میری ایسی حالت دیکھ کر وہ بھی نہ صرف پریشان ہو گئی تھی بلکہ اس نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ مجھے کچھ نہیں ہوا لیکن وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ اس کے پوچھنے پر فاروق نے اسے وہی بتایا جو میں نے اسے بتایا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے فاروق کو اپنی موٹر بائیک پتا کرنے کے لیے بھیج دیا۔ مجھے اپنی موٹر بائیک کی بہت فکر ہو رہی تھی۔ مرینہ میرے لیے جلدی سے سوپ بنا لائی۔ سوپ پینے سے مجھے راحت محسوس ہوئی۔ مجھے امی کی بھی فکر ہو رہی تھی۔ میرے پوچھنے پر مرینہ نے بتایا کہ امی کی طبیعت بدستور ویسی ہی ہے۔ فاروق ڈاکٹر کو لے آیا تھا جس نے دوائی تجویز کر دی تھی اور امی کو وہی دوائیاں استعمال کرائی جا رہی تھیں۔ جس سے وہ پُرسکون رہتی تھیں اور زیادہ تر سوتی رہتی تھیں۔

مرینہ کے بقول فاروق کے گھر والے بھی آتے رہے تھے۔ وہ بھی میری گمشدگی پر بے حد پریشان تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد فاروق آ گیا۔ اس نے بتایا کہ میری موٹر بائیک مطلوبہ جگہ پر موجود نہیں تھی۔ قرب و جوار کے لوگوں سے بھی پوچھا تھا لیکن سب نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ جب مرینہ میرے کمرے سے باہر چلی گئی تو میں نے فاروق کو شائستہ سے ہونے والی بات چیت دُہرا دی۔ وہ اچانک ہی تشویش میں مبتلا دکھائی دینے لگا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"علی بھائی۔ مجھے لگتا ہے روزینہ کو....." فاروق کہتے کہتے رکا تو میں بھی ٹھٹک گیا۔

"کیا روزینہ کو.....؟"

"بھائی! شائستہ نے تمہیں بتایا تھا کہ شاید چوہدری ساجد نے روزینہ کو امریکا یا لندن بھجوا دیا ہوگا۔ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں روزینہ بہن کو دوسرے ملک نہ بھیج دیا گیا ہو۔" میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے ان باتوں کا اندازہ تھا۔ فاروق نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تم جانتے ہو کہ یورپ میں پورنوگرافی عام ہے بلکہ وہ انڈسٹری کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ کچھ لڑکیاں بخوشی یہ پیشہ اختیار کرتی ہیں اور کچھ لڑکیوں کو اسمگل کر کے زبردستی ایسے کام کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں میں نے نیوز پیپر میں ایک خبر بھی پڑھی تھی کہ دنیا بھر میں پورنوگرافی کا وسیع نیٹ ورک پھیلا ہوا ہے اور مختلف ممالک سے لڑکیاں اغوا کر کے پورنوگرافی کے لیے یورپ اسمگل کی جاتی ہیں پھر ان کی لائیو ویڈیو ڈیپ ویب پر اپ لوڈ کر دی جاتی ہے..... اللہ کرے ایسا نہ ہوا ہو اور روزینہ بہن محفوظ ہو۔"

پورنوگرافی کے بارے میں، میں بھی کافی حد تک جانتا تھا اور فاروق کی بات سن کر تو میرے جسم میں سنسناہٹ کی لہریں دوڑنا شروع ہو گئی تھیں۔ ایک اخبار نے تو یہاں تک لکھا تھا کہ پاکستان کے مختلف شہروں میں بھی ایسا مکروہ کام کرنے والوں کا نیٹ ورک پھیلا ہوا ہے جسے انتہائی خفیہ طریقے سے چلایا جا رہا ہے۔ جن لڑکیوں کو اغوا کیا جاتا تھا ان کی ویڈیو بنا کر انٹرنیٹ کی ڈیپ ویب پر اپ لوڈ کر دی جاتی ہے۔ یہ سوچ کر ہی میرے اندر تھرتھراہٹ ہونے لگی تھی کہ اگر روزینہ کی بھی ویڈیو بنا کر انٹرنیٹ پر وائرل کر دی گئی تو.....

اس سے آگے میں سوچ بھی نہ سکا بلکہ اندر تک کانپ کر رہ گیا۔ یہ کام کرنے والے معاشرے کا ناسور ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو نہ ہی اللہ کا خوف ہوتا ہے اور نہ اپنی اور دوسروں کی عزت کی پاسداری کا خیال ہوتا ہے۔

میں نے فاروق سے کہا۔ "ہمیں جلد از جلد روزینہ کو تلاش کرنا ہوگا۔"

"اگر وہ پاکستان میں ہوئی تو ہم ضرور اسے تلاش کر لیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چوہدری ساجد نے اسے کسی دوسرے ملک نہ بھیجا ہو اور شائستہ نے تمہیں بھٹکانے کے لیے یہ بات کی ہو۔"

"اللہ کرے روزینہ پاکستان میں ہو اور محفوظ ہو۔" میں نے صدقِ دل سے کہا۔

"اگر تم کہو تو میں فحاشی کے اڈوں پر چیک کروں۔" فاروق نے اجازت طلب لہجے میں پوچھا۔ "ہو سکتا ہے کہ چوہدری ساجد نے اسے فحاشی کے کسی اڈے پر فروخت کر دیا ہو۔"

"ہونہہ۔" میں نے ہنکارا بھرا۔ کافی دیر ڈسکشن کے بعد یہی طے پایا کہ فاروق پہلے ملتان میں فحاشی کے اڈوں پر روزینہ کو تلاش کرے گا۔ اگر وہ ملتان کے کسی اڈے پر موجود نہ ہوئی تو پھر ہم لاہور جائیں گے۔ میں نے اسے روزینہ کی تصویر دے دی تھی۔

فاروق نے ملتان کے تمام فحاشی کے اڈوں پر روزینہ کی تلاش شروع کر دی تھی۔ میرے پاس جتنے پیسے تھے وہ بھی ختم

ہوتے جا رہے تھے۔ گھر کا راشن بھی چند روز کا تھا یہ الگ پریشانی تھی۔ اگر کسی سے ادھار بھی لیتا تو کس سے لیتا؟ کون مجھے ادھار دیتا۔ اس مہینے کی سیلری تو مل گئی تھی لیکن اگلے مہینے کی سیلری کا کوئی پتا نہیں تھا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میری خود کی حالت بہتر نہ تھی۔ میں امی اور بہن کو اکیلا چھوڑ کر میانوالی سرکس میں جا نہیں سکتا تھا اور امی کی حالت کے پیشِ نظر ان کو وہاں لے کر جا بھی نہیں سکتا تھا۔

سوچتے سوچتے میرے ذہن میں اسماعیل شاہد کا نام آیا۔ وہی مجھے ادھار دے سکتے تھے چنانچہ میں نے روبہ صحت ہونے کے بعد ان سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ دو دن کے بعد میری حالت قدرے بہتر ہو گئی تھی اور میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ پھر میں نے اپنے باس اسماعیل شاہد کو کال کی۔ سلام و دعا کے بعد انہوں نے پوچھا۔ "تمہاری بہن کا کچھ پتا چلا؟"

"نہیں سر۔" میں نے کہا۔ "پولیس اسے تلاش کر رہی ہے۔"

"ہونہہ۔"

"سر اصل۔۔۔ دراصل۔" میں کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں بولو۔ کیا بات کرنی ہے؟" وہ بولے۔

"سر مجھے کچھ پیسے ادھار چاہئیں۔" میں نے بالآخر کہہ دیا۔ "دراصل۔۔۔"

"ہونہہ۔۔۔ کتنے؟"

"یہی کوئی تیس ہزار۔"

"ہونہہ۔" اسماعیل شاہد نے کہا۔ "میں ان دنوں شہر سے باہر ہوں۔ تم میرے گھر چلے جاؤ۔ چوکیدار تمہیں پیسے دے دے گا۔ میں گھر کہہ دیتا ہوں۔"

"بہت شکریہ سر۔" میں نے ممنون لہجے میں کہا۔ "میں جاب پر واپس آتے ہی آپ کے پیسے تھوڑے تھوڑے کر کے اتار دوں گا۔"

"کوئی بات نہیں۔" اسماعیل شاہد نے کہا۔ "اوکے، میں بزی ہوں، بعد میں بات کرتے ہیں۔"

میں نے سیل فون جیب میں ڈالا اور سرینہ کو دروازہ بند کرنے کا کہہ کر اسماعیل شاہد کی کوٹھی پر جانے کے لیے رکشا لے لیا۔

انہوں نے اپنے گھر فون کر دیا تھا اس لیے میں نے جب گیٹ پر پہنچ کر بیل بجائی تو چوکیدار باہر آیا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے اپنی پتلون کی جیب سے ایک لفافہ نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور لفافہ جیب میں ڈال کر واپس گھر آ گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر لفافہ نکالا اور پیسے گنے تو وہ تیس ہزار کی بجائے پچاس ہزار روپے تھے۔

میں نے لفافہ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور کرسی پر بیٹھ کر ایک بار پھر روزینہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ نجانے وہ کہاں اور کس حال میں ہو گی۔ مجھے چوہدری ساجد تک پہنچنا تھا اور اس تک مجھے شانی ہی پہنچا سکتا تھا اور۔۔۔ یہی بات مجھے الجھن میں مبتلا کر دیتی تھی لیکن مجھے ہر حالت اور ہر صورت میں چوہدری ساجد تک پہنچنا تھا۔

☆.....☆

میں نے گھر میں ایک مہینے کا راشن ڈلوا دیا تھا۔ بجلی، گیس اور پانی کے بل بھی بھر دیئے تھے۔ جو جو ضروری چیزیں چاہیے تھیں وہ سب لے دی تھیں۔ شہر میں ساجد نام کے ایک ہزار سے زائد افراد موجود تھے۔ ان میں کئی ایسے بھی تھے جن کے نام کے ساتھ چوہدری بھی لگتا تھا۔ اب مجھے کیسے پتا چلتا کہ ان میں "چوہدری ساجد" کون سا شخص ہے جس کے ہاتھوں شانی نے میری بہن کو فروخت کیا ہے۔ یہ شانی ہی بتا سکتا تھا۔

فاروق کا ایک دوست ملتان کے فاشی اڈے سے متصل علاقے میں دکان چلاتا تھا۔ اس کی مدد سے اس نے تمام فاشی کے اڈوں پر روزینہ کے بارے میں معلومات لی تھیں لیکن سب نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ پھر ہم نے یہ طے کیا کہ ہم دونوں لاہور جا کر ہیرا منڈی میں روزینہ کو تلاش کریں گے چنانچہ اگلے روز ہم ٹرین کے ذریعے لاہور پہنچ گئے۔

لاہور بس اڈے سے ہم سیدھا ہیرا منڈی پہنچے۔ فاروق کا ایک واقف کار وہاں بھی مل گیا اس کی مدد سے ہم نے جتنے بھی فاشی کے اڈے تھے سب سے روزینہ کی تصویر دکھا کر اس کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن سب نے یہی بتایا تھا کہ اس نام اور شکل کی لڑکی یہاں فروخت کے لیے نہیں لائی گئی۔ چار دن کے بعد ہم خجل خوار ہو کر واپس ملتان آ گئے۔

میں پھر الجھ چکا تھا۔ کوئی راستہ، کوئی تدبیر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پولیس نے الگ مجھ سے تحریری بیان لکھوا لیا تھا کہ میں چوہدری باسط اور اس کے بیٹے شانی کے اردگرد دکھائی دیا تو وہ مجھے دہشت گردی ایکٹ کے تحت دھر لیں گے اور میری ضمانت بھی نہیں ہو گی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ چوہدری ساجد کے بارے میں شانی ہی جانتا تھا۔ میرے دماغ میں یہ خیال بھی آیا

کہ ہوسکتا ہے کہ چوہدری باسط بھی جانتا ہو۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس خفیہ طور پر میری نگرانی کرا رہی ہوگی اور میری ہر ہر نقل و حرکت نوٹ کر رہی ہوگی۔

میں روزینہ کی بازیابی کے سلسلے میں روزانہ تھانے کا چکر لگاتا تھا لیکن ہر بار یہی جواب ملتا کہ تلاش جاری ہے۔ دوسری طرف میں نے شانی کی تلاش میں فاروق کی ڈیوٹی لگائی ہوئی تھی۔ شانی کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ وہ تو ایسے غائب ہوا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ بعد میں مجھے شانی کے ایک دوست کے توسط سے معلوم ہوا تھا کہ چوہدری باسط نے اسے کچھ عرصے کے لیے لندن بھجوا دیا ہے۔ شاید اسے ڈر تھا کہ میں شانی پر دوبارہ حملہ کر سکتا ہوں۔ ایک روز میں تھانے سے ہو کر گھر کی طرف آ رہا تھا کہ راہ چلتے میری ملاقات بابر عرف جوکر سے ہوگئی۔

بابر عرف جوکر میرا کلاس فیلو تھا۔ وہ انتہائی فن کھ، باتونی نوجوان تھا۔ بات بات پر اس کی حس مزاح پھڑک اٹھتی تھی۔ اس کا دل نجانے کتنی لڑکیوں پر آیا تھا۔ اگر کوئی خوبصورت لڑکی دیکھتا تو وہ اسے دل دے بیٹھتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ کسی لڑکی نے اسے گھاس نہیں ڈالی۔ اس کے باوجود وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا تھا۔ اس کا تعلق وہاڑی کے ایک چک سے تھا اور وہ یہاں اپنے کسی حیدر نامی انکل کے پاس رہتا تھا۔ جب ہم کالج سے فری ہوئے تھے تو وہ واپس اپنے گاؤں چلا گیا تھا اور آج تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد میری اس سے ملاقات ہو رہی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

"ارے کیا تم علی ہی ہو ناں۔" وہ مجھے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولا تو میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

"ہاں، میں علی ہی ہوں، اور تم بابر عرف جوکر ہو۔"

"ارے علی۔" وہ چیختا ہوا مجھ سے گلے لگ گیا۔ اس کی خوشی دیدنی تھی جیسے اسے اس کی پسندیدہ چیز مل گئی ہو۔ میں بھی گرم جوشی سے ملا اور ہم نے ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا۔

"یار، ماشاء اللہ کافی بڑے ہو گئے ہو۔ مجھے یاد ہے جب میں بی اے کرنے کے بعد گاؤں جا رہا تھا تو تم شاید بارہ تیرہ سال کے بچے تھے۔" وہ اپنی عادت کے مطابق مجھے طائرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا تو نہ چاہتے ہوئے بھی میں ہنس دیا۔

"تمہاری عادت نہیں بدلی جوکر۔" میں نے کہا۔

"بدل بھی نہیں سکتی بلکہ میرے ساتھ ہی قبر میں جائے گی۔" وہ بولا تو میں ایک بار پھر ہنس دیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا پھر ہم ایک ہوٹل میں چلے گئے۔ چائے پینے کے ساتھ ساتھ باتیں کرنے لگے۔ اس نے بتایا کہ اس کے انکل نے اسے کسی ضروری کام کے سلسلے میں ملتان بلایا ہے۔ وہ کل ہی ملتان آیا تھا اور ہوسکتا ہے وہ مہینہ، ڈیڑھ مہینا یہاں رہے۔ میں نے اس سے اس کا سیل نمبر لے لیا اور اپنا اسے دے دیا۔ ہمیں باتیں کرتے ہوئے ایک گھنٹا ہو گیا تھا کہ اس کے انکل کا فون آ گیا اور وہ چلا گیا۔

اسی شام مغرب کے بعد میں اپنے گھر کے باہر ایک تھلے پر بیٹھا ہوا تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے سیل فون نکال کر اسکرین کی طرف دیکھا تو ایک انجانا سا نمبر جگمگا رہا تھا۔

"ہیلو۔" میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تم علی حسن بول رہے ہو۔" ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔

"ہاں۔ میں علی حسن بول رہا ہوں۔" میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔ "آپ....."

"میں تمہیں ایک ایڈریس بتا رہا ہوں۔" آواز آئی۔ "تمہاری بہن وہیں قید ہے۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ اس وقت چوہدری ساجد کے کارندے یہاں موجود نہیں ہیں تم فوراً پہنچو۔ یہ تمہارے پاس بہترین موقع ہے۔ تم اپنی بہن کو یہاں سے لے جا سکتے ہو۔ میں گیٹ کھول دوں گا تم اندر آ جانا۔" پھر اس نے مجھے ایک کالونی کی کوٹھی کا ایڈریس بتا دیا۔

"اوکے۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے لیکن فون بند ہو گیا تھا۔ میں نے نمبر ری ڈائل کیا لیکن اس نے نمبر بند کر دیا تھا۔ بات میری بہن کی تھی اس لیے میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ فون کرنے والا کون ہے۔ دوست ہے یا دشمن ہے لیکن یہ شانی کے باپ کی چال تو نہیں کہ وہ مجھے پھانسنے کے لیے چکر چلا رہا ہو لیکن اس وقت میرے دماغ پر روزینہ سوار تھی۔ میں کچھ سوچے سمجھے بغیر ہی مطلوبہ ایڈریس کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ شہر سے باہر ایک علاقے کا ایڈریس تھا جس کا نام شہزاد کالونی تھا۔ شہزاد کالونی میں پہنچنے تک مجھے دو گھنٹے لگے تھے۔ مطلوبہ کوٹھی بھی ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ دقت نہ ہوئی تھی۔

وہ ایک شاندار کوٹھی تھی۔ کوٹھی کے اندر لائٹس جلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں البتہ گیٹ پر تاریکی اور گہرے سناٹے کا

رات تھا۔ میں نے تاریکی میں بچ کر گیٹ کا جائزہ لیا تو فون کرنے والے کے مطابق واقعی گیٹ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا لیکن گیٹ کے ستون پر کسی کے نام کی پلیٹ موجود نہ تھی پھر بھی مجھے یقین تھا کہ یہ چوہدری ساجد کی کوٹھی ہے۔ چوہدری ساجد کا نام ذہن میں آتے ہی میری کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں اِکا دُکا ہی لوگ نظر آ رہے تھے۔ کوئی آ رہا تھا تو کوئی جا رہا تھا لیکن میرے اندازے کے مطابق کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی تھی چنانچہ میں تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھا اور پھر اندر داخل ہو کر گیٹ بند کرنے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

گیٹ کے دائیں طرف لان تھا جہاں گملے رکھے ہوئے تھے۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں لمبی لمبی جھاڑیاں بھی موجود تھیں جن کی بیلیں دیوار پر پھیلی ہوئی تھیں۔ لان میں پلاسٹک کی ایک میز اور اس کے گرد چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں لیکن مجھے وہاں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ سامنے ہی وسیع و عریض پورچ تھا جہاں کوئی کار موجود نہیں تھی۔ پورچ کے دائیں طرف ایک دروازہ تھا جو اندر کھلتا تھا۔

میں آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا پورچ والے دروازے کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں آہٹیں سنائی دیں۔ میں بے اختیار چونک کر مڑنے ہی لگا تھا کہ اچانک لان میں موجود جھاڑیوں سے دو بٹے کٹے آدمیوں نے نکل کر مجھے دبوچ لیا۔ میں نے خود کو ان کی گرفت سے چھڑانے کی تگ و دو کی لیکن وہ دونوں آدمی بے حد طاقتور تھے۔ وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے اندرونی کمرے کی طرف لے جانے لگے۔ شاید وہ میرے ہی انتظار میں تھے۔

"کون ہو تم۔" میں نے چیختے ہوئے پوچھا لیکن انہوں نے کوئی جواب نہ دیا اور مجھے گھسیٹتے ہوئے پورچ والے دروازے سے گزار کر ایک کمرے میں لے آئے۔

کمرے میں پہلے ہی دو آدمی موجود تھے جو جسامت میں لحیم شحیم اور سانڈوں کی طرح پلے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رسیاں تھیں۔ دبوچنے والوں نے مجھے زبردستی ایک کرسی پر بٹھایا اور رسیاں پکڑے آدمی مجھے کرسی سے باندھنے لگے۔ ان بٹے کٹے چار آدمیوں کی گرفت سے خود کو چھڑانا میرے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔

میں سخت غصے کا شکار تھا اور دل ہی دل میں اپنی بے وقوفی پر خود کو کوس رہا تھا۔ کسی نے ہمدرد بن کر مجھے فون کیا تھا اور میں بلا سوچے سمجھے یہاں آ کر جال میں پھنس گیا تھا۔ مجھے باندھنے کے بعد وہ تین آدمی تو کمرے سے باہر چلے گئے جبکہ ایک وہیں رہ گیا۔

"سنو! کیا میں چوہدری ساجد کے قبضے میں ہوں۔" میں نے اس آدمی سے مخاطب ہو کر کہا جو اپنی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکال رہا تھا، پھر جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک سیل فون تھا۔

"صبر کرو بیرو۔ جلد ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا۔" اس آدمی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اس آدمی نے سیل فون پر نمبر پنچ کیے اور پھر اسے کان سے لگا لیا۔ جیسے ہی اس کا رابطہ ہوا تو اس نے کہا۔

"چوہدری صاحب۔ شکار پنجرے میں قید ہو چکا ہے۔ اب مزید کیا حکم ہے۔"

وہ خاموشی سے دوسری طرف کی بات سننے لگا۔ پھر بولا۔

"ٹھیک ہے چوہدری صاحب۔ آپ بے فکر رہیں۔ یہ یہاں سے فرار نہیں ہو سکتا۔ ٹھیک ہے۔"

پھر اس نے فون بند کر کے اسے جیب میں ڈالا اور مڑ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

"سنو۔" میں نے اسے آواز دی لیکن اس نے میری بات ان سنی کر دی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی میں نے خود کو رسیوں سے چھڑانے کی تگ و دو شروع کر دی لیکن بدبخت سانڈوں نے اتنی مضبوطی کے ساتھ رسیاں باندھی تھیں کہ میں ہلنے جلنے سے بھی معذور ہو گیا تھا۔

کوئی چارہ نہ دیکھ کر میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ بیس بائی بیس سے زیادہ بڑا کمرا نہیں تھا۔ فرش پر ٹائلیں لگی ہوئی تھیں۔ چند کرسیوں اور ایک میز کے علاوہ... کوئی قابل ذکر چیز وہاں موجود نہیں تھی۔ دیواروں پر آف وائٹ کلر کیا گیا تھا جبکہ کھڑکی کے سامنے پھول دار پردہ لگا ہوا تھا۔ روشندان نہیں تھا۔

میں کتنی دیر اس کمرے میں بند رہا مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ چاروں آدمیوں میں سے کوئی ایک آدمی بھی دوبارہ اندر نہیں آیا تھا۔ وہ مطمئن تھے کہ میں رسیاں توڑ کر وہاں سے فرار نہیں ہو سکتا۔ مجھے باہر سے بھی کسی آدمی کے بولنے کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دیواروں کی ساخت بتا رہی تھی کہ وہ کمرا ساؤنڈ پروف ہے۔ اسی وجہ سے باہر کی آوازیں مجھے سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔

نجانے رات کے کتنے بج رہے تھے کہ اچانک کمرے کا

دروازہ کھلا اور دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ ایک تو وہی تھا جس نے سیل فون پر بات کی تھی۔ اندر آتے ہی وہ دونوں مجھ پر پل پڑے اور بے دردی سے مجھے پیٹنے لگے۔

"بغیر سوال جواب کیے، مجھ سے کچھ پوچھے وہ لوگ مجھ پر تشدد کیے جا رہے تھے۔ تکلیف کی شدت سے میری چیخیں اور کراہیں نکل رہی تھیں۔ میں انہیں روکنے کے لیے صرف زبان ہلا سکتا تھا اور وہ میں کر رہا تھا لیکن ان کے ہاتھ نہیں رک رہے تھے۔ ان کے بے رحمانہ تشدد سے میرے حواس مختل ہو گئے تھے۔ میرے منہ اور ناک سے خون نکل رہا تھا۔ آنکھیں سوج گئی تھیں۔

ان دونوں کے ظالمانہ تشدد سے بالآخر میں بے ہوش ہو گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے بے ہوش ہونے کے بعد بھی انہوں نے مجھ پر تشدد جاری رکھا تھا یا نہیں لیکن جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک کمرے میں بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور میرے دائیں طرف کرسی پر فاروق بیٹھا ہوا تھا۔ میرے چہرے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میری آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اس لیے وہ بمشکل کھل رہی تھیں۔ چہرے پر پٹیاں تھیں اس وجہ سے میں کمرے کا جائزہ بھی نہیں لے پا رہا تھا۔

"شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا ہے۔" فاروق اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔

"میں کہاں ہوں؟" میں نے نحیف و نزار آواز میں پوچھا۔

"تم اسپتال میں ہو۔"

اسپتال کا سنتے ہی میں بے اختیار چونک پڑا۔

"میں..... میں اسپتال میں..... کیوں ہوں۔" میں نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

"تم زخمی تھے۔ تمہیں کس نے زخمی کیا ہے؟" فاروق نے پوچھا۔

"چوہدری ساجد کے کارندوں نے۔"

"اوہ....." فاروق تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

"مجھے اسپتال کون لایا تھا؟"

فاروق نے کہا۔ "تم سڑک کی فٹ پاتھ پر دو لڑکیوں کو زخمی اور بے ہوش حالت میں ملے تھے۔ وہی تمہیں اپنی کار میں ڈال کر اسپتال لے آئی تھیں۔ چونکہ تمہارے پاس تمہارا سیل فون تھا اس لیے ایک لڑکی نے مرینہ کو فون کر کے تمہارے بارے میں بتایا تھا پھر مرینہ نے مجھے بتایا تو میں یہاں آ گیا۔"

فاروق کی بات سن کر میرے دماغ میں دھماکے ہونے لگے اور ساری بات مجھے یاد آ گئی۔ مجھے کسی چوہدری نے دھوکے سے اپنے ٹھکانے پر بلایا تھا اور اس کے کارندوں نے مجھ پر سبق سکھانے کے لیے تشدد کیا تھا۔ پھر انہوں نے مجھے اوارگوں کی طرح فٹ پاتھ پر پھینک دیا ہوگا۔ میں دل ہی دل میں ان لڑکیوں کا شکر ادا کرنے لگا جنہوں نے مجھے بروقت اسپتال پہنچایا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے کہ زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔" فاروق کہہ رہا تھا۔ "لیکن تم چوہدری کے ہتھے کیسے چڑھے..اور یہ کون سا چوہدری ہے کیونکہ تمہارے مقابل دو چوہدری ہیں۔"

"مجھے خود بھی سمجھ نہیں آ رہا کہ یہ کس کی چال ہے، چوہدری باسط کی یا چوہدری ساجد کی۔" میں نے جواب دیا۔

"چوہدری ساجد بھی ہو سکتا ہے کہ .... معلوم ہو گیا ہوگا کہ تم اسے تلاش کر رہے ہو اس لیے اس نے تمہیں سبق سکھانے کے لیے اپنے ٹھکانے پر بلایا۔ کیا تم پولیس میں رپورٹ کرو گے؟"

"نہیں۔ پولیس میں رپورٹ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" میں نے نفی میں جواب دیا۔ "میرے پاس چوہدری ساجد کے خلاف کوئی ثبوت بھی تو نہیں ہے اور نہ ہی میں نے چوہدری ساجد کا چہرہ دیکھا ہوا ہے۔ پولیس کو میں کیا ثبوت پیش کروں گا؟"

"ہمم۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"مرینہ کہاں ہے؟"

"وہ گھر پر ہے۔ وہ یہاں آنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔"

"امی کی طبیعت کیسی ہے؟"

"وہ ٹھیک ہیں۔" فاروق نے کہا۔ "مرینہ نے انہیں تمہارے زخمی ہونے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ورنہ ان کی طبیعت بگڑ جاتی۔"

امی کی طبیعت کا سن کر مجھے تسلی ہو گئی تھی اور میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ میرا ذہن ایک بار پھر چوہدری ساجد کی طرف بھٹک گیا تھا اور میں نے دل میں قسم کھائی تھی کہ میں اس سے خود پر کیے گئے تشدد کا بدلہ ضرور لوں گا۔

فاروق نے بتایا تھا کہ میں رات سے ہی اسپتال میں ہوں اور اس وقت دن کے گیارہ بج رہے ہیں۔ میں اتنی دیر تک بے ہوش رہا تھا۔ مجھ پر خاصا بے رحمانہ تشدد کیا گیا تھا جس سے میرے چہرے کے خدوخال بھی کافی حد تک بگڑ گئے تھے اور

زخم ٹھیک ہونے میں کم از کم ایک مہینا لگ سکتا تھا۔ اسی اثناء میں کمرے کا دروازہ کھلا اور آگے پیچھے دو لڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔

سب سے آگے والی لڑکی بے حد حسین تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کے سر کے بال کھلے ہوئے اور شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں جبکہ دوسری لڑکی قبول صورت تھی لیکن وہ بھی قدرے ماڈرن اور بیش قیمت لباس میں ملبوس تھی۔ دونوں لڑکیوں نے اپنے اپنے گاگلز اپنے سر کے بالوں میں اٹکائے ہوئے تھے۔

ان دونوں لڑکیوں کو دیکھ کر فاروق اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے مؤدبانہ انداز میں سلام کیا تو لڑکیوں نے سر کی جنبش سے سلام کا جواب دیا۔ پھر فاروق میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”علی! یہی تمہاری محسن ہیں جو تمہیں زخمی حالت میں یہاں لائی تھیں۔“

میں نے ان کی طرف دیکھا تو نیلی آنکھوں والی لڑکی بولی۔ ”کیسے ہیں آپ؟“

”جی..... بہتر ہوں۔“ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”آپ کا شکریہ کہ آپ.....“

”شکریہ کی کوئی بات نہیں۔“ لڑکی نے میری بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر ہماری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی ایسا ہی کرتا جو ہم نے کیا۔“

جواباً میں نے سر کو ہلکے انداز میں جنبش دی تھی۔

”آپ بیٹھیں، میں ابھی آتا ہوں۔“ فاروق نے کہا اور پھر وہ تیزی سے باہر نکل گیا جبکہ دونوں لڑکیاں کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ مجھ سے صرف نیلی آنکھوں والی لڑکی ہی بات کر رہی تھی۔ دوسری لڑکی نے مجھ سے صرف میری خیریت ہی دریافت کی تھی اس کے بعد اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔

نیلی آنکھوں والی لڑکی نے اپنا نام شانزے بتایا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ گزشتہ رات اپنی سہیلی ماریہ کے ساتھ، جو اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی، ایک فنکشن سے آ رہی تھی کہ اسے سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر میں زخمی حالت میں ملا تھا۔ گو کہ یہ پولیس کیس تھا پھر بھی وہ انسانیت کے ناتے ڈرائیور کی مدد سے مجھے کار میں ڈالا اور اسپتال لے آئی تھیں۔ پھر اس نے وہی باتیں بتائی تھیں جو فاروق مجھے پہلے بتا چکا تھا۔ میں ان کا مشکور و ممنون تھا کہ وہ مجھے بروقت اسپتال لائی تھیں۔ اسی دوران فاروق ان دونوں کے لیے چائے لے آیا تھا۔

شانزے اور ماریہ تھوڑی دیر بیٹھی رہیں۔ جتنی دیر وہ وہاں موجود رہیں فاروق بھی وہیں موجود تھا۔ شانزے نے دوبارہ آنے کا کہا اور پھر وہ ماریہ کے ساتھ چلی گئی۔ شانزے کو دیکھ کر نجانے کیوں مجھے عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ وہ مجھ سے ایسے گھل مل کر باتیں کر رہی تھی جیسے ہم کافی عرصے سے ایک دوسرے سے آشنا ہوں۔ مجھے اس کے انداز اور باتوں میں اپنائیت محسوس ہوئی تھی۔ گو اس نے مجھے اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن مجھے وہ کسی اچھے اور متمول خاندان کی معلوم ہوئی تھی۔ وہ میری محسن تھی۔ اس نے میری جان بچائی تھی۔ اگر وہ بروقت مجھے اسپتال نہ پہنچاتی تو نجانے میں زندہ بھی ہوتا یا نہیں۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور
ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 9000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین
یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

میں تین روز اسپتال میں رہا تھا۔ شانزے اور اس کی سہیلی تینوں روز میری خیریت دریافت کرنے آتی رہی تھیں۔ ان تین دنوں میں فاروق میرے ساتھ رہا تھا اور اس نے میرا بہت خیال رکھا تھا۔ سریہ اسپتال آنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے منع کر دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ امی کو اکیلا چھوڑے ..... امی کو سنبھالنے کے لیے بھی تو گھر میں کسی کو ہونا چاہیے۔

چوتھے روز جب مجھے اسپتال سے ڈسچارج کیا جانا تھا تو اس روز صرف شانزے آئی تھی۔ وہ اکیلی تھی اور میرے لیے پھلوں سے بھرے دو شاپر لے آئی تھی۔

"ارے اس کی کیا ضرورت تھی؟ آپ نے خوامخواہ تکلف کیا ہے۔" میں نے ازراہ تفنن کہا۔

"اس میں تکلف کی کوئی بات نہیں ہے مسٹر علی!" وہ اپنائیت سے بولی۔ "آپ پھل کھائیں اور جلد از جلد صحت مند ہو جائیں۔"

اس کی بات سن کر میں مسکرا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب مجھے ڈسچارج کر دیا گیا تو میں نے فاروق کو ٹیکسی لانے کی ہدایت کی۔ فاروق باہر جانے لگا تو شانزے نے اسے روک دیا۔

"ٹیکسی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کو گھر ڈراپ کر دوں گی۔"

میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ شاید میں بھی یہی چاہتا تھا۔ فاروق مجھے سہارا دے کر اسپتال سے باہر لے آیا۔ اس دوران شانزے پارکنگ سے کار لے آئی تھی۔ فاروق نے مجھے پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور خود میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ شانزے ڈرائیونگ خود کر رہی تھی۔ آدھے گھنٹے کے بعد ہم گھر پہنچ گئے۔

گھر آتے ہی میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں دانستہ امی کے پاس نہیں گیا تھا کیونکہ اگر امی مجھے پٹی بندھی حالت میں دیکھ لیتیں تو شاید ان کی حالت مزید خراب ہو جاتی۔ فاروق نے مجھے بیڈ پر لٹا دیا اور خود ایک سائیڈ پر کھڑا ہو گیا جبکہ شانزے فاروق کے کہنے پر کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"میں آپ کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔" میں نے شانزے سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ بہت زیادہ تکلف کرتے ہیں۔" شانزے بولی تو میں مسکرا دیا اور بولا۔

"یہ میری عادت ہے۔"

"اچھی عادت ہے۔"

پھر میں سریہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "سریہ! ان کا نام شانزے ہے اور یہی مجھے اسپتال لے گئی تھیں۔"

سریہ نے بھی شانزے کا شکریہ ادا کیا۔

"ارے اب بس بھی کرو۔ دونوں بہن بھائی کتنی بار میرا شکریہ ادا کرو گے۔" شانزے نے کہا۔ "اب دوبارہ شکریہ کے الفاظ نہیں بولیں گے آپ۔" یہ بات اس نے مجھ سے کہی تھی۔ میں نے ہلکے سے انداز میں سر کو جنبش دی تھی۔

شانزے تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہاں سے چلی گئی تو میں نے فاروق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "فاروق! تمہارا بھی بے حد شکریہ۔ تم نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا ہے۔"

فاروق مسکراتے ہوئے بولا۔ "دو تمانچے پڑیں گے تو شکریہ کا بھوت اتر جائے گا۔"

میں فاروق کے خلوص کا معترف ہوں۔ وہ واقعی بے حد اچھا انسان تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھا رہا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا علی بھائی! اب میں چلتا ہوں۔ اگر کوئی ضروری کام ہو تو مجھے فون کر لیجیے گا۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔"

فاروق نے سلام کیا اور وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد سریہ میرے پاس آ بیٹھی اور مجھ سے پوچھنے لگی کہ میری یہ حالت کس نے بنائی ہے۔ میں اسے کچھ بھی بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے ٹال دیا۔ میں نے اسے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ میں نے روزینہ کو دیکھا ہے اور شانی نے اسے کسی چوہدری ساجد کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔

شانزے جاتے جاتے مجھ سے میرا سیل نمبر لے گئی تھی اس لیے وہ ہر روز میرے گھر آنے کی بجائے فون پر ہی میری خیریت دریافت کر لیتی تھی اور کسی کسی دن وہ خود بھی آ جاتی تھی۔ وہ جب بھی آتی تھی تو میرے لیے پھل ضرور لے کر آتی تھی۔ اس مہربانی کی وجہ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

شانزے نے مجھ سے اس دن والے واقعے کے بارے میں کریدنے کی کوشش کی تھی جس دن چوہدری ساجد کے شہدوں نے مجھ پر بے پناہ تشدد کر کے سڑک پر پھینک دیا تھا۔ میں نے اسے یہی بتایا تھا کہ کچھ لوگوں سے لین دین کے چکر میں لڑائی ہو گئی تھی جس پر انہوں نے مجھ پر تشدد کیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق شانزے مطمئن ہو گئی تھی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھ میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔ نوعمری سے میری یہی

خواہش تھی کہ لڑکیاں مجھ میں دلچسپی لیں اس کی مجھ پر توجہ مجھے ریشہ ختمی میں مبتلا کر دیتی مگر اس وقت حالات نے جس طرح نیا موڑ لیا ہے، کوئی خوشی مجھے متاثر نہیں کر رہی تھی۔ شانزے کی مجھ میں دلچسپی بھلی نہیں لگ رہی تھی۔

مجھے اسپتال سے گھر آئے آٹھواں روز تھا۔ جب اسماعیل شاہد مجھ سے ملنے میرے گھر آئے۔ وہ بھی میری حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ بولے۔ "کس نے تم پر تشدد کیا ہے؟"

"کسی چوہدری کے کارندوں نے۔" میں نے جواب دیا تو میں نے اسماعیل شاہد کو ایک لمحے کے لیے چونکتے ہوئے دیکھا، پھر انہوں نے جلدی سے خود کو نارمل کر لیا۔ ایسا کیوں ہوا یہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

"کون ہے یہ چوہدری؟"

"لڑکیوں کا اسمگلر ہے۔" میں نے جواب دیا اور پھر انہیں بھی تفصیل سے بتا دیا۔ ساتھ ہی اپنے خدشے کا اظہار بھی کیا جو مجھے فاروق نے بتایا تھا کہ شاید روزینہ کو پورنوگرافی کے لیے یورپ کے کسی ملک نہ بھیج دیا گیا ہو۔ وہ ہونٹ بھینچے خاموشی سے سنتے رہے۔ اس ساری گفتگو کے دوران ان کے چہرے کے تاثرات دھواں دھواں بدلتے رہے تھے۔

"ہونہہ۔ یہ تو واقعی خوفناک بات ہے۔" وہ ہنکارا بھرتے ہوئے بولے۔ "جب سے یہ انڈرائڈ موبائل آئے ہیں ہمارے نوجوان عزت، احترام اور انسانیت سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے دماغوں میں صرف خناس اور فحاشی ہی بھرا جا رہا ہے۔ میری دعا ہے کہ تمہاری بہن محفوظ ہو اور وہ جلد بازیاب ہو جائے۔"

"آمین۔" میں نے اور فاروق نے ایک ساتھ ہی کہا۔

"تم نے تشدد کے حوالے سے پولیس میں رپورٹ کرائی؟" اسماعیل شاہد دوبارہ بولے۔

"نہیں سر۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "پولیس نے میری بات پر یقین نہیں کرنا اور نہ ہی میرے پاس چوہدری کے خلاف کوئی ثبوت ہے۔"

"ہمم۔"

"سر! آپ سے گزارش کرنی ہے۔"

"ہاں..... بولو۔"

"سر! اگر آپ کسی طرح مجھے چوہدری ساجد کے بارے میں معلومات حاصل کر کے دے دیں تو میں آپ کا بے حد ممنون رہوں گا۔" میں نے کہا۔

اسماعیل شاہد چند لمحے کچھ سوچتے رہے پھر بولے۔ "علی! ایسے لوگ بے حد خطرناک ہوتے ہیں اور ان کے ہاتھ بھی لمبے ہوتے ہیں۔ ان سے ٹکرانا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے لیکن تم فکر نہ کرو، میں چوہدری ساجد کے بارے میں معلوم کرنے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا، پھر اسے قانون کی گرفت سے چھڑانے والا کوئی نہیں ہو گا۔"

ان کے ہامی بھرنے پر میں انہیں ممنون نظروں سے دیکھنے لگا پھر میں نے کہا۔ "شکریہ سر۔"

"لیکن مجھ سے وعدہ کرو۔"

"کیسا وعدہ سر۔"

"آئندہ تم اکیلے کسی سے نہیں بھڑو گے۔" وہ بولے۔ "اب تو چوہدری نے تمہیں زندہ چھوڑ دیا ہے، ہو سکتا ہے آئندہ تمہیں زندہ نہ چھوڑے۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو تمہاری بہن اور ماں کا کیا ہو گا۔ کیا اس بارے میں تم نے سوچا ہے؟ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم ایسے لوگوں سے نہ بھڑو اور پولیس پر چھوڑ دو۔ مجھے یقین ہے... وہ تمہاری بہن کو بازیاب کر لے گی اور چوہدری کو بھی سخت ترین سزا دے گی۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے "آجاؤ" کہا تو دروازہ کھلا اور مرینہ ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ ٹرے پر شیشے کا ایک گلاس پڑا ہوا تھا جو مشروب سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ مرینہ نے سر پر دوپٹا اوڑھا ہوا تھا۔ اس نے انتہائی ادب کے ساتھ ٹرے اسماعیل شاہد کے پہلو میں پڑی میز پر رکھ دی۔ اسماعیل شاہد نے نظر موڑ کر مرینہ کی طرف دیکھا۔

"سر! یہ میری چھوٹی بہن ہے، مرینہ۔" میں نے کہا۔

"السلام علیکم۔" مرینہ نے انہیں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔" اسماعیل شاہد شفقت سے بولے، پھر مرینہ کے وہاں سے جانے کے بعد انہوں نے شربت پیا اور مجھے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کر کے چلے گئے۔ انہیں مرینہ ہی دروازے تک چھوڑنے گئی تھی۔ انہیں چھوڑنے کے بعد وہ واپس میرے کمرے میں ہی آ گئی۔

"بھائی!"

"ہاں بولو۔"

"آپ نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا۔" وہ خفگی سے بول رہی تھی۔ "میں نے آپ کی ساری باتیں سن لی ہیں۔"

میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "میں

تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"اب تو سب کچھ سن کر پریشان ہوگئی ہوں نا۔" اس نے دکھی لہجے میں کہا۔ اس کے جواب نے مجھے لاجواب کر دیا تھا۔ وہ مزید بولی۔ "مجھے باجی کی بے حد فکر ہو رہی ہے۔ نجانے وہ کہاں اور کس حال میں ہوں گی۔"

"اللہ سے اچھائی کی دعا کرو۔" میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا اور اس کے سر پر پیار کرنے لگا۔

"بھائی! آپ باجی کو واپس لے آئیں گے نا؟"

"ہاں ان شاء اللہ۔ میں ٹھیک ہو جاؤں پھر میں اس کی تلاش میں نکل پڑوں گا۔" میں نے عزم سے کہا۔ "درندوں کے چنگل سے اپنی بہن کو نکالنے کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑا میں کروں گا۔"

"بھائی! اپنا خیال رکھنا۔"

اس کے لہجے میں تشویش تھی۔ میں نے اسے بھی نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں، ایک بات کا خیال رکھنا۔ گھر سے کبھی اکیلی باہر نہ جانا۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا۔ میں لا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے بھائی۔" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور میری پڑھائی کا کیا ہوگا؟ پیپرز میں تین ماہ رہ گئے ہیں۔"

"تم گھر بیٹھ کر پڑھ لیا کرو۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "پرائیویٹ امیدوار کے طور پر پیپرز دے دینا۔ میں تمہیں خود سینٹر چھوڑ آؤں گا اور خود ہی لے آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے ہامی بھری۔ "بھائی! آپ مجھے باجی کے متعلق کچھ اور بھی بتائیں۔"

پھر وہ مجھ سے روزینہ کے متعلق مزید باتیں کریدنے لگی اور میں اسے سچ سچ بتاتا گیا۔ چھپانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ساری بات سن کر پریشان ہوگئی تھی۔ ظاہر ہے وہ چھوٹی بہن تھی۔ اپنی بڑی بہن کے لیے پریشان ہونا فطرتی بات تھی۔

"بھائی! آپ اپنا خیال رکھیے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارا آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ میری بہن جہاں بھی ہو خیریت سے ہو۔" مرینہ نے ایسے لہجے میں کہا کہ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے۔

"آمین۔" میرے منہ سے نکلا۔ پھر میں نے مرینہ کو سختی سے تنبیہ کی کہ وہ روزینہ کے متعلق امی کو کچھ نہ بتائے اور ان کا پوری طرح سے دھیان رکھے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کر لیا تھا اس لیے میں مطمئن ہو گیا تھا۔

☆.....☆

تقریباً ایک مہینے تک میں ٹھیک ہو گیا تھا۔ میرے چہرے کے زخم بھی کافی حد تک مندمل ہو چکے تھے اور جو رہ گئے تھے وہ مندمل ہو رہے تھے۔ البتہ میری امی کی حالت بدستور ویسی ہی تھی۔ مرینہ ان کا بہت خیال رکھ رہی تھی۔

ایک مہینا گزرنے کے باوجود پولیس کی طرف سے کوئی حوصلہ افزا رپورٹ نہیں ملی تھی جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ میری بہن کو بازیاب کرنا تو ایک طرف ٹریس تک نہیں کر سکی تھی۔ فاروق ہر دوسرے تیسرے روز تھانے کے چکر لگا رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ روزینہ کو بھی تلاش کر رہا تھا۔ فاروق نے میری بائیک کی "گمشدگی" کی رپورٹ تھانے میں درج کرا دی تھی لیکن اتنے دن گزر جانے کے باوجود میری بائیک بھی ابھی تک بازیاب نہیں ہو سکی تھی۔ پتا نہیں وہ صحیح سلامت بھی تھی یا چور نے اس کے حصے بخرے کر دیے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں اپنے حوصلے اور عزائم مضبوط کرتا جا رہا تھا۔ کئی بار میں نے پلاننگ بنائی تھی لیکن قابل عمل نہ ہونے کی وجہ سے اسے مسترد کر دیا تھا لیکن مجھے ہر حالت میں چوہدری ساجد تک پہنچنا تھا۔ اس تک پہنچ کر ہی میں اس کے گینگ کے خلاف متحرک ہو سکتا تھا۔ نجانے اس نے کتنی لڑکیاں اغوا کر کے دوسرے ممالک اسمگل کی ہوں گی۔ کتنے گھروں کو اجاڑا ہوگا۔ یہ وہ ناسور تھا جس کا اگر قلع قمع نہ کیا گیا تو یہ زہر کی طرح پھیلتا چلا جائے گا۔ میرے دل میں چوہدری ساجد کے خلاف نفرت کا لاوا سا بھر گیا تھا۔ ایک آتش فشاں تھا جو کسی بھی وقت پھٹ سکتا تھا اس لیے میں نے ایک بار پھر میدان میں اترنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چوہدری باسط کے خلاف بھی سیدھا سپر ہونا تھا جب کہ ایس ایچ او نے بھی نوٹ لکھوا رکھے تھے جس کی بنیاد پر وہ میرے خلاف کچھ بھی کر سکتا تھا۔ حالانکہ اسماعیل شاہد نے مجھے ایسے لوگوں سے دور رہنے کی تنبیہ کی تھی لیکن مجھے ہر حال میں اپنی بہن کو تلاش کرنا تھا۔

☆.....☆

کافی سوچ بچار کرنے کے بعد ایک رات میں گھر سے نکل پڑا۔ گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے مرینہ کو دروازہ بند کرنے کا کہا تھا۔ اس کے پوچھنے پر میں نے اس سے کہا تھا کہ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ دو گھنٹے تک واپس آ جاؤں گا۔ مرینہ کے چہرے پر فکرمندی کے تاثرات تھے اور اس نے مجھے اپنا خیال رکھنے کی نصیحت بھی کی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ

میرے لیے بہت فکر مند رہتی ہے۔

میں ایک آٹو رکشے پر سوار ہو کر شہزاد کالونی پہنچا۔ آٹو رکشے والے نے مجھ سے منہ مانگے پیسے لیے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ اسے واپسی پر خالی آنا پڑے گا کیونکہ وہاں سے سواریاں رات کے وقت مشکل سے ملتی ہیں۔

مجھے واپس کیسے گھر پہنچنا تھا میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ میرے دل، دماغ اور حواسوں پر صرف چوہدری ساجد ہی سوار تھا۔

شہزاد کالونی میں داخل ہونے والی سڑک کے قریب میں نے آٹو رکشا رکوایا تھا اور نیچے اتر کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا چوہدری ساجد کی کوٹھی کی طرف بڑھنے لگا۔ میری داڑھی اور مونچھیں ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی تھیں۔ سر کے بال بھی قدرے بڑے تھے اس لیے میرا خیال تھا کہ چوہدری ساجد کے آدمی ایک نظر میں مجھے نہیں پہچان سکیں گے۔

گلی سنسان اور ویران پڑی تھی البتہ آوارہ کتے جگہ جگہ موجود تھے لیکن انہوں نے مجھے دیکھ کر بھونکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود میں نے احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں چوہدری ساجد کی کوٹھی کے سامنے موجود تھا۔ آج وہاں کا ماحول قدرے مختلف تھا۔ کوٹھی کے نچلے پورشن کے اندرونی حصے میں انرجی سیور آن تھے لیکن گیٹ پر تاریکی اور سناٹا تھا البتہ آج گیٹ اندر سے بند تھا۔ اس کے ساتھ والی کوٹھی کے باہر ایک انرجی سیور آن تھا جس کی مدھم روشنی ارد گرد تک پھیلی ہوئی تھی۔ میں اسی مدھم روشنی میں ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔

میں پہلے اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ کوٹھی میں کوئی موجود بھی ہے یا نہیں۔ چوہدری ساجد کی کوٹھی کے سامنے ایک پلاٹ تھا جس کی صرف بنیاد ہی اٹھی تھی البتہ قریب ہی اینٹوں اور بجری کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ کچھ سوچ کر میں اینٹوں کے ڈھیر کے عقب میں جا کر بیٹھ گیا اور چوہدری ساجد کی کوٹھی کے گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔

آدھا گھنٹا گزر گیا لیکن اس کوٹھی سے نہ ہی کوئی باہر نکلا اور نہ ہی کوئی اندر گیا۔ میں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ کچھ بھی ہو جائے آج میں نے چوہدری ساجد کے کسی کارندے پر ہاتھ ضرور ڈالنا تھا کیونکہ اس کا کارندہ ہی مجھے اس تک پہنچا سکتا تھا۔

اچانک مجھے کسی گاڑی کی آواز سنائی دی تو میں نے چونک کر اُدھر دیکھا جدھر سے ہیڈ لائٹس کی روشنی اینٹوں کے ڈھیر پر پڑی تھی۔ جب وہ گاڑی ایک کوٹھی کے گیٹ پر جلتے بلب کی روشنی میں آئی تو میں نے دیکھا کہ وہ پجارو تھی۔

پجارو اسی طرف آ رہی تھی۔ اس کی رفتار بھی مناسب تھی لیکن جیسے جیسے وہ قریب آ رہی تھی اس کی روشنی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ پھر وہ وہاں سے گزرنے کی بجائے چوہدری ساجد کی کوٹھی کے گیٹ پر رک گئی تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے اینٹوں کے ڈھیر کی اوٹ سے پجارو کا جائزہ لیا تو بے اختیار چونک پڑا۔ یہ وہی پجارو تھی جسے شانی استعمال کرتا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن بھی یکلخت تیز ہو گئی تھی۔

چند لمحے گزرے تھے کہ گیٹ کھل گیا۔ گیٹ کھولنے والا وہی لحیم شحیم شخص تھا جس نے اپنے ساتھی کے ساتھ مل کر میری درگت بنائی تھی۔

اس نے جب گیٹ مکمل کھول دیا تو پجارو اندر چلی گئی اور گیٹ کھولنے والا گیٹ بند کرنے لگا۔ میری نظریں اسی طرف جمی ہوئی تھیں۔ گیٹ بند ہونے سے پہلے ہی میں نے چوہدری باسط کو پجارو سے نیچے اترتے ہوئے دیکھا۔ اسے دیکھ کر نہ صرف میں حیران رہ گیا بلکہ میرے ذہن میں ان گنت سوالات بھی سر ابھارنے لگے۔ بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھ پر تشدد چوہدری ساجد نے نہیں، چوہدری باسط نے کرایا تھا۔ اس نے چوہدری ساجد کا صرف نام ہی استعمال کیا تھا۔

مجھے یاد پڑتا ہے جب مجھے پکڑنے والے نے فون کال کی تھی تو اس نے نام نہیں لیا تھا صرف چوہدری صاحب کہا تھا۔ چونکہ مجھے چوہدری ساجد کا نام لے کر بلایا گیا تھا اس لیے میں اب تک خود پر تشدد کا ذمے دار چوہدری ساجد کو سمجھتا رہا تھا۔ ساری بات مجھے سمجھ آ گئی تو غصے کی شدت سے میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ چوہدری باسط نے شانی پر تشدد کرنے کا مجھ سے بدلہ لیا تھا۔

میرے دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ چوہدری ساجد کو تلاش کرنے کی میری پلاننگ ایک بار پھر ہوا ہو گئی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے میں ایک بار پھر اندھیرے میں آ گیا ہوں اور دور دور تک مجھے روشنی کی ایک کرن بھی دکھائی نہیں دے رہی۔ میں مسلسل سوچنے میں مگن تھا لیکن کوئی ترکیب سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کوٹھی میں چوہدری باسط اور گیٹ کھولنے والے شخص کے علاوہ اور کتنے افراد موجود ہیں۔ اگر یہ دو ہیں تو ان دونوں پر میں اکیلے قابو پا سکتا تھا لیکن اگر زیادہ افراد ہوئے تو ان پر قابو

پانا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں ایک بار پھر کسی مشکل کا شکار ہو سکتا تھا۔

میں اب کسی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اگر میں اس بار چوہدری باسط اور اس کے کارندوں کے ہتھے چڑھ گیا تو یہ مجھے یقیناً زندہ نہیں چھوڑیں گے بلکہ ہو سکتا ہے کہ مجھے قتل کر کے میری لاش ہی غائب کر دیں۔ اس لیے میں کوئی رسک لینے کا متحمل نہیں ہو رہا تھا۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میں نہ ہی اپنی بہن کو درندوں کے چنگل سے بازیاب کرا سکوں گا اور نہ ہی لڑکیوں کی اسمگلنگ کرنے والے گینگ کو منظر عام پر لا سکوں گا۔ پھر میری بہن مر جائے اور امی بھی ناساعد حالات کا شکار ہو جائیں گی۔ اللہ کے بعد میں ہی ان کا واحد سہارا تھا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا لیکن میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ خود سے الجھتے الجھتے اچانک میں ایک نکتے پر الجھ گیا۔ میرے دماغ میں یہ خیال آ گیا کہ کیا چوہدری باسط، چوہدری ساجد کو جانتا ہے کیونکہ اس نے چوہدری ساجد کا نام لے کر ہی مجھے اس کوٹھی میں بلوایا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ چوہدری باسط کا چوہدری ساجد کے ساتھ کوئی لنک تھا ورنہ اسے اس کا نام استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی اور وہ کیسے اس کے بارے میں جانتا تھا۔ کیا شانی نے اسے بتایا تھا یا کوئی اور بات تھی۔

اب تو یہ معلوم کرنا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔ گتھیاں سلجھنے کی بجائے الجھتی جا رہی تھیں۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ میں آدھی رات کو کوٹھی میں داخل ہوں گا جب سب سو رہے ہوں گے۔ پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ مجھے معلوم تھا کہ بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہنے والے لوگ رات گئے تک جاگتے رہتے ہیں اور ڈھائی، تین بجے سے پہلے نہیں سوتے چنانچہ میں دوبارہ اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے دبک کر بیٹھ گیا اور آدھی رات کے ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

میرے اندازے کے مطابق اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے سیل فون پر ٹائم نہیں دیکھا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ کسی کوٹھی کی بالکونی میں کوئی موجود ہو اور میرے سیل فون کی روشنی دیکھ کر چونک جائے اسی لیے میں نے سیل فون آن نہیں کیا تھا۔ وقت گزارنا میرے لیے بے حد مشکل ہو رہا تھا۔ میرا دل کر رہا تھا کہ ابھی دیوار کود کر کوٹھی میں داخل ہو جاؤں اور چوہدری باسط کو دبوچ کر اس سے ساری حقیقت اگلوا لوں۔

کوٹھی کے اندر جلنے والی ساری بتیاں بجھ گئیں سوائے پورچ کی بتی کے۔ اس کا مطلب تھا کہ چوہدری باسط سو رہا تھا۔ یہ بہت اچھی بات تھی۔ میں نے تقریباً آدھا گھنٹہ انتظار کیا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ چوہدری باسط اور اس کے کارندے سو گئے ہوں گے تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مسلسل ایک جگہ بیٹھے رہنے سے میری کمر بھی اکڑ گئی تھی۔ میں نے پہلے ارد گرد کا اچھی طرح جائزہ لیا پھر میں اینٹوں کے ڈھیر سے نکل کر دھڑکتے دل کے ساتھ چلتا ہوا کوٹھی کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ گیٹ اور دیواروں کی اونچائی برابر تھی۔ گیٹ کے پاس پہنچتے ہی میں نے گیٹ کا جائزہ لیا تو اگلے ہی لمحے میں برق رفتاری سے دائیں طرف ہو گیا۔ گیٹ کے ساتھ والے پلر کے اوپر قدرے فاصلے پر مجھے ایک کیمرا دکھائی دیا تھا۔

میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہاں کیمرا بھی ہو گا۔ اگر وہ کیمرا آن ہوا تو یقیناً مجھے دیکھا جا چکا ہو گا اور چوہدری باسط کے کارندے باہر آتے ہی ہوں گے۔ اسی خیال کے تحت میں جھکے جھکے انداز میں چلتا ہوا کوٹھی سے قدرے فاصلے پر موجود درخت کی طرف بڑھ گیا۔ میں اپنا اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ درخت کی اوٹ میں کافی دیر کھڑے رہنے کے باوجود جب کوٹھی سے کوئی باہر نہ نکلا تو میں نے ایک طویل سانس لیا۔ کسی کے باہر نہ آنے کا مطلب تھا کہ یا تو کیمرا بند تھا یا پھر کسی نے مجھے گیٹ پر چیک نہیں کیا تھا۔

میں درخت کی اوٹ سے نکلا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا ایک بار پھر کوٹھی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس مرتبہ میرا رخ گیٹ کی طرف نہیں تھا بلکہ اس دیوار کی طرف تھا جس کی دوسری طرف لان تھا۔ میں پہلے ہی لان میں گھنی جھاڑیاں دیکھ چکا تھا اس لیے میں نے یہی پلان بنایا تھا کہ میں دیوار پر چڑھ کر جھاڑیوں میں ہی دبک جاؤں گا چنانچہ میں دیوار چڑھ کر بے آواز انداز میں لان میں اترا اور جھاڑیوں میں دبک کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں جھاڑیوں سے نکلا اور گربہ پا چلتا ہوا کوٹھی کے دائیں طرف والی تنگ گلی کی طرف بڑھ گیا۔

تنگ گلی میں گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اس طرف گٹر تھے اور ان پر ڈھکن پڑے ہوئے تھے۔ میں انتہائی احتیاط سے چلتا ہوا دوسری طرف پہنچ گیا۔ دوسری طرف سرونٹ کوارٹر تھا لیکن وہ بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا البتہ پیڈسٹل فین کے چلنے کی آواز گونج رہی تھی۔ سرونٹ کوارٹر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے دروازے سے اندر جھانکا تو مجھے چارپائی پر ایک آدمی لیٹا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے مخالف سمت کروٹ بدلی ہوئی تھی اور اس کے ہلکے ہلکے خراٹے بھی مجھے سنائی دیے۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو مجھے اس کے علاوہ اور کوئی دکھائی نہ دیا۔ سوئے ہوئے آدمی کے لباس سے میں نے اسے شناخت کر لیا

کہ یہ وہی تھا جس نے گیٹ کھولا تھا۔ یہ میری خوش بختی ہی تھی کہ اس کوٹھی میں سوائے اس آدمی کے اور کوئی کارندہ موجود نہیں ہے۔

میں واپس پلٹا اور کوٹھی کے اندرونی کمرے کے دروازے پر پہنچ کر دروازہ کھولنا چاہا تو وہ اندر سے لاک تھا۔ اسی طرح میں نے دوسرے دروازے بھی چیک کر لیے لیکن وہ بھی اندر سے لاک تھے۔ پورچ میں شائی کی پجارو موجود تھی۔ میں پجاروں پر سرسری نظریں ڈالتا لان کراس کر کے دوسری سمت پہنچا تو میں ایک کمرے میں روشنی دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

شاید وہ کچن تھا لیکن اس کا دروازہ بھی اندر سے لاک تھا۔ دروازے پر لوہے کی پتلی پتلی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور ان کے اوپر جالی تھی۔ میں نے دیوار کے ساتھ لگ کر کچن میں جھانکا تو مجھے ایک لڑکی دکھائی دی جس نے نائٹی پہنی ہوئی تھی۔ اس لڑکی کی عمر چوبیس سے اوپر تھی لیکن وہ بے حد حسین تھی۔ وہ فریج سے پانی سے بھری بوتل نکال کر میز کی طرف آ رہی تھی۔ میز پر شیشے کا گلاس پڑا ہوا تھا۔ اس نے میز کے قریب رک کر بوتل کا ڈھکن کھولا اور گلاس میں پانی انڈیلنے لگی۔ گلاس بھرنے کے بعد اس نے بوتل میز پر رکھی اور بائیں ہاتھ سے گلاس اٹھا کر کھڑے کھڑے ہی پانی پینے لگی۔ وہ مجھے سائیڈ پوز سے دکھائی دے رہی تھی۔

نجانے وہ کون تھی لیکن وہ چوہدری باسط کی بیٹی تو ہرگز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مجھے اس سے کوئی سروکار بھی نہیں تھا کہ وہ کون تھی اور چوہدری باسط کے گھر میں کیا کر رہی تھی۔ مجھے تو ہر حال میں چوہدری باسط تک پہنچنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے غیر ارادی طور پر دروازے پر دستک دی تھی۔ دستک کی آواز سنتے ہی لڑکی نے بے اختیار چونک کر دروازے کی طرف دیکھا تھا لیکن میں برق رفتاری سے دیوار کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ پھر میری عین توقع کے مطابق ہوا تھا۔ وہ لڑکی گلاس میز پر رکھ کے دروازے تک آئی اور اپنا چہرہ جالی کے ساتھ لگا کر باہر جھانکنے لگی۔ میں چونکہ دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا اس لیے وہ مجھے نہ دیکھ پائی۔ وہ چند لمحے حیرت بھری نظروں سے باہر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرتی رہی پھر وہ پلٹ کر جانے لگی۔ میں نے دروازے سے جھانک کر اسے جاتے دیکھا تو میں نے دوبارہ دستک دے دی۔

دستک کی آواز سنتے ہی لڑکی ٹھٹکی اور برق رفتاری سے مڑ کر دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر گہرا استعجاب چھایا ہوا تھا۔

"کون دستک دے رہا ہے؟" میرے حساس کانوں میں لڑکی کی بڑبڑاہٹ سنائی دی پھر وہ دروازے کی طرف آنے کی بجائے کچن سے نکلتی چلی گئی۔ مجھے اپنا منصوبہ چوپٹ ہوتا واضح دکھائی دے رہا تھا لیکن دو منٹ ہی گزرے تھے کہ مجھے چوہدری باسط کی آواز سنائی دی اور میں تیزی سے دیوار کے ساتھ لگ گیا۔

"یہ تمہارا وہم ہوگا بلی۔"

"میرا وہم نہیں ہو سکتا چوہدری صاحب۔" لڑکی کی آواز سنائی دی۔ چوہدری باسط نے اس کا نام بلی لیا تھا۔ "دو بار دروازے پر دستک ہوئی تھی۔"

"میں دیکھتا ہوں۔"

میں خطرے کے احساس سے برق رفتاری سے ایڑیوں کے بل چلتا ہوا راہداری سے نکل کر لان میں موجود جھاڑیوں میں دبک گیا۔ اسی لمحے میں نے جھاڑیوں کی اوٹ سے چوہدری باسط کو کچن کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے دیکھا البتہ بلی بدستور کچن میں موجود تھی۔

چوہدری باسط بھی نائٹ سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا لان تک آیا اور اِدھر اُدھر جھانکنے کے بعد اپنی تسلی کر کے واپس مڑ کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔ جھاڑیوں میں دبکا ہونے کی وجہ سے میں چوہدری باسط کو دکھائی نہیں دیا تھا۔ اسی لمحے بلی بھی دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

"کیا ہوا؟"

"میری جان! میں نے کہا تھا ناں کہ تمہارا وہم ہے۔" چوہدری باسط نے قدم بڑھاتے ہوئے محبت بھرے انداز میں جواب دیا۔ "یہاں کوئی نہیں ہے۔"

"لیکن یہاں کوئی تھا۔"

"پھر وہی رٹ۔" چوہدری باسط جھنجلایا پھر اس نے پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "میری جان! یہاں بھلا کون آ سکتا ہے۔ سارے کیمرے آن ہیں۔ اگر کوئی یہاں آتا تو میری نظروں سے کیسے بچ سکتا تھا۔"

"لیکن یہاں کوئی آیا تھا، تم میری بات کا یقین کرو۔" بلی بھی اپنی ضد پر اڑی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے حسین چہرے پر الجھن اور پریشانی کے تاثرات موجود تھے۔ چوہدری باسط کے لب و لہجے سے میں سمجھ گیا کہ بلی اس کی داشتہ ہے اور وہ اسے رات گزارنے کے لیے یہاں لایا ہے۔ ایک خیال میرے ذہن میں آیا تو میں نے جلدی سے اپنی پتلون کی جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور اسے نائٹ موڈ میں آن کر کے چوہدری اور

بلی کی ویڈیو بنانے لگا۔

"آؤ اندر چلیں۔" چوہدری باسط نے اس سے کہا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے لیے کچن کی طرف بڑھ گیا۔ کچن کے دروازے پر پہنچ کر بلی رک گئی۔

"چوہدری صاحب! آپ چلیں، میں آتی ہوں۔"

"کیا کرنا چاہتی ہو میری جان؟"

"میں کچھ ٹائم کھلی فضا میں گزارنا چاہتی ہوں۔" بلی بولی۔ "میں تھوڑی دیر تک آجاؤں گی۔"

چوہدری باسط چند لمحے پیار بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ "ہونہہ۔ ٹھیک ہے۔ زیادہ دیر مت لگانا۔ تمہیں ٹھنڈ لگ سکتی ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔" بلی ایک ادا سے بولی تو چوہدری باسط کچن کے راستے اپنے بیڈروم میں چلا گیا جبکہ بلی وہیں کھڑی رہی۔ میں نے جلدی سے ویڈیو سیف کی اور سیل فون آف کر کے اسے جیب میں رکھ لیا۔ نجانے بلی کیوں رک گئی تھی بہرحال یہ میرے لیے اچھا ہوا تھا۔ میں جھاڑیوں کی اوٹ سے بلی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بلی روش پر چلتی ہوئی کوٹھی کی سائیڈ پر بنی پتلی گلی کی طرف بڑھ گئی۔ کچن میں داخل ہونے کے لیے میرے پاس بہترین موقع تھا چنانچہ میں جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلا اور جھکے جھکے انداز میں ایڑیوں کے بل لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کچن کی طرف بڑھ گیا۔ میں کچن کا دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ مجھے بلی کے چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ واپس آرہی تھی۔

میں نے جلدی سے کچن میں داخل ہو کر اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو مجھے سنک کے اوپر دیوار پر چھوٹی سی ایک نوکری دکھائی دی جس میں اسٹیل کے چمچوں کے علاوہ ایک چھری بھی موجود تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر چھری اٹھائی اور بلی کے آنے سے پہلے ہی راہداری میں آگیا۔ راہداری کافی وسیع و عریض تھی اور آمنے سامنے چار کمرے بنے ہوئے تھے۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ چوہدری باسط کا بیڈروم کون سا ہے۔ اسی لمحے مجھے بلی کے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں تو میں پریشان ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کہاں چھپوں۔ ابھی یہ سوچ میرے ذہن میں گردش کر رہی تھی کہ اسی لمحے بلی کچن سے نکلی اور ایک کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ چونکہ اس کی میری طرف پشت تھی اس لیے اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ یکدم میرے دماغ میں ایک فلم کا سین چلنے لگا جس میں ہیرو چھری کے ساتھ ایک لڑکی کو کور کرتا ہے لیکن میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا کیونکہ بلی ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی تھی اور میری آنکھوں کے سامنے دروازہ بند ہونے کے بعد لاک گھوما تھا۔

میں جھنجلا کر رہ گیا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میرا سارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ میں اس لڑکی کو قابو کر کے چوہدری باسط تک پہنچنا چاہتا تھا لیکن میرا اناڑی پن میرے آڑے آگیا تھا۔ گو میں تجربہ کار نہیں تھا اور زندگی میں پہلی بار مگرمچھوں سے ٹکرایا تھا لیکن مجھے تجربہ ہوتا جا رہا تھا۔

میرے پاس چوہدری باسط کے خلاف ثبوت آگیا تھا اسی لیے میں نے اس ثبوت کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ جب میں چوہدری باسط کو اس کی کارستانیوں کے بارے میں بتاؤں گا اور ویڈیو بھیجوں گا تو وہ نہ صرف میرے سامنے سرنڈر ہو جائے گا بلکہ مجھے چوہدری ساجد کے بارے میں بھی بتانے پر مجبور ہو جائے گا چنانچہ میں واپس مڑ کر کچن میں آگیا۔ کچن کی لائٹ بدستور آن تھی۔ میں نے چھری میز پر رکھی اور دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں دیوار کود کر کوٹھی سے باہر نکلا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا سڑک کی طرف بڑھ گیا۔ اتنی رات کو سواری ملنا مشکل امر تھا، اس لیے پیدل ہی بڑھنے لگا۔

کافی دور آنے کے بعد قسمت نے یاوری کی اور مجھے ایک رکشا مل گیا۔

جب میں گھر پہنچا تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ اذانیں ہو رہی تھیں۔ دروازہ مریم نے ہی کھولا تھا۔ وہ ابھی تک میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو اس کی جان میں جان آئی اور چہرے پر بشاشت پھیل گئی۔ میں تھکا ہوا تھا اس لیے اپنے کمرے میں جاتے ہی بستر پر لیٹ گیا۔ میں بھی مطمئن تھا کیونکہ اب چوہدری ساجد کے بارے میں معلوم کرنا میرے لیے کسی طرح بھی ناممکن نہیں تھا۔

☆.....☆

میرے پاس کمپیوٹر تو تھا لیکن پرنٹر کی سہولت نہیں تھی۔ مجھے چوہدری باسط کی تصویریں بنوا کر اسے بھیجنی تھیں مگر میں یہ کام باہر کے کسی اسٹوڈیو سے نہیں کروا سکتا تھا۔ ایسا کرنے سے معاملہ لیک بھی ہو سکتا تھا۔ میں ہر کام محتاط ہو کر کرنا چاہتا تھا اس لیے کافی سوچ و بچار کے بعد مجھے اپنے دوست عبید کا خیال آگیا۔

عبید میرا کالج فیلو تھا۔ اس نے ایف اے کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا کیونکہ غربت آڑے آگئی تھی۔ اس نے

مارکیٹ میں کمپیوٹر کی شاپ کھول لی تھی۔ وہ شادی کارڈ، وزیٹنگ کارڈ اور چھپائی کے دوسرے کام کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھار اس سے میری ملاقات ہو جاتی تھی چنانچہ میں نے اپنے کمپیوٹر پر پہلے چوہدری باسط کی تصویریں Save کیں پھر انہیں یو ایس بی میں ٹرانسفر کر کے اگلے روز عبید کی شاپ پر پہنچ گیا۔ وہ مجھے کافی عرصے کے بعد دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔

"یار! کہاں غائب ہو۔ تم تو ایسے غائب ہو گئے ہو جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نے کہاں جانا ہے، یہیں ہوں۔"

"آج بھی ویسے کے ویسے ہیرو دکھائی دیتے ہو۔" عبید نے میری تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "جیسے کالج کے دور میں تھے۔"

"تم بھی کم نہیں ہو۔"

میری بات پر اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"خیر چھوڑو یہ بتاؤ آج میری یاد کیسے آ گئی؟"

میں نے کہا۔ "یار! چند تصویروں کے کلر پرنٹس چاہئیں تھے۔"

"لے لو جتنے چاہو پرنٹ۔"

"شکریہ۔"

"اچھا تم بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آج لڑکا چھٹی پر ہے اس لیے سارے کام مجھے خود کرنے پڑ رہے ہیں۔"

وہ میرے لیے کھانے پینے کی چیزیں لینے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے چار تصویروں کے پرنٹ خود ہی نکال لیے اور انہیں ایک لفافے میں ڈال کر لفافہ اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد عبید آ گیا۔ اس نے میری اچھی خاصی خاطر تواضع کی۔ ہم نے کالج دور کی یادگاریں تازہ کیں پھر ایک گھنٹے کے بعد میں وہاں سے اپنے گھر آ گیا۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نے لفافہ کھول کر تصویریں نکالیں اور غور سے انہیں دیکھنے لگا۔ ایک تصویر میں چوہدری باسط نجلی کے ساتھ کھڑا تھا جبکہ دوسری تصویر میں چوہدری باسط نجلی کے رخسار کا بوسہ لے رہا تھا۔ یہ تصویریں میرے لیے بے حد قیمتی تھیں۔ جب چوہدری باسط دیکھے گا تو اس کے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھے گی اور پھر وہ میرے اشاروں پر ناچے گا۔ بہرحال میں نے دو تصویریں چوہدری باسط کی کوٹھی پر ٹی سی ایس کرا دیں۔ میں جانتا تھا کہ میرا بھیجا گیا پیکٹ چوہدری باسط کو شام تک مل جائے گا۔ ساتھ ہی میں نے ایک چٹ بھی رکھ دی تھی جس پر میں نے اپنا رابطہ نمبر لکھا تھا۔

چٹ پر جو نمبر میں نے لکھا تھا وہ سم کافی عرصے سے بند پڑی تھی اور اس کا نمبر بھی کسی کے پاس نہیں تھا۔ چونکہ وہ گولڈن نمبر تھا اس لیے میں نے خریدا تھا لیکن استعمال کم کم ہی کرتا تھا۔ آج میں نے وہ نمبر ایکٹو کرا لیا تھا۔ میرے پاس ایک پرانا سیل فون موجود تھا۔ میں نے گولڈن نمبر والی سم اسی پرانے سیل فون میں لگا لی تھی۔

مجھے چوہدری باسط کی کال کا انتظار تھا۔ میں جانتا تھا کہ جیسے ہی وہ اپنی تصویریں دیکھے گا تو مجھے فوراً ہی کال کرے گا۔

پھر وہی ہوا۔ شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے جب میرے سیل فون پر انجانا سا نمبر جگمگانے لگا۔ میرے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ اب اونٹ پہاڑ کے نیچے آ رہا تھا۔ میں نے فون اٹینڈ کر کے کان سے لگا لیا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف سے چوہدری باسط کی آواز سنائی دی تو میری مسکراہٹ گہری ہو گئی لیکن میں نے چوہدری باسط کے ہیلو کا جواب نہ دیا۔ میں نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔ چند سیکنڈ کے بعد چوہدری باسط کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔

"ہیلو۔ کیا تم مجھے سن رہے ہو؟"

"جی سن رہا ہوں۔" میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"کون ہو تم اور یہ کیا مذاق ہے؟"

"مذاق..... کیسا مذاق؟" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

چوہدری باسط کی آواز سنائی دی۔ "میں ان تصویروں کی بات کر رہا ہوں جو تم نے مجھے بھیجی ہیں۔ کون ہو تم اور کیسے میری تصویریں بنائی ہیں۔"

"میں کون ہوں، جب میں تمہارے سامنے آؤں گا تو تم مجھے پہچان جاؤ گے۔ رہی بات تصویریں کھینچنے کی تو میں نے اپنے سیل فون سے بنائی ہیں۔" میں نے چشم تصور میں چوہدری باسط کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے سر کے بال نوچ رہا ہو۔

دوسری طرف چوہدری باسط جھنجلایا ہوا تھا۔ "کیا بکواس کر رہے ہو؟ میں پوچھ رہا ہوں، کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟"

میں نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "چوہدری صاحب۔ ان تصویروں کو دیکھ کر کتنے بے صبرے ہو رہے ہو۔ یہ جاننے کے لیے بے چین ہو کہ میں کون ہوں اور یہ تصویریں تمہیں بھیج کر تم سے کیا چاہتا ہوں۔"

"ہاں، یہی تو پوچھ رہا ہوں۔" وہ حلق کے بل چلایا۔

"چوہدری صاحب! سوچو، اگر میں یہی تصویریں میڈیا کو دے دوں تو تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ مجھے یہ تصویریں دے دینی چاہئیں۔ کم سے کم دنیا کو تمہارے مکروہ چہرے کا علم تو ہو۔ لوگ جسے سیجا سمجھتے ہیں وہ دراصل کتا رو سیاہ ہے۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود تم نے داشتہ رکھی ہوئی ہے۔" میں نے اس بار زہر خند لہجے میں کہا تو دوسری طرف خاموشی طاری ہوگئی۔ شاید چوہدری باسط کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ میری بات کا کیا جواب دے۔ بالآخر وہ بولا۔

"دیکھو، تم ایسا نہیں کرو گے۔"

"اچھا، کون روکے گا مجھے۔"

"دیکھو، اگر تم نے ایسا کیا تو میں حشر برا کردوں گا۔" الفاظ سخت تھے مگر لہجہ ہارے ہوئے جواری کی طرح تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے پیسوں کی خاطر ایسا کیا ہے بلکہ شاید بلی نے ایسا کروایا ہے۔ وہ چند روز سے مجھ سے پیسوں کا تقاضا کررہی تھی۔ جب میں نے اس کی بات نہیں مانی تو اس نے اوچھا ہتھکنڈا استعمال کرلیا۔"

چوہدری باسط روانی میں ہی بولتا جارہا تھا اور اس نے بلی سے تعلقات استوار ہونے کا اعتراف بھی کرلیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا خیال تھا کہ بلی نے ہی پیسوں کی خاطر مجھ سے ایسا کام کروایا ہے۔ یعنی وہ مجھے بلی کا ساتھی سمجھ رہا تھا۔ جب اسے اپنی بات کا ادراک ہوا تو وہ گڑبڑا گیا۔ اس نے پوچھ۔ "بلی تمہاری کیا لگتی ہے؟"

"میں بلی کو نہیں جانتا۔" میں نے جواب دیا۔ "اور نہ ہی اس کے کہنے پر میں نے تمہاری تصویریں بنائی ہیں۔"

"تو۔۔۔ تو پھر تم کون ہو؟" چوہدری باسط کی ہسٹریائی آواز سنائی دی۔ "کیا تم رات کو میری کوٹھی۔۔۔۔"

میں نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں، میں رات شہزاد کالونی والی تمہاری کوٹھی میں موجود تھا اور میں نے تمہاری ویڈیو بنائی تھی جب تم بلی کے ساتھ تھے۔ مجھے دیر ہو گئی تھی ورنہ میں تمہارے بیڈروم میں کیمرا فٹ کردیتا۔"

چند لمحے دوسری طرف خاموشی طاری رہی پھر چوہدری نے کہا۔ "لیکن تم میری کوٹھی میں کیسے داخل ہوئے تھے؟ تم مجھے کیمرے میں دکھائی کیوں نہیں دیئے تھے؟"

"اس بات کو رہنے دو چوہدری صاحب۔" میں نے کہا۔

"کام کی بات کی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔"

"ہونہہ۔ پھر بتادو کہ تم کیا چاہتے ہو؟ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

چوہدری باسط کا لہجہ کاٹ دار تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ اگر میں اس کے سامنے ہوتا تو وہ مجھے شاید کچا ہی چبا جاتے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ کرتا۔ اس کی پریشانی پر میں بے حد محظوظ ہورہا تھا۔ میں نے اس وقت حاضر دماغی اور تحمل کا مظاہرہ کیا تھا جب چوہدری باسط، بلی کے ساتھ تھا۔ قدرت نے چوہدری باسط کو بے نقاب کرنے میں میری مدد کی تھی۔ ویسے بھی اخبارات میں آئے روز چوہدری باسط جیسے سیاستدانوں کے اسکینڈلز کی خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اگر چوہدری باسط کے اسکینڈل کی خبر شائع ہوجائے گی یا چینل پر چلے گی تو یہ اچنبھے کی بات نہیں ہوگی۔ میرے مشاہدے میں تھا کہ ہائی سوسائٹی میں جتنے بھی بڑے لوگ ہیں چاہے وہ سیاستدان ہیں، فنکار ہیں یا بیوروکریٹ، کسی نہ کسی کا کسی عورت کے ساتھ تعلق ضرور ہوتا ہے اور جب ان کا سکینڈل منظر عام پر آتا ہے تو ان کی جان پر بن آتی ہے اور وہ صفائیاں دیتے نہیں تھکتے۔

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنے لہجے پر آتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟"

"یہ تو مل کر ہی بتاؤں گا۔"

"ابھی بتاؤ۔"

"سوری۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں فون پر نہیں بتا سکتا۔ میں تم سے آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا میں تمہیں جانتا ہوں؟" چوہدری باسط کی چبھتی ہوئی آواز سنائی دی تو میرے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ میرا خیال تھا کہ چوہدری باسط کے شاطر دماغ میں میرا خیال ضرور آیا ہوگا اس لیے اس نے یہ بات کی تھی۔

"یہ بات زیادہ اہم نہیں ہے چوہدری صاحب۔" میں نے کہا۔ "اگر تم مجھ سے ملنے کے لیے راضی ہو تو بتاؤ۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"ہونہہ۔ کہاں ملنا ہے؟" چند لمحوں کے بعد چوہدری باسط نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

"جگہ کا انتخاب تم کرو۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے، تم اسی کوٹھی میں آجاؤ۔" اس کا اشارہ شہزاد کالونی والی کوٹھی کی طرف تھا۔

"نہیں، اس کوٹھی میں نہیں، کسی اور جگہ۔" میں نے کہا۔

چوہدری باسط سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ مجھے پھانسنے کے لیے چالاکی کا مظاہرہ کرسکتا تھا لیکن وہ کایاں آدمی تھا۔

''پھر تم ہی بتادو کہ میں تم سے کہاں ملوں؟'' چوہدری باسط کے لہجے میں بیزاریت نمایاں تھی۔

''کسی ہوٹل میں یا.....''

چوہدری باسط نے میری بات کاٹ دی۔ ''ٹھیک ہے، ہم گلستان ہوٹل میں ملتے ہیں۔ کب ملنا ہے؟''

''آج ہی مل لیتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں گلستان ہوٹل پہنچ رہا ہوں۔ تم بھی پہنچ جاؤ۔'' چوہدری باسط نے ہامی بھرتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں بے چینی اور بے قراری واضح تھی۔ ویسے بھی وہ یہ بات کل پر نہیں چھوڑ سکتا تھا کیونکہ اسے اپنی سیاست، اپنی عزت اور ساکھ کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

''میں آرہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ لیکن ایک بات اپنے دماغ میں بٹھالو چوہدری صاحب۔ تمہیں اکیلے آنا ہوگا۔ اگر تم نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو یاد رکھو، نقصان تمہارا ہی ہوگا۔ میرا ایک دوست ایک چینل میں کام کرتا ہے۔ میں نے تمہاری ویڈیو اسے دے دی ہے اور کہا ہے کہ اگر مجھے کچھ ہوجائے تو اس کا ذمے دار چوہدری باسط ہوگا اور یہ ویڈیو تم چینل پر چلوادینا۔''

''ٹھیک ہے، میں اکیلا ہی آؤں گا۔'' چوہدری باسط نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

میں نے آج رات نو بجے گلستان ہوٹل کا کہہ کر کال منقطع کردی۔ میرے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں چوہدری باسط کے ذریعے چوہدری ساجد تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔ بات وہی تھی کہ مجھے چوہدری باسط پر یقین نہیں تھا لیکن لڑکیوں کی اسمگلنگ کرنے والے گینگ تک پہنچنے کے لیے مجھے یہ رسک لینا تھا۔

گلستان ہوٹل ہمارے شہر کا گویا فائیو اسٹار ہوٹل تھا۔ وہاں زیادہ تر غیر ملکی ٹھہرتے تھے۔ میں اس ہوٹل میں پہلی مرتبہ جارہا تھا اس لیے میں نے اچھے لباس کا انتخاب کیا تھا۔ تیار ہونے کے بعد جب میں نے آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیا تو میں واقعی کسی ''ہیرو'' سے کم دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے تیار ہونے سے ایسے لگتا تھا جیسے میں کسی فنکشن میں جارہا ہوں۔ جب میں تیار ہوکر جانے لگا تو مریہ میرے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ وہ مجھے سوٹڈ بوٹڈ دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''بھائی اتنے تیار ہوکر کہاں جارہے ہو؟''

''کسی سے ملنے جارہا ہوں۔''

''کس سے؟''

''چوہدری باسط سے۔''

''یہ کون ہے؟'' وہ حیران ہوئی۔

میں نے اسے چوہدری باسط اور اس سے ملنے کا مقصد بتایا تو مجھے اس کی آنکھوں اور چہرے پر خوف کے سائے دکھائی دیئے۔

''بھائی! اپنا خیال رکھنا۔'' وہ خوف بھرے لہجے میں بولی۔ ''مجھے تو خطرے کی بو آرہی ہے۔''

اس کی بات سن کر میں ہنسا۔ ''ارے پریشان نہ ہو، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔''

''اللہ آپ کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ آمین۔''

''میں مانتا ہوں کہ میں بھڑوں سے بھڑنے والا ہوں اور اکیلا بھی ہوں پھر بھی میں اب پیچھے ہٹنے والا نہیں۔ لڑکیوں کی اسمگلنگ انتہائی مکروہ فعل ہے۔ ایسے لوگ سماشرے کا ناسور ہیں۔ ان کو بے نقاب کرنا ضروری ہے۔ مجھے اپنی بہن تک پہنچنے کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے تو میں کروں گا۔ ہوسکتا ہے اس طرح دوسری لڑکیاں بھی محفوظ رہیں۔''

''آپ کا جذبہ نیک ہے بھائی!'' وہ نم لہجے میں بولی۔ ''لیکن ایسے لوگ بے حد خطرناک ہوتے ہیں۔ آپ کو انتہائی محتاط رہنا ہوگا۔''

''جانتا ہوں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میں خود بھی احتیاط برت رہا ہوں کیونکہ اکیلا ہوں۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ انہیں عقل سے گھما گھما کر شکست دوں گا۔''

''انشاء اللہ۔''

میں گھر سے نکل کر سڑک پر آیا جیسے ہی میں سڑک پر پہنچا مجھے آٹو رکشا مل گیا۔ آٹو رکشے میں سوار ہونے کے بعد میں نے ڈرائیور کو گلستان ہوٹل چلنے کا کہا۔ اس نے رکشا آگے بڑھا دیا۔ میرے گھر سے گلستان ہوٹل تک کا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ لہٰذا رکشا ڈرائیور نے پچیس منٹ میں مجھے گلستان ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ میں وقت کا بے حد پابند ہوں اس لیے میں نو بجے سے پانچ منٹ پہلے ہی ہوٹل پہنچ گیا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں پھر ہوٹل میں داخل ہوا اور ہال کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

ہال میں داخل ہونے کے بعد میں اطراف کا جائزہ لینے

لگا۔ درجن بھر غیر ملکی موجود تھے جن میں عورتیں، مرد، لڑکے اور لڑکیاں شامل تھیں۔ ایک میز کے پیچھے رکھی کرسی پر بیٹھے آدمی پر نظر ٹھہر گئی۔ وہ ہلکے نیلے رنگ کے قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا۔ چونکہ مجھے اس کا پہلو دکھائی دے رہا تھا اس لیے میں یہی سمجھا کہ یہی چوہدری باسط ہے لیکن میں اپنی تسلی کرنا چاہتا تھا۔

اسی اثناء میں ایک باوردی ویٹر میرے پاس آیا اور نرم و شائستہ لہجے میں بولا۔ "سر! کیا آپ کی سیٹ ریزرو ہے؟"

"نہیں۔" میں نے بھی شائستہ لہجے میں جواب دیا۔

"دراصل مجھے کسی نے انوائٹ کیا ہے لیکن شاید وہ ابھی تک نہیں پہنچے۔"

"کس نام سے ان کی ٹیبل ریزرو ہے؟"

"چوہدری باسط کے نام سے۔" میں نے کہا۔

"چوہدری باسط۔" اس نے زیر لب نام دُہرایا اور پھر مڑ کر اس طرف دیکھنے لگا جدھر ٹیبل کی دوسری طرف پڑی کرسی پر وہ آدمی بیٹھا تھا جس پر مجھے چوہدری باسط ہونے کا گمان تھا۔ ویٹر اس آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ بولا۔ "سر! وہ چوہدری باسط صاحب بیٹھے ہیں۔"

اسی لمحے اس آدمی نے گردن موڑ کر ہال کے داخلی و خارجی دروازے کی طرف دیکھا تو میں اندر ہی اندر بے اختیار چونک پڑا۔ وہ چوہدری باسط تو نہیں تھا لیکن اس کا ہمشکل ضرور دکھائی دے رہا تھا۔ شاید اس پر چوہدری باسط کا گیٹ اپ کیا گیا تھا۔ اگر میں نے چوہدری باسط کو قریب سے نہ دیکھا ہوتا تو اسے ہی چوہدری باسط سمجھتا۔ یہ تو میرے لیے اچھا ہو گیا تھا کہ میں اس کے پاس نہیں گیا تھا۔ یقیناً چوہدری باسط نے مجھے پھانسنے کے لیے چال چلی تھی۔

وہ آدمی قدرے بے چین دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کبھی گھڑی کی طرف دیکھتا تو کبھی ہال کے داخلی و خارجی دروازے کی طرف۔

"آیئے سر! میں آپ کو چوہدری باسط صاحب کی ٹیبل تک پہنچا دوں۔"

"نو تھینکس۔ میں پہلے واش روم جانا چاہتا ہوں۔"

"اوکے سر۔"

"واش روم کس طرف ہے۔" میں نے بہانہ بناتے ہوئے کہا تو ویٹر نے میری رہنمائی کی۔ مجھے واش روم جانے کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ ویٹر کسی شک میں مبتلا ہو۔ جب ویٹر واپس چلا گیا تو میں واش روم میں جانے کی بجائے ہوٹل کے خارجی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں خارجی دروازہ عبور کر کے راہداری میں آیا اور سیل فون نکال کر چوہدری باسط کو کال کرنے لگا۔ تیسری بیل پر ہی اس نے فون اٹھا لیا۔

"ہیلو۔" اس کا لہجہ گمبھیر تھا۔

"چوہدری صاحب۔ تم ابھی تک ہوٹل نہیں پہنچے۔ میں کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب۔ میں تو آدھے گھنٹے سے ہوٹل میں موجود ہوں۔" چوہدری باسط کی چونکتی ہوئی آواز آئی۔ "تم ابھی تک نہیں آئے۔"

"میں بھی ہوٹل میں موجود ہوں۔"

"کہاں ہو؟"

"تم بتاؤ تم کہاں ہو؟"

"میں نے کہا ناں کہ میں ہال میں موجود ہوں۔"

"نہیں۔ میں نے سارا ہال دیکھ لیا ہے۔ تم کہیں موجود نہیں ہو۔" میں نے کہا۔

"میں نے ہلکے نیلے رنگ کا لباس پہنا ہوا ہے۔"

"تم کسی اور کو الو بناؤ چوہدری۔"

"مطلب؟" چوہدری باسط بولا۔

"تم سمجھتے ہو کہ تم اپنی جگہ کسی اور کو اپنے گیٹ اپ میں بھیج کر مجھے الو بنانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یہ تمہاری خام خیالی ہے۔"

دوسری طرف گمبھیر خاموشی رہی پھر چوہدری باسط کی آواز مجھے سنائی دی۔ "کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟"

مجھے اس کے احمقانہ لہجے پر ہنسی آ گئی۔ وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ میں نے اس کی ویڈیو بنائی تھی پھر وہ ملک کی مشہور سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتا تھا۔

"چوہدری صاحب! تم احمق ہو یا جان بوجھ کر بننے کی کوشش کر رہے ہو۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو۔" چوہدری باسط بھڑک اٹھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم نے پوچھا کہ کیا میں نے تمہیں دیکھا ہوا ہے، عقلمند آدمی غور کرو کہ میں نے تمہاری ویڈیو بنائی تھی تو ظاہر ہے تمہیں پہچانتا بھی ہوں۔"

دوسری طرف گہری خاموشی رہی۔ نجانے چوہدری باسط کیا سوچ رہا تھا۔ شاید اسے اپنی احمقانہ چال کا ادراک ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تم نے اپنی جگہ کسی اور کو بھیج کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تم بہت چالاک، شاطر اور کایاں ہو۔ تم سیاست میں ہو پھر بھی ایسی احمقانہ حرکت کرو

کہ تمہیں حیرت ہو رہی ہے۔" میرے لہجے میں طنز تھا۔ چوہدری باسط نے میری بات کاٹ دی۔

"میری بات سنو......"

میں نے اسے بولنے کا موقع ہی نہ دیا۔ "تم ایک دھوکے باز اور مکار انسان ہو۔ تم قابل اعتبار نہیں ہو اس لیے میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ تم آج رات بارہ بجے والی نیوز پر اپنی ویڈیو دیکھ لینا بلکہ صبح کے اخبارات میں بھی اپنے اسکینڈل کے بارے میں تفصیل سے پڑھ لینا۔"

"نہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"میں ایسا کروں گا۔" میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے اور تمہاری یہی سزا ہے تاکہ عوام کو بھی پتا چلے کہ سیاست دانوں کا اصل چہرہ کتنا مکروہ ہے۔"

"ہاں میں مانتا ہوں کہ میں نے تم سے دھوکا کیا ہے۔" چوہدری باسط نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "دراصل میں ایک اہم کام میں مصروف تھا اس لیے میں خود نہیں آسکا اور میں نے اپنے کارندے کو بھیج دیا۔"

"میں نہیں مان سکتا۔" میں نے کہا۔ "تم نے مجھے گھیرنے کی کوشش کی ہے اور یقیناً ہوٹل کے آس پاس بھی تمہارے کارندے خفیہ طور پر موجود ہوں گے۔"

"ہم کل مل لیتے ہیں۔ میں خود تم سے ملوں گا۔" چوہدری باسط نے میری بات نظر انداز کردی۔

"اب کوئی فائدہ نہیں چوہدری صاحب۔" میں نے کہا۔ "پانی سر سے گزر چکا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کل تم خود آنے کی بجائے مجھے اغوا کروالو۔ نہیں چوہدری، میں تمہارے جھانسے میں آنے والا نہیں ہوں۔"

میرا انداز قطعی تھا کہ چوہدری باسط نے جلدی سے کہا۔ "نہیں، پانی ابھی سر سے نہیں گزرا۔ میرا یقین کرو، کل میں خود تم سے ملنے آؤں گا۔"

"سوری، میں یقین نہیں کرسکتا۔"

"تمہیں یقین کرنا ہوگا۔"

"یہ دھمکی ہے۔"

"نہیں، میری التجا ہے۔" چوہدری باسط نے کہا۔ اسے اپنی عزت بچانے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

"سوری۔" اتنا کہہ کر میں نے کال منقطع کردی اور سیل فون آف کر کے اسے پتلون کی جیب میں رکھا اور ٹہلنے کے انداز میں آگے بڑھ گیا۔ راہداری عبور کر کے میں سیڑھیاں اتر

ہم لوگ (ڈپٹی نذیر احمد) بہت غریب تھے۔ نہ کھانے کو روٹی نہ پہننے کو کپڑا۔ وہ بدبخت جس کے بعض معیت مند رشتہ دار دلی میں دست کاری سے اور بجنور میں کاشت کاری سے اپنا پیٹ پالتے، انیسویں صدی کے وسط میں اس نے باپ (مولوی سعادت علی) سے پرانے قاعدے پر پڑھنا شروع کیا۔ سب سے پہلے قرآن پڑھا مگر وہی طوطے کی طرح۔ میں نے جو قرآن کے اس پڑھنے کو طوطے کی طرح کا پڑھنا کہا تو اس سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ میں اس طرح کے پڑھنے کو تضیع وقت سمجھتا ہوں۔ ایک کم سن بچہ جس نے تحصیل علم کے میدان میں پہلا قدم رکھا ہے اس سے زیادہ اور کیا کر بھی سکتا ہے۔ طوطے کی طرح کا پڑھنا بھی خاص کر مسلمانوں کے بچوں کے لیے ضرور مفید ہے۔ قرآن کے پڑھنے سے حروف عربی کے مخارج پر ان کی زبان توفیق ہے جو اردو کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ بہر کیف میں بڑے فخر اور بڑی مسرت کے ساتھ اس کا اعلان کرتا ہوں کہ میری تعلیم قرآن سے شروع ہوئی۔

اقتباس: مشاہیر کی آپ بیتیاں، از عظیم الشان صدیقی

مرسلہ: افتخار زیدی۔ لاہور

رہا تھا کہ اسی لمحے مجھے شانزے آتی دکھائی دی۔ حسب معمول اس کی کیلی ماریہ اس کے ساتھ تھی۔ شانزے نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ میری طرف آئی۔

"ارے علی تم۔" مجھے دیکھ کر بولی۔

ہم اس حد تک بے تکلف ہو چکے تھے کہ ہم ایک دوسرے کو "تم" کہہ کر پکارتے تھے۔

"شکریہ۔" میں نے کہا۔ "تم کیسی ہو شانزے۔"

شانزے مجھے ستائشی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ مجھے سوٹڈ بوٹڈ دیکھ کر خوش ہوگئی تھی۔ ہماری ملاقات بھی تقریباً تین ہفتوں کے بعد ہو رہی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم یہاں کیسے؟"

"ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔"

"ہونہہ۔ ملاقات ہوگئی۔"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میرے دوست کو کوئی ضروری کام پڑ گیا تھا اس لیے وہ نہیں آیا۔"

"اب کہاں جا رہے ہو؟"

"گھر جا رہا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ اس دوران ماریہ بھی ہمارے قریب آ گئی تھی۔ اس نے بھی مجھے ہیلو کہا تو میں نے بھی ہیلو کہہ کر جواب دیا۔ میں نے نوٹ کیا تو ماریہ بھی ستائشی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ماریہ سے میری یہ دوسری ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات اسپتال میں ہی ہوئی تھی جب میرا چہرہ پٹیوں میں چھپا ہوا تھا۔

"ہم ڈنر کرنے آئے ہیں۔" شانزے بولی۔ "اگر تمہارا موڈ ہو تو ہمارے ساتھ آ جاؤ۔"

میں نے پس و پیش سے کام لینا چاہا۔ "لیکن....."

"فکر نہ کرو بل میں پے کروں گی۔" وہ شرارتی لہجے میں بولی تو میں مسکرا دیا۔

"تمہاری دوست کو برا لگ سکتا ہے؟"

"نہیں۔ اسے کیوں برا لگے گا۔" شانزے بولی۔ پھر وہ ماریہ کی طرف دیکھنے لگی۔ "ماریہ! علی کا ہمارے ساتھ ڈنر کرنا تمہیں برا تو نہیں لگے گا ناں۔"

"نہیں۔ مجھے کیوں برا لگے گا۔" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"سن لیا؟" شانزے بولی۔

"ہاں۔" میں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی۔ پھر ہم تینوں ہی ہال کی طرف بڑھ گئے۔ جب ہم ہال کے داخلی دروازے کے قریب پہنچے تھے تو میں نے اسی آدمی کو بے چینی سے باہر آتے دیکھا تھا۔ اس نے ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے ایک اچٹتی نظر ہم سب پر ڈالی تھی اور پھر باہر چلا گیا تھا۔ اسے بے چین دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ چوہدری باسط نے اسے فون کر کے بتا دیا ہوگا کہ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔

شانزے نے پہلے سے ہی ٹیبل ریزرو کروائی ہوئی تھی۔ اس نے ویٹر سے کہہ کر میرے لیے بھی کرسی لگوا دی تھی۔ شانزے کے آرڈر کرنے کے بعد ہم باتیں کر رہے تھے کہ اسی اثناء میں وہی ویٹر آ گیا جس نے واش روم تک رہنمائی کی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

"سر! آپ کہاں چلے گئے تھے؟ چوہدری باسط صاحب آپ کا انتظار کر کے چلے گئے ہیں۔"

"میری ان سے بات ہو گئی تھی۔" میں نے بات بنائی۔ "تمہارا شکریہ۔"

"یو ویلکم سر۔" ویٹر نے مؤدبانہ لہجے میں کہا اور پھر وہ وہاں سے چلا گیا تو میں نے شانزے کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر حیرت و پریشانی کے ملے جلے تاثرات ابھرے تھے۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ حیران و پریشان کیوں ہو گئی تھی۔ میں نے ماریہ کی طرف دیکھا تو اس کی حالت بھی شانزے سے کم نہیں تھی۔

"یہ چوہدری باسط کون ہے اور تم ان سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟" شانزے کے لہجے میں دنیا بھر کی حیرت سموئی ہوئی تھی جو میرے لیے اچنبھے کی بات تھی۔

"میرا جاننے والا ہے۔" میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ "اسی نے مجھے یہاں بلایا تھا لیکن وہ خود نہیں آیا۔"

"یہ چوہدری باسط وہ تو نہیں جو سیاست میں ہے؟" شانزے نے پوچھا۔ شاید وہ تجسس میں مبتلا ہو گئی تھی۔

"ارے نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں نے کہا ناں کہ میرا جاننے والا ہے۔ اب ضروری تو نہیں... کہ چوہدری باسط صرف ایک ہی ہو۔"

"ہونہہ۔" شانزے نے ہنکارا بھرا۔ اس کے چہرے پر اب سکون کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"آپ جاب کیا کرتے ہیں؟" اچانک ماریہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"میں..... مس شانزے نے آپ کو بتایا نہیں؟"

"نہیں۔"

"میں ایک سرکس میں بطور کیشئر جاب کرتا ہوں۔" میں نے جواب دیا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ویٹر نے کھانا سرو کرنا شروع کر دیا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم نے کافی پی۔ شانزے نے بل ادا کر دیا تو ہم ہال سے باہر آ گئے۔

باہر کا موسم بے حد خوشگوار تھا۔ آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

"کیا تمہارے پاس سواری ہے؟" شانزے نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ میری موٹر بائیک چوری ہو گئی ہے اور پولیس ابھی تک اسے بازیاب نہیں کر سکی۔" میں نے جواب دیا۔

"آؤ پھر، ہم تمہیں ڈراپ کر دیتے ہیں۔" اس نے مجھے آفر کی۔

"نہیں۔ تم جاؤ۔ میں آٹو رکشے سے چلا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"ہم بھی ادھر ہی سے جائیں گے۔ اب انکار مت کرنا۔"

شانزے نے لاڈ بھرے لہجے اور انداز میں کہا تو میرے پاس اس کی بات ماننے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ البتہ ماریہ بدستور خاموش تھی۔ وہ یا تو کم گو تھی یا میری وجہ سے زیادہ نہیں بولتی تھی۔ میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی تھی۔ شانزے دل و جان سے مجھ پر نچھاور ہو چکی تھی اور میں بھی اس کے سحر میں گرفتار ہو چکا تھا۔

مجھے میرے گھر کے باہر ڈراپ کرنے کے بعد شانزے اور ماریہ دونوں چلی گئیں تو میں گھر آ گیا۔ میرے پاس لاک کی ایکسٹرا چابی تھی اس لیے میں نے بیل نہیں بجائی تھی لیکن جب میں مرینہ کے کمرے کے سامنے سے گزرنے لگا تو مرینہ کے کمرے کی لائٹ آن تھی۔ شاید وہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ بیڈ پر بیٹھتے ہی میں نے پتلون کی جیب سے سیل فون نکالا اور اسے آن کر دیا۔ چند ہی سیکنڈ گزرے تھے کہ چوہدری باسط کی کال آ گئی۔ میں کافی دیر تک فون کی اسکرین دیکھتا رہا لیکن میں نے کال اٹینڈ نہ کی۔ میں چاہتا تھا کہ چوہدری باسط کی آج رات کی نیند حرام ہو جائے۔ وہ سونے کی کوشش کرے لیکن اسے نیند نہ آئے۔ اس کی بے چینی اتنی بڑھ جائے کہ اسے ایک لمحے کے لیے بھی سکون میسر نہ ہو۔ میں نے فون اٹینڈ کر کے سیل فون کان سے لگا لیا۔

"ہیلو۔" چوہدری باسط کی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تو میں نے سیل فون تھوڑا سا ہٹا لیا۔

"چوہدری صاحب۔ اتنی اونچی آواز؟ کیا میرے کان کے پردے پھاڑنا ہیں؟" میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"تمہارا فون کیوں بند تھا۔ میں کافی دیر سے تمہیں کال کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"میری مرضی کہ میں فون بند رکھوں یا آن۔ تمہیں کیا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔

"دیکھو لڑکے! تم جو کچھ مجھ سے چاہتے ہو میں وہ دینے کو تیار ہوں لیکن میری عزت کی دھجیاں مت اڑاؤ۔" چوہدری باسط نے کہا۔

"اب کوئی فائدہ نہیں ہے چوہدری صاحب۔"

"کک..... کیا مطلب۔ کیا تم نے ویڈیو چینل والوں کو دے دی ہے؟" چوہدری باسط کی ڈوبتی ہوئی آواز آئی۔

"ہاں۔"

"اوہو نہیں۔" چوہدری حلق کے بل چیخا۔ "تم نے ایسا کیوں کیا ہے۔ میں..... میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ....."

"تم نے مجھ سے دھوکا کیا ہے چوہدری۔" میں نے کہا۔ "آئی ایم سوری، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ گڈ بائی۔"

اتنا کہہ کر میں نے کال منقطع کی اور فون کو "ٹپ" پر لگا کر اسے سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر ایک طویل سانس لیتے ہوئے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا لی۔ تیس سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ میرے سیل فون کی بیپ ہوئی تو میں نے دیکھا کہ چوہدری باسط کال کر رہا تھا۔ میں مسکرا دیا۔

"آج رات تم بے چین ہو کر گزارو۔ میں تو سو رہا ہوں۔" میں نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا اور سیدھا ہو کر لیٹنے کے بعد کروٹ بدل لی اور آنکھیں موند لیں اور کچھ ہی دیر میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ رات کے نجانے کس پہر مرینہ میرے کمرے میں آئی تھی اور لائٹ آف کر گئی تھی۔

صبح میں جاگا تو بے حد کسلمندی محسوس کر رہا تھا۔ نہا دھو کر کمرے میں آ کر میں نے سیل فون اٹھا کر دیکھا تو اس پر چوہدری باسط کی چھیالیس مس کالز تھیں۔ شاید وہ ساری رات ہی مجھے کال کرتا رہا تھا۔ میں تصور کر سکتا تھا کہ چوہدری باسط نے رات کس طرح کانٹوں پر گزاری ہو گی۔ ایک ایک پل اسے اس پر بھاری گزرے ہوں گے۔ ایک لمحے کے لیے بھی وہ ٹی وی کے سامنے سے نہیں ہٹا ہو گا۔ جب اس نے ٹی وی چینل پر اپنے اسکینڈل کے حوالے سے کوئی نیوز سنی اور نہ صبح کے اخبارات میں خبر پڑھی ہو گی تو اس نے سکون کا سانس لیا ہو گا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ ابھی تک بے سکون ہو گا۔

مکروہ چہرے رکھنے والے یہ وہ لوگ ہیں؟ جن پر تھوکا جائے۔ میں نے بھی قصد کر لیا تھا کہ چوہدری باسط کو سکون سے نہیں رہنے دوں گا۔ یہ وہ مہرہ تھا جو مجھے چوہدری ساجد تک پہنچا سکتا تھا۔

ناشتا کرنے کے بعد میں نے چوہدری باسط کو کال ملائی تو اس نے فوراً ہی اٹینڈ کر لی۔

"رات کیسی گزری چوہدری؟"

"رات کسی چینل پر نہ تو میرے متعلق کوئی نیوز چلی ہے اور نہ ہی صبح کے اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ تمہاری وجہ سے میں ساری رات کانٹوں پر لوٹتا رہا ہوں۔ دیکھو، میں تم سے پھر کہہ رہا ہوں کہ وہ ویڈیو مجھے دے دو، میں تمہیں منہ مانگی قیمت دوں گا۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں مجھے مزید پریشان مت کرو۔ میری زندگی برباد ہو جائے گی۔ میرے بیوی بچے مجھ سے دور ہو جائیں گے۔"

"ہو جائیں، مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔" میرا انداز بے پروا

تھا۔ "رہی بات ویڈیو کی، تو میں نے دوست کو چلانے سے منع کر دیا تھا ورنہ تم کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتے چوہدری۔"

"آخر تم مجھ سے چاہتے کیا ہو، صاف صاف بتا کیوں نہیں دیتے؟" چوہدری باسط جھنجلایا۔

"اگر تم خود ملنے آتے تو میں بتا دیتا۔" میں نے کہا۔ "اب کیا فائدہ بتانے کا۔"

"ہونہہ۔ ہم آج مل رہے ہیں پھر۔"

"میں تمہاری بات پر کیسے یقین کر لوں؟"

"سمجھنے کی کوشش کرو۔ آج میں خود ہی آؤں گا۔"

"ہو سکتا ہے یہ بھی تمہاری چال ہو۔" میں نے کہا۔

"نہیں، میں کوئی چال نہیں چل رہا۔"

"تم سے کچھ بعید بھی تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے ہوٹل میں تمہارے آدمیوں کو دیکھ لیا تھا جو خفیہ رہ کر میری نگرانی کر رہے تھے۔"

یہ بات کر کے میں نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا جو نشانے پر لگنے کی بجائے اندھیرے میں ہی گم ہو گیا تھا۔ چوہدری صاف مکر گیا تھا۔

"نہیں۔ یہ جھوٹ ہے۔ میں نے اپنے کسی آدمی کو تمہاری نگرانی پر مامور نہیں کیا تھا۔"

"ہو سکتا ہے میرا وہم ہو۔"

"پھر آج راحت مل رہے ہیں ہاں؟"

"اپنا شیڈول دیکھ کر بتاؤں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ابھی میں بہت مصروف ہوں۔"

"تمہیں ہر صورت میں ملنا ہو گا۔" چوہدری باسط کا لہجہ التجائیہ تھا گویا اس کے کس بل نکل گئے تھے اب میں بہ آسانی اسے استعمال کر سکتا پھر بھی میں نے گمبھیر لہجے میں کہا:

"دھمکی دے رہے ہو چوہدری؟"

"نہیں۔" چوہدری باسط یکدم بھیگی بلی بن گیا۔ "میں تم سے التجا کر رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اپنا شیڈول دیکھ کر تمہیں بتاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میری کال کا انتظار کرو۔"

پھر میں نے کال منقطع کر دی اور بے اختیار میرے حلق سے قہقہہ نکل گیا۔ چوہدری باسط زندگی میں شاید اتنا بے بس کبھی نہ ہوا تھا جتنا آج میرے ہاتھوں ہو رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر چوہدری باسط کو پریشان کرنے کی خاطر سیل فون آف کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے بلی سے بھی پوچھ گچھ کی ہو گی لیکن اس بیچاری کو تو کچھ معلوم بھی نہیں تھا بلکہ ہو سکتا ہے جب چوہدری باسط نے اسے بتایا ہو گا کہ ان دونوں کی میں نے ویڈیو بنا لی ہے اور چینل و اخبارات میں دینے والا ہوں تو اس کی حالت بھی دیدنی ہو گی۔

دن کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے جب میں صحن میں کرسی پر بیٹھا نئی پلاننگ ترتیب دینے میں مصروف تھا کہ اسی اثناء میں امی کمرے سے باہر نکل آئیں۔ مریہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ امی کو دیکھ کر میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ان کی حالت ویسی ہی تھی۔ ذرا بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ میں جانتا تھا، انہیں ابھی بھی روزینہ کی فکر ہو رہی تھی اسی لیے انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"علی! روزینہ کہاں ہے۔ میں نے اس سے پوچھا ہے لیکن یہ بتاتی ہی نہیں۔" انہوں نے مریہ کی طرف اشارہ کیا تو میں نے مریہ کی طرف دیکھا۔ وہ بے چاری بے بس و لاچار دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر امی کو شانوں سے تھام کر کرسی پر بٹھا دیا، پھر میں ان کے سامنے فرش پر بیٹھنے کے بعد بولا۔

"امی! روزینہ کالج گئی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر تک آ جائے گی۔"

"آج اس نے دیر نہیں کر دی کالج سے آنے میں۔" امی نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "آج کالج میں فنکشن تھا اس لیے اسے دیر ہو گئی ہے۔"

"آئے تو سہی میں اس کی خبر لیتی ہوں۔" امی نے کہا۔ "کتنی مرتبہ کہا ہے کہ گھر سے زیادہ دیر باہر مت رہا کرے لیکن وہ میری بات سنتی ہی نہیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں، میں اسے لینے جاؤں گا۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔" امی بولیں۔ "پھر دیر کیوں کر رہے ہو، جاؤ اور اسے لے آؤ۔"

"میں جا رہا ہوں امی۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"تم بھی دیر مت کر دینا۔" امی نے مجھے تنبیہ کی۔

"جی ٹھیک ہے امی۔" میں نے کہا۔ "آئیں، میں پہلے آپ کو آپ کے کمرے میں چھوڑ آؤں۔"

"تم جاؤ، میں خود چلی جاؤں گی۔" وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولیں، پھر وہ مریہ کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی

گئیں۔ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہی اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ ماں کی بے بسی دیکھ کر میرا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ وہ اتنی لاچار اور بے بس ہوں گی میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میری ماں کو اس حالت تک پہنچانے میں سب سے اہم کردار شانی کا تھا۔ میں اسے ہی اس سب کا ذمے دار ٹھہراتا تھا۔ نہ وہ میری بہن کو اغوا کر کے فروخت کرتا اور نہ میری امی کی آج یہ حالت ہوتی۔ شانی کا خیال ذہن میں آتے ہی نفرت کی ایک لہر میرے پورے وجود میں گھوم گئی۔ میری مٹھیاں بھی خود بخود بھنچ گئی تھیں۔ اگر وہ اس روز چوہدری ساجد کے بارے میں بتا دیتا تو آج میں چوہدری ساجد تک پہنچ چکا ہوتا۔

تھوڑی دیر کے بعد مرینہ بھی امی کے کمرے سے باہر نکل آئی تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بتایا کہ امی سو گئی ہیں تو میں مطمئن ہو گیا۔

"بھائی! چائے پئیں گے؟" مرینہ نے پوچھا۔

"نہیں، رہنے دو۔" یہ کہہ کر میں کرسی سے اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "دروازہ بند کر لو۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"ایک دوست سے ملنے۔" میں نے جواب دیا۔ "تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔"

"اپنا خیال رکھیے گا۔" وہ مجھے نصیحت کرنا نہیں بھولی تھی۔

میں اثبات میں سر ہلاتا ہوا گھر سے باہر آ گیا تو مرینہ نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ گھر میں ایک طرف بڑھنے لگا۔ میرے پاس دوسرا سیل فون تھا۔ جس سیل فون میں وڈیو اور گولڈن نمبر تھا وہ سیل فون میں نے گھر رکھا ہوا تھا۔ میں کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا اس لیے وہ سیل فون ساتھ نہیں رکھا تھا۔

میں نے تو مرینہ کو یونہی کہہ دیا تھا کہ میں دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔ میں تو آوارہ گردی کی غرض سے باہر آیا تھا۔ دراصل میں کسی اکیلی جگہ پر بیٹھ کر چوہدری باسط کو گھیرنے کی پلاننگ کرنا چاہتا تھا۔ تھانے کے چکر لگانے میں نے ختم کر دیے تھے کیونکہ میں جانتا تھا کہ پولیس ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی ہے۔ وہ مجھے یہی بتائے گی کہ میری بہن کی تلاش جاری ہے۔

میں آوارہ گردی کرتا ہوا ایک پارک میں آ گیا۔ یہ پارک قدرے وسیع و عریض اور سرسبز و شاداب تھا۔ یہاں شام کو کافی رش ہوتا تھا لیکن دن کے وقت اکا دکا افراد ہی دکھائی دیتے تھے۔ یہ پارک میرے لیے یادگار تھا کیونکہ میں نے اسی پارک میں بیٹھ کر ایف اے، بی اے اور بی ایڈ کی تیاری کی تھی۔ گھر میں بیٹھ کر مجھ سے تیاری نہیں ہوتی تھی تو میں کتابیں لے کر پارک میں آ جاتا تھا۔ جب میں ایف اے میں تھا تو میرے پاس سائیکل تھی مگر جب میں نے بی اے کر لیا تو میرے والد نے کمپنی نکلنے پر مجھے موٹر بائیک لے کر دی تھی۔ بائیک لے کر میں ایسے خوش ہوا تھا جیسے مجھے قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔

میں پارک میں ایک گھنے درخت کے نیچے پڑے بینچ پر بیٹھ کر ادھر ادھر کا طائرانہ جائزہ لینے لگا۔ پارک کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا بلکہ پہلے سے زیادہ سرسبز، شاداب اور خوبصورت بنا دیا گیا تھا۔ وہاں چند مرد، خواتین اور لڑکیاں موجود تھیں۔ ایک بوڑھی عورت اور ایک لڑکی میرے سامنے سے گزرتے ہوئے پارک کے خارجی گیٹ کی طرف جا رہی تھیں۔ انہوں نے عام سے لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان کے حلیے اور لباس سے لگتا تھا کہ ان کا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔ میں نے صرف نظر کی اور گھاس پر پڑے پتے اٹھا کر ان سے کھیلتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ مجھے کسی کے چلانے کی آواز سنائی دی۔

"بچاؤ۔ بچاؤ۔"

میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا تو میری نظر پارک کے خارجی گیٹ پر ٹھہر گئی۔ گیٹ کے قریب وہی بوڑھی عورت جو میرے سامنے سے گزری تھی، ہاتھ ہلاتے ہوئے چیخ رہی تھی۔ پارک میں موجود لوگ بھی چونک پڑے تھے۔ میں اٹھا اور تیزی سے گیٹ کی طرف دوڑ پڑا۔ بوڑھی عورت مسلسل چیخ رہی تھی۔ میری طرح اور بھی کئی لوگ اس کی چیخ و پکار سن کر پہنچ گئے تھے۔ میں بھی اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اکیلی تھی۔ اس کے ساتھ جو لڑکی تھی وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"کیا ہوا اماں جی۔ آپ کیوں چیخ رہی ہیں؟" ایک نوجوان نے پوچھا۔

"وہ..... وہ..... وہ میری پوتی کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔" بوڑھی عورت نے رک رک کر بولتے ہوئے کہا تو مجھ سمیت سب ہی چونک پڑے۔

"کون اماں جی؟" اسی نوجوان نے پوچھا تو بوڑھی خاتون نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔ ہم سب نے چونک کر اس سمت دیکھا۔ ایک سفید رنگ کی وین دور ہوتی جا رہی تھی۔ قریب ہی ایک لڑکا بائیک لیے کھڑا بڑی بی کی باتیں سن رہا تھا کہ میں نے اسے دھکا دے کر گرایا اور بائیک کو تیز رفتاری سے ادھر دوڑا دیا۔

(جاری ہے)

کیکٹس

جناب ایڈیٹر سرگزشت

سلام تہنیت!

وطن سے اتنی دور رہ کر بھی اردو سے دور نہیں ہوں۔ سرگزشت سے بھی رابطہ قائم ہے لیکن صرف پڑھنے کی حد تک۔ لیکن اب سوچا ہے کہ کچھ لکھ کر بھی اپنی شرکت ثابت کروں۔ یہ چند سچ بیانیاں حاضر ہیں اگر ان میں سے کچھ صفحات کی زینت بن جائیں تو کیا ہی اچھا ہو۔

روشن سبطین
(یو ایس اے)

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ سمجھی کہ آج پھر وہ حسبِ معمول صبح سویرے اٹھ گئی ہے۔ کیونکہ پردوں کی جھریوں سے دھوپ اٹھکیلیاں کرتی اندر در آئی۔ دو چار انگڑائیاں لے کر وہ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بستر سے نکلنے کے بعد اسے ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ شال اٹھا کر اسے اپنے گرد لپیٹی اور بالکنی سے باہر دیکھا، اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پتوں سے خالی گنجے درختوں کی سوکھی ٹہنیاں زور زور سے ہل رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر تیز ہوا چل رہی ہے۔ موبائل پر موسم کا حال دیکھا تو پیش گوئی تھی کہ سردی بڑھے گی، برف کے طوفان متوقع ہیں۔ درختوں کی شاخیں چرچرا رہی تھیں۔ کچھ ٹوٹ کر گر بھی پڑی تھیں۔ ایسے موسم میں درختوں کی جڑیں بھی اکھڑ جاتی ہیں اور درخت بھی زمین بوس ہوجاتے ہیں۔

ابھی کچھ دن پہلے ہی تو یہ درخت، گہرے سبز، کاہی، دھانی پتوں سے ڈھکے ہوئے تھے پھر انہوں نے رنگ بدلنا شروع کیا۔ کہیں درخت کے پتے سرخ ہوئے، کوئی پیلا کوئی قرمزی کوئی میرون رنگ کے، یہ تبدیلی خزاں کی آمد کا پتا دیتی ہے لیکن یہ خزاں بھی کتنی حسین ہے۔ رنگ برنگے درختوں کے پتے انہیں ایک نئے روپ میں پیش کرتے ہیں اور جب پتے جھڑنے لگتے ہیں تو سب کے سب براؤن ہی ہوتے ہیں۔ اس وقت فضا میں افسردگی سی محسوس ہوتی ہے۔ پتوں کے ڈھیر کو دیکھ کر گھبراہٹ سی ہوتی ہے لیکن انہیں فوری طور پر صاف بھی کردیا جاتا ہے۔ گاڑیاں پتوں کے ڈھیر کو بھر کر لے جاتی ہیں۔

کنول کی بڑی تمنا تھی کہ وہ امریکا میں میڈیکل کرے۔ اسے جان ہاپکنز میں ایڈمیشن مل گیا۔ پڑھائی میں تیز تھی پھر قسمت نے ساتھ دیا اور اسے امریکا کی مشہور یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ کل ہی وہ میڈیکل کے آخری امتحان سے فارغ ہوئی تھی۔ اب سونا جاگنا اپنی مرضی سے تھا۔ میری لینڈ کے ایک خوب صورت اپارٹمنٹ جو ایک بیڈ روم، لیونگ، کچن اور باتھ روم پر مشتمل تھا۔ چھوٹی سی ایک بالکنی تھی جس میں بیٹھ کر قدرت کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ بہار میں پھولوں سے لدی کیاریاں، چڑیوں کی چہچہاہٹ انسان کی ساری تنہائی کو اپنے اندر سمو لیتی تھیں۔

پیٹ میں بھوک کی گھنٹیاں بجنے لگیں تو اس نے اپنا ناشتا بنایا اور ٹرے میں سجا کر بالکنی کے دروازے سے لگی کافی ٹیبل پر رکھ دیا تاکہ باہر کے نظاروں سے لطف اندوز ہو سکے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ باریک باریک سے سفید ریشے آسمان سے برسنے لگے اور Blizzard آگیا۔ حدِ نظر ایک سفید چادر تن گئی۔ درختوں کی شاخیں سفید فرشتوں جیسا لباس پہن کر لہرانے لگیں۔ شاخیں برف کے بوجھ سے ٹوٹ بھی رہی تھیں۔ یہ برف کا طوفان تین روز تک جاری رہنا تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک غائب تھی کیونکہ یہ ہدایت کردی گئی تھی کہ کوئی بلا ضرورت گھر سے نہ نکلے کیونکہ اس موسم میں حادثے بہت ہوتے ہیں۔ سڑکوں پر کئی کئی انچ برف جم جاتی ہے۔ برف صاف کرنے والی گاڑیاں بھی نہیں آسکیں۔ متواتر برف باری سے صفائی کرنا ناممکن ہے۔ طوفان رکے

کے بعد گاڑیاں تنگ سڑکوں پر پھنسی ہیں تاکہ برف پگھل جائے۔ سب سے خطرناک بلیک آئس ہوتا ہے جس پر خطرناک پھسلن ہوتی۔ بڑے بڑے ٹرک بھی پھسل جاتے ہیں۔ لوگ گھروں میں قید ہو کر رہ جاتے ہیں۔ خود چاہے انسان گھر میں کتنے دن بھی رہے کوئی گھٹن نہیں ہوتی اسے، زبردستی مقید ہونا پڑے تو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ لوگ موسم کی پیش گوئی کی وجہ سے پہلے ہی اپنی ضرورت کی خریداری کر لیتے ہیں۔ مالز میں رش لگ جاتا ہے۔ اکثر اسٹور خالی ہو جاتے ہیں، ساری اشیاء بک جاتی ہیں۔

امریکا آنے کے بعد اسے گرلز ہاسٹل میں ایک کمرا ملا جس میں تین لڑکیاں اور تھیں۔ دو گوری تھیں اور ایک کا تعلق انڈیا سے تھا۔ ایلین کا تعلق ایک بڑے گھرانے سے تھا جب کہ شلپا اور کلاڈیا کا تعلق کمل کی طرح متوسط گھرانے سے تھا۔ بہت جلد یہ چاروں گھل مل گئی تھیں اور انہوں نے کیا انٹر نیشنل کا گروپ بنا لیا تھا۔ حالانکہ چند لڑکے چاہتے تھے کہ وہ ان کے گروپ میں آ جائیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ دانش ایک پاکستانی تھا اس نے بہت چاہا کہ کمل اس کے گروپ میں آ جائے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ایلین کا بوائے فرینڈ دانش کے گروپ میں تھا۔ اس طرح سے ان لڑکیوں کو دوسروں کی اسٹڈیز کے بارے میں علم رہتا تھا اکثر نوٹس بھی ایک دوسرے سے شیئر کر لیتے تھے۔ دانش اکثر کمل سے نوٹس وغیرہ مانگنے آ جاتا تھا۔ کمل کو اکھڑ، بد مزاج یا اپنے آپ کو مغرور کہلانے کا کوئی شوق نہیں تھا اس لیے بس وہ تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے اس سے نوٹس وغیرہ تو شیئر کر لیتی تھی لیکن کسی قسم کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے حدود کو پار کر لے۔ اسے اپنی خودداریاں، اپنی تہذیب اپنے معاشرے، مذہب کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔

کمل نے اسکالرشپ کے لیے اپلائی کر دیا تھا اور یہ اسے اس وقت ہی مل سکتا تھا جب وہ نمایاں کامیابی حاصل کر سکے۔ اس کی پوری توجہ اپنی تعلیم کی طرف تھی۔ اسے اپنے گھریلو حالات کا بھی پتا تھا۔ بڑا بھائی اپنے مستقبل کی تگ و دو میں لگا ہوا تھا۔ کمل سے چھوٹی دو بہنیں اور ایک بھائی زیر تعلیم تھے۔ اس کی اعلیٰ تعلیم کے لیے والدین نے مالی مدد میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی لیکن اب وہ ان کا بار ہلکا کرنا چاہتی تھی۔

اسکالرشپ مل گیا۔ پہلے ہی سمسٹر میں اس نے نمایاں کامیابی حاصل کی تھی اور دوسری خوش قسمتی یہ ہوئی کہ اس کی ایک پروفیسر تھیں جو لکھتی تھیں انہیں ایک مددگار کی ضرورت تھی جو ان کے کام کو ٹائپ کر سکے اور ترتیب دے سکے۔ ان کی نظرِ انتخاب کمل پر پڑی۔ انہوں نے استدعا کی تو وہ تیار ہو گئی۔ اسے ہفتہ اتوار دو تین گھنٹے کام کرنا تھا۔ مشاہرہ بھی اچھا خاصا تھا۔ اس کے پاس اب اتنا پیسا تھا کہ وہ ہاسٹل سے نکل کر اپنا اپارٹمنٹ لے سکے اور پھر اس نے یہ اسٹوڈیو اپارٹمنٹ لے لیا۔ گاڑی اس کے پاس تھی۔

جب وہ اپنے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوئی تو اس کی دوستوں نے اسے تحفے تحائف دیے جس میں گھریلو استعمال کی اشیاء تھیں۔ انہوں نے اس کے اپارٹمنٹ کی صفائی ستھرائی بھی کی۔ شلپا نے اس کے لیے دو ہفتے کی گروسری بھی کر دی۔ حالانکہ اس کی دوستوں کو اس کے جانے سے دکھ بھی تھا۔ کمل بھی کافی اداس تھی لیکن ایک تو پڑھائی میں وہ یکسوئی نہیں ہو پا رہی تھی جو وہ چاہتی تھی چونکہ جب چار لڑکیاں ساتھ رہیں گی تو یہ ناممکن تھا کوئی ہلا گلا نہ ہو پھر ہاسٹل میں کھانے پینے کا بھی مسئلہ تھا وہی حلال حرام کا۔

جب پہلی دفعہ کمل نے اپنے گھر میں کھانا پکا کر کھایا تو اسے لگا جیسے وہ اپنے پیارے ملک میں ہو۔ گو کہ اپنے ملک میں مسائل بے تحاشا ہونے کے باوجود وہ اپنا تھا۔ یہاں کی پُرسکون زندگی میں بھی غیریت کا احساس ہوتا تھا۔ نہ اپنی زبان سنائی دیتی تھی نہ اپنا لباس نہ اپنا کھانا پینا سب کچھ مختلف تھا۔

☆.....☆

Blizzard (برف کا طوفان) ابھی جاری تھا۔ کمل نے بالکنی سے جھانک کر دیکھا اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں برف کے پہاڑ نظر آئے۔ پتا نہیں کتنے فٹ برف باری ہوئی تھی۔ ہر طرف سکوت سا طاری تھا صرف درختوں کی شاخیں چرچرا رہی تھیں۔ ہوا میں بھی تیزی کم نہ ہوئی تھی۔ ایسی خاموشی اور تنہائی سے خوف سا محسوس ہوتا ہے۔ اگر ان کے ساتھ گھر میں کوئی ساتھ ہو جائے تو مدتے آتے کام ہی تمام ہو جائے۔ رات کے نو بجے تھے۔ نہانے کے بعد کھانا کھایا۔ اپنے بیڈ پر دراز ہو کر جیمز ہڈلے چیز کا ناول پڑھنے لگی۔ انسان کے پاس کوئی مصروفیت ہو تو اسے ڈپریشن نہیں ہوتا لیکن کمل کے پاس امتحانوں کے بعد کوئی مصروفیت ہی نہ تھی۔ ڈر، خوف تنہائی جیسے بھوت اسے ستاتے اس لیے اس نے اپنے آپ کو کتاب میں غرق کر لیا۔ پڑھتے پڑھتے پتا نہیں کس وقت اسے نیند کی دیوی

نے تھپکیاں دیں اور وہ بے خبر سو گئی۔

نامعلوم رات کا کون سا پہر تھا۔ ڈور بیل کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی لیکن غنودگی طاری تھی۔ اس نے ٹٹول کر سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون کا ریسیور اٹھایا پھر بھی گھنٹی کی آواز گونجتی رہی۔ اب اسے ہوش آیا اور وہ بری طرح چونک گئی۔ اس کی ساری حسیں بیدار ہو گئی تھیں۔ خوف کی لہر اس کے تن بدن میں پھیل گئی۔ ''اس وقت اس موسم میں کون آ سکتا ہے؟'' اسے اپنے اندر ڈر کا ایک ریشہ سا محسوس ہوا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور دروازے پر پہنچ کر آئی پیس سے باہر کا جائزہ لیا تھا۔ رین کوٹ میں لپٹا کوئی وجود وہیں ایستادہ تھا۔ ہمت کر کے اس نے پوچھا۔ ''کون؟''

''میں ہوں دانش۔'' ایک کپکپاتی ہوئی سی مردانہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''اس وقت یہاں کیوں آئے ہو؟'' اس نے وال کلاک پر نظریں جماتے ہوئے سوال کیا۔

''میں سردی سے مرا جا رہا ہوں۔ تم دروازہ کھولو تو میں اپنی پناہ بیان کروں۔'' چند لمحوں تک وہ تذبذب کے عالم میں ساکت کھڑی رہی۔

''کیا میرے سردی سے مرنے کا انتظار کر رہی ہو۔'' ایک جھنجلائی سی طنزیہ سرگوشی سنائی دی۔ حمل نے دروازے کی کنڈی نہیں ہٹائی نیم وا دروازے سے پوچھا۔

''ایسی کیا افتاد آ پڑی کہ اتنے بڑے شہر میں تمہیں میرا ہی دروازہ نظر آیا۔'' حمل نے طنزیہ کہا۔

''میں یہاں..... اپنی مالک مکان سے چابی لینے آیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک ہفتے کے لیے اپنی بہن سے ملنے تھر پارکر گئی ہوئی ہے۔ اس کی سیڈ نے اتنا ہی بتایا پھر تیزی سے دروازہ بند کر لیا۔'' اس نے تھرتھراتی، کپکپاتی آواز میں جملہ پورا کیا۔ ''اور اب میری گاڑی بری طرح برف میں دھنس چکی ہے۔ واپسی کا کوئی راستہ نہیں ورنہ کسی ہوٹل میں پناہ لے لیتا۔'' اس نے مزید اکتائے لہجے میں کہا اور ٹھنڈ سے دہرا ہو گیا۔ حمل کے دل میں انسانی ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوا۔ اور وہ سوچنے لگی میری ذرا سی مدد اسے بچا سکتی ہے۔ اس کا ہم وطن اگر ٹھٹھر کر مر گیا تو کیا وہ زندگی بھر اپنے آپ کو معاف کر سکے گی؟ اس کے ضمیر نے اسے جھنجوڑا اور اس نے آہستہ سے کنڈی گرا دی۔ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر یہ زیادہ دیر باہر کھڑا فریاد کرتا رہا تو کہیں اڑوس پڑوس کے لوگ ہوشیار نہ ہو جائیں۔

ثب مین، ولیم: 1895-1971ء

لائبیریا کے سیاست دان، باپ پادری اور ایوان نمایندگان کے سابق سپیکر تھے۔ 1917ء میں قانون کی ڈگری لی۔ 1923ء اور 1939ء میں سینیٹر منتخب ہوئے۔ 1937ء سے 1944ء تک سپریم کورٹ کے نائب صدر رہے۔ 1943ء میں صدارت کے انتخاب میں کامیاب ہوئے۔ 1951ء میں آئین میں تبدیلی کر کے تاحیات صدر بن گئے۔ انہوں نے لائبیریا کے مختلف قبیلوں کو متحد کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

مرسلہ: افراسیاب خان، پشاور

دانش نے باہر ہی اپنا رین کوٹ جھاڑا۔ جوتوں پر سے برف صاف کی اور اندر چلا آیا۔ سردی سے اس کے ہونٹ نیلے پڑے ہوئے تھے اور وہ ٹھنڈ سے اچھا خاصہ لرز رہا تھا۔ جب وہ کرسی پر بیٹھ گیا تو حمل نے اسے کمبل دیا جس سے اس نے اپنے جسم کو ڈھانپ لیا اور تولیا سے اپنے بدن کی بھی برف صاف کرنے لگا۔

''کافی مل جائے گی۔ شاید سردی کم ہو جائے۔'' اس نے پوچھا۔ حمل خاموشی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے دو کپ کافی بنائی اور ٹرالی پر لا کر رکھ دی۔

''کچھ کھانے کو مل جائے گا۔ بہت بھوک لگی ہے۔'' اس نے پوچھا۔ حمل نے خاموشی سے سر ہلایا اور سینڈوچ بنا کر لے آئی۔ دانش اس وقت اپنی کافی میں چینی ڈال رہا تھا۔ حمل نے اپنا کپ اٹھا لیا اور ہلکے ہلکے چسکیاں لینے لگی۔ کافی ختم ہوئی تو اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ اس نے سوچا شاید یہ موسم کا اثر ہے کہ اسے نیند زیادہ آ رہی ہے۔ دانش کو لیونگ روم کے صوفے پر بیٹھا چھوڑ کر وہ اپنے بیڈ روم کی طرف ڈگمگاتی لڑکھڑاتی اور بستر پر گر سی پڑی۔ بیڈ روم کا دروازہ کھلا رہ گیا۔ اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کی حالت میں نہیں تھی۔ دماغ میں گھوں گھوں سی ہو رہی تھی۔ اس نے تکیے پر سر رکھا تو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کا سر اس کے جسم سے علیحدہ ہو گیا ہو پھر اسے کچھ پتا نہ چلا کہ کب وہ بے سدھ ہو کر نیند کی آغوش میں سما گئی۔ حالانکہ اس نے پہلے سوچا تھا کہ وہ رات جو کہ چند گھنٹے ہی رہ گئی تھی جاگ کر گزارے گی۔ اسے کسی غیر مرد کی موجودگی اپنے گھر میں بے چین کر رہی تھی۔ وہ خوفزدہ بھی

تھی۔ اس کی یہاں آمد اسے اندر سے کسی نامعلوم خطرے کا الارم بجا رہی تھی اور اسے اپنی رحم دلی پر غصہ اور ندامت بھی ہو رہی تھی مگر اب تو وہ ہر خوف سے آزاد و بے خبر سو گئی تھی یا بے ہوش تھی۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اب تک اس کے دماغ میں دھمک سی ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں۔ سر دبایا، پھر اس کی نظر وال کلاک پر گئی سوئیاں بارہ بجے سے آگے رقص کرتی نظر آئیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر پھر سر تکیے پر اوندھا ہو گیا۔ اس نے کمبل ایک طرف پھینکا اور جھٹکا دے کر اٹھنے کی کوشش کی۔ بدن بری طرح دکھ رہا تھا۔ سینے سے ٹیس سی اٹھ رہی تھیں یا الٰہی یہ کیا ہو گیا۔ اس موسم نے تو بری طرح مجھے جکڑ لیا ہے۔ ہمت کر کے وہ بیٹھ گئی، پھر اس کی نظر اپنے ٹراؤزر پر پڑی جو گڑ مڑ یا ہوا اس کے پیروں پر پڑا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بستر پر نظر پڑتے ہی اس کے حواس جواب دے گئے۔ اس نے اپنے گالوں کو بے دردی سے پیٹا اور بالوں کو نوچنا شروع کر دیا۔ زار و قطار روتی جاتی تھی گالوں کو پیٹتی جاتی تھی۔ اب اسے بالکل اس بات کا احساس نہیں رہا تھا کہ اس کی چیخیں باہر سنائی دے جائیں گی۔ اسے اپنا وجود بالکل تعفن زدہ مردار کی طرح محسوس ہوا۔ نجاست، غلاظت، اسے ابکائی سی آنے لگی وہ جلدی سے غسل خانے میں گھس کر رونے لگی۔ رات کی کالی غلاظت میں بہہ گئی پھر وہ شاور کے نیچے کھڑی ہو کر نہانے لگی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنے جسم کو کھرچ ڈالے۔ جیسے سارا قصور صرف اور صرف اس کے جسم کا تھا۔

نہانے کے بعد اس کی وحشت کچھ کم ہوئی لیکن آنکھوں سے بہتے آنسو اب بھی نہ رکے۔ اب وہ بے آواز رو رہی تھی۔ خالی لیونگ روم اسے اپنے اوپر قہقہے لگاتا محسوس ہوا۔ اپنی بے بسی، کمزوری دل میں ابھرتے ہوئے انتقام کے شعلے اسے پاگل بنائے دے رہے تھے۔ وہ اس سے کیا انتقام لے سکتی تھی؟ میں ابھی 911 کو فون کر کے پولیس کو بلاتی ہوں۔ وہ اچھی طرح سمجھ لیں گے۔ ساری ڈاکٹری واکٹری دھری رہ جائے گی۔ اس کے ہاتھ ابھی فون کی طرف بڑھے ہی تھے کہ دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ جو کہہ رہی تھی۔ ”بی بی ضرور پولیس کو بلاؤ۔ ساری انکوائری ہو گی۔ میڈیا والوں کے ہاتھ ایک چٹ پٹی خبر آ جائے گی۔ پوری دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ امریکا میں ایک پاکستانی ڈاکٹر کو اس کے ہم وطن ہی نے بے آبرو کر دیا۔ تو بی بی یہ خبر تمہارے گھر میں آگ کے شعلوں کی طرح پھنکارتی ہوئی لپکے گی۔ پورا خاندان لپیٹ میں آ جائے گا۔ ان کی عزت اور ناموس کے اس طرح پرخچے اڑ جائیں جیسے بم بلاسٹ کے بعد انسانی جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے جسے سمیٹا نہیں جا سکتا؟

پھر اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ ”پھر میں کیا کروں؟“ ”صرف خاموشی، لیکن ایک بار تو میں اس سے ضرور ملوں گی۔ اس کا منہ نوچ لوں گی۔ میں اس کی مردانگی کو ہمیشہ کے لیے ناپید کر دوں گی۔ ہجڑہ بنا دو۔ تالیاں پیٹتا پھرے گا؟ کچھ نہیں ہو گا۔ اس کے پاس بھی بہت کچھ الزامات لگانے کے لیے مواد ہو گا۔ تمہیں تمہارے ملک تک بدنامی کی پوٹ لے جائے گا۔ پھر لوگ کیا کہیں گے؟

”ارے بھئی بڑا غرور تھا۔ لڑکی امریکا میں ڈاکٹری پڑھ رہی ہے۔ کرتوت تو دیکھو۔“ کوئی بی بی گالوں کو پیٹتے ہوئے کہے گی۔

”اری بھنو جانے کب سے ہانڈی میں گڑ پھوڑا جا رہا ہو۔ ایکدم سے تو کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاتا۔“ کوئی کہے گا ”گئی تھیں ڈاکٹر بنے اور یہ گل کھلایا۔“ جتنے منہ اتنی باتیں ہوں گی۔ بھائی بہنوں کے رشتوں میں کھنڈت پڑ جائے گی۔ سب اسے ہی منہ بھر بھر کوسیں گے۔ جس کی وجہ سے ان کے مستقبل کی راہیں مسدود ہو گئیں۔

نمل نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اٹھ کر چائے بنائی۔ ایک سلائس بمشکل حلق سے اتارا۔ اسے سوچنے کے لیے وقت چاہیے تھا۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی، دماغ قابو میں آیا تو اسے اپنی دوستوں کا خیال آیا۔ کم از کم اس خبیث کا اتا پتا تو معلوم کرے۔

بالکنی کا پردہ سرکا کر اس نے باہر کا منظر دیکھنا چاہا۔ برف کے پہاڑ بنے ہوئے تھے۔ پتوں سے خالی برہنہ درختوں نے سفید براق برف کا لباس پہن لیا تھا۔ سب کچھ بڑا خوب صورت تھا لیکن اس وقت یہ ماحول حسین لگتا جب انسان کا ذہن ہر پریشانی سے خالی ہو۔ Blizzard اب تک جاری تھا۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں، جو درخت اور شاخیں برف کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی تھیں... وہ چرچراہٹ کی مچ پر شور آوازوں کے ساتھ زمین بوس ہو رہی تھیں۔ اس موسم میں برف صاف کرنے والی گاڑیاں بھی نہیں آتیں۔ ہر طرف دل میں گھبراہٹ پیدا کرنے والے سناٹے کا راج تھا۔

جھجکتے ہوئے اس نے شلپا کو فون کیا کچھ دیر ادھر ا

اُدھر کی باتیں موسم کا حال بیان کرنے کے بعد اس نے دانش کے بارے میں پوچھا۔

''تمہیں دانش کے بارے میں معلوم کرنے کا خیال کیسے آگیا۔'' شلپا نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''اس کے پاس میری کچھ کتابیں اور نوٹس رہ گئے ہیں۔'' نمل نے جواب دیا۔

''میں تو نہیں جانتی شاید ہیلن کو پتا ہو۔ اس کا بوائے فرینڈ اس کے گروپ میں ہے اور دونوں میں شاید کچھ دوستی بھی ہے۔''

''اگر تم معلوم کرسکتی ہو تو پوچھ کر مجھے بتاؤ۔''

''اچھا میں ہیلن سے بات کر کے ابھی بتاتی ہوں لیکن اس موسم میں تو وہ تمہاری چیزیں واپس کرنے کسی صورت نہیں آسکتا۔ تمام راستے بند ہیں موبائل پر برابر ہدایتیں دی جارہی ہیں کہ بغیر ضرورت کوئی گھر سے باہر نہ جائے۔ اس کے بعد لائن ڈراپ ہوگئی۔ نمل ہاتھوں کو مسلتے ہوئے ٹہلے جارہی تھی۔ رات کی ایک ایک بات اسے یاد آرہی تھی اور پھر وہ اپنے آپ کو الزام دینے لگی کہ اس نے اس ڈیوس کو گھر میں گھسایا کیوں؟ اسے کیا معلوم اس کی یہ ہمدردی اس کے لیے کتنا بڑا طوفان لائے گی۔ ایسا داغ لگا جائے گی جسے وہ زندگی بھر صاف نہ کر پائے گی یہ داغ اب کسی طرح نہیں مٹے گا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کیکٹس کے پودوں پر گر پڑی ہو اور اس کے تمام کانٹے اس کے جسم میں چبھ کر رگوں میں خون کی روانی کے ساتھ بہہ رہے ہوں۔

کافی دیر بعد شلپا کا فون آیا کہ ہیلن سے رابطہ نہیں ہو پارہا۔ کیا پتا اس کا فون چارج نہ ہو یا اس نے بند کیا ہوا ہو۔ یا موسم کی گڑبڑ ہو۔ ''جیسے ہی رابطہ ہوا میں تم سے بات کروں گی۔'' شلپا نے فون بند کردیا۔ نمل پھر اپنے خیالوں میں گم ہوگئی۔ اسے دانش سے اپنا رویہ یاد آرہا تھا۔ دانش نے کئی بار اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تھی لیکن نمل کے روکھے جواب، سرد رویہ، اکثر اس کا لہجہ ہتک آمیز ہوجاتا۔ نمل کو تو اپنے پروفیشن سے عشق تھا۔ اس کے گھر والوں کی ذمے داریاں تھیں اس پر سوا اس لیے دانش کے بارے میں اس نے کبھی کچھ سوچا ہی نہ تھا۔ اکثر اسے اس کی باتوں سے الجھن سی ہوتی۔ یونیورسٹی کے لان میں کسی درخت کے سائے میں بیٹھی وہ پڑھتی رہتی۔ اس وقت دانش اچانک یہاں آجاتا بڑی معنی خیز باتیں کرتا۔ نمل ایسا ظاہر کرتی جیسے وہ کچھ سمجھی ہی نہیں یا وہ اس کی باتوں کو اہمیت نہیں دیتی وہ اپنی کتابیں سمیٹتی اور لائبریری کا رخ کرتی۔ بات چیت، ہم آہنگی، دلچسپی، محبت، پھر عشق، مدارج ہوتے ہیں اور کوئی شخص اس کو پہلی سیڑھی بھی نہ چڑھنے پائے تو یہ اس کی اپنی مرضی ہے۔ کسی کا پاس اپنے ہی مقاصد ہوں۔ اپنی راہیں ہوں جن پر چل کر وہ اپنی منزل کی طرف نہایت استقامت کے ساتھ بڑھ رہا ہو تو پھر پلٹ جانا چاہیے لیکن وہ ایک ہی چپو سے کشتی کو چلا رہا تھا۔ اس میں نمل کا کیا قصور تھا کہ اسے اس طرح پامال کردیا جاتا۔ اس نے نمل کی بے اعتنائی کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا تھا اور اس کی انا کا بت ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ وہ بہت ہینڈسم تھا۔ نتائج بھی اچھے آرہے تھے۔ مستقبل کا ایک کامیاب ڈاکٹر ہونے والا تھا۔ کیا کمی تھی اس میں اور شاید انہیں جذبات نے اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑکا دی تھی۔

برف کا طوفان ختم ہو چکا تھا۔ برف صاف کرنے والی گاڑیاں سڑک صاف کررہی تھیں۔ سڑک کے کنارے سفید برف کے اوپر سرمئی اور کالی برف کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ کچھ ہلچل شروع ہوگئی تھی۔ نمل کی طبیعت میں کوئی بحالی نہ آسکی تھی۔ اسے شلپا کے فون کا بے چینی سے انتظار تھا۔ آخر کار شلپا کا فون آہی گیا۔

''بڑی مشکل سے آج ہی میرا ہیلن سے رابطہ ہوا ہے۔ اس نے اپنے بوائے فرینڈ سے دانش کا پتا معلوم کرنے کا وعدہ کیا ہے۔'' شلپا نے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے فون بند کردیا۔ آج تین چار دن بعد زندگی جاگی تھی اسے بھی اسٹور جانا تھا۔ نمل کے پاس بھی کھانے پینے کی چیزیں ختم ہوگئی تھیں لیکن اس کا دل کہیں جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

''تم اسٹور میں آجاؤ دونوں کی ملاقات بھی ہوجائے گی اور شاپنگ بھی کرلیں گے۔'' شلپا کا فون دوبارہ آیا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں کچھ بخار ہوگیا ہے۔''

''اچھا میں تمہاری طرف آتی ہوں۔ جو کہو لیتی آؤں۔'' شلپا کے اصرار پر اس نے دو چار چیزیں بتادیں۔ نمل نے جلدی جلدی گھر کا اور اپنا حلیہ درست کیا۔ ہر چیز پھیلی پڑی تھی۔ گھنٹی بجی تو اس نے دروازہ کھولا۔ سامان سے لدی پھندی شلپا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے جلدی سے کچھ تھیلیاں اس کے ہاتھ سے لے لیں۔

''اگر تمہیں کہیں اور دیکھتی تو شاید پہچانتی بھی نہیں۔'' شلپا نے حیرت سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ نمل سامان لے کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

''آنکھوں کے گرد سیاہ دائرے، پیلا رنگ آخر اسے

ایسی کیا بیمار ہو گئی تھیں۔" شلپا نے استفسار کیا۔

"ارے کچھ نہیں ڈیئر تھوڑا سا بخار ہو گیا۔ دوسرے اس موسم نے قیدی بنا کر رکھ دیا تھا۔" کومل نے پیار سے اس کے کندھے دباتے ہوئے کہا اور سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"ہاں یہ تو ہے۔" شلپا نے کہا۔

"سامان کی رسید تو مجھے دو۔" کومل نے ہاتھ بڑھایا۔

"وہ تو میں پھینک آئی ضرورت بھی کیا تھی۔"

"یہ تو زیادتی ہے۔" کومل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خیر چھوڑو ان باتوں کو پہلے تم مجھے یہ بتاؤ تمہاری یہ حالت کیوں ہو رہی ہے۔"

"دراصل گھر والے بہت یاد کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں ریڈیڈنسی شروع کرنے سے پہلے ایک چکر گھر کا لگا لو۔"

"تو چلی جاؤ اس میں کیا قباحت ہے۔"

"مجھے امتحانوں کی تیاری کرنی ہے۔" کومل نے جواز پیش کیا۔

"ہاں یاد آیا ہیلن نے اپنے بوائے فرینڈ سے دانش کے بارے میں پوچھا تھا اس نے بتایا آج صبح جیسے ہی فلائٹس کھلیں وہ پہلی فلائٹ سے پاکستان چلا گیا۔" شلپا نے بتایا تو کومل کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ شلپا سمجھی کہ ان کے درمیان لو افیئر سے آگے کا بھی کوئی معاملہ ہے۔

"دوستوں سے کیا پردہ دل میں کوئی بلبل کوک رہی ہو تو بتا دو۔" شلپا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ ایسی گھٹیا حرکتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔" کومل کے انداز میں تلخی سی آ گئی۔ سو شلپا نے بھی موضوع بدل دیا۔ کومل اسے کچن میں لے گئی۔ دونوں نے مل کر اپنے لیے کچھ چٹ پٹی چیزیں بنائیں اور دونوں فضی مذاق کرتی چیزوں سے انصاف کرنے لگیں۔ ساتھ ہی ادھر ادھر باتیں بھی ہوتی رہیں۔ ماحول کافی تبدیل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد شلپا نے گھڑی پر نظر ڈالی اور چلنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"شلپا اب کب آؤ گی؟"

"اب تمہاری باری ہے میرے پاس آنے کی۔ تمہارے ہاتھوں میں کوئی مہندی لگی ہے۔" دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

شلپا کے جانے کے بعد پھر وہی تنہائی کا ڈستا ناگ سر اٹھانے لگا اور سانپ کا زہر نکالنے کا اس کے پاس کوئی تریاق نہیں تھا۔

"سانپ تو ڈس کر نکل گیا۔ اب اپنے زخم کے بارے میں سوچو کیا کرنا ہے۔" وہ اپنے اندر سے اٹھتے ہوئے طوفان کا مقابلہ کرتے تھک چکی تھی۔ دل بہلانے کو جو بچوں کی طرح مچلے جا رہا تھا۔ بالکنی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ شاید باہر کی چلتی پھرتی زندگی کی ہل جل اسے بہلنے کا موقع دے۔

☆.....☆

نتیجہ بہت شاندار تھا لیکن اس کی خوشیاں تو جیسے کسی سمندر کی تہوں میں سما گئی تھیں۔ اس کے وجود میں کوئی دوسرا وجود بھی پل رہا تھا اور اگر وہ اسے نکال پھینکتی تو راز طشت از بام ہو جاتا۔ اب جو کچھ ہو رہا تھا اس کے ساتھ اسے گزارا کرنا تھا۔ وہ جلد از جلد اس اسٹیٹ سے نکل جانا چاہتی تھی۔ گیارہ جگہ سے Residincy کے لیے اس کی عرضی کا جواب آیا۔ اس نے ایل اے جانے کا فیصلہ کیا اور اسے کال بھی کر لیا گیا۔

یہاں پر تین چار پاکستانی لیڈی ڈاکٹرز اور دو میل ڈاکٹر تھے تمام عملہ بہت ملنسار تھا۔ وہ جلد ہی ان میں گھل مل گئی۔ اپنے بارے میں اس نے سب کو یہ بتایا کہ اس کی شادی خفیہ طور پر اسلامی طریقے سے ایک ڈاکٹر سے ہوئی۔ بعد میں وہ پاکستان اپنے والدین سے ملنے گیا تو انہوں نے (بقول اس کے) زبردستی اس کی شادی اپنے خاندان میں کروا دی اور اس نے کومل کو طلاق نامہ بھیج دیا۔ جو بچے کی پیدائش کے بعد نافذ العمل ہو جائے گا۔ ان سب میں اریبہ نے اسے بہت متاثر کیا۔ وہ ایک سنجیدہ سی، ہمدرد، ہر وقت ہر کسی کے لیے مدد کرنے کو تیار۔ اسے بھی کومل بہت پسند آئی دونوں کے مزاج میں یکسانیت تھی۔ دونوں جلد گھل مل گئیں۔ اریبہ شادی شدہ تھی اس کا ایک سال کا بیٹا بھی تھا۔ کومل تو اسپتال کے قریب ہی ہاسٹل میں رہتی تھی۔ اریبہ کی رہائش بھی دور نہیں تھی لیکن ان کی ڈیوٹیاں اکثر مختلف اوقات میں لگتیں جس کی وجہ سے ملاقات کم ہی ہوتی۔ اریبہ کو کومل کا بہت خیال تھا چونکہ اس کے آخری مہینے جا رہے تھے۔ اکثر وہ کومل کے لیے کچھ نہ کچھ گھر سے بنا لاتی۔ جیسے جیسے پیدائش کے دن قریب آتے جا رہے تھے کومل جلد تھکنے لگی تھی آخر کار اسے چھٹی لینی پڑی۔

اریبہ نے کومل کا بے بی شاور بڑی دھوم دھام سے کیا۔ اچھے خاصے تحفے تحائف بھی آئے۔ احباب کا حلقہ بھی بڑھا۔ اریبہ اسے دن میں ایک دو بار چیک کر لیا کرتی۔

آخر کو وہ وقت قریب آ گیا۔ کومل کو درد شروع ہوا تو

اسپتال میں داخل ہو گئی۔ کیس اریبہ کے ہاتھ میں تھا۔ ثمل نے سختی سے کہہ دیا تھا وہ کوئی دوا نہیں لے گی وہ چاہتی تھی کہ بچہ قدرتی انداز میں پیدا ہو تا کہ اسے اپنے بچے سے بھی محبت ہو سکے۔ کیونکہ اس معصوم کا تو کوئی قصور نہیں تھا کہ زبردستی اس دنیا میں لایا جا رہا تھا۔ وہ اپنے بچے پر کوئی گندہ داغ نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ آٹھ گھنٹے کی تکلیف دہ دردوں میں اس نے ایک خوب صورت دس پاؤنڈ کے بچے کو جنم دیا۔ ڈاکٹر اریبہ نے بچے کا نام، باپ کا نام پوچھا کیونکہ یہاں پہ یہ قانون ہے کہ بچے کا نام اور ولدیت اسی وقت رجسٹر ہو جاتی ہے جس میں پھر رد و بدل مشکل ہے۔

"تابش جہانگیر ولد دانش جہانگیر۔" ثمل نے روندھے ہوئے گلے سے نام لکھوایا۔ اریبہ نے سوچا اس وقت ثمل کو بچے کے باپ کی یاد آ گئی ہے۔ حالانکہ وہ اس زلزلے کا اندازہ نہیں کر سکتی جو ثمل کے دل کو جھٹکے دے رہا تھا۔

اریبہ کا تعلق فیصل آباد سے تھا۔ اس کا شوہر بینک میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ یہ بھی اچھا ہی تھا۔ ثمل کا تعلق کراچی سے تھا اگر اریبہ بھی کراچی کی رہائشی ہوتی تو ثمل کا راز کھلنے کا اندیشہ تھا۔ اریبہ کا بیٹا دانیال سال بھر کا ہو چکا تھا۔ چونکہ دونوں کے اپارٹمنٹس پاس پاس تھے اس لیے انہوں نے ایک نین کو دونوں بچوں کی دیکھ بھال کے لیے رکھ لیا تھا۔ کیونکہ ڈیوٹی پر جانا پڑتا تھا تو بچوں کی دیکھ ریکھ کا مسئلہ تھا۔

ثمل کی ریزیڈنسی بھی مکمل ہو گئی تھی۔ ادھر گھر والوں کا اصرار بڑھ رہا تھا۔ دو بھائیوں کی شادیاں اس کی غیر موجودگی میں ہو گئی تھیں۔ اب سب سے چھوٹی بہن کی رخصتی باقی تھی اور اسے ماں باپ نے سخت تاکید کی تھی کہ انہوں نے رخصتی اس کے انتظار میں روک رکھی ہے اور اس کی شرکت بہت ضروری ہے۔ ثمل کے لیے تابش کا مسئلہ تھا۔

اریبہ کو اس کی خفیہ شادی کا علم تھا اور سمجھتی تھی کہ ثمل بچے کو لے کر نہیں جا سکتی۔ سو اس نے ثمل کو سمجھایا کہ وہ پاکستان چلی جائے تابش چار سال کا ہو چکا ہے اور اس سے مانوس بھی ہے اس لیے ثمل بے فکر ہو کر بچے کو اس کی نگرانی میں چھوڑ کر چلی جائے۔ ثمل کو بھی یہ آئیڈیا پسند آیا اور وہ مطمئن ہو گئی۔ گھر والوں کے لیے تحفے تحائف خریدے اور انہیں اپنی آمد کی اطلاع کر کے روانہ ہو گئی۔

پندرہ دن آنکھ کھولتے بند کرتے گزر گئے۔ گھر والوں کے اصرار پر بھی وہ زیادہ نہیں رک سکی۔ اس کا دل تو تابش میں لگا ہوا تھا۔ حالانکہ وہ روز رات کو اریبہ سے اس کی خیریت معلوم کر لیتی تھی۔ والدین کا پرزور مطالبہ تھا کہ اب اسے بھی شادی کر لینی چاہیے اور وہ ہنس ہنس کر ٹالتی رہی۔

"ارے بی بی اب کون سا وقت آئے گا کیا بڑھاپے میں شادی کرو گی۔ تمہارے ساتھ کی لڑکیاں کئی کئی بچوں کی مائیں بن گئی ہیں۔" بڑی بھابھی نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا کئی اچھے رشتے آئے ہیں۔ تمہاری تعلیم بھی مکمل ہو چکی ہے۔ اب امریکا کا پیچھا چھوڑو اور گھر بساؤ۔"

"امی مجھے ابھی Specialisation کرنا ہے پھر سوچوں گی۔"

"ہاں بیٹا جب سر پر چاندی چمکنے لگے گی تب دیکھا جائے گا۔ کوئی بڈھا کھوسٹ مل جائے گا۔" ماں نے جل کر کہا۔

ثمل کی ایک سوچ تھی "سنے سب کی کرے اپنے من کی" سو وہ اپنے والدین کے اترے ہوئے چہرے دیکھتی ہوئی واپس آ گئی۔ حالانکہ اسے اپنے رویے پر افسوس بھی تھا لیکن زندگی نے اس کے ساتھ کیا کیا۔ وقت نے جو مذاق کیا تھا اسے کس طرح چھپاتی۔ یہ کوئی ایسا داغ تو نہیں تھا جو کسی ڈٹرجنٹ سے دھل جاتا۔ روح پر لگے گھاؤ کبھی مندمل نہیں ہوتے۔ جسم کے زخم تو بھر جاتے ہیں لیکن روح پر لگے نیزے زندگی بھر تڑپاتے ہیں۔ ان کی ٹیس کبھی ختم نہیں ہوتی۔ شاید مرتے وقت بھی انسان نزع کے عالم سے زیادہ اس اذیت کو ساتھ باندھ کر لے جاتا ہو۔

زندگی اپنی ڈگر پر آ گئی تھی اور اپنی منزل کی طرف جاتی راہوں پر اس نے مضبوطی سے قدم رکھنا سیکھ لیا تھا۔ وقت سے اچھا کوئی معلم نہیں۔ تابش اسکول جانے لگا تھا۔ اکثر بچوں کو ان کے باپ چھوڑنے آتے۔ تابش کا ننھا سا ذہن سوچتا اس کے پاپا کیوں نہیں ہیں؟ ماں اتنی مصروف تھی کہ وہ اگر سوال بھی کرتا تو وہ کہیں نہ کہیں مصروف ہو جاتی کبھی فون کرنے لگتی، کبھی نین کو ہدایات دینے لگتی۔ بڑی خوب صورتی سے تابش کو ٹال جاتی وہ کہانی جو اس نے سب کو سنائی تھی، تابش کی سمجھ میں نہ آتی۔ ثمل کے لیے بچے کا سوال بڑی آزمائش تھا۔ اریبہ کو بھی تابش کی الجھن کا پتا تھا اور ایک دن اس نے ثمل سے کہا۔ "تم اس سے یہ کیوں نہیں کہہ دیتی کہ وہ کار ایکسیڈنٹ میں ختم ہو گئے۔ خس کم جہاں پاک۔" ثمل نے تابش کے بار بار کے سوال کا جواب دے ہی دیا۔ اب اس کے اسکول میں کوئی اس سے پوچھتا تو ڈبڈبائی آنکھوں رندھی آواز میں کہہ دیتا۔ "میرے پاپا کار ایکسیڈنٹ میں مر گئے۔ اب وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔"

نمل رات کی ایمرجنسی ڈیوٹی پر تھی۔ دو تین میل ڈاکٹرز اور نرسیں بھی تھیں۔ پتا نہیں کیوں مرض کا حملہ مریضوں پر رات ہی کو کیوں ہوتا ہے۔ مختلف بیماریوں سے متاثر مریض آ رہے تھے۔ کسی کو ہارٹ کی تکلیف تھی کوئی دمے کا مریض تھا۔ کسی کا فریکچر ہو گیا تھا۔ زیادہ تر عمر رسیدہ لوگ تھے۔ ایک نوجوان گھٹنے میں فریکچر کا تھا۔ بھلا بتاؤ آدھی رات کو یہ کیا کر رہا تھا جو گھٹنا تڑوا بیٹھا۔ بہر حال انہیں تو طبی امداد دی جا رہی تھی سب ہی مصروف تھے اسی وقت ایک ایکسیڈنٹ کیس آ گیا سر پر شدید چوٹیں تھیں۔ خون کا بہاؤ بھی تیزی سے ہو رہا تھا جسے فوری طور پر روکنا تھا۔ ڈاکٹروں نے جلدی جلدی خون روک کر سر پر پٹیاں باندھ دیں اور اس کے سر کو اس طرح کس دیا گیا کہ وہ سر اور گردن نہ ہلا سکے۔ ڈرپ لگا دی گئی تھی۔ ایک ڈاکٹر نے نمل کے پاس آ کر آہستہ آہستہ سے مریض کی کیفیت بتائی جو اس وقت دمے کے مریض کو چیک کر رہی تھی۔

''اسے آئی سی یو میں شفٹ کر دو اور نیورو سرجن کو کال کرو۔''

''مریض ہوش میں تو آ چکا ہے لیکن بولنے سے قاصر ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر فون کی طرف بڑھ گیا۔ وارڈ بوائے مریض کو آئی سی یو میں لے جا رہے تھے۔

''میں نے نیورو سرجن کو فون کر دیا ہے اس وقت سرجری میں ہیں جیسے ہی فارغ ہوتے ہیں یہاں پہنچ جائیں گے۔ پیشنٹ کو آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا ہے یہاں سے فارغ ہو کر آپ ذرا اسے چیک کر لیں۔''

''تم چلو میں بس آ رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر نمل نے ایک اور مریض کو دیکھا اور عملے کو کچھ ہدایات دے کر آئی سی یو کی طرف روانہ ہو گئی۔ مریض کی ہسٹری نمل کو تھما کر وہ ڈاکٹر چلا گیا۔ نمل نے سرسری طور پر رپورٹ کا معائنہ کیا اور مریض کی طرف متوجہ ہو گئی لیکن اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ اسے معلوم ہوا جیسے پھر کسی نے اسے کیکٹس کے پودوں پر دھکا دے دیا ہو۔ اپنا وہم دور کرنے کے لیے مریض کے منہ پر لگا آکسیجن ماسک ہٹا کر اس نے اس کے چہرے پر جھک کر دیکھا تو شبہ یقین میں بدل چکا تھا۔ اس نے ہونٹوں کو بھینچ کر ایک لمبی سانس لی۔ مریض کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں وہ بھی اپنے اوپر جھکے چہرے کو تکنے لگا اور ڈاکٹر کا طمطراق سے تمتمایا ہوا چہرہ اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔

''تو یہ تم ہو جس نے مجھے بے آبرو کیا۔ ایک ناجائز بچے کی ماں بنا دیا۔ میری خود اعتمادی، میری انا، میرا غرور سب کچھ چھین لیا اور فرار ہو گئے۔ ورنہ میں تمہارا وہ حشر کرتی کہ دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔'' نمل غصے اور انتقام کی آگ میں بری طرح جل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ مریض کی آنکھوں میں حیرت اور خوف بھر گیا تھا۔ اس نے بولنا چاہا لیکن نرخرے سے گڑگڑاہٹ کی خفیف سی آواز نکلی۔ اس نے پلکیں جھپکائیں کدلائی ہوئی آنکھوں میں بے گناہی کی لکیریں سی ابھریں۔ اس نے دونوں ہاتھ جو پٹیوں میں جکڑے ہوئے تھے اٹھا کر جوڑنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ کر سکا۔ نہ نمل سمجھ سکی۔ نمل نے ہوا سے بھری سرنج اس کے رگوں میں گھسا دی۔ آکسیجن ماسک چہرے پر لگا دیا لیکن اس کا جسم اب جھٹکے لینے لگا تھا اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ نمل کا کولیگ اسی وقت داخل ہوا۔ نمل نے کہا۔ ''سی پی آر کرو۔'' وہ ڈاکٹر یہ کہتا ہوا کہ نیورو سرجن آ رہا ہے۔ سی پی آر کرنے لگا۔

کوریڈور کے دائیں ہاتھ والے دروازے سے نمل باہر نکل رہی تھی جب کہ دوسری طرف کے بائیں ہاتھ کے دروازے سے نیورو سرجن عملے کے ساتھ تیزی سے داخل ہوا اور آئی سی یو میں چلا گیا۔ نمل کی سماعت سے ایک دہشت زدہ، دکھ، حیرت، غم میں ڈوبی آواز ٹکرائی۔ جو چیخ سے مشابہ تھی۔ O my god۔

نمل باتھ روم میں گھسی اپنی سانسیں درست کر رہی تھی۔ پسینہ اس کے جسم سے بری طرح پھوٹ رہا تھا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، اپنی سانسوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ خاصی دیر بعد باتھ روم سے نکل آئی تو اپنے اوپر خاصا کنٹرول کر چکی تھی۔

ایک ڈاکٹر بیٹھا مریض کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنا رہا تھا۔

''ڈاکٹر نمل بڑا ہی افسوسناک واقعہ ہوا ہے۔ مرنے والا ایبرسٹر راحیل جہانگیر نیورو سرجن دانش جہانگیر کا جڑواں بھائی تھا۔ کیسا اندوہناک اتفاق ہے۔'' ڈاکٹر نے افسوس سے سر ہلایا اور کوائف لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

نمل کو ایک زور کا چکر آیا۔ مریض کی التجائیہ نظریں اس کے ذہن میں کسی گولی کی طرح پیوست ہو گئیں۔ اب وہ تمام زندگی کیکٹس کے پودوں پر گرتی رہے گی۔

ڈاکٹر لپک کر نمل کی طرف بڑھا اور اسے تھام لیا ورنہ زمین پر گر پڑتی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

میں تو یہ سمجھا تھا کہ یہ خواب ہے لیکن یہ خواب نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت تھی جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔

میرے خواب خوب صورت اور سہانے نہیں ہوتے تھے ...کیونکہ میں نے کبھی بھی خود کو خود فریبی کا شکار نہیں کیا تھا۔ آج جب میں نے اپنی بیوی بتول کو دیکھا تو نظروں پر یقین نہیں آیا اُس کے چہرے پر خوشی کے دھنک رنگ بکھرے تھے۔ ایسی دل کشی، نکھار اور جاذبیت نظر آ رہی تھی کہ وہ اپنی عمر سے دس برس چھوٹی لگ رہی تھی۔ چمکتی آنکھوں اور دل فریب مسکراہٹ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی روح کو طمانیت اور قلب کو سکون کی مسرت ملی ہے

اپنا گھر

محترم مدیر

السلام علیکم!

میں ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہوں۔ وقت گزاری کے لیے ٹیوشن پڑھاتا ہوں پھر بھی ڈھیر سارا وقت بچ جاتا ہے۔ اسے گزارنے کے لیے سرگزشت پڑھتا ہوں کیونکہ اس میں آپ بیتیاں جگ بیتیاں ہوتی ہیں۔ دوسروں کی آپ بیتیاں پڑھتے پڑھتے خیال آیا کہ میری زندگی میں بھی ایسے کئی واقعات ہیں جنہیں بطور کہانی سجایا جاسکتا ہے۔ بس میں قلم سنبھال کے بیٹھ گیا۔ پورا ایک ماہ لگا ہے لیکن ایک بہترین کہانی ہو گئی ہے۔

احمد

(لاہور)

جس سے وہ آج تک محروم تھی۔ میں حیران تھا کہ ایسی خوشی کہاں سے نازل ہوگئی؟ آج اس نے میرے گھر میں کیسے جھانک لیا جس کے بارے میں، میں نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا؟ کیوں کہ ایسی خوشی جس کا تصور خود فریبی تھا، اس لیے میں صابر و شاکر تھا۔ اس کا خیال کر کے دل دکھانے والی بات تھی۔

''کیا بات ہے؟ آج تو تم اتنی خوش دکھائی دیتی ہو کہ مجھ سے شادی کر کے بھی اتنی مسرور نظر نہیں آئی تھیں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''آپ کے تینوں بیٹے شاہد، خالد اور زاہد مل کر اختر اعوان صاحب کی کوٹھی خرید رہے ہیں۔'' بتول نے فرط مسرت سے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں برقی قمقمے روشن ہوگئے۔

''کون سی کوٹھی؟ ان کی تین کوٹھیاں ہیں، کیا ان کی ڈیفنس والی کوٹھی؟'' مجھے یقین نہ آیا کیونکہ وہ کروڑوں کی مالیت کی تھی۔

''جی ہاں — وہی وسیع و عریض کوٹھی جس میں سات بڑے بڑے اور کشادہ بیڈ رومز ہیں۔ اس کے علاوہ ہال نما فیملی لاؤنج، ڈرائنگ روم، لیونگ روم، دو اسٹور، بہت بڑا امریکن کچن، وسیع و عریض لان بھی ہے۔ اس کے علاوہ سوئمنگ پول بھی۔'' وہ ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔ ''ہر کمرا ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ سرونٹ کوارٹر بھی ہے۔''

''کیا کہا؟'' میں اس طرح اچھل پڑا جیسے کرنٹ لگا ہو۔ میری آنکھیں حیرت سے پھٹنے لگیں۔ ''وہ کوٹھی تو ہم نے بھی دیکھی ہے۔ وہ میرے اندازے کے مطابق چھ سات کروڑ بلکہ اس سے بہت زیادہ کی ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ وہ اس طرح خرید سکتے ہیں؟ ان کے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ان تینوں نے مل کر کہیں ڈاکے مارے ہوں۔ بینک لوٹے ہوں۔ چند روز میں دن دہلے دو بینکوں میں کروڑوں کی ڈکیتی ہوئی ہے۔''

''لگتا ہے کہ اس خبر کو سن کے آپ کو خوشی نہیں بلکہ دکھ ہوا ہے۔'' وہ برہم سی ہوگئی۔

''تمہارے لیے یہ خوشی کی بات ہو سکتی ہے میرے لیے نہیں۔'' میں نے تحمل سے کہا۔ ''یہ میرے لیے انتہائی حیرت، ناقابل یقین اور سوچنے کی بات ہے کہ ان کے پاس اتنی راتوں رات اتنی دولت کہاں سے آگئی؟ کیا میں جان سکتا کہ میری اولاد کی حیثیت اور اوقات کیا ہیں؟''

''آپ تیس برسوں میں بڑا مکان کیا بڑا پلاٹ تک نہیں خرید سکے اور میرے جگر کے ٹکڑوں نے تین برس میں ایک ہزار گز کے رقبے پر بنی کوٹھی خرید لی۔ آپ خوش ہونے کی بجائے پولیس والوں کی طرح جرح کرنے بیٹھ گئے جیسے وہ بیٹے نہ ہوں، ڈکیت ہوں، کیسے باپ ہیں آپ؟ کیا باپ ایسے ہوتے ہیں جو بچوں پر نازاں ہونے، فخر کرنے کی بجائے ناخوش ہو رہے ہیں۔''

''میں ان کے راتوں رات دولت مند بننے پر کیسے خوش ہو سکتا ہوں؟'' میں نے کہا۔ ''چاہے وہ میرے بیٹے ہی کیوں نہ ہوں۔ آخر میں نے کیوں تیس برس سنگلاخ راستوں پر چل کر اس گھر، بیوی بچوں پر حرام کمائی کا سایہ تک پڑنے نہیں دیا اس لیے کہ وہ انسان بن سکیں۔ حرام کمائی کا لقمہ ان کے حلق سے نہ اترے، ان کی زندگی دوسروں کے لیے نمونہ بن جائے۔ صرف میں نے ہی نہیں تم نے بھی تو اپنے خوابوں کو مسمار کیا۔ خوشیوں کو پامال کیا۔ آخر کس لیے صرف اس لیے کہ وہ بڑے ہوں تو ان کی زندگی آئینے کی طرح ہو۔ ان کا سر کسی کے آگے نہ جھکے۔ وہ کسی سے نظریں نہ چرائیں۔ سینہ تان کر چلیں۔ باپ کے کالے ہاتھوں کی وجہ سے انہیں کسی کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ کیا اس دن کے لیے ہم نے کٹھن اور مشکل زندگی گزاری تھی؟ دولت کے حصول کے لیے کیا ہم اتنے گر جائیں کہ اچھے برے کی تمیز کھو بیٹھیں؟ بغیر دولت کے بھی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ کیا لاکھوں افراد ایسی زندگی بسر نہیں کر رہے ہیں؟ میں نے جب دیکھا کہ دیانت داری اور محنت سے دولت نہیں کمائی جا سکتی تو قناعت کی زندگی گزاروں۔ اس طرح سے دولت کمانا جائز نہیں سمجھا۔''

''یہ آپ کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں کہ ہمارے بچوں نے غلط کام کر کے دولت حاصل کی ہے۔'' بتول کے چہرے پر ناگواری تھی۔

''اس بنیاد پر کہ ان کی تنخواہ کیا ہے؟ اس تنخواہ میں تین برس میں کیا تین سو برس میں بھی آدمی تیس لاکھ بچا نہیں سکتا۔ وہ صرف تین برس میں کروڑوں کی کوٹھی خریدنے والے ہیں۔ تم نے یہ بات بھی سوچی؟'' میں نے کہا۔

''کیا پتا ان کے سسرال والوں نے ان کی مدد کی ہو؟'' بتول نے اپنے بیٹوں کا دفاع کیا۔ ''کیا وہ ایسا نہیں کر سکتے؟''

''کیا تم اپنے سمدھیانے کے بارے میں نہیں جانتیں

کہ وہ کتنے پانی میں ہیں؟" میں نے گہری سانس کے لیے توقف کیا۔ "وہ اپنے آپ کو، مجھے اور ساری دنیا کی آنکھ میں دھول جھونک نہیں سکتے۔ ایمان بیچنا اور ضمیر فروش بن کے دولت کمانا سب سے آسان کام ہے۔ سب سے مشکل کام دیانت داری اور زندگی قناعت سے بسر کرنا ہے۔"

"میں نے اس پہلو پر سوچا نہیں تھا؟" وہ میری نگاہوں کی تاب نہ لا سکی۔ اس نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ "جب میں نے یہ خوش خبری سنی تو سب کچھ بھول گئی تھی۔"

"انہیں جب ہماری کوئی خبر نہیں ہے تو ہمیں ان کی خوشی سے کیا واسطہ؟" میں نے کہا۔ "تم کیوں دیوانی ہو رہی ہو؟"

"آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے شاہد اور اس کی بیوی آئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ ایک دن میں اس گھر کا سودا ہو جائے گا۔ وہ کہہ کر گیا ہے کہ ہمیں ساتھ لے جا کے اپنے گھر میں رکھے گا۔ رہنے کو ایک بیڈ روم دے گا۔ وہ اس نے گھر کا انتظام ہمیں سونپنا چاہتے ہیں۔"

"کیا تم جانتی ہو کہ کون سا جذبہ کارفرما ہے؟"

"نہیں۔" بتول نے نفی میں سر ہلایا۔ "بیٹے ماں باپ کا خیال نہیں کریں گے کیا؟"

"جی نہیں، یہ بات نہیں زوجہ محترمہ! اس لیے کہ اچھے نوکر اور ایمان دار چوکیدار ڈھونڈنے سے اور کسی بھی قیمت پر نہیں ملتے۔" میں نے کہا۔ "اور چونکہ تم بہت اچھے، لذیذ اور ذائقہ دار کھانے پکاتی ہو۔ ایسا مزہ نہ تو ان میں سے کسی کی بیوی کے ہاتھ میں ہے اور نہ ہی کسی خانساماں کے ہاتھ میں ہو گا اور میں ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہوں، لہٰذا چوکیداری کروں گا۔ اس لیے انہیں ہماری ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

"نہیں..... یہ بات نہیں ہے۔" بتول نے تکرار کی۔ "وہ اس لیے ہمیں ساتھ لے جانا چاہتے ہیں کہ ہم ان کے ماں باپ ہیں۔"

"تم بیٹوں کے ساتھ رہنے کی خوشی میں پاگل ہو رہی ہو۔" میں نے تند لہجے میں کہا۔ "انہیں ان تین برسوں میں ماں باپ کی ضرورت اور کمی کا کوئی احساس نہیں ہوا اور خوشی میں تم یہ بات بھول رہی ہو کہ مجھ جیسا شخص رشوت خور اولادوں کے ساتھ جا کر کیسے رہے گا؟"

بتول خجل سی ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی تو اس میں دکھ کی آمیزش تھی۔ پھر وہ تاسف سے بولی۔ "آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں اگر وہ ہمیں لینے آئیں گے تو میں صاف انکار کر دوں گی۔ اتنی عمر کسی نہ کسی طرح تو گزر گئی جو بچی ہے وہ بھی گزر جائے گی۔ اب ہم حرام کی کمائی کا زہر اپنے خون میں سرایت نہیں کریں گے۔"

تیسرے دن میرے تینوں بیٹے گھر آئے تھے۔ وہ ہمیں ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس گھر کا نہ صرف سودا کر لیا تھا بلکہ قبضہ بھی لے لیا تھا۔ وہ شادی کے بعد اپنی بیویوں کو لے کر الگ ہو گئے تھے۔ دنیا والے کہتے تھے کہ بیویاں انہیں ہم سے چھین کے لے گئیں لیکن میں نے کبھی اپنی بہوؤں کو دوش نہیں دیا تھا اس لیے کہ اس میں سارا قصور میرے لڑکوں کا تھا جو اپنی بیویوں کے اشاروں پر ناچنے لگے۔ زن مرید بن گئے تھے۔ بڑا بیٹا شاہد تو گھر داماد بن گیا تھا اور دوسرا بیٹا خالد اپنے سسر کے ایک فلیٹ میں کرائے پر رہنے لگا تھا۔ تیسرے بیٹے زاہد کی بیوی کو اس کے ماں باپ نے دو بیڈ روم کا ایک کشادہ فلیٹ جو اعلیٰ علاقے میں تھا، جہیز میں دیا تھا۔ وہ دونوں اس میں رہتے تھے۔ آج کل شادی کے بعد لڑکیاں نہیں، لڑکے رخصت ہونے لگے ہیں۔

دنیا کی ریت بھی ہے کہ ماں کو لڑکے سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ بتول کو لڑکوں کی شدید تمنا تھی۔ اللہ نے اسے تین لڑکوں سے نوازا۔ وہ تین لڑکوں کی ماں بن کر بے حد خوش تھی۔ ان لڑکوں کی پیدائش سے جوانی تک اس نے ان کے بارے میں کیا کیا خواب نہیں دیکھے ہوں گے لیکن اس کے وہ خواب پورے نہ ہو سکے۔ شادی کے بعد کوئی بیٹا اس ادب لیا مکان میں ہمارے ساتھ ایک گلی بندھی زندگی گزارنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ انہیں یا ان کی بیویوں کو یہ قید خانہ ذرا بھی پسند نہیں تھا جہاں کچھ پابندیاں اور ضوابط بھی تھے۔ وہ اپنی مرضی کی خود مختار اور بے لگام زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ ہم نے انہیں روکا نہیں۔ بتول نے صرف سب سے چھوٹے بیٹے زاہد کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بچوں کو وہ بہت چاہتی تھی۔ زاہد نے اپنی ماں پر اپنی حسین بیوی کو ترجیح دی تھی۔ بتول کے دل کو اتنا گہرا صدمہ پہنچا تھا کہ وہ ایک مہینے تک بستر سے لگی رہی تھی جب کہ میں نے اس کا کوئی جذباتی اثر نہیں لیا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ ایک دن تو ایسا ہونا تھا۔

وہ ہم سے ملنے گاہے گاہے آتے رہتے تھے۔ کبھی اکیلے تو کبھی بیوی بچوں کے ساتھ۔ بڑا احمقانہ سا انداز ہوتا تھا۔ وہ بیٹے نہیں مہمان معلوم ہوتے تھے۔ ایک اجنبیت سی محسوس ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ خانہ پری کرنے آتے

ہوں۔ آج آئے تھے تو ان میں سابقہ انداز نہ تھا۔ بڑی محبت اور گرم جوشی تھی۔ شاہد نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ "ابو! ہم آپ اور امی کو لے جانے کے لیے آئے ہیں؟"

"کہاں؟" میں نے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے پوچھا۔

"اپنے ہاں۔" اس نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا۔ "ہم تینوں نے مل کے ایک کوٹھی خریدی ہے، ہم تینوں کی فیملی کے وہاں شفٹ ہو گئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی آجائیں اس گھر پر آپ کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا ہمارا ہے۔ وہاں آپ کو بہت آرام ملے گا۔ خدمت کے لیے نوکر چاکر بھی ہیں۔ وہ گھر بڑا خوب صورت، کشادہ اور ہوادار ہے۔ اس گھر کی طرح ڈربا نما نہیں جس میں سانس گھٹتی ہے۔ پلیز! ابو چلیے نا؟"

"کیا تم اس بات کی توقع رکھتے ہو کہ تمہارے ماں باپ جنہوں نے اپنی ساری زندگی کبھی اصولوں کا سودا نہیں کیا، وہ تمہارے ساتھ زندگی گزاریں گے؟" میری آواز تیز ہو گئی۔ "شاید تم لوگوں نے اپنے باپ کو قریب سے نہیں دیکھا اور اسے آج تک سمجھ نہیں سکے ورنہ آج ایسی بات نہ کرتے۔"

"مگر ابو! آپ اور امی ہمارے ساتھ رہیں تو اس میں کیا برائی ہے؟" زاہد کہنے لگا۔ "کیا اولاد ہونے کے ناتے ہمارا فرض نہیں بنتا کہ آپ کی خدمت کریں؟ آپ ہمیں اس فرض سے کس لیے محروم کرنا چاہتے ہیں؟"

"برائی؟" میرا منہ اس طرح بن گیا جیسے کڑوی کسیلی گولی آ گئی ہو۔ "میرے نزدیک سب سے بڑی برائی رشوت لینا ہے جو تمہارے نزدیک سب سے اچھی بات ہے۔ تم لوگ رشوت خور ہو، اب میں اس عمر میں حرام کمائی کھاؤں؟"

"یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ ہم رشوت خور ہیں؟ رشوت لیتے ہیں؟" خالد نے حیرت سے میری شکل دیکھی "یہ غلط بات ہے۔"

"یہ رشوت کی آمدنی سے خریدی ہوئی کوٹھی نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ تم تینوں راتوں رات لکھ پتی، کروڑ پتی کیسے بن گئے؟" میرا پارہ چڑھ گیا۔ "کیا الہ دین کا چراغ ہاتھ لگ گیا؟"

"اوہ! یہ بات ہے؟" شاہد ایک دم سے مسکرا دیا۔ "نہیں ابو! ہم نے جو کوٹھی خریدی ہے۔ اس میں ایک روپیہ بھی حرام کا نہیں ہے۔ ہم تینوں بھائیوں نے مل کر مارکیٹ اور سوتی چادریں ایکسپورٹ کی تھیں۔ اس کاروبار کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا تھا۔ نہ آپ کو اور نہ ہی اپنی بیویوں کو اس کی ہوا لگنے دی تھی۔ اس ایک دو برس میں ہم نے کروڑوں کمائے۔ پاکستانی کرنسی، غیر ملکی کرنسی کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے۔ غیر ملکی کرنسی سے کئی گنا زیادہ۔ پاکستانی کرنسی سے ہماری آمدنی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اب ہم اپنی اپنی ملازمتوں سے استعفیٰ دینے والے ہیں تاکہ ایکسپورٹ کا کاروبار جاری رکھیں۔"

"اچھا!" میں ایک دم سے خوش ہو گیا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی سیدھے راستے سے ہی راتوں رات دولت مند بن سکتا ہے۔ بہت خوب.....! تم لوگوں نے میری سوچ اور اندازوں کو غلط ثابت کر دیا اور اس طرح سے کما کر ایک مثال بھی قائم کر دی۔ اب مجھے اور تمہاری ماں کو ذرا سوچنے دو۔ صرف ایک دن کی مہلت۔ اگر ہم نے تمہارے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا تو کل سہ پہر تک تمہاری کوٹھی میں منتقل ہو جائیں گے۔"

بچوں کے جانے کے بعد میں نے بتول کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ اک دم سے برہم ہو گئی۔ "بچوں کے ساتھ جا کر رہنے میں اب بھی مین میخ رہ گئی ہے، اب بھی آپ کا دل صاف نہیں ہوا کہ ان کی حلال کمائی ہے۔"

"کیا تم وہاں جا کے خوش رہ سکو گی؟" میں نے پوچھا۔ "جذباتی نہ ہو، ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو کیونکہ اس گھر اور اس عالی شان پرشکوہ کوٹھی کی زندگی میں ایسا ہی فرق ہے جیسا زمین آسمان کے درمیان۔"

"کون ماں ایسی ہے جو بچوں کے ساتھ خوش نہ رہ سکے؟" وہ مغرور لہجے میں بولی۔ "آپ کیا جانیں کہ ماں کی ممتا کیا ہوتی ہے؟"

"چھوٹے بچوں اور بڑے بچوں میں بڑا فرق ہوتا ہے اب وہ خود بچوں والے ہیں۔ ہمارے تابع نہیں ہیں۔"

"جب بچی اور بے پایاں خوشی مل رہی ہے تو آپ اسے ٹھکرا رہے ہیں۔" وہ زہر خند لہجے میں بولی۔ "میں نے تیس برسوں میں کون سی خوشی دیکھی؟ ان خوشیوں کی بات کر رہی ہوں جنہیں ہم چھو سکتے ہیں۔ جیسے بڑے اسکرین کے رنگین ٹیلی ویژن۔ ماسٹر بیڈ روم۔ اے سی۔ ڈی وی ڈی۔ خدمت کے لیے نوکر چاکر۔ ہم وہاں رہ کر ان خوشیوں کو پکڑ تو سکتے ہیں۔"

''اچھا!'' میں اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ ''یہ چیزیں خوشیاں دیتی ہیں اور تم وہاں مسرت پا سکتی ہو؟ تو سہ پہر تک انتظار کیوں کریں، سویرے ہی چلے جاتے ہیں۔''

بتول نے تیس برس تک کے ایک طویل عرصے میں صابر و شاکر عورت اور باوفا بیوی بن کے زندگی کے نشیب و فراز میں ہر دم دل و جان سے خدمت کی تھی۔ اس نے شادی کی پہلی رات زندگی کے سفر میں آخری لمحے تک ساتھ دینے کا عہد کیا تھا۔ اس نے احساس محرومی اور ناگفتہ بہ حالات کو نوشتہ تقدیر سمجھ لیا تھا۔ اس نے جان لیا تھا کہ وہ ایک دیانت دار سرکاری ملازم کی بیوی ہے۔ اس نے تیس برس کی کڑی اور نامساعد حالات کی ازدواجی زندگی میں کبھی حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ اس نے ہر قدم اور ہر حال میں میرا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔ میرے دل کے کسی کونے میں بہت ساری خواہشیں تھیں۔ میں اسے کسی رانی کی طرح رکھنا چاہتا تھا مگر باوجود کوشش کے رکھ نہ سکا تھا کیونکہ میری تنخواہ ہی کیا تھی؟ اگر میں بالائی آمدنی کی طرف ہاتھ بڑھاتا تو کب کا بہت ساری خوشیاں حاصل کر چکا ہوتا۔ وہ حوصلہ مند تھی اور میرا حوصلہ بھی بڑھا ہوا تھا مگر آج تیس برسوں کے بعد وہ ایک دم سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ ساری زندگی کی قناعت اور سادگی اور بے کیف سی زندگی سے وہ اکتا گئی تھی۔ تھک گئی تھی کیونکہ حالات نے اسے کسی گیلے کپڑے کی طرح نچوڑ دیا تھا۔ بچوں نے آسمان جیسی بلندیوں کو چھو لیا تھا تو وہ ان بے پایاں خوشیوں کو پانے کے لیے بے چین ہو گئی تھی۔

ہم دونوں دوسرے دن سہ پہر کے وقت بچوں کے گھر پہنچ گئے تھے۔ ہم نے یہ حتمی فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ مکان کسی قیمت پر نہیں چھوڑیں گے اس لیے اس گھر سے ہماری جذباتی اور ماضی کی وابستگی تھی، یادیں اور ناقابل فراموش لمحات یادگار تھے، بتول اس گھر میں دلہن بن کر آئی تھی۔ ہم اس گھر کے بغیر کچھ بھی نہ تھے۔ جب ہمارے بڑے بیٹے کی شادی ہوئی تھی تو میں نے کہہ دیا تھا کہ جتنے کمرے کہو اوپر نیچے بنا دوں لیکن اس کی نوبت نہ آئی کیونکہ ہر بیٹا شادی کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ چلتا بنا تھا۔ گویا یہ ڈھائی کمروں کا ڈربا نما مکان تھا۔

اس کوٹھی میں آ کر ایسا لگا کہ ہم رنگین سپنوں کی حسین دھرتی پر آ گئے ہوں۔ اس گھر میں ایک خواب ناک زندگی بچھی ہوئی تھی۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ ہر کمرا ایسا خوب صورت، اتنا بڑا اور اس قدر آراستہ و پیراستہ تھا کہ اس پر کسی شاہی محل کی خلوت گاہ کا گمان ہوتا تھا۔ یہ کروڑوں مالیت کی کوٹھی جو خریدی گئی تھی اس کی آرائش و زیبائش، راحت اور آسائش کے لوازمات پر لاکھوں کی رقم خرچ کی گئی تھی۔ یہ سابقت کی دوڑ تھی ہمارے بچے اس میں آگے نکل جانا چاہتے تھے۔ یہ ایک نئی دنیا تھی، ہماری دنیا سے بالکل مختلف۔ بتول بیگم صاحبہ بن گئی تھی۔ نوکر چاکر اس کے ماتحت تھے۔ گھر کے تمام اخراجات کے لیے بیٹے اس کے ہاتھ پر رقم رکھ دیتے تھے۔ وہ اب بازار نہیں جاتی تھی بلکہ نوکر سودا سلف لاتے تھے۔ حتیٰ کہ نوکر ہی کھانا پکاتے تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی کہ اپنے گھر میں بتول بازار جاتی تھی، سودا سلف خوب مول تول کے لاتی تھی، اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتی تھی اور اب اس گھر کا نظام نوکروں کے مرہون منت ہو کے رہ گیا تھا۔ بہوئیں بھولے سے بھی باورچی خانہ میں جھانکتی تک نہیں تھیں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کھانا تو دور کی بات ہے کہ انہوں نے کبھی اپنے ہاتھ سے چائے تک بنا کے پلائی ہو۔

ایک تو وہ صبح کی بجائے دوپہر تک ایک دو بجے سے پہلے جاگتی نہیں تھیں۔ نہانے اور میک اپ میں دو دو گھنٹے لگ جاتے تھے۔ ناشتا ایک بجے کے بعد ہوتا تھا۔ تینوں کے ٹیلی فون اور موبائل فون بھی مصروف ہو جاتے تھے۔ وہ اپنے میکے، سہیلیوں اور رشتے داروں سے باتیں کرتی رہتی تھیں۔ ان کا موضوع میک اپ، ملبوسات اور تقریبات تھے۔ یہاں آ کر صرف ایک ہی مہینا ہوا تھا کہ بتول کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ ہر ہفتے کسی نہ کسی اسپیشلسٹ سے رجوع کیا جاتا تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ شاید کسی مہینے کسی کی بیماری پر بھی بیس تیس روپے بھی خرچ ہوئے تھے اس لیے کہ بچوں کو مالی مجبوریوں کی بنا پر آئس کریم، ٹافیوں، چپس اور بازار کی چیزوں اور کولڈ ڈرنکس سے کوسوں دور رکھا تھا۔ اس گھر میں نوکر نہیں آیا کرتے تھے۔ بتول خود ہی جھاڑو، پونچھا اور کھانے پکانے کا کام کرتی تھی۔ میرے بچوں اور اپنے کپڑے بھی سیتی تھی۔ اتنا کام کرنے کے باوجود وہ بیمار نہ ہوتی تھی بلکہ چاق و چوبند رہتی تھی۔ ایک روز سویرے اپنے کمرے میں ناشتا کرتے وقت اس کی طبیعت ناساز دیکھی تو میں نے کہا۔ ''بتول! کیا تمہیں کبھی اپنی بیماری کی وجہ سمجھ میں آئی ہے؟ تم نے کبھی کیا اس بات پر غور کیا ہے؟''

''جی!'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بڑھاپا ہے۔ اس وقت میں پچپن برس سے اوپر کی ہو رہی

ہوں۔"

"بڑھاپا نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم ڈیڑھ ایک مہینے پہلے بھی اسی عمر کی تھیں تب کوئی بیماری نہیں تھی۔ بیماری تو تمہیں پرتعیش زندگی نے دی ہے۔"

"نہیں! یہ بات نہیں۔" بتول نے نفی میں سر ہلایا۔ اس عمر میں بیماریاں ساتھی بن جاتی ہیں۔ یہ بڑھاپے کا روگ ہوتی ہیں۔"

"تم بھول رہی ہو یا پھر اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہو؟" میں نے کہا۔ "تمہیں اس بات کا دکھ ہے کہ یہاں بہوؤں کی حکومت ہے۔ تم ان کے شوہروں کی ماں ہونے کے باوجود ان کے زیر اثر ہو۔ اس دکھ نے تمہیں بیمار بنا دیا ہے اور ہمارے بیٹوں کا رویہ ہمارے ساتھ رکھی انداز کا سا ہے۔"

"آپ اپنے بچوں کی کمائی سے جلتے اور حسد کیوں کرتے ہیں۔ یہاں کس چیز کی کمی ہے؟ انہوں نے کتنے آرام اور عزت سے رکھا ہوا ہے۔ کیا آپ نے کبھی سکھ کا ایک دن بھی دیا تھا؟ بچوں کو احساس محرومی کے سوا کیا ملا تھا؟ بچوں نے اس کے برعکس ایک خوب صورت زندگی دی ہے۔ ہر طرح سے ہمارا خیال رکھتے ہیں۔ پھر بھی آپ یہ کہتے ہیں کہ ان کا رویہ رکھی انداز کا سا ہے۔ وہ آپ کے لیے اور کیا کریں؟"

ایک روز میں نے زاہد سے گاڑی کے لیے کہا تو وہ ٹال گیا اس لیے کہ اس کی بیوی کو بال سیٹ کروانے بیوٹی پارلر جانا تھا۔

"آپ رکشا یا ٹیکسی میں تو جا سکتے تھے۔" بتول نے تیز لہجے میں کہا۔ "آپ کو گاڑی مانگنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

"اس علاقے میں رکشا ٹیکسی کہاں ملتی ہے؟" میں نے کہا۔

"رکشا ٹیکسی کیوں نہیں ملتی۔" وہ خشک لہجے میں بولی۔ "کیا ان کا داخلہ ممنوع ہے؟"

"اس لیے کہ یہاں سب گاڑی والے رہتے ہیں اور ان سے ملنے والے بھی گاڑی میں آتے ہیں۔"

"بس اسٹاپ آخر ہے کتنی دور؟" بتول بولی۔ "آپ ٹہلتے ہوئے چلے جاتے۔ بسوں کا کرایہ ہوتا کتنا ہے۔ کیا آپ کے پاس کرایہ بھی نہیں ہے؟"

"بس اسٹاپ دو قدم پر نہیں بلکہ ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔" میں نے جل کے کہا۔ "یہاں جو لوگ رہتے ہیں ان کی ناک بہت بڑی ہوتی ہے۔ انہیں ہر بات ناگوار ہوتی ہے لیکن انہیں ناک کا کٹنا کسی قیمت پر پسند نہیں ہے۔ مجھے تمہارے بچوں کی ناک کٹنے کا خوف ہے۔ تم سب سے پہلے اعتراض کرتیں کہ آپ کو بچوں کی عزت کا ذرا بھی خیال نہیں۔ لوگ کیا کہیں گے کہ کروڑ پتی بیٹوں کا باپ پیدل آتا جاتا ہے۔ بسوں اور ویگنوں میں دھکے کھاتا ہے جب کہ گھر میں گاڑیاں موجود ہیں۔ کہیں یہ نوکر تو نہیں ہے؟"

"کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ بس اسٹاپ تک ٹہلتا ہوا جاتا ہوں کیونکہ ڈاکٹروں نے پیدل چلنے کی تاکید کی ہوئی ہے۔ بسوں میں کون سفر کرتا ہے جو آپ سے پوچھے گا۔ سب کے پاس اپنی اپنی گاڑیاں ہیں اور یہ ان گاڑیوں میں آتے جاتے ہیں۔"

"اس عمر میں تم مجھے جھوٹ بولنا سکھا رہی ہو؟" میں بگڑ گیا۔ "تم جانتی ہو کہ ساری عمر میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اب کیسے بولوں گا۔"

"اس جھوٹ بولنے سے آپ کی ذات پر کون سا حرف آجائے گا؟" بتول تنک کر بولی۔ "جب میں بیاہ کر آپ کے گھر آئی تو آپ کے پاس تھا کیا؟ ایک سرکاری کوارٹر جو مرغیوں کے ڈربے کی طرح تھا۔ کیا میں نے آپ کا گھر اپنے ہاتھوں سے نہیں بنایا؟"

"تمہارے ماں باپ نے دیا کیا تھا جہیز میں؟" میں نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ "بھکو اور کنگلے تھے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ جوڑے کی رقم نہیں دی جب کہ غریب سے غریب بھی دو ہزار سے پانچ ہزار روپے دیا کرتے تھے۔ جائے پر نکاح پڑھوا کے اس طرح رخصت کیا تھا جیسے دھکے دے کر گھر سے نکال رہے ہوں۔ پلاٹ میری کمائی سے لیا تھا، حلال کمائی سے۔ اسے میں نے تمہاری بیماری کے علاج کے لیے کوڑیوں میں فروخت کر دیا۔"

"شادی سے پہلے بھی کماتے تھے؟ گھر میں کیا تھا؟ ایسا لگتا تھا کہ گھر میں جھاڑو پھیر دی گئی ہو۔"

"مجھے فضول میں گھر کو سجانے کی ضرورت بھی کیا تھی؟" میں نے جواب دیا۔ "میں نے اس لیے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ قناعت پسند تھا۔"

"چرند پرند تنکے جوڑ جوڑ کے اپنے آشیانے بناتے ہیں۔" اس کا لہجہ تیز ہو گیا۔ "کیا آپ نے ان سے نہیں سیکھا؟"

"پرندے بناتے ہوں گے۔" میں نے قدرے

بڑی بے رخی سے کہا۔ "مجھے کسی چیز کی کوئی محتاجی نہ تھی۔ تم نے میری زندگی میں آکر میرے سارے خواب چھین لیے۔ تمہارے لیے مجھے اپنی ساری زندگی تج دینا پڑی۔ تمہاری بے رحمانہ خوشیوں نے میری خوشیوں کو روند ڈالا پھر بھی تم مجھ پر احسان جتا رہی ہو اگر میں تم سے شادی نہ کرتا تو تم سے کوئی بھی شادی نہ کرتا اس لیے کہ تمہارے ماں باپ کے پاس تھا ہی کیا۔ تم یہاں آکر اپنی اوقات بھول رہی ہو۔ انسان بڑا ناشکرا اور احسان فراموش ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے احسان بھول جاتا ہے جو اس پر کسی کا ہوتا ہے۔"

"احسان فراموشی کی بھی حد ہوتی ہے۔" وہ کہنے لگی۔ "کبھی ایک چوڑی تک بنا کے نہیں دی اور آج میں آپ کو بری لگ رہی ہوں؟ میری کھری باتوں میں زہر محسوس ہو رہا ہے؟"

"تم کبھی بری نہیں لگیں؟" میں اندر ہی اندر بری طرح جل گیا۔ "لیکن تمہاری باتیں زہر لگتی ہیں۔ میری جگہ اور کوئی ہوتا تو وہ جوتی اٹھا لیتا اور تمہیں گنجی کر دیتا۔"

"میری جگہ کوئی اور ہوتی تو وہ ایک دن بھی آپ کے ساتھ گزارا نہیں کرتی، یا تو آپ پاگل خانے پہنچ جاتے یا پھر وہ غریب چلی جاتی۔"

"یہ کیا کم ہے کہ تم نے مجھے تیس برسوں تک پاگل بنا رکھا۔" میں نے کہا۔ "وقت جو بھی رکتا نہیں، تھمتا نہیں، کسی کا ہوتا نہیں اور وہ گزر گیا جس سے کئی سہانی اور جذباتی یادیں وابستہ ہیں۔ اب آج ایک دوسرے کو بچھو کی طرح ڈنک مارنے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس کا وقت اور موقع ہے۔ میں یہ کیسے بھول سکتا ہوں کہ تم نے بچوں کو پڑھا لکھا کے اور ان کی تربیت کر کے اپنا فرض اور ذمے داری پوری کر دی۔ غریب ماں باپ کے بیٹے کروڑپتی ہیں۔ تم ان کی ماں ہو، ہم نے ان کی تعلیم و تربیت میں اپنا اپنا بڑا کردار ادا کیا ہے اور پھر تمہیں اپنے بیٹوں سے جذباتی لگاؤ بھی ہے۔ ایک ماں ہونے کے ناتے تم ان کے ساتھ رہو۔ زندگی کی ساری خوشیوں کو قید کر لو جس کے لیے تم پاگل ہو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

وہ ایک دم کھلکھلا کے ہنس پڑی تو میں نے اسے بازوؤں کے حصار میں قید کر لیا۔ تیس برسوں کے بعد آج بھی وہ ایسی جوان اور حسین دکھائی دیتی تھی جیسے ابھی دلہن بن کر آئی ہو۔ اس کے چہرے کی تازگی، شادابی و شباب اور لمبے کالے بالوں سے وہ جوان لگتی تھی۔ کچھ دیر خود سپردگی سے من مانیاں کرنے دیتی رہی پھر وہ کسمسائی اور بازوؤں کی گرفت سے نکل کر بولی۔ "کوئی آ جائے گا۔" پھر اپنے بال اور لباس درست کرنے لگی۔

"آپ کو بہت جلد غصہ آ جاتا ہے بلکہ ہر وقت ناک پر رہتا ہے۔"

"مرد کی ناک ہی تو سب کچھ ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم جو ہر وقت غصہ دلانے والی باتیں کرنے لگی ہو۔"

"مگر میں بھی تو آپ کی ناک ہوں۔" وہ مسکرانے لگی۔ "آپ یہ کیوں نہیں سوچتے ہیں؟"

"میں تیس برسوں کے اس لمبے سفر میں اپنے رفیق سفر کو آج تک سمجھ نہیں سکا۔" میں نے کہا۔ "ایک عورت اور بیوی کے کتنے روپ ہوتے ہیں۔ گویا میں اپنی زندگی ایک اداکارہ کے ساتھ گزار رہا ہوں۔ عورت کتنی بڑی اداکارہ ہوتی ہے۔"

"آپ کو میری ساری زندگی کا احسان مند ہونا چاہیے۔" وہ بولی۔ "آپ مجھے اداکارہ کہہ رہے ہیں؟ وہ کس بنا پر؟"

"تم نے مجھ پر کیا احسان کیا ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"یہ بیوی ہی ہوتی ہے جو اپنے مرد کی ناک کٹنے سے بچاتی رہتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "جس ناک کی میں نے تیس برس حفاظت کی کیا آج میں اسے کٹنے دوں گی؟"

اسی وقت ایک آہٹ کمرے سے باہر ہوئی تو ہم دونوں الگ ہو گئے۔ شاہد کمرے میں داخل ہوا تو میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"آپ دونوں میں کس بات پر بحث و تکرار ہو رہی تھی؟" اس نے دریافت کیا۔ "کہیں آپ دونوں آپس میں لڑائی جھگڑا تو نہیں کر رہے ہیں؟"

"جھگڑے کی عمر اب کہاں رہی ہے بیٹے۔" بتول نے جواب دیا۔ "کسی بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں۔ نیاز کی بات ہو رہی تھی۔ میں تمہارے ابو سے کہہ رہی تھی کہ کسی مسجد میں نیاز کی رقم دے آئیں۔ کل تمہارا بیٹا بھاگتے ہوئے گر پڑا تھا۔ اللہ نے بچایا ورنہ پیر یا ہاتھ ٹوٹنے کا ڈر تھا۔ یہ کہہ رہے تھے کہ سوا روپیا نہیں ایک سو میں روپے۔"

میں نے بتول کے سفید جھوٹ بولنے پر اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی۔ یہ ایک ایسی بات تھی کہ میں اسے ٹوک بھی نہیں سکتا تھا۔ "سوا روپے کی حقیقت ہی کیا ہے؟"

میرے بیٹے نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ''ابو! ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ایک سو بیس روپے بھی کچھ نہیں ہیں۔''

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ زاہد اور خالد بھی کمرے میں آ گئے۔ میں نے کہا۔ ''آج نہ تو آدمی کی قدر ہے اور نہ ہی پیسوں کی۔''

''نہیں ابو! آپ غلط کہہ رہے ہیں۔'' شاہد نے درمیان میں تیزی سے کہا تو میں کہتے کہتے رک گیا۔ ''آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ سو، پانچ سو اور ہزار کے نوٹ کی کوئی قدر نہیں۔ کوئی حقیقت نہیں۔ جب میں اسکول بسوں میں جاتا تھا تب بسوں میں اندر لکھا ہوتا تھا کہ ایک روپے سے زیادہ ریزگاری نہیں ملے گی۔ ہوٹلوں میں ایک تختی آویزاں ہوتی تھی کہ سو روپے کے نوٹ والے کاؤنٹر سے معلوم کریں لیکن آج آپ کسی چھوٹے سے چھوٹے ہوٹل والے سے کہیں کہ میرے پاس ہزار کا نوٹ ہے تو وہ اس کا کھلا دے دے گا۔ ایک ذرا سی بات پر نذر نیاز دینے کی کیا ضرورت ہے؟ بچے تو کھیلتے میں گرتے پڑتے رہتے ہیں۔''

''جان و مال کا صدقہ دیتے رہنا چاہیے۔'' بتول بولی۔ ''اس سے بلائیں دور ہو جاتی ہیں، سکون ملتا ہے، صدقہ خیرات دینے میں حرج کیا ہے؟''

''سکون تو بہت ساری چیزوں سے ملتا ہے ابو۔'' شاہد نے کہا۔ ''ایک شرابی، شراب پی کے، ہیروئچی ہیروئن کا نشہ کر کے، افیمی افیون پی کر کہا کرتا ہے کہ بڑا سکون ملتا ہے۔ دنیا کے ہر غم، دکھ، پریشانی اور مصیبت سے نجات مل جاتی ہے۔ اس طرح ہر شخص کسی نہ کسی چیز میں سکون پا لیتا ہے۔ تمباکو نوشی کرنے والوں کی مثال لیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سگریٹ سے بھی بڑا سکون ملتا ہے۔''

''سکون..... سکون میں بڑا فرق ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ایک سکون تو عارضی ہوتا ہے اور ایک سکون دائمی۔ جو عارضی سکون ہے وہ صرف ذہن تک محدود ہوتا ہے۔ حلال حرام کمائی میں جو فرق ہے ایسا ہی فرق اس سکون میں بھی ہے۔ حرام کمائی والے کے پاس لاکھوں روپے بھی آتے ہیں تو بھی اس کے دل کو وہ سکون اور خوشی محسوس نہیں ہوتی جو حلال کمانے والے کو سو روپے سے، اس لیے کہ حرام کمائی والے کے دل میں ہوس ہوتی ہے اور حلال کمائی والا قناعت پسند ہوتا ہے۔ وہ دولت کو اس لیے اہمیت نہیں دیتا ہے کہ یہ فانی چیز ہے۔''

''تمہارے ابو ساری زندگی حلال اور حرام کے چکر میں پڑے رہے۔ لوگ گھر پر تھیلوں میں اور لفافوں میں نوٹ بھر کے لاتے تھے اور ایک یہ تھے کہ انہیں گھسنے ہی نہیں دیتے تھے ان کے نزدیک یہ حرام کمائی تھی۔ اگر یہ اس چکر میں نہیں پڑتے تو بیس پچیس برس پہلے ہی ایک نہیں بلکہ دو ایسی کوٹھیاں ہوتیں اور تین چار گاڑیاں ہوتیں۔ میں تو ان کی سوچ اور ان کے خواب دیکھ کے دل مسوس کر رہ جاتی تھی۔''

''نوٹ پر تو لکھا نہیں ہوتا کہ حلال کا ہے یا حرام کا؟'' زاہد بولا۔ ''یہ جس کے پاس ہوگا وہ اس کا مالک ہوگا۔''

میرے نزدیک کسی کام کے عوض رقم لینا رشوت نہیں ہے۔'' شاہد نے کہا۔ ''اس لیے میں نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ نہیں دیا۔''

''آپ کے اس خیال اور بات سے مجھے بھی سو فیصد اتفاق ہے۔'' خالد نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ''ہم کسی سے کسی کام کا معاوضہ لیں تو وہ رشوت کہی جاتی ہے۔ جیسے آج غیر ممالک سے کوئی مال تجارت کی غرض سے چوری چھپے لایا جائے تو وہ اسمگلنگ کہلاتی ہے۔''

میں ان کی باتیں سن کر ششدر رہ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرے بیٹے رشوت لیتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے جھوٹ کہا تھا کہ وہ رشوت نہیں لیتے اس لیے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور نہ آ سکتی تھی کہ لاکھوں کا کاروبار کرنے کے باوجود انہوں نے ابھی تک اپنی ملازمتوں سے استعفیٰ کیوں نہیں دیا؟ دولت نے ان کی عقلوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔ انہیں اچھے برے کی تمیز نہیں رہی تھی۔ وہ دولت کمانے کے اندھے جنون میں مبتلا ہو گئے تھے۔

میں گھر سے نکل کے مسجد کی طرف روانہ ہو گیا جو بہت دور تھی۔ انہیں شاید مسجدوں کی ضرورت نہیں تھی، اس لیے اس علاقے میں مسجدیں نہ تھیں۔ شاید یہاں والوں کو سکون اور خوشی نماز میں کہاں ملتی ہوگی...؟ ان کی خوشی، کوٹھیاں بنانے، دولت کمانے، کلبوں میں جانے اور تقریبات میں ہم رقص ہونے اور ہر برس نئی گاڑیاں بدل کے اور خرید کے خوشی ہوتی ہوگی۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ جن مکانوں کے آس پاس مسجد ہوتی ہے اس کی مالیت کم ہو جاتی ہے۔ اس کا فروخت ہونا بڑا مشکل ہوتا ہے۔

ظہر کی اذان میں بہت دیر تھی۔ مسجد خالی پڑی تھی۔ جب میں اندر داخل ہوا تو میرے قلب میں ایک عجیب سا سکون اتر آیا۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے سوچنے لگا۔ آج سے قبل میرے پاس دولت نہ تھی تو کیا ہوا اس چھوٹے سے

گھر میں سکون تھا۔ اس چھوٹی سی کمائی میں کیسی خیر و برکت تھی۔ بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی، ان کی تربیت ایسی کی کہ وہ ایک دن مثالی بن جائیں۔ کوئی الجھن، جھگڑا اور پریشانی نہیں تھی۔ اس کوٹھی میں آکر جو گھر نہیں بلکہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل معلوم ہوتا تھا۔ اس میں وہ آزادی اور زندگی نہ تھی جو اپنے اس چھوٹے سے گھر میں تھی۔ یہاں بہوؤں کا راج تھا۔ ان کی حکمرانی تھی۔ ان کا سکہ چلتا تھا۔ ہم دونوں کی حیثیت ڈمی کی سی تھی۔ ایک خاص پرزہ تھے اس مشینی زندگی کے۔

میرے دل کو جس بات سے شدید رنج پہنچا تھا اور اس انکشاف پر کہ میرے بچوں کے نزدیک حلال حرام کمائی میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ آج بھی اس لیے ملازمت کر رہے تھے کہ وہ رشوت کی آمدنی سے محروم ہونا نہیں چاہتے تھے کیونکہ حرام ان کے منہ لگ چکا تھا۔ گویا اس میں حلال، حرام کی کمائی ساتھ آرہی تھی۔ میری ریٹائرمنٹ کے بعد بچے گھر کے اخراجات کے لیے کچھ رقم ماں کو دیتے تھے۔ اس سے ہم نے وہ قرض اتارا جو ان کی شادی پر لیا ہوا تھا۔ اس میں سے کچھ رقم اپنی ذات پر خرچ کر چکے تھے اور کر بھی رہے تھے اس لیے کہ میری پنشن سے گھر بنانے کے لیے جو قرض لیا تھا وہ ادا ہو رہا تھا۔ گویا وہ حرام کمائی تھی جس سے ہماری گزر بسر ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے کبھی رقم نہیں لی لیکن میری اولاد نے ماں باپ کو حرام کمائی کھلا دی تھی۔ یہ میرے لیے بڑے دکھ اور اذیت کی بات تھی۔ میں نے بڑے کرب سے سوچا کہ کیا میں اس دن کے لیے زندہ رہ گیا تھا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ اب میں اس گھر میں نہیں جاؤں گا۔ یہاں سے سیدھے اپنے گھر چلا جاؤں گا جس کی چابی اس وقت میری جیب میں موجود ہے۔ میں بتول کو ٹیلی فون کر دوں گا کہ وہ آجائے۔ کیا وہ آجائے گی؟ ان خوشیوں کو چھوڑ کے جنہیں وہ چھوڑ رہی ہے؟ کیا میں اس کے بغیر زندگی گزار سکوں گا؟ وہی تو آج میرے لیے سب کچھ ہے۔ آج بھی ہم ایک دوسرے کو اس شدت سے چاہتے تھے جس طرح جوانی کے دور میں چاہتے تھے۔ روتے جھگڑتے بھی تھے۔ ایک دوسرے کی چٹکیاں لیتے تھے جس سے پیار اور چاہت میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ ہماری زندگی کا حسن اس میں تھا مگر میں نماز پڑھ کے نہ جاتے ہوئے بھی گھر آگیا کہ بتول کو اس جہنم سے نکال کے لے جاؤں گا۔ بتول نے مجھے اور دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے تین بج رہے تھے۔ اس نے تنک کر کہا تھا۔

''کس سوکن کے پاس چلے گئے تھے، بھوک کے مارے میرا برا حال ہو رہا ہے۔''

''کیا تمہیں میرے واپس آنے کی اُمید تھی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں یہاں سے.....''

اس نے میری پوری بات نہیں سنی۔ کمرے سے عجلت سے نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد ٹرے میں کھانا لے کر آگئی۔ تپائی پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''اللہ کا شکر ادا کرو کہ میں زندہ ہوں، اگر میں زندہ نہ ہوتی تو کوئی پانی کو بھی نہ پوچھتا۔ اپنے آپ کو بدل ڈالو۔ دور اندیشی کا تقاضا ہے کہ حالات سے سمجھوتا کر لو۔ نوکر سو رہے ہیں۔ بہوئیں کمرے میں بند ہو کر کے ممنوعہ قسم کی فلمیں ڈی وی ڈی پر دیکھ رہی ہیں اور بچے چھت والے کمرے میں ٹی وی پر کارٹون فلمیں دیکھ رہے ہیں۔ کسی بچے کو اجازت نہیں کہ پانچ بجے سے پہلے اپنی ماؤں کے پاس جائیں۔ ایسا کرو گے تو میرے بعد کھانا کون دے گا؟''

''کیا کہیں جا رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، آسمان پر۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے تیز لہجے میں جواب دیا۔ ''کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے؟''

''اعتراض کیا ہو سکتا ہے بلکہ یہ سن کے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ اب لگ رہا ہے کہ فرطِ مسرت سے بے ہوش ہونے والا ہوں۔ تم نے یہ خوش خبری سنانے میں برسوں کی تاخیر کر دی۔ خیر دیر آید درست آید۔'' میں نے کہا۔ ''کیا یہاں کی خوشیوں سے جی بھر گیا ہے۔''

''جی ہاں! یہی سمجھ لیجیے۔ آپ جانتے ہیں کہ آدمی کتنا ناشکرا اور ناقدرا ہوتا ہے۔''

''نہیں میں تمہیں ہرگز پہلے جانے نہیں دوں گا۔ ہر جگہ لیڈیز فرسٹ نہیں چلے گا۔ تمہاری یہاں اشد ضرورت ہے۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے بستر پر اسے ساتھ بٹھا لیا۔ ''بچوں اور خوشیوں سے تمہارا جی کہاں بھرا ہوگا؟ یہاں آکر پھر سے جوان دکھائی دینے لگی ہو۔ بڑی پُرکشش اور پُرشباب ہو گئی ہو۔''

''یہ شاعری رہنے دیں۔ اب میں کسی فریب میں آنے والی نہیں ہوں۔ عورت اپنی پہلی سہاگ رات کبھی نہیں بھولتی۔ لہٰذا میں بھی نہیں بھولی۔ سہاگ کی پہلی رات اور ان تیس برسوں میں ایسی شاعری نہیں کی۔ شاعری کا وقت تو گزر گیا ہے۔'' وہ ہذیان لہجے میں بولی۔ ''آپ نے جس

طرح مجھے گھر سے وداع کروایا تھا اس طرح اپنے گھر سے بھی رخصت کرو گے نا؟''

''میں ساٹھ برس کا ہو چکا ہوں اذرا یہ بھی تو سوچو۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میرے ناتواں کندھے ایک بھینس کا بوجھ کیسے اٹھا سکیں گے؟''

''میں جس وقت گھر سے رخصت ہو کر آئی تھی گول مٹول اور نازک اندام سی تھی۔ گڑیا لگتی تھی اور سبھی مجھے رشک بھری نظروں سے دیکھتے اور میری نظر اتارا کرتے تھے۔'' بتول نے جواب دیا۔ ''اب تو میں ہڈیوں کا ڈھانچا ہو کے رہ گئی ہوں۔ اب میرا وزن سولہ کلو بھی نہیں ہوگا۔''

''میرے چلے جانے پر تمہیں اعتراض کس لیے ہے؟'' میں نے کہا۔ ''آخر یہ سلسلہ کب بند ہوگا؟ آخر کیوں محترمہ.....! تم مجھے سبقت لے جانے دینا نہیں چاہتی ہو؟''

''اس لیے کہ مجھ سے اس عمر میں شادی کے لیے کوئی تیار نہیں ہوگا۔ میں یہ بے عزتی، توہین اور ناقدری سہہ نہ سکوں گی۔'' وہ بولی۔ ''اور پھر میں رونے دھونے اور سینہ کوبی کے موڈ میں نہیں ہوں۔ آٹھ آٹھ آنسوؤں کا اسٹاک کہاں سے لاؤں گی؟''

میں نے کھانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آج ہم حرام کمائی سے پکا ہوا کھانا کیسے مزے لے لے کر کھا رہے ہیں۔ انگلیاں چاٹ رہے ہیں؟''

''آپ کو بچوں کی بات بری لگی ہے نا؟ کیا ہوا اگر وہ رشوت لیتے ہیں تو؟ رشوت کون نہیں لے رہا ہے؟ اوپر سے نیچے تک یہ گند ہے؟ یہ زہر سارے معاشرے میں کینسر کی طرح سرائیت کر چکا ہے۔ یہ لاعلاج مرض ہے اور ایک ایسی برائی ہے جسے سبھی جانتے اور سمجھتے ہیں۔ آپ کس کس برائی کے خلاف جہاد کریں گے؟ اگر ایسا کریں گے تو ہم بھوکے مر جائیں گے۔''

''ان تمام باتوں کے باوجود آج تمہارے نزدیک حرام کمائی اس لیے بری نہیں ہے کہ تمہارے بچے رشوت لیتے ہیں۔'' مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کھانا چھوڑ دیا۔

''جان!'' بتول نے اپنا نوالہ پلیٹ میں رکھ کے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''یہاں زینہ بہ زینہ دوسروں کے ساتھ اوپر چڑھنا پڑتا ہے۔ زندگی ایک ریس ہے۔ خصوصاً آج کی زندگی میں جس میں ہر دم مقابلہ رہتا ہے۔ اپنے خواب ہوتے ہیں۔ اپنی خوشیاں ہوتی ہیں اور اپنی ایک منزل ہوتی ہے۔ آدمی دولت کے پیچھے پیچھے بھاگتا ہے اور اسے پکڑنے کی کوشش کرتا۔ ہر شخص آپ کی طرح نہیں بن سکتا؟ آپ کی اور میری طرح ہر کوئی کٹھن، دشوار گزار اور سسکتی ہوئی زندگی نہیں گزار سکتا۔ بس آپ سوچنا، فکرمند اور پریشان ہونا چھوڑ دیں۔ ترک کر دیں۔ آپ ہی آپ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''مگر تم نے کیا یہ بھی سوچا ہے کہ غلط کام غلط ہوتا ہے۔ تمہارے بچے ہزاروں اور لاکھوں میں بات کرتے ہیں۔ کسی بھی دن پکڑے جا سکتے ہیں۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ سو دن چور کے ایک دن شاہ کا۔ کوتوال کا جو آج ایس ایچ او کہلاتا ہے۔ جس روز دھر لیے جائیں گے اس روز ان کی ناک کٹ جائے گی۔ یہی ناک تو ہے جس کی ہم جان سے زیادہ حفاظت کرتے چلے آ رہے ہیں۔''

''اب ناک نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔'' وہ بکھرار کے انداز میں کہنے لگی۔ ''آپ اچھی طرح جانتے ہیں دنیا میں پیسے سے زیادہ طاقت ور چیز کوئی نہیں ہے۔ کوئی جادو اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پیسے کا جادو ہر عیب کو چھپا لیتا ہے۔ ناک عزت دار آدمی کی ہوتی ہوگی۔ اسمگلر، رشوت خور، منشیات فروش، خود غرض اور بدکردار سیاست دانوں کو پکڑ لیا جاتا ہے تو ان کی ناک اور اونچی ہو جاتی ہے جو رشوت لیتے پکڑا جاتا ہے وہ رشوت دے کر چھوٹ جاتا ہے۔ یہ تو آپ نے سنا ہوگا۔ ہمارے ہاں ایسا ہوتا ہے۔ کتنی عجیب سی بات ہے کہ آپ اپنے بچوں کے بارے میں بھی ایسا ہی سوچتے ہیں؟ اگر وہ جیل جائیں گے تو آپ کو خوشی ہوگی؟''

''میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ انہیں اس غلاظت کی دلدل سے نکالوں۔ یہ ایک ایسی دلدل ہے جو اس میں ایک مرتبہ گر جاتا ہے نکل نہیں پاتا۔ اگر کوشش بھی کرے تو نکلنے کی بجائے دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔'' میں کہنے لگا۔ ''میں انہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ زندگی تنخواہ اور چند ہزار روپے میں بھی گزاری جا سکتی ہے۔ قناعت بہت بڑی دولت ہے۔ ایمان داری سے عزت بھی ملتی ہے، سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں لوگ بھی ایسی زندگی گزار کے خوش ہیں۔''

''اب وہ اس راستے پر اتنی دور نکل گئے ہیں کہ واپس نہیں آ سکتے؟'' بتول بولی۔ ''انہیں کسی بات کی پروا اور کوئی احساس بھی نہیں رہا۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو؟'' میں نے کہا۔ ''تم نے یہ بھی سوچا کہ اس میں قصور کس کا ہے؟ سارا قصور تمہارا اپنا ہے۔''

''میرا؟'' اس کا چہرہ تمتما گیا۔ وہ تنک کر بولی۔ ''کیا میں نے انہیں رشوت لینا سکھایا ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے سر ہلا دیا۔ ''تم انہیں بچپن اور جوانی سے دولت، کار اور کوٹھی کے خواب دکھاتی آ رہی ہو، آج بھی انہیں ٹوکتی نہیں ہو۔''

''میں نے ان سے بھولے سے بھی نہیں کہا ہے کہ ناجائز طریقے سے دولت کماؤ؟'' اس نے ہذیان لہجے میں کہا۔ ''آپ میرے سر سارا قصور کیوں تھوپ رہے ہیں، اچھی رہی۔''

''یہ جو تم دن رات میرے سامنے دنیا کا سبق پڑھاتی تھیں، طعنے دیتی تھیں۔ انہوں نے اسے رٹ لیا اور آج یہ سب کچھ اس کی وجہ سے ہے۔'' وہ غصے سے کھولتی ہوئی برتن اٹھا کے لے گئی۔ بدمزگی سی پیدا ہو گئی تھی۔ اگر وہ کھڑی رہتی تو شاید میں جذباتی ہو جاتا' اس لیے سرخ ہو کر بہت پیاری لگ رہی تھی۔ بدمزگی بھی دور ہو جاتی۔ میں گھر سے نکل آیا۔ قریب ہی ایک پارک تھا۔ اس میں چلا گیا۔ سبزے پر لیٹ گیا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا تو سر گھومنے لگا۔ مجھے ساری دنیا گھومتی دکھائی دی۔ ایک خوف ناک زندگی کسی عفریت کی طرح منہ کھولے بچوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے اپنے بچوں کو ساری زندگی جو درس دیا تھا اسے نئے زمانے نے مسترد کر دیا تھا۔ یہ نیکی اور بدی کی جنگ تھی جو نسل در نسل چلی آ رہی تھی۔ بدی نے ازل سے ہی ساری دنیا میں آگ لگا رکھی تھی۔ ساری دنیا جل رہی تھی اور اس میں جل جانا چاہتی تھی۔ نیکی ایک طرف کھڑی حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے بجھا نہیں سکتی تھی۔ یہ اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ میں پارک میں عصر تک بیٹھا رہا پھر عصر، مغرب اور عشاء پڑھ کے گھر آیا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ کوٹھی کے اندر اور باہر تین چار شاندار قسم کی نئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ گہما گہمی سی نظر آ رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ آج گھر پر کوئی تقریب ہے، مہمان آئے ہوئے ہیں۔ آج کی تقریب کے بارے میں مجھے کسی نے بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ بتول نے بھی نہیں اور نہ ہی میرے بیٹوں اور بہوؤں نے۔ شاید یہ پروگرام آج اچانک بن گیا ہوگا۔ میں نے دل کو سمجھایا۔ میں برآمدے کی سیڑھیاں طے کرنے لگا تاکہ نشست گاہ میں جا کے مہمانوں سے ملوں۔ سامنے والے کمرے سے بتول نکل آئی اس نے مجھے برآمدے میں روک لیا۔

''زاہد کے مہمان آئے ہیں۔ میں آپ کے لیے وہیں کھانا لے آتی ہوں۔''

''کیوں؟ کیا ہم کھانا ڈائننگ ہال میں نہیں کھا سکتے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے جواب میں سر ہلا دیا۔

''وہ کس لیے؟'' میں نے تعجب بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا وہاں کھانے پر پابندی لگ گئی ہے؟''

''اس لیے کہ میز پر مہمانوں کے لیے کھانا چنا جا رہا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''ہم ساتھ ہی کھائیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''اس طرح زاہد کے مہمانوں سے تعارف اور ملاقات بھی ہو جائے گی۔''

''زاہد نے ہم دونوں کو منع کیا ہے مہمانوں کے سامنے آنے سے۔'' بتول بتانے لگی۔ ''اس لیے کہ کوئی بہت بڑا افسر، اس کی سیکریٹری، ٹی وی کی کوئی نامور اور مقبول اداکارہ اور اس کے کچھ قریبی دوست بھی مدعو ہیں۔ اسے اس افسر سے کوئی بڑا کام ہے، اس لیے ڈنر پر مدعو کیا ہے۔''

''اچھا۔'' میرے دل کو صدمہ ہوا۔ ''شاہد، خالد اور بہوئیں کہاں ہیں؟''

''وہ سب نشست گاہ میں بیٹھے مہمانوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ آپ اپنے کمرے میں چلیے نا۔'' بتول کا چہرہ اور لہجہ بجھا بجھا تھا۔

میں اپنے کمرے میں آ کر خاموشی سے بستر پر دراز ہو گیا۔ میں اندر سے جیسے ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ میرا دماغ سنسنا رہا تھا۔ رگوں میں لہو ابلنے لگا تھا۔ زاہد نے مجھے اور بتول کو سامنے آنے سے منع کیوں کیا؟ کیا میں اس قابل نہیں ہوں، مجھے اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس گھر میں میری اور بتول کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ہم کسی مشین کے فالتو پرزے ہیں۔

پھر مجھے چھوٹی چھوٹی بہت ساری باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔ جب میں دو ایک مرتبہ نشست گاہ میں چلا گیا تو وہاں مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے بیٹے اور بہوئیں بھی موجود تھیں۔ کسی بیٹے نے مہمانوں سے میرا تعارف نہیں کرایا تھا۔ بہوؤں کو سخت ناگوار لگا تھا اور پھر ایسے موقعوں پر بتول کو بھی آنے نہیں دیا جاتا تھا۔ اس کے ذمے کچن اور نوکروں کو سنبھالنا رہ گیا تھا۔ سودا سلف منگوانا تھا، بہوؤں کے ہاں تقریبات ہوتی تھیں تو بتول کو ساتھ نہیں لیا جاتا تھا جیسے انہیں ساتھ لے جاتے ہوئے ہتک کا احساس ہوتا تھا۔ ہم پرانے لوگ جو پرانے خیالات کے مالک تھے۔ دولت مند بیٹوں کے غریب ماں باپ۔

میں بڑا جذباتی اور دکھی ہو رہا تھا۔ تبھی بتول ایک ٹرے میں کھانا لے کر آئی۔ وہ ٹرے تپائی پر رکھتی ہوئی بولی تو لہجے میں بڑی افسردگی بھری ہوئی تھی۔

''آپ کھانا کھا لیجیے۔ میں نہیں کھاؤں گی۔''

میں نے اس کے چہرے پر گھٹا سی چھائی ہوئی دیکھی۔ اس کی آنکھوں سے حزن و ملال جھانک رہا تھا۔ ''وہ کس لیے؟''

''اس لیے کہ میں نے تھوڑی دیر پہلے ہی دو کپ چائے پی لی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بھوک مر گئی ہے۔''

''مجھے بھی بالکل بھوک نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں ایک دوست کے ہاں چائے پی کر آیا ہوں۔''

بتول نے اصرار نہیں کیا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ کھانا کھلائے بغیر رہی ہو اور مجھے بھوکا سونے دیا ہو۔ وہ باورچی خانے میں ٹرے رکھ کے چلی آئی۔ بستر پر دراز ہونے کی بجائے کرسی پر بیٹھ کے اخبار پڑھنے لگی۔ اس کے چہرے پر دکھ کی گھٹا تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں بھوکا ہی سو گیا۔ میری آنکھ کھلی تو دن نکل آیا تھا۔ بتول کی تیز و تند آواز کمرے میں سنائی دے رہی تھی۔

''صبح کے نو بج رہے ہیں۔ ہم لوگوں نے نہ تو میز صاف کی اور نہ ڈرائنگ روم کی صفائی۔ سب لوگ دیر میں اٹھنے والے ہیں۔ کیا وہ ناشتا فرش پر بیٹھ کر کریں گے۔ تم لوگوں کو کسی بات کا احساس اور فکر تک نہیں ہے؟''

''ابھی صفائی ہو جاتی ہے جی!'' نوکر نے جواب دیا۔ ''بس پندرہ بیس منٹ لگیں گے۔''

''کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ سارے کام نمٹا کے سونے جانا لیکن میری بات نہیں مانی نہ سہی۔ اتنی دیر تک سونے کا کوئی وقت ہے۔ تم لوگ بھی صاحب بن گئے ہو۔''

''کیا ہم انسان نہیں ہیں؟'' دوسرے نوکر نے تڑ سے کہا۔ ''کوئی صاحب ٹوکتے ہیں نہ بیگم صاحب۔ بس آپ ہی ایک ٹوکتی ہیں۔ ہم رات تین بجے سارا کام نمٹا کے سوئے ہیں۔ صرف یہ میز رہ گئی تھی۔''

''تمیز سے بات کرو۔'' بتول کا پارہ چڑھ گیا۔ ''تم لوگ نکمے اور حرام خور ہو گئے ہو۔''

''آپ ہماری بے عزتی نہ کریں۔'' نوکر نے تڑختے لہجے میں کہا۔ ''ہم آپ کی باتیں سننے نہیں بیٹھے ہیں۔ ہم بھی آخر عزت دار ہیں جی! ہمارا حساب صاف کر دیں جی۔ ہمیں نوکری نہیں کرنا ہے۔ ہمارے لیے نوکریاں بہت پڑیں۔''

بتول سنسناتے ہوئے تیر کی مانند اندر آئی اور پرس اٹھا کے نکل گئی۔

''یہ تمہارے بیس دن کی تنخواہ ہے۔ دفع ہو جاؤ۔''

دوسرا نوکر اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کے تڑے کرنے لگا تو وہ اس پر بھی برہم ہو گئی۔ ان دونوں میں بحث و تکرار ہونے لگی تو بیٹے اور بہوئیں اپنے اپنے کمروں سے نکل آئیں۔ ساس اور سب سے چھوٹی بہو میں مکالمے بازی ہوئی۔ الفاظ سمجھ میں نہ آ سکے۔ میں نے محسوس کیا کہ ساس اور بہو کی گفتگو نازک مرحلے میں داخل ہو گئی ہے تو میں کمرے سے نکل آیا۔ زاہد آنکھیں ملتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''یہ گھر پھر سے مچھلی بازار کیوں بن گیا ہے؟''

بہو نے اپنے شوہر سے قدرے تنک کر کہا۔ ''کیا میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ پارٹی کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں دے دیں۔ گھر میں مہمان آتے ہیں تو سب کے تیور ہی بدل جاتے ہیں۔ انہیں دعوتیں زہر لگتی ہیں۔''

''مہمان بھی کیا سوچیں گے۔ ہم نے اتنی قیمتی کوٹھی اس لیے خریدی ہے اور اس کے ڈیکوریشن پر ساٹھ ستر لاکھ اس لیے خرچ کیے ہیں کہ مہمانوں کو ہوٹلوں میں دعوت دیں۔'' زاہد کی آواز میں بلا کی تندی تھی۔ ''یہ عالیشان گھر ہے۔ مہمانوں پر زبردست اثر پڑتا ہے، گراف اونچا ہوتا ہے۔ آدمی کی اور اس کی حیثیت کی شناخت ہوتی ہے۔ ہوٹلوں میں تو وہ دعوت دیتے ہیں جو.....'' اس نے دانستہ اپنا آخری جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اس کا کیا کیا جائے کہ آپ کی والدہ ماجدہ کو گھر میں مہمانوں کا آنا اور کسی تقریب کا منعقد کرنا بالکل بھی پسند نہیں۔'' چھوٹی بہو نے اپنے ترکش سے زہریلا تیر چلایا۔

''وہ چاہتی ہیں ہم ہر وقت سر پر دوپٹا اوڑھے بیٹھی رہیں۔ مہمان مردوں اور آپ کے دوستوں کے سامنے نہ آئیں۔'' بڑی بہو خاموش کیوں رہتی۔

''اصل بات یہ ہے کہ امی یہ بھول جاتی ہیں کہ ہم ڈیفنس میں رہتے ہیں۔'' چھوٹی بہو کے دل کی بھڑاس نکلی نہیں تھی۔ ''یہ جس دن سے یہاں آئی ہیں اس دن سے ہم میں کیڑے نکالنے لگی ہیں۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔''

''میں چونکہ گھر کی بڑی ہوں اس لیے تم لوگوں کے بھلے کے لیے کہتی ہوں۔'' بتول کا چہرہ تمتمانے لگا۔ وہ تیز و تند لہجے میں بولی۔ ''غیر مردوں کے سامنے کھلے بالوں اور

بغیر دوپٹے کے آنا۔ بغیر آستینوں اور کھلے گلے کے بلاؤز اور قمیص پہننا، ان سے بےتکلفی سے باتیں کرنا اور غیر مردوں سے ہاتھ ملانا۔ کیا اچھی عورتوں کا شیوہ ہے؟ عورت گھر کی عزت ہوتی ہے۔ میرے بیٹے بھی کیسے بےغیرت ہو گئے ہیں جو اپنی بیویوں کو۔ غیر مردوں کے سامنے رنگین تتلیاں بنا کے....''

میں نے دیکھا کہ وہ نان اسٹاپ ٹرین کی طرح برق رفتاری سے بولے جا رہی ہے اور ان کے چہروں کے رنگ اڑتے جا رہے ہیں۔ وہ فق ہونے لگے ہیں۔ میں نے سوچا اب بریک لگنا چاہیے اس لیے کہ ہم بچوں کے گھر میں تھے۔ ناک ہماری کٹتی، ان کی نہیں۔ میں نے درمیان میں تیزی سے کہا۔

''بتول! ایک منٹ کے لیے ذرا اوپر تو آؤ۔''

وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کے میرے پاس آئی تو میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ اس کی سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ اسے بستر پر بٹھا کے ایک گلاس پانی پلایا۔ جب وہ ایک ہی سانس میں پانی پی چکی تب اعتدال میں آئی۔ میں نے کہا۔

''تم ہر بار یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ جس کا گھر ہوتا ہے اس کا حکم چلتا ہے۔ یہ ہمارا گھر نہیں۔''

''ہمارا گھر کیوں نہیں ہے؟'' اس نے تکرار کی۔ ''کیا یہ ہمارا گھر نہیں ہے؟ کیا یہ ہمارے بچے نہیں ہیں؟''

''یاپ بڑا نہ بھیا..... سب سے بڑا روپیا۔'' میں نے کہا۔

''میرے بیٹوں اور بہوؤں کو کیا ہو گیا ہے؟'' اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''بے حیائی کی بھی حد ہوتی ہے۔''

''جس گھر میں بے حیائی کی کمائی آتی ہے، وہاں عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں اور آنکھوں پر پردہ—'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''یہ تم نے وہاں کیا فصیح و بلیغ تقریر شروع کر دی تھی؟''

''میں یہ سب کچھ ہرگز ہرگز کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتی؟'' وہ الجھ کے بولی۔ ''ماں ہونے کے ناتے اس گھر پر میرا ابھی تو حق ہے؟ کیا ہم انہیں ڈانٹتے، مارتے اور مرغا نہیں بناتے تھے۔ کیا میں انہیں آج ٹوک بھی نہیں سکتی؟''

''نہیں۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ جب میں کماتا تھا۔ میرا گھر تھا۔ اس گھر میں ہم دونوں کا حکم چلتا تھا۔ آج ہم ان کے گھر میں ہیں۔ وہ کماتے ہیں اور ہم ان کا کھاتے ہیں۔ ان کے محتاج ہیں۔ ہمیں اب اپنی زندگی ان کی مرضی اور خواہش کے مطابق گزارنا ہوگی اور ان کی بات بھی سننا اور ماننا ہوگی۔''

''اگر ایسی بات ہے تو میں یہاں نہیں رہوں گی۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ یہ میرا گھر نہیں ہے۔ یہ آپ کا گھر بھی نہیں ہے۔''

''پھر کہاں جاؤ گی؟'' میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر قریب کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھوں میں عزم و حوصلے کی جھلک چمک رہی تھی۔

''اس گھر میں جہاں ہم تیس برس سے رہ رہے تھے۔ وہ گھر جو آپ کا تھا۔ وہ گھر جو میں نے بنایا تھا۔''

''کیا وہاں جا کے پنشن میں گزارہ کر سکو گی؟ بچوں سے دور رہ سکو گی؟ ان خوشیوں کو چھوڑ دو گی جنہیں تم چھوڑنے آئی تھیں؟'' میں نے توقف کر کے گہری سانس لی۔ ''ہمارے بیٹے شاید اپنی بیویوں کے کہنے پر آ کر اپنا ہاتھ کھینچ لیں۔ خرچ دینا بند کر دیں۔''

اس نے پہلے اپنے ہاتھوں کو دیکھا پھر میرے ہاتھ تھام لیے۔ ''یہ ہاتھ جب تک سلامت ہیں انہیں کسی کے سامنے پھیلانے کی ضرورت کیا ہے۔ میں سلائی سینٹر میں جا کر لڑکیوں عورتوں کو تربیت دیا کروں گی یا کسی سلائی کے کارخانے میں سپروائزر رہوں گی تو دس ہزار کہیں نہیں گئے۔ آپ گھر پر ٹیوشن سینٹر کھول لیں تو تین سے پانچ ہزار آسانی سے مل جائیں گے۔ کیا یہ کمائی کافی نہیں ہوگی؟''

''ضرورت سے زیادہ ہی ہوں گے۔'' میں نے اسے پھر چوم لیا۔

''تو کیا سوچا آپ نے؟'' اس نے سرخ ہو کے پوچھا۔

''چلو ابھی اور اسی وقت.....'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔

تھوڑی دیر بعد ہم اپنا وہ سوٹ کیس لے کے باہر آ گئے جس میں چار جوڑے کپڑے رکھ کے لائے تھے۔ کسی کو ہمارے جانے کی خبر تک نہ ہو سکی۔ تیس برس کے بعد ایک نئے اور سہانے سفر کا آغاز ہوا تھا اس لیے کہ ہم اپنے گھر جا رہے تھے۔ اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔ وہ کتنا بھی چھوٹا ہو؟ اس میں سر ہی کیوں نہ۔ چھپایا جاتا ہو۔

سفید خون

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
پہلی بار ایک سچ بیانی کے ساتھ سرگزشت کی محفل میں حاضر ہو رہا ہوں۔ یہ روداد میری نہیں کاشی کی ہے۔ ایک ایسے لڑکے کی جو قوت گویائی سے محروم تھا۔ اس کے ساتھ اس کے سگے باپ نے جو کچھ کیا، اسے سن کر کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

سلمان بشیر
(بہاول نگر)

آہ..... بیچارہ کاشی.....
پرسوں دوپہر کو اس دارفانی سے کوچ کر گیا۔
اللہ پاک میرے عزیز دوست کی مغفرت فرمائے اور اس کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

کاشی سے مجھے دلی لگاؤ تھا۔ وہ آواز کی نعمت سے محروم تھا۔ اس سے لگاؤ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے اور میرے غم یکساں تھے۔ اس کی اور میری کہانی بھی ایک سی تھی۔ اس کے والد کا نام اور میرے والد کا نام بھی ایک ہی تھا۔ اس کے والد

نے بھی اس کے سر پر سوتیلی ماں کا سایہ ڈال دیا تھا اور میرے والد نے بھی۔ ہم دونوں ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔

بستی حافظ آباد کے وسط میں ہم رہائش پذیر تھے۔ گلی شروع ہوتے ہی پہلا مکان کاشی کا تھا اور گلی کا اختتام میرے گھر پر ہوتا تھا۔

کاشی کے والد کسی زمانے میں ٹھیکیدار ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان کی پہلی بیوی ان کے ساتھ رہتی تھی۔ ان کی جوان اولاد کا ساتھ اسے حاصل تھا۔

مگر یہ جو قدرت ہے نا، یہ بندے کا امتحان لیتی ہے۔

کاشی کے والد سے بھی وہ امتحان لیا گیا مگر وہ بیچارہ اس امتحان میں ناکام ہو گیا۔

سوری! اسے بیچارہ کہنا بیچارے کی توہین کرنے جیسا ہے۔ وہ ایک مطلبی، مکار، دھوکے باز اور ظالم انسان تھا۔ اپنی اولاد پر وہ بہت ظلم کرتا تھا۔ بہت مارتا تھا انہیں۔ جو چیز ہاتھ لگتی اسی سے مارتا تھا۔

مجھے آج بھی یاد ہے وہ دن جب کاشی کے بڑے بھائی کو اس کے والد نے مارا تھا۔ اتنا مارا اتنا مارا کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ اس کا گریبان اس کے خون سے سرخ ہو گیا۔ کاشی کا بھائی چیختا رہا، چلاتا رہا مگر اس ظالم باپ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

اس لکڑی پر کیل لگا ہوا تھا۔ لکڑی جہاں پڑتی کیل وہیں اس کے جسم میں دھنس جاتا اور وہاں سے خون رسنا شروع ہو جاتا۔

نہ جانے کیسا ظالم باپ تھا وہ۔ اپنے بیٹے کا خون دیکھ کر بھی اس کا دل نرم نہیں ہو رہا تھا۔ کیا کوئی اتنا ظلم بھی کر سکتا ہے؟ شاید نہیں۔

جب وہ مار مار کر تھک گیا تو اس نے اپنے بیٹے کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔

وہ بیچارہ اپنے زخمی وجود کو گھسیٹتے ہوئے ہماری چوکھٹ پر آ گرا۔

میرے گھر والے اسے اندر لے آئے۔ اس کی قمیص اتار کر اس کے زخم صاف کیے۔ مرہم لگایا۔ ٹکور کیا۔ گرم دودھ پلا کر وہیں بستر میں لٹا دیا۔

کاشی کا بھائی ساری رات زخموں سے چور حالت میں روتا رہا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس رات ہم میں سے کوئی بھی سو نہیں پایا تھا۔

اگلے دن اسے ناشتا کروایا۔ نئے کپڑے پہنائے اور آرام کرنے کے لیے بستر پر لٹا دیا۔

میں اسکول جانے کی تیاری کر رہا تھا اور ساتھ ہی اسے بھی دیکھ رہا تھا جو چھت کو گھورتے ہوئے آنسو بہا رہا تھا۔ نہ جانے اس وقت اس کے ذہن میں کیا چل رہا تھا مگر میں اتنا جانتا تھا کہ وہ اگلی زندگی کے بارے میں کوئی پلان بنا رہا تھا۔

تیار ہو کر میں اسکول کے لیے نکل گیا۔ گھر سے نکلتے وقت میں نے اسے دیکھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔

اسکول سے جب میں واپس گھر لوٹا تو وہ اپنے بستر پر نہیں تھا۔

گھر والوں سے پوچھنے پر علم ہوا کہ وہ باہر تازہ ہوا کھانے نکلا تھا مگر واپس نہیں آیا۔

کون جانتا تھا کہ وہ کبھی واپس نہ آنے کے لیے گیا تھا۔

اس کی ماں کا رو رو کر برا حال ہو چکا تھا۔ اسے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ رات بھر ہمارے گھر رکا تھا۔

ہم نے کچھ دن تک اس کا انتظار کیا۔ نہ جانے کیوں مگر ایک امید تھی کہ وہ واپس لوٹا تو سب سے پہلے ہمارے گھر آئے گا۔

مگر اس کو دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں اور وہ نہ جانے دنیا کے کس کونے میں جا کر بس گیا تھا۔

اس دن سے کاشی کے گھر سے رحمت ختم ہوتی چلی گئی۔ بیٹے کی جدائی کا دکھ ماں کو وقت سے پہلے بوڑھی بنانے لگا۔

یہ مائیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں نا، زندگی کا ہر دکھ برداشت کر لیتی ہیں مگر جیسے ہی اولاد کا دکھ ملتا ہے وہ راکھ ہونے لگتی ہیں۔ ایسی راکھ جن کو فنا کرنے کے لیے فقط ادنیٰ سی ایک پھونک درکار ہوتی ہے۔

کاشی کے ظالم باپ نے اپنے بیٹے کی خبر تک نہیں لی کہ وہ کہاں ہے۔ رفتہ رفتہ وہ گھر کے باقی مکینوں سے بھی متنفر ہوتا چلا گیا۔ اپنی بیوی کو طلاق دے کر اپنے گھر سے نکال دیا۔ اولاد کو بھی گھر سے نکال دیا۔ نہ جائیداد میں سے حصہ دیا نہ کوئی اور سامان۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان لوگوں نے وہ درد وہ کرب وہ اذیت کیسے برداشت کی تھی۔ میں نے صرف وہ اذیت اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھی تھی، محسوس تو انہوں نے کی تھی۔ شاید محسوس نہیں بلکہ جھیلی تھی۔

کاشی سب سے چھوٹا تھا اور گونگا بھی تھا۔ وہ اپنی طلاق یافتہ ماں اور بھائیوں کے ساتھ کسی کرائے کے گھر میں شفٹ ہو گیا۔

تب کتنا روئے ہوں گے وہ لوگ جب وہ بچے کے آغاز میں مکان کا کرایہ دیتے ہوں گے۔ کیا کیا ان کے دل میں ٹوٹتا ہوگا یہ سوچ کر کہ ان کی اتنی جائیداد اور زمینیں ہونے کے باوجود ان کے باپ نے ان کو ایک کوڑی تک نہیں دی۔ بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔

تب ان کا دل یقیناً خون کے آنسو روتا ہوگا۔

وہ اس شخص کے لیے روتے ہوں گے جس شخص کا خون شاید تھا ہی سفید۔

آہ.....اے برے وقت، تُو اچھوں کے ساتھ اتنا بے رحم کیوں ہوتا ہے؟ کیوں اچھوں کے ساتھ اتنا برا سلوک کرتا ہے۔

کاشی کے باپ کا گھر قبرستان کی مانند ہو گیا تھا جہاں نہ کوئی آتا تھا نہ جاتا تھا۔ ہر وقت تنہائیاں رقص کرتی تھیں وہاں۔ اور کاشی کا باپ اکیلا ان تنہائیوں سے زور آزمائی کرتا تھا۔ جب اس نے یہ محسوس کر لیا کہ وہ ان تنہائیوں سے کسی طور بھی جیت نہیں سکتا تو ان تنہائیوں کو ختم کرنے کے لیے اس نے اپنا نیا ہم سفر چن لیا۔ اس نے دوسری شادی کر لی۔

نئی دلہن کے آتے ہی کاشی کے باپ کی ٹھیکیداری بھی چلی گئی اور خاصے نقصان بھی اٹھانے پڑے۔

نئی دلہن کے نخرے تو آسمانوں سے باتیں کرتے تھے۔

نئی سے نئی جیولری بنواتی۔ ہر دوسرے دن ایک آدھ نئے کپڑے سلواتی۔ برانڈ کی چپل پہنتی۔ مختصر یہ کہ اسے اپنے خاوند سے بس یہ آسائشیں ہی چاہیے تھیں۔

کاشی کے باپ نے نیا کاروبار شروع کر لیا۔ موٹر بائیک کا شوروم بنایا جو نئی بیگم کی روز روز کی عیاشیوں کی نذر ہو گیا۔

اس کی اولاد جب اس کے ساتھ تھی تب پیسے میں کھیلا کرتا تھا وہ، کیونکہ اس کی اولاد اس کے بازو بنے ہوئے تھے مگر ان کے جاتے ہی وہ بازو بیکار ہو گئے۔ اس کا وجود بیکار ہو گیا۔ صرف چلتا پھرتا عیب کا مارا بن گیا تھا۔

جب ہر کام کر کے تھک گیا تو اس نے آٹے کی چکی بنا لی۔ بالی پیٹ کو ایندھن مہیا کرنے کے لیے آخر کچھ تو کرنا تھا مگر وہ اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ ایک اس کی انا اور دوسری کمزوری۔

اس نے بڑی چالاکی سے اپنی پہلی بیوی سے رابطہ کر کے کاشی کو یہ کہہ کر اپنے پاس بلوا لیا کہ وہ اپنے چھوٹے بیٹے سے بہت پیار کرتا ہے اس کے بنا اس کا گھر میں دل نہیں لگتا۔

1957ء میں پہلی بار میری ملاقات ساحر لدھیانوی سے تب ہوئی جب وہ ایک مشاعرہ کے سلسلے میں دہلی آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ جاں نثار اختر اور دیگر دوست بھی تھے جب میں ان سے ملنے جامع مسجد کے قریب ظفر ہوٹل گیا۔ میری خواہش تھی کہ ان کی کسی تصنیف سے اپنی "اردو پاکٹ سیریز" کا آغاز کروں۔ جب میں نے اپنی خواہش کا اظہار ساحر سے کیا تو ان کا جواب تھا "دوسرے پبلشرز میری تصانیف کو پوچھے بغیر چھاپ رہے ہیں۔ آپ کو اجازت کی ضرورت کیوں ہے؟" بہرحال انہوں نے مجھے "گاتا جائے بنجارہ" کو "اسٹار پاکٹ سیریز" کی پہلی کتاب کے طور پر شائع کرنے کی اجازت دے دی۔ ساتھ ہی اس مجموعے کے سابقہ ایڈیشن میں کچھ نئے گیتوں کا اضافہ کرنے کا وعدہ بھی کیا اور چند روز بعد ہی مجھے اضافہ شدہ مسودہ مل گیا۔

اپریل 1974ء میں ہمارے ادارہ کی طرف سے ہندی پاکٹ سیریز کی دسویں سالگرہ کا اہتمام کیا گیا جس میں اندر کمار گجرال، جو ان دنوں مرکزی وزیر اطلاعات تھے، کی صدارت میں ایک مشاعرہ کا اہتمام بھی کیا گیا۔ اس مشاعرہ میں اردو، ہندی اور پنجابی کے کئی عظیم شعراء نے حصہ لیا۔ ان میں ساحر کے علاوہ امرتا پریتم اور ہندی کے عظیم شاعر رام دھاری سنگھ دنکر بھی تشریف لائے۔

ستمبر 980ء میں عظیم گلوکار محمد رفیع کے انتقال کی خبر ملی۔ اتفاق سے ساحر سے فون پر بات ہوئی اور میں نے انہیں کہا کہ محمد رفیع کو ہدیہ عقیدت کے طور پر گانوں کے مجموعے کے لیے دیباچہ لکھ دیں اور وہ دیباچہ جو ان کی نثر کی شاید آخری تحریر تھی مجھے دو روز بعد ہی مل بھجوا دیا۔

"تلخیاں" کے پچھلے ایڈیشن کے پیش لفظ از امرتا چند دہلوی

مرسلہ: انور اعجاز خان۔ پشاور

وہ بے چاری اپنے شاطر خاوند کے آنسوؤں کو سمجھ نہ پائی اور دل پر پتھر رکھ کر کاشی اپنے خاوند کو سونپ دیا۔

بہت دنوں کے بعد کاشی کو پھر سے دیکھ کر مجھے اچھا لگا تھا۔

وہ اب میری طرح جوان ہو گیا تھا۔

اسے گھر کے ایک تاریک کونے میں واقع کمرا عنایت کر دیا گیا۔ ایک چارپائی۔ ایک بستر اور کپڑے وہی تین سوٹ تھے جو وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ ایک خستہ حال جوتا جو اس کے بھائی کا تھا وہ پہن کر آ گیا تھا۔

یہ چند چیزیں اس کی ملکیت تھیں۔ کروڑوں کی جایداد سے اسے بس یہی ملا تھا۔ واہ رے مطلبی باپ۔ قربان تیرے پتھر دل پر۔

اگلے ہی دن سے کاشی کو اس کا باپ اپنے ساتھ آٹے کی چکی پر لے جانے لگا۔ دو دن کے اندر کاشی سارا کام سیکھ گیا اور پھر چکی خود ہی سنبھالنے لگا۔ اس کا باپ بس دکان کے سامنے کرسی ڈال کر بیٹھا رہتا اور پیسوں کا حساب کتاب اپنے پاس ہی رکھتا۔

کاشی صبح اپنے باپ کے ساتھ گھر سے نکلتا اور شام کے بعد گھر لوٹتا۔ جب وہ واپس آتا تب اس کے کپڑے، منہ اور سر سفید ہوتا تھا۔ اس کے پورے جسم پر جگہ جگہ آٹا لگا ہوتا۔

کاشی کی سوتیلی ماں بہت شاطر تھی۔ اس نے لمحے سے پہلے ہی وہ گھر اپنے نام لکھوا لیا تھا۔ جب کاشی کے باپ کو پتا چلا کہ وہ بانجھ ہے تو انہوں نے ایک بچی گود لے لی۔

میں تب ان کی سوچ دیکھ کر افسوس ہی کر سکتا تھا۔

اپنی سگی اولاد کو تو گھر سے دھکے دے کر نکال دیا اور اب کسی اور کی اولاد کو گود لے لیا۔ کیسی سوچ تھی ان کی۔

کیا کبھی اس نے یہ نہیں سوچا کہ اس کی اولاد کو جب اس بات کا علم ہوا ہو گا تو ان کا دل کتنا خون کے آنسو رویا ہو گا۔ زمانے بھر کی نظروں کا کیسے انہوں نے سامنا کیا ہو گا۔

میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس شخص کو جہنم واصل کر دوں۔ نہ جانے کیوں مجھے وہ زہر لگتا تھا اور اب بھی۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا۔ بہت سے موسم گزر گئے۔ چہروں کے رنگ بدل گئے۔ بہت اچھے اچھے لوگ دنیا سے کنارا کر کے زمین کے اندر جا کر سو گئے۔

کاشی جب بھی شام کو چکی سے واپس آتا، میرے پاس میری شاپ پر ضرور آتا تھا۔ کچھ کھانے پینے کی چیزیں خریدتا۔ کچھ باتیں سناتا۔

کاشی گونگا تھا مگر میرے لیے نہیں کیونکہ مجھے اس کے اشارے سمجھ آتے تھے۔ میرے ساتھ بات کرتے وقت اسے آواز کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

میں اس کے ہر اشارے کو بہ آسانی سمجھ لیتا تھا۔

اکثر وہ مجھ سے اپنے باپ کے ناروا سلوک کا ذکر کرتا تھا۔ اپنی سوتیلی ماں کے سوتیلے پن کا رونا روتا تھا۔

کاشی کو اس کے گھر میں نوکروں کی طرح رکھا گیا تھا۔ وہ بیچارہ کسی سے کچھ کہتا بھی نہیں تھا۔

جب وہ ہر دکھ کو ہر تکلیف کو بنا کسی سے کہے برداشت کرتا تو مجھے اس پر بہت ترس آتا تھا کیونکہ اس کا اور میرا غم سانجھا تھا۔

بہت سالوں سے میں نے اس کو کبھی ایک ہی رنگ کی شلوار قمیص پہنے نہیں دیکھا تھا۔

اس کی شلوار کا رنگ الگ ہوتا اور قمیص کا الگ۔ دونوں کے سٹف بھی مختلف ہوتے۔ جوتا اس کے پاس وہی تھا جو وہ اپنے بھائی کا پہن کر آیا تھا۔

اس کا باپ نہ جانے کیوں اس کے ساتھ سوتیلوں سے بھی برا سلوک کرتا تھا۔

کیا وہ اس کی سگی اولاد نہیں تھا۔ سگی اولاد تھا مگر پھر یہ سوتیلا پن کیوں؟ کیوں اس کو بھکاریوں کی زندگی جینے دی جا رہی تھی۔

ایک شام میں نے اسے کہا کہ تم مجھ سے دو جوڑی کپڑے لے لو کیوں کہ وہ سہارے ناپ کے ہیں اور تم پہ اچھے بھی لگیں گے مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ نہیں سلمان بھائی، میرے ابو ماریں گے مجھے۔

اس کی بات سن کر میرا دل مٹھی میں بھر آیا تھا۔ آنسو پلکوں کو نم کر کے نیچے جا گرے۔ اس کی بات نے مجھے واقعی بہت دکھ دیا تھا۔ کتنے دکھ سے اس نے مجھے کہا تھا کہ سلمان بھائی میرے ابو ماریں گے مجھے۔

میں نے بہت بار اس کی مدد کرنا چاہی مگر وہ نہیں مانا۔ اسے اپنے باپ کا ڈر تھا۔

کچھ دنوں کے بعد عید الفطر آنے والی تھی۔

پھر چاند رات بھی آ گئی۔

اس رات وہ میرے پاس شاپ پر آیا تو میں نے اس سے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "ہاں بھئی کاشی کل پھر کون سا سوٹ پہنے گا؟"

میری بات کا وہ بیچارہ جواب نہیں دے پایا۔

اس کی آنکھیں بہنے لگیں۔

زندگی میں پہلی بار مجھے خود پر انتہائی شرمندگی اور غصہ آیا تھا۔ میرے ایک سوال نے اس کا کتنا دل جلایا تھا یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

میرے اس سوال میں کتنی آگ ہوگی جس نے اس بیچارے کی آنکھوں کو پگھلا دیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہ بولا کہ اس کے باپ نے کہا ہے کہ اس عید پر یہی کپڑے پہن لینا اگلی عید پر نیا سوٹ لے دوں گا اور جیب خرچ کے لیے پچاس روپے اس کو تھما دیے تھے۔ اس نے وہ پچاس کا نوٹ اپنی جیب سے نکال کر روتے ہوئے وہیں پھاڑ کر پھینک دیا اور چلا گیا۔

اس رات میں کاشی کے لیے رویا تھا۔ مجھے اس کا درد اپنا درد لگتا تھا جیسے وہ میرا ہی عکس ہو۔ میرا ہمزاد ہو۔

صبح عید کی نماز کے دوران میری کاشی کے باپ پر نظر پڑی۔ سفید لٹھے کے سوٹ میں نواب ہی لگ رہا تھا مگر کاشی کہیں نظر نہیں آیا۔ یقیناً وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا رو رہا ہوگا۔

جب میں گھر واپس آیا اور اپنے بہن بھائیوں کو عیدی دینے لگا تو کاشی کی سوتیلی ماں سج دھج کے کھیر بنا کر ہمارے گھر آئی۔

گاؤں میں عید کے دن ایک دوسرے کے گھر تحفے پکوان بنا کر دیے جاتے ہیں اسی لیے وہ کھیر بنا کر لائی تھی۔ چہرے پہ میک اپ کی لیپ کیے، ہونٹوں کو لپ اسٹک سے سرخ کیے مٹک مٹک کر چلتی ہوئی واپس لوٹ گئی۔

اس کا سوٹ دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کم سے کم سات سے آٹھ ہزار کا ہوگا اور دو سے تین ہزار کے درمیان جوتی۔

لیکن کاشی کے لیے وہ پانچ سو کا سوٹ بھی تیار نہیں کروا سکے۔

لعنت ہے ایسے لوگوں پر۔ لعنت ہے ایسے پیسے پر۔

کچھ دنوں کے بعد کاشی بیمار رہنے لگا۔

بخار اور کھانسی نے اس کو ختم کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے ٹھیک سے چلا بھی نہیں جاتا تھا مگر اس کا باپ زبردستی اس کو بھی پر لے جا کر کام کرواتا اور خود نواب بن کر کرسی پر بیٹھتا۔

میں اس کے باپ پر حیران تھا۔ پچھلے سال وہ عمرہ بھی کر آیا تھا۔ پانچ وقت کی نماز بھی ادا کرتا تھا مگر اولاد سے ایسا سلوک؟

یقیناً اس کی نماز اس کا عمرہ کسی کام کا نہیں۔ جو شخص اولاد کے حقوق ادا نہیں کر سکا وہ خدا کے حقوق کیسے ادا کر سکتا ہے۔

کچھ دن پہلے کاشی کے باپ کو لوگوں نے کہا کہ "یار! تم کیسے بندے ہو تمہارا بیٹا اتنا بیمار ہے اور تم اسے ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں لے کر جاتے ہو۔" لوگوں نے اسے بہت شرم دلوائی تب جا کر وہ کاشی کو اسپتال لے گیا۔

مگر اس وقت آسمان کتنا رویا ہوگا جب وہ کاشی کو اسپتال بے یار و مددگار چھوڑ کر گھر آ گیا۔ گھر آ کر اس نے اپنے بڑے بیٹے کو کال کر کے بتایا کہ تمہارا بھائی اسپتال داخل ہے اسے گھر لے جاؤ۔

کلیجہ پھٹ گیا تھا میرا جب میں نے سنا تھا کہ کاشی کو اس کا باپ اسپتال میں اکیلا چھوڑ کر گھر آ گیا ہے۔

خدا بھی معاف نہیں کر سکتا ایسے شخص کو جو اتنا ظالم ہے جو اولاد کو یوں زندہ در گور کر رہا ہو۔

کاشی کے بھائی نے جا کر کاشی کے ٹیسٹ کروائے۔ کاشی کو کینسر ہو گیا تھا وہ بھی آخری اسٹیج پر تھا۔ وہ اسے بہاولپور اسپتال لے گیا۔ کاشی کے ساتھ کاشی کا بڑا بھائی اور ماں تھے۔

مگر کاشی کے باپ نے ایک کال کر کے بھی نہیں پوچھا کہ کاشی کیسا ہے کیا علاج کے لیے تم لوگوں کو پیسوں کی ضرورت ہے یا نہیں؟

اور میرا دوست کاشی اسی دن اس جہان سے اگلے جہان کو رخصت ہو گیا۔

مجھے جب یہ خبر ملی تب میں بستر پہ لیٹا ہوا سو رہا تھا۔ کاشی کی وفات کا سنتے ہی میرا دل خون کے آنسو رونے لگا اور میں نے اس کی مغفرت کی دعا کے ساتھ خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے کاشی کو اپنے پاس بلا لیا۔

کیونکہ یہ دنیا اس بیچارے کے لائق نہیں تھی۔ یہ دنیا والے اس کے لائق نہیں تھے۔

کاشی کا بھائی کاشی کی میت اپنے باپ کے گھر لے کر نہیں آیا۔ اس دن کاشی کے والد کو لوگوں نے جو باتیں سنائیں اگر اس میں شرم ہوتی تو وہ سن کر ہی مر جاتا مگر نہیں ایسے لوگ مرتے نہیں بلکہ عبرت کا نشان بنتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں۔

اب کاشی کہیں نظر نہیں آتا مگر ایسے لگتا ہے جیسے وہ ابھی میرے پاس شاپ پر آئے گا اور مجھے کوئی بات سنائے گا۔ دن بھر کے قصے دہرائے گا۔

دعا ہے اللہ پاک تم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور قبر کے عذاب سے محفوظ رکھے، آمین!

میں روز ادھر سے گزرتا ہوں...... کون دیکھتا ہے۔

میں جب ادھر سے نہ گزروں گا تو کون دیکھے گا......!

++

گناہ

جنابِ من
سلام شوق
عرصہ بعد "گناہ" کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ روداد ہے انوشہ کی، اکبر کی شرافت اور تیمور کی عیاری و مکاری کی۔ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں بگڑتے معاشرتے کا عکس صاف نظر آئے گا۔ اُمید ہے یہ سچ بیانی قارئین بھی پسند کریں گے۔

اعتزاز سلیم وصلی
(تاندلیا نوالی فیصل آباد)

محلے سے باہر جانے والی سڑک پر زیادہ رش نہیں تھا۔ دھوپ نرمی سے سڑک کے گرد لگے درختوں پر چمک رہی تھی۔ انہی درختوں کی قطار کے درمیان میں سے ایک چھوٹی سڑک پرائمری اسکول کی طرف مڑتی تھی۔ پرائمری اسکول میں یہ وقت بریک کا تھا۔ بچے کینٹین پر گھر سے لائے

گئے پیسے خرچ کرنے میں مصروف تھے۔ ایسے میں ایک سات سال کا بچہ اپنے سے دو تین سال بڑی عمر کے بچے سے ساتھ لڑنے میں مصروف تھا۔ اس کی شرٹ جو کہ پہلے بھ کچھ خاص صاف ستھری نہ تھی، اب تو بالکل ہی مٹی سے گھٹڑ دکھائی دے رہی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں

آنسو تھے مگر اس کے لڑنے میں ایک جنون تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ سامنے والے کو جان سے مار دینا چاہتا ہو۔ ارد گرد موجود بچے تماشا دیکھ رہے تھے جبکہ پانچویں کلاس کے کچھ بچے انہیں چھڑوانے میں مصروف تھے۔ ''چھوڑ دو یار، نہ لڑو۔'' ایک بچے کی آواز بار بار بلند ہوتی مگر وہ قابو میں نہیں آ رہے تھے۔

''میں ماروں گا تمہیں۔'' سات سال کے اس بچے کی آواز میں لرزش تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب بھی بڑی عمر کے بچے کو دے ماری تھی۔ اتنی مار کھانے اور عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود وہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ ایسے میں ایک استاد وہاں آ گیا۔

''پیچھے ہٹ جاؤ۔ کیا ہو رہا ہے یہ؟'' استاد کا خوف تھا یا احترام۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

''حذیفہ، انہیں میرے کمرے میں لے آؤ۔'' استاد نے پانچویں کلاس کے بچے کو حکم دیا۔ پورے جسم پر مٹی لیے وہ دونوں چپ چاپ حذیفہ کے ساتھ چل پڑے۔ استاد کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ ان دونوں کے سرخ چہرے دیکھ کر اس نے کہا۔ ''پہلے ہاتھ منہ دھو کر آؤ بدمعاشوں۔ برا حال ہو رہا ہے۔'' وہ سر جھکا کر کچھ دور لگے نلکے کی طرف بڑھ گئے۔ ہاتھ منہ دھونے کے بعد وہ دوبارہ استاد کے سامنے حاضر ہو گئے۔ ''اب بتاؤ، کیوں ریسلنگ کا شو جاری تھا؟'' اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''سر میں کینٹین پر چپس کھا رہا تھا کہ یہ اچانک سے آ کر مجھ سے لڑنے لگ گیا۔ پہلے تختی ماری پھر کتابیں اور پھر گریبان سے پکڑ کر میری وردی پھاڑ دی۔'' اس نے اپنی شرٹ کے ٹوٹے بٹن دکھائے۔

''ہاں بھئی؟ کیا مسئلہ تھا؟'' استاد نے حیرانگی سے اس سات سال کے بچے کی طرف دیکھا جو کلاس میں بالکل خاموش رہتا تھا۔

''اس نے بھی میری وردی پھاڑی ہے اور مارا بھی ہے۔'' اس کی آنکھ میں دوبارہ آنسو آ گئے۔

''سر شروع اس نے کیا تھا۔'' دوسرے بچے نے الزام لگایا۔

''پہلے لڑائی شروع کیوں کی تم نے؟'' استاد نے دوبارہ اسے دیکھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔

''دیکھیں اب بول بھی نہیں رہا۔'' دوسرے بچے نے مداخلت کی۔

''تم چپ کرو۔'' استاد نے اسے جھڑکا۔ ''ہاں بھئی جواب دو؟''

''بس سر۔ اس نے......''

''ہاں ہاں بولو۔ کچھ کہو گے نہیں میں۔''

''سر یہ روز سب بچوں کے ساتھ مل کر......'' سسکیاں بلند ہوئیں۔

''کیا؟ کھل کے بولو۔''

''دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر مجھے تنگ کرتا ہے۔ کہتا ہے اس کی ماں گھر سے بھاگ گئی تھی۔'' رونا بلند ہوا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ استاد اسے روتا دیکھ رہا تھا جبکہ دوسرے بچے کا سر جھک گیا تھا۔

☆......☆

''خوبصورت ہوگا وہ، بڑی سی گاڑی ہوگی اس کے پاس۔ ایک بڑے گیٹ والا گھر ہوگا جہاں وہ ہوگا اور میں ہوں گی بس اور کوئی نہیں ہوگا۔'' وہ جیسے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں اپنے گھر کے کچے کمرے سے دور، خیالات میں بنائے گئے ایک بنگلے پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ شاید اس بنگلے کے کسی صوفے پر بیٹھی جوس منہ سے لگانے لگی تھی جب ساتھ بیٹھی میرا نے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا۔

''انوشہ! کدھر کھو گئیں؟''

''ہاں ہاں؟'' وہ چونک کر خوابوں سے باہر آئی۔

''میں پوچھ رہی تھی ایسا کون سا شہزادہ ملے گا تجھے؟ ساس سسر بھی نہیں ہیں تیرے خوابوں میں۔ بس وہ اور تم؟'' وہ ہنس رہی تھی۔ انوشہ جانتی تھی میرا اس کے خوابوں کو بس خواب سمجھتی ہے۔

''ایک دن ضرور آئے گا تم دیکھنا۔''

''ہٹ جھلی۔'' وہ بھی کہہ کر وہاں سے اٹھ گئی جبکہ انوشہ ایک پنجابی گانا گنگناتی ہوئی ایک سائیڈ پر پڑے گھڑوں میں سے ایک گھڑا اٹھا کر نلکے کے نیچے رکھ کر بھرنے لگی۔ اسی دوران اس کی ماں ثمینہ اندر داخل ہوگئی۔

''آ گئی اماں، سارے گاؤں کی خبریں لے کر۔'' بڑبڑاہٹ ثمینہ تک پہنچ گئی۔ اس نے گھور کر بیٹی کی طرف دیکھا اور چارپائی کی طرف بڑھ گئی۔ گرمیوں کا سورج سارا دن لوگوں کا صبر آزمانے کے بعد اب اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ کچے کمرے کا سایہ کچھ ٹھنڈا محسوس ہونے لگا تھا۔ شام کی اداسی دھیرے دھیرے اس گاؤں میں رہنے والے غریب گھروں میں اتر رہی تھی۔

''اپنی زبان کو سنبھال کر رکھ انوشہ، سسرال میں جا کر کام آئے گی۔''

''کیوں؟ میں نے کون سا وہاں جا کر لڑائی کرنی ہے؟''

''جیسی تیری حرکتیں ہیں، لڑائی کے علاوہ اور کیا کرے گی؟''

''اماں ہر وقت طعنے نہ مارا کر۔'' وہ جھنجھلا گئی۔

''ابھی تیری خالہ کے گھر سے آئی ہوں۔ اس کی بڑی بیٹی عالیہ کا رشتہ بھی طے ہو گیا ہے۔ تجھ سے صرف ایک سال بڑی ہے۔''

''اچھی بات ہے اللہ نصیب اچھے کرے۔'' اس نے کسی سمجھدار عورت کی طرح دعا دی۔

''اپنے لیے بھی دعا کر۔ تیرے نصیب بھی کھل جائیں۔ پورے گاؤں میں تو اکیلی میٹرک پاس ہے پھر بھی کوئی رشتہ نہیں آتا۔''

''آ جائے گا اماں۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔ گڑھا دوبارہ سابقہ جگہ پر رکھ کر وہ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی اندر چلی گئی۔ اسی دوران نور محمد اندر داخل ہوا۔ چالیس سے کچھ اوپر عمر کا نور محمد وقت سے پہلے بوڑھا لگنے لگا تھا۔ کمزور جسم اور کم گوشت میں سے جھانکتی ہڈیاں اس کے نقوش کو عجیب رنگ دے رہی تھیں۔ اپنی سائیکل ایک کونے میں کھڑی کر کے وہ چارپائی پر ثمینہ کے پاس بیٹھ گیا جو اس کے بیٹھنے سے پہلے پانی کا مگ دے چکی تھی۔ نور محمد کی سبزی کی دکان تھی۔ بڑھتی مہنگائی کی وجہ سے وہ بس اتنا کما پاتا کہ تین افراد کا یہ گھرانا کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے بغیر دو وقت کی روٹی کھا لیتا۔ اس گھر میں چند سال پہلے تک کوئی پریشانی نہ تھی۔ ان دنوں انوشہ کا رشتہ پھپھو کے گھر طے ہو چکا تھا۔ شادی کا امکان جلد تھا کہ اچانک دن بدل گئے۔ اس کا منگیتر کلیل جمع پونجی اکٹھی کر کے دبئی چلا گیا۔ محنت کی اور چند سالوں میں ہی گھر کے حالات بدل دیے۔ پھپھو نے گاؤں سے شہر کا رستہ طے کیا جہاں کلیل نے چھوٹے بھائیوں کو ایک جنرل اسٹور خرید کر دے دیا۔ شہر جا کر پھپھو نے وہی کام کیا جو پیسا آتے ہی لوگ اپنے خونی رشتوں سے کرتے ہیں یعنی لاتعلقی۔ ثمینہ نے ایک دو بار انوشہ اور کلیل کی منگنی کی یاد دلائی مگر دوسری طرف سے انکار ہی سننے کو ملا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نور محمد کی بہن ان کے لیے جیتے جی مر گئی۔

وقت گزر گیا۔ انوشہ کی ہم عمر تمام لڑکیوں کی یا شادی ہو گئی یا پھر رشتے طے ہو گئے۔ ویسے بھی گاؤں میں انیس بیس سال تک شادی کر دی جاتی تھی۔ ایسے میں انوشہ ہی تھی جو ماں باپ کے گھر بیٹھی تھی۔ پہلی منگنی ٹوٹنے کے بعد کوئی رشتہ نہ آیا۔ اس کے خواب بھی اونچے تھے۔ کچے گھر میں رہنے والی وہ لڑکی جوانی کی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی کسی شہزادے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ اس کے خواب اس کی سہیلیوں میں بہت مشہور تھے۔ یہ خواب پورے ہوتے یا ادھورے رہتے۔ یہ تو وقت ہی بتا سکتا تھا۔ وہ گاؤں کی اکلوتی میٹرک پاس لڑکی تھی۔ اس نے ضد کر کے پڑھائی کی تھی۔ کچھ غرور تھا اس کے اندر، شکل و صورت بھی اچھی تھی۔ یہ خواب دیکھنا حق بنتا تھا۔

☆.....☆

بوڑھی عورت تھی وہ۔ چہرے پر جھریاں، تھوڑا جھک کر چلنے والی بالکل سادہ لباس میں ملبوس۔ ثمینہ کے پاس بیٹھی باتوں میں مصروف تھی جبکہ اس عورت کی بیٹی گود میں ایک چھوٹے سے بچے کو لیے تھی۔ ''اکبر کا اپنا کام ہے۔ رکشا چلاتا ہے اور شام کو اتنا کما کر لے آتا ہے کہ ایک گھر چلا سکے۔ بس کچھ بہنوں کی شادی کی وجہ سے اور کچھ حالات کی مجبوری کی وجہ سے شادی میں دیر ہو گئی پر مرد کی عمر کب دیکھی جاتی ہے بہن۔ خوش رہے گی ہماری بیٹی۔'' بوڑھی عورت اکبر کی ماں بشیراں تھی۔ یہ رشتہ انوشہ کی خالہ کے توسط سے آیا تھا۔

''جی خالہ، اماں ٹھیک کہہ رہی ہے انوشہ خوش رہے گی بھائی کے ساتھ۔ کوئی ہماری طرح سسرال تو ہو گا نہیں۔ بس ایک اماں ہی ہو گی۔ سنبھال بھی آسانی سے لے گی۔'' اس بار اکبر کی بہن نے گفتگو میں حصہ لیا تھا۔ انوشہ کمرے کے دروازے کے ساتھ کھڑی ساری باتیں سن رہی تھی۔ اپنے حصے کا کام وہ کر چکی تھی۔ شربت بنا کر مہمانوں کو پلایا جا چکا تھا۔ ثمینہ اس رشتے پر خوش تھی۔ رسماً سوچنے کا وقت مانگ کر اس نے نور محمد سے بات کی۔ اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ سب کچھ ٹھیک تھا مگر راضی نہیں تھی تو صرف وہ جس کی شادی ہو رہی تھی۔ اکبر کی تصویر دیکھ کر ہی اس نے صاف انکار کر دیا۔

''اماں رنگ دیکھ اس کالے کا۔ بھینس سے بھی زیادہ کالا ہے اور عمر بھی مجھ سے کوئی بارہ تیرہ سال زیادہ ہو گی۔''

''چپ کر منہ پھٹ۔ مرد کی شکل و صورت نہیں دیکھی

جاتی۔ کمانے والا ہے بس یہی بہت ہے۔"

"اماں پیسے کمانے کا یہ مطلب نہیں کہ کسی بھی بڈھے کے ساتھ مجھے باندھ دو۔" اس نے خوب احتجاج کیا لیکن کب تک؟ اور وہ احتجاج کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ صرف دو ماہ بعد انوشہ کی دنیا اکبر کے نام ہو گئی۔ تھوڑی نرم شخصیت کا مالک اکبر اسے پا کر خوش تھا۔ وہ اپنی نئی نویلی خوبصورت بیوی کے لیے اپنی اوقات سے بڑھ کر خوشیاں خریدنا چاہتا تھا اس لیے خوب محنت کر رہا تھا۔ عمر میں زیادہ تھا مگر زندگی میں پہلی بار نسوانی وجود کا مالک بنا تھا۔ اس نئے نشے کی وجہ سے وہ بیوی کی ہر بات ماننے کے لیے تیار تھا۔ رہی بات انوشہ کی تو وہ خوش نہیں تھی۔ شہزادوں کا خواب دیکھنے والی لڑکی ایک رکشا ڈرائیور کی بیوی بن کر کیسے خوش ہو سکتی تھی؟ خاموشی کی ایک چادر اپنے گرد اوڑھ کر وہ چپ چاپ یہ رشتہ نبھانے لگی۔ وقت پر لگا کر اڑ گیا۔ پانچ سال بعد اس گھر میں دو بچوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ تین سال کا احمد اور ایک سال کی سدرہ۔ اکبر کی ماں دنیا چھوڑ چکی تھی۔ بدلتے وقت اور دو بچوں کی پیدائش نے بھی انوشہ پر کچھ خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔ خاموشی سے کسی مشین کی طرح گھر کے سارے کام کرتی ہر بات پر "جی اچھا۔" کہنے والی۔ دن بھر کام کرنے کے بعد شوہر کے حکم پر چپ چاپ رات کو خود کو اس کے حوالے کرنے والی۔ لوگ تو کہتے ہوں گے کہ اکبر جیسی اچھی قسمت کم ہی کسی کی ہو گی جسے اتنی اچھی بیوی ملی ہے لیکن انوشہ کے دل میں اتر کر دیکھا جاتا تو شاید انہیں اپنے خیالات بدلنے پڑتے۔ انوشہ اور اکبر کی زندگی کے اس سیدھے چلتے رستے پر اچانک ایک موڑ آ گیا اور اس موڑ کا نام تھا۔ تیمور شہزاد۔

☆......☆

موسم بدل رہا تھا۔ اکتوبر کی آخری رات نے نومبر کو خوش آمدید کہنے کے لیے بارش کا انتظام کر رکھا تھا۔ بوند بوند برستی بارش نے اچانک غصہ دکھایا اور اس ساری رات تیز بارش کے ساتھ ہوا اور بادلوں کی گونج نے ماحول کو سہا دیا۔ سردی وقت سے پہلے اپنے قدم جما چکی تھی۔ اکبر صبح اٹھا تو اس نے ساتھ سوئی انوشہ کو آواز دی۔ "انوشہ اٹھو ناشتا بناؤ۔" اسے کام پر جانا تھا۔ اس صبح وہ ویسے بھی دیر سے اٹھا تھا۔ انوشہ بے سدھ پڑی تھی۔ اس نے دو تین بار آواز دی مگر انوشہ کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر کمبل ہٹایا اور دیکھا کہ انوشہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ انوشہ کے ماتھے پر رکھا۔ اسے شدید بخار تھا۔ سانس کی رفتار بھی بڑھی ہوئی تھی۔ اکبر کو پریشانی نے گھیر لیا۔ علاقے میں صرف ایک ہی سرکاری اسپتال تھا جس میں ڈاکٹر ملنے کی امید دس گیارہ بجے سے پہلے نہ تھی۔ کچھ سوچنے کے بعد وہ پڑوس میں رہنے والے اپنے دور کے رشتے دار کے گھر چلا آیا۔ ان سے کہہ سن کر ایک عورت کو اپنے ساتھ لے آیا۔ عورت نے انوشہ کے ماتھے پر پانی میں بھگو کر اپنا دوپٹا رکھ دیا۔ کافی کوششوں کے بعد بخار کچھ کم ہوا تو انوشہ کو ہوش آیا۔ عورت کے جانے کے بعد اکبر نے اس سے کہا۔

"انوشہ ڈاکٹر آ چکا ہو گا۔ اسپتال چلتے ہیں۔"

"رہنے دیں۔ بخار تو اتر چکا ہے۔"

"اترا نہیں۔ کم ہوا ہے۔ ڈاکٹر کو دکھا لیتے ہیں دوائی لے آئیں گے۔" اکبر اس کا جواب سنے بغیر رکشا نکال کر دروازے پر لے آیا۔ وہ چپ چاپ رکشے میں بیٹھ گئی۔ بچوں کو پڑوس میں چھوڑ کر وہ دونوں اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب بھی وہ رکشے میں بیٹھتی تھی اسے اپنی کار میں بیٹھنے کا خواب یاد آ جاتا۔ آج بھی خواب کو سوچ کر تلخ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔ اسپتال کے گیٹ سے اندر داخل ہو کر انہوں نے پرچی بنوائی اور ڈاکٹر کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ڈاکٹروں کی مخصوص کرسی پر بیٹھے شخص کا چہرہ ان کے لیے اجنبی تھا کیونکہ پہلے یہاں ڈاکٹر امین ہوا کرتے تھے جن کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر تیمور شہزاد نے انوشہ کو اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا جبکہ اکبر دیوار کے ساتھ بنے پتھر کے بینچ پر بیٹھ گیا۔ یہاں سب جانے پہچانے چہرے تھے کیونکہ یہ بھی ان کے علاقے کے وہ لوئر مڈل کلاس لوگ تھے جو پرائیویٹ اسپتال افورڈ نہیں کر سکتے تھے اس لیے سرکاری اسپتال میں ایک روپے کی پرچی بنوا کر مفت دوائیوں پر گزارا کرتے تھے۔

"لگتا ہے آپ پر موسم کا اثر ہو گیا ہے۔" ڈاکٹر تیمور کی زندگی سے بھرپور آواز سن کر انوشہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وقت جیسے تھم گیا ہو۔ خواب جیسے دوبارہ آنکھوں میں زندہ ہو گئے ہوں۔ پانچ سال پرانے انوشہ کے خوابوں کا شہزادہ اس کے سامنے تھا۔ ہاں وہ ایسے ہی کسی شخص کا خواب دیکھا کرتی تھی۔ چہرے پر مسکراہٹ لیے خوبصورت شخصیت کا مالک تیمور شہزاد۔

"جی بس......" وہ کوئی جواب نہ سوچ سکی۔

''خیال رکھیں اپنا اور یہ دوائی کھائیں۔'' ڈاکٹروں کی مخصوص لکھائی میں دوائیوں کے نام لکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ مسکراہٹ جیسے اس کے چہرے کے لیے بنی ہو۔ وہ عام سرکاری ڈاکٹروں کے برعکس خوش مزاج تھا۔ انوشہ کے لیے اس سے دور جانا ناممکن ہو گیا تھا۔ اکبر کے ساتھ باہر کو بڑھائے جانے والے قدم وہ جس دل سے اٹھا رہی تھی، صرف وہی جانتی تھی۔

بخار اتر گیا۔ سب کچھ معمول پر آ گیا۔ بس ایک انوشہ کا دل تھا جو اکبر کے گھر سے دو کلومیٹر دور سرکاری اسپتال میں رہ گیا تھا۔ اس نے خود کو سمجھانے کی بار بار کوشش کی۔ وہ دو بچوں کی ماں تھی۔ عمر بھی پچیس چھبیس سال تھی۔ کوئی نوجوان لڑکی نہیں تھی جو دل کو سنبھال نہ سکتی مگر ان خوابوں کا کیا کیا جائے جو تعبیر کو سامنے دیکھ کر پھر سے آنکھوں میں جاگ گئے تھے۔ صرف ایک ہفتے بعد انوشہ اکبر علی کی غیر موجودگی میں ایک بار پھر ایک روپے کی پرچی کٹوا کر ڈاکٹر تیمور شہزاد کے سامنے موجود تھی۔

''میرے پیٹ میں درد ہے۔'' تیمور نے معمول کے مطابق سب دوائیاں دیں اور اسی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''اپنا خیال رکھیں۔'' لیکن وہ کیسے اپنا خیال رکھ سکتی تھی۔ کبھی اکبر کے ساتھ تو کبھی اکیلی۔ وہ ہر ہفتے اسپتال کے چکر لگانے لگی۔ بچوں کی طرف سے بے خبر ہو گئی۔ آنکھوں کے سامنے تھا تو بس ڈاکٹر تیمور۔ اکبر بھی بیوی کی 'بیماریوں' کی وجہ سے پریشان رہتا تھا۔ خوش تھی تو صرف وہ مریض عشق۔ دنیا کیا کہے گی، شوہر کیا سوچے گا، مستقبل کیا ہوگا؟ ان تمام سوالات کو دماغ سے بھلا کر وہ صرف تیمور شہزاد کی سوچوں کو جگہ دے چکی تھی۔ تیمور شہزاد ذہین شخص تھا۔ انوشہ کے بیماری کے ڈرامے، ذومعنی باتیں اور اس کے ہاتھ کو چھونے کی کوششیں، یہ سب اسے بہت کچھ سمجھانے کے لیے کافی تھا۔ شہر میں بسنے والے اس ستائیس سال کے ایک خوبرو شخص کو دو بچوں کی ماں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اس کی زندگی ویسے بھی رنگین تھی۔ مڈل کلاس سے تعلق رکھنے کے باوجود اس کی شخصیت پر مرنے والیوں کی تعداد کم نہ تھی۔ میڈیکل کی تعلیم اور کالج کے دوران بھی اس نے ان میں سے کافی تتلیوں کے دل جیت کر اپنی راتیں سجائی تھیں۔ انوشہ کی اس محبت کا جواب اس نے سرد مہری سے دیا۔ قصبے کی کوئی جوان کنواری لڑکی ہوتی

تو وہ اس محبت کا 'فائدہ' ضرور اٹھاتا مگر شادی شدہ لڑکی کو کسی قسم کا مثبت جواب دے کر وہ کوئی مصیبت مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ انوشہ کے ان حملوں کے جواب میں آخر ایک دن اس نے اسے اکبر علی کی غیر موجودگی میں الگ کمرے میں تنہائی میں بلالیا۔

"جی ڈاکٹر صاحب۔" دوپٹے کو ہاتھ کی انگلیوں پر لپیٹتی انوشہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر تنہائی میں بلانے کی وجہ پوچھی حالانکہ اس کا دل اس صورتِ حال پر خوشی کے مارے جھوم رہا تھا۔

"دیکھو انوشہ، روز روز کے تماشے کی بجائے سیدھی بات کرو کیا چاہتی ہو؟"

"کیا مطلب جی؟ میں تو بیمار ہوں۔" وہ چونک گئی۔

"یہ ڈراما اپنے شوہر کے سامنے کرنا۔ میں جانتا ہوں جتنی تم بیمار ہو۔ ڈاکٹر ہوں میں، کوئی رکشا ڈرائیور نہیں۔" وہ اس کے بارے میں کافی حد تک جان چکا تھا۔

"پتا نہیں آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟"

"میرے سمجھنے کو چھوڑو۔ تم کیا چاہتی ہو یہ بتاؤ؟"

"مگر....."

"اگر مگر چھوڑو انوشہ۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"صاف صاف بتاؤ۔"

"میں آپ کو چاہتی ہوں۔" نجانے اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی۔ اس نے سیدھا ڈاکٹر کی نظروں میں دیکھ کر کہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے خاموش رہنے کے بعد تیمور نے جواب دیا۔

"مگر میں تمہیں نہیں چاہتا۔ نہ میرا مستقبل میں ایسا کوئی ارادہ ہے۔" وہ اس کا جواب سن کر مسکرادی۔

"آپ کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ میں تو آپ سے محبت کرتی ہوں۔" اس اقرار کے تو کب سے لب پیاسے تھے۔ آج ان کی پیاس بھی محبوب کے سامنے بجھی تھی۔

"مجھے تمہاری محبت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ آئندہ یہ فضول سے بہانے بنا کر مجھ سے ملنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" دو چار اور باتیں سنا کر اس نے انوشہ کو ہسپتال سے نکال دیا لیکن اپنے آپ کو اس کے دل سے نہیں نکال سکا تھا۔

☆.....☆

کہتے ہیں عورت اپنے پسند کے مرد کو حاصل کرنے میں کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ انوشہ کی تو پسند کے ساتھ کئی سالوں کی خواہشات جڑی تھیں۔ اپنا گھر، شوہر اور بچے۔ سب کچھ بھلا کر اس نے تیمور کو پانے کی جدوجہد شروع کردی۔ ایک ایسے شخص کو پانا بہت مشکل تھا جس نے زندگی کے کئی سال اس طرح کی کئی لڑکیوں کے ساتھ کھیلنے میں گزارے تھے۔ انوشہ نے بھی ہر حد پار کرلی۔ تیمور کی سختی، طنز اور اسے ٹھکرانے کی کوشش۔ سب ناکام رہا۔ آخر تیمور کو ہار ماننی پڑی۔ گھر سے دور اس علاقے میں اسے ایک خوبصورت عورت کا ساتھ قبول کرنا پڑا۔ انوشہ بھی اس کی ہر خواہش کے آگے سر جھکاتی چلی گئی۔ بیماری کے بہانے کبھی اسپتال تو کبھی اکبر کی غیر موجودگی میں تیمور کی رہائش گاہ پر۔ تعلق پروان چڑھا تو محبت کے نام پر ہونے والے ہوس کے اس تماشے نے ان دونوں کو ہوش بھلا دیئے۔

عشق چھپتا نہیں اور عشق کے نام پر کی جانے والی یہ برائی بھی نہ چھپ سکی۔ بات نکلی تو کئی کانوں نے سنی۔ کب، کیسے، کس نے نکالی؟ ان سوالات سے ہٹ کر سوچنا بس یہ تھا کہ اکبر ان حالات میں کیا کرتا۔ ظاہر ہے وہ اسی علاقے میں رہتا تھا اور بدنام ہونے والی اس کی بیوی تھی۔ اس تک بھی بات پہنچ گئی۔ تیمور اور انوشہ کا یہ شیطانی رشتہ جو پچھلے ایک سال سے کامیابی سے چل رہا تھا، اب خطرے میں تھا۔ اکبر تو بیوی کے رویے میں تبدیلی کافی دنوں سے محسوس کررہا تھا مگر انوشہ شوہر کی باتوں میں کبھی کو محسوس نہ کرسکی۔ وہ بھی زمانے بھر کی سرگوشیوں کو سن رہا تھا۔ "اس کی بیوی کو پر لگے ہوئے ہیں۔"

"اڑ جائے گی کسی دن۔"

"ہاں شہری ڈاکٹر جو پھنسالیا ہے۔"

"بے چارہ اکبر۔" یہ ادھر دیاں تھیں یا طنز۔ اکبر فرق نہ کرسکا۔ مرد تھا کب تک برداشت کرتا؟ بیوی سے صاف صاف بات کرنے میں بھی ہچکچاہٹ تھی۔ بہانہ تلاش کرنا مشکل تھا، ناممکن نہیں۔ اس صبح اکبر نے انوشہ سے کہا۔

"مجھے آج کچھ کام ہے۔ شہر جاؤں گا۔ رکشے پر کچھ سامان لے جانا ہے۔ شاید آج رات نہ آسکوں۔ بچوں کا دھیان رکھنا۔" اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے کے بعد اکبر وہاں سے چل دیا۔ وہ اتنی اچھی اداکارہ ہرگز نہ تھی کہ خوشی کو چھپا جاتی۔ وہ جواب میں 'جی اچھا' بھی نہ کہہ سکی۔ اکبر چلا گیا۔ انوشہ نے شام ہونے کا انتظار کیا۔ سائے گہرے ہوتے ہی اس نے دونوں بچوں کو ساتھ لیا اور

رکشے میں بیٹھ کر اپنی ماں کے گھر چلی گئی۔

''اماں اکبر اور مجھے شہر جانا ہے انہیں سنبھال لینا۔'' ایسے کئی جھوٹ وہ مسلسل بول رہی تھی۔ ثمینہ سادہ عورت تھی۔ بڑھتی عمر نے ویسے بھی زیادہ سوچنے کے قابل کہاں چھوڑا تھا۔ وہ ان معصوموں کی رونق سے ہی خوش ہو چکی تھی۔ انہیں اپنے گھر چھوڑنے کے بعد انوشہ نے اسی رکشے پر واپسی کا سفر طے کیا۔ تیمور کی رہائش سے کچھ ہی دور رکشا رکوا کر اسے کرایہ دیا اور سیدھا تیمور کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ ساری رات تیمور اور اس کے لیے عیاشی کی رات تھی۔ اگلی صبح جب وہ دونوں بچوں کو لے کر گھر پہنچی تو اکبر وہاں پہلے سے موجود تھا۔ ''جلدی آ گئے آپ۔'' سدرہ کو چارپائی پر لٹانے کے بعد اس نے بات کا آغاز کیا۔

''ہاں۔'' یک لفظی جواب سن کر وہ کچھ دیر چپ رہی۔

''کچھ کھانے کے لیے لاؤں؟''

''زہر۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چونکی۔

''ایک غیرت مند مرد کو زہر کھا کر مر جانا چاہیے اس وقت جب اس کی بیوی کسی پرائے مرد کے ساتھ رات گزار کر آئی ہو۔'' حقیقت کھل چکی تھی۔ انوشہ نے جھوٹ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔

''مگر میں رات کوای کے گھر تھی۔''

''جس رکشے پر تم گئی تھی وہ اشرف کا تھا اور اشرف میرا دوست ہے، اڈے پر ساتھ ہوتا ہے میرے۔'' اکبر کے چہرے کے نقوش بگڑے ہوئے تھے۔

''مگر.....'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے تھپڑ انوشہ کا چہرہ سرخ کر گیا۔

''اگر مگر کچھ نہیں۔ اب مجھ میں کچھ مردانگی ہوئی تو میں تمہیں خود روک لوں گا ورنہ گھر میں تمہاری لاش ہو گی یا میری۔'' وہ یہ کہہ کر لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ انوشہ گال پر ہاتھ رکھے وہیں ساکت کھڑی تھی۔ یہ تو ایک دن ہونا تھا۔ وہ جتنا مرضی چھپا لیتی، چالاک بنتی، گناہ پر پردہ ڈال لیتی۔ یہ ایک نہ ایک دن ضرور ظاہر ہونا تھا۔ اس کے پاس کھڑا اس کا بیٹا احمد حیرت سے کبھی ماں اور کبھی باہر جاتے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تو غلطی پر اسے بھی نہیں مارتا تھا، آج نجانے کیوں اس کا ہاتھ اٹھ چکا تھا۔

انوشہ کے گھر سے باہر نکلنے پر اکبر نے پابندی لگا دی۔ وہ کام پر جاتا تو پڑوس سے اس کی رشتے دار عورت اس کے گھر آ کر بیٹھ جاتی۔ انوشہ اسے ٹوک نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنا گناہ جانتی تھی۔ گناہ میں بھی ایک کشش ہوتی ہے۔ یہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ انوشہ کو تیمور کی قربت پکار رہی تھی۔ وہ یقیناً اسے یاد کر رہا تھا۔ اگلا ایک ہفتہ انوشہ نے ہر ممکن کوشش کی مگر اکبر کو دھوکا نہ دے سکی۔ ایک رات اس نے باہر جانی انوشہ کو پکڑ کر خوب دھلائی کی۔ وہ بس روتی رہی، زبان سے کچھ نہ بولی۔ اگلی صبح ناشتا دیتے ہوئے اس نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

''مجھے طلاق دے دو اکبر، بچے اپنے پاس رکھ لو۔''

''نہ انوشہ بی بی نہ۔ تم میرے نکاح میں رہو گی اور میرے گھر رہو گی، تمہیں تو سبق مل گیا اب ذرا اس شہری ڈاکٹر کو لگ جانے دو میرے ہاتھ۔''

''تیمور کو کچھ مت کہنا۔'' وہ تڑپ اٹھی۔

''اپنے یار کے نام پر تیرا تڑپنا میرا غصہ بڑھا رہا ہے۔ اب تیری اور میری ضد ہے۔ تیمور کو تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' انوشہ سب برداشت کر سکتی تھی مگر تیمور کی تکلیف نہیں۔ وہ سارا دن سوچتی رہی اور آخر ایک نتیجے پر پہنچ کر سکون سے گھر کا کام کرنے لگ گئی۔ رات کا کھانا تیار کرنے کے بعد انوشہ نے بہت پہلے تیمور سے حاصل کی گئی نیند کی دوائی اس میں ملا دی۔ اکبر واپس گھر آیا تو اس نے کھانا اکبر کے سامنے رکھ دیا۔ وہ رات اس گھر کی بدقسمت رات تھی مگر رات، دن، صبح یا شام۔ ان کو بدقسمت کہنا غلط ہے۔ غلط تو وہ انسان ہے جو اس وقت پر ایسا قدم اٹھاتا ہے جس سے گھر کے حالات بدترین ہو جاتے ہیں۔ انوشہ نے اپنا سامان سمیٹا، اکبر اور بچوں کو سوتا چھوڑ کر وہ گھر سے نکل گئی۔ کئی منٹ پیدل چلنے کے بعد وہ ڈاکٹر تیمور کی رہائش گاہ پر جا پہنچی۔ چوکیدار اسے پہچانتا تھا۔ ڈاکٹر تک پہنچنے میں اسے کوئی دشواری نہ ہوئی۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوا۔

''انوشہ تم اس وقت یہاں؟''

''یہاں سے نکل چلیں تیمور۔ اکبر آپ کی اور میری جان لینا چاہتا ہے۔''

''مگر کیوں؟'' یہ سوال بے معنی تھا۔

''اسے سب پتا چل گیا ہے۔ وہ آپ کو مار دے گا۔ خدا کا واسطہ ہے جلدی نکلو۔'' تیمور جھنجلایا ہوا تھا۔ شاید گناہ کی لذت میں ڈوب کر وہ اس کے نتائج سے بے خبر تھا۔

''تم نے ہی یہ مصیبت میرے گلے میں ڈالی ہے۔''

وہ خوفزدہ تھا۔ ہر مجرم کی طرح جو جرم بھی کرتا ہے اور ڈرتا بھی ہے۔ تیمور کی کار میں بیٹھ کر وہ اس علاقے سے بہت دور نکل گئے۔ شہر کے کسی انجان حصے کی جانب۔ جہاں زندگی کا یہ سفر ابھی کئی آزمائشیں لیے ان کے انتظار میں تھا۔

☆.....☆

وقت اپنی چال چلتا ہے۔ انسان اس کی چالاکی سے بے خبر اپنے حالات میں مگن رہتا ہے اور نتیجہ اس بے خبر انسان کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ اکبر کے گھر پر بھی قیامت ٹوٹ پڑی۔ انوشہ کا گھر سے غائب ہونا کوئی ایسی خبر نہ تھی جسے چھپایا جا سکتا۔ اکبر نے ہر جگہ اسے تلاش کیا۔ ڈاکٹر تیمور اور وہ غائب ہو چکے تھے۔ اس شام اکبر کے چھوٹے سے گھر میں سارے رشتے دار موجود تھے۔ اکبر ایک کونے میں پڑی چارپائی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ''قتل کر دیں گے اس حرامزادی کو.....'' اس کے بہنوئی کی للکار گونجی۔

''ملی تو کرو گے، وہ تو نجانے کہاں نکل گئی۔'' اس بار بلند ہونے والی آواز اس کی بہن کی تھی۔

''ڈھونڈ لیں گے۔ خاندان کی عزت کا سوال ہے۔''

''ایک ڈیڑھ سال سے یہ چکر چل رہا ہے۔ میں نے بھائی صاحب کو کہا بھی تھا کہ کچھ خیال کر لیں پر نہ جی، تب تو بیوی کا عشق سوار تھا دل و دماغ پر۔'' بہن کے طنزیہ انداز پر بھی اکبر نے سر نہ اٹھایا۔ وہ سب بے خبر تھے اکبر نے اپنی ہر ممکن کوشش کی تھی۔

''میں تو کہتا ہوں مٹی ڈالو اس حرافہ پر۔ بچوں کو ابھی دو تین گھروں میں بانٹ کر سنبھال لیتے ہیں بعد میں اکبر کی شادی کر دیں گے۔ میں تو پہلے بھی دوسری برادری میں شادی کرنے پر راضی نہ تھا۔'' ایک نسبتاً بڑی عمر کے شخص نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''لوگ کیا کہیں گے چاچا؟''

''لوگوں نے کچھ نہ کچھ کہنا ہوتا ہے پتر۔ اب بھی کہیں گے اور زیادہ بات پھیلی تب بھی۔ بہتر ہے چپ کر کے بیٹھ جاؤ۔''

''میری قسمت کا فیصلہ کرنے والے تم سب لوگ کون ہوتے ہو؟'' اکبر نے سر اٹھایا تھا۔ اس کی غصیلی آواز سن کر سب خاموش ہو گئے۔ ''یہ کریں گے وہ کریں گے یوں کرتے ہیں ایسے کرتے ہیں، کون ہو تم لوگ؟'' وہ چیخا۔

''پتر ہم تمہارے اپنے ہیں۔''

''کوئی نہیں میرا اپنا۔ نکل جاؤ سب۔'' وہ دہاڑا۔ سناٹا چھا گیا۔ ''میں خود ڈھونڈوں گا انوشہ کو۔ مار دوں گا اس کو۔'' اس نے سر جھکایا اور دونوں بازوؤں میں چہرہ چھپا لیا۔ وہ رو رہا تھا۔ ہاں مرد ہو کر بھی وہ رو رہا تھا۔ بہن نے آنسو صاف کیے اور پانی کا گلاس تھمایا۔ سب چپ بیٹھے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ نارمل ہوا تو اس نے سر اٹھا کر بہن سے کہا۔ ''بچوں کو اپنے گھر لے جاؤ۔ میں بھی وہاں آ جاؤں گا۔'' وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ کسی کی ہمت نہ ہوئی اسے روکنے کی۔

اگلے کئی ماہ اکبر نے انوشہ اور تیمور کو ڈھونڈنے میں لگا دیے۔ وہ دیوانہ ہو چکا تھا۔ گلی گلی، شہر شہر۔ اس نے ہر ممکن جگہ پر انہیں تلاش کیا مگر انوشہ نہ مل سکی اور نہ ہی تیمور کا پتا ملا کہیں سے۔ آخر تھک ہار کر اس نے خود کو اپنے کام میں مگن کر لیا۔ دن رات رکشا چلا کر وہ بس پیسے کمانے لگا۔ بچے اپنی پھپھو کے پاس تھے۔ کس حال میں تھے، اکبر لاعلم تھا۔ وہ انسان نہیں رہا تھا بس مشین بن گیا تھا۔ ہوٹل سے کھانا کھا کر وہ کسی پلاٹ میں سو جاتا اور جو کمائی ہوتی اس میں اپنا خرچا نکال کر باقی بہن کو تھما دیتا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ کئی ماہ اس طرح زندگی گزارنے کے بعد آخر ایک دن اس کو اپنے حالات پر غور کرنا پڑا۔

اس دن اسے احمد کے اسکول والوں نے بلایا تھا۔ احمد کا استاد اسلم اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔

''آپ اکبر صاحب ہیں؟''

''جی۔''

''آپ نے اپنے بیٹے کو لاوارث کیوں چھوڑا ہوا ہے؟''

''کیا مطلب؟ وہ روز اسکول تو آتا ہے اب تو شاید سدرہ بھی ساتھ آتی ہے۔'' اکبر نے اپنی چار سال کی بیٹی کا نام لیا۔

''آپ کو یہ بھی کنفرم نہیں کہ آپ کی بیٹی آتی ہے یا نہیں؟ کیسے باپ ہیں آپ؟ آپ جانتے ہیں احمد دو سال سے ایک ہی کلاس میں ہے؟ وہ کچھ پڑھتا نہیں۔ پھٹی پرانی اس کی وردی ہوتی ہے۔ نہانا دور کی بات، اس کا منہ بھی نہیں دھلا ہوتا۔ کل اس کی ایک بچے کے ساتھ شدید لڑائی ہوئی ہے۔''

''کیوں؟'' وہ شرمندگی سے سر جھکائے بیٹھا تھا، چونک کر اسلم صاحب کو دیکھا۔

''اس لڑکے نے احمد کی ماں کے بارے میں کچھ بول دیا تھا۔'' اکبر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ احمد چھوٹا سہی مگر

اتنی سمجھ کم از کم اس میں تھی۔

"میں اب خیال رکھوں گا۔" اکبر نے جواب دیا۔

"میں نے آپ کے حالات اور گھر کے بارے میں محلے کے کافی بچوں سے معلوم کیا ہے پھر خود بھی چکر لگایا ہے کچھ ادھر اُدھر سے باتیں معلوم کیں۔ معذرت کے ساتھ اکبر صاحب، آپ نے انتہائی غیر ذمے دار رویہ اپنایا ہوا ہے۔ دفع کریں ماضی کو اور مستقبل کا سوچیں۔ بچوں کی طرف توجہ دیں اپنی قسمت کی خرابی کا بدلا ان سے نہ لیں۔" اسلم صاحب ذہین آدمی تھے۔ استاد ہونے کی وجہ سے انہیں سمجھانے کا فن بھی آتا تھا۔ اکبر کو زندگی کی طرف واپس لانے کے لیے وہ ایک دو گھنٹے کافی ثابت ہوئے۔

اکبر نے بہن سے کوئی سوال جواب نہ کیا۔ وہ جانتا تھا پرائے بچوں کو کسی اور کے گھر میں پالنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ چپ چاپ انہیں واپس اپنے گھر لے آیا۔ صرف دو ماہ بعد اس نے ایک بیوہ عورت سے شادی کر لی۔ شازیہ غریب گھر سے تھی اور صرف اٹھائیس سال کی عمر میں شوہر کی موت کا دکھ برداشت کر رہی تھی۔ اکبر نے گھر اس کے حوالے کر دیا۔ اس سادہ سی عورت نے گھر کو سنبھال لیا تھا۔ بچے اس کے ساتھ مانوس ہو گئے۔ زندگی معمول پر لوٹ آئی..... اور صرف دو سال بعد۔ انوشہ بھی لوٹ آئی تھی۔

تیز ہوا اور بارش کی وجہ سے اکبر جلدی گھر واپس آ رہا تھا جب راستے میں وہ ملی۔ الجھے بال جن میں مٹی کے ذرات کثرت سے پائے جاتے تھے۔ جگہ جگہ سے پھٹے کپڑے اور جوتے کی قید سے آزاد پیر۔ ہاں وہ انوشہ ہی تھی جس کی جان لینے کا خواب وہ کئی بار دیکھ چکا تھا۔ انوشہ نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔ اکبر نے رکشا سائیڈ پر کھڑا کیا اور بھاگتا ہوا انوشہ کی جانب بڑھا۔ وہ سڑک کے درمیان بیٹھ گئی تھی۔ بارش کی بوندیں ان دونوں کو بھگو رہی تھیں۔

"انوشہ؟"

"اکبر۔" اس کے منہ سے نام پھسلا۔ "مارو گے نہیں مجھے؟"

"تم اس قابل نہیں رہی۔ شاید قدرت کی طرف سے کوئی سزا مل چکی ہے۔"

"ہاں — میرے بچے کہاں ہیں؟"

"خبردار، انہیں اپنے بچے کہا تو۔ وہ تمہاری اولاد نہیں ہیں۔" وہ گرجا۔

"مجھے معاف کر دو اکبر۔"

"تم معافی کے بھی لائق نہیں۔" اس نے انوشہ کے چہرے پر تھوک دیا۔ واپس پلٹا اور رکشے میں بیٹھ گیا۔ اس نے انوشہ کو مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

☆.....☆

تیمور کے ساتھ آنکھوں میں خواب سجائے وہ اس گھر میں موجود تھی جہاں تیمور کے ماں باپ اور ایک بڑا بھائی اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ گھر کافی بڑا تھا۔ اس کے خوابوں کے بنگلے جیسا تو نہیں مگر اکبر کے گھر سے کہیں زیادہ بڑا۔ وہ کمرے میں کھڑی دلچسپی سے اردگرد ہر چیز کو دیکھ رہی تھی جب اسی کی عمر کی ایک اور عورت اندر داخل ہوئی۔ نئے ڈیزائن کا لباس پہنے اس عورت نے انوشہ کی طرف الجھی نگاہوں سے دیکھا۔

"کون ہو تم؟ اور یہاں کیا کر رہی ہو؟" اس نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

"وہ جی....." اسی دوران تیمور اندر داخل ہوا۔

"بھابی یہ کام والی میں اپنے ساتھ لایا ہوں۔ امی بتا رہی تھیں کہ ضرورت ہے گھر میں۔" تیمور کے الفاظ شاید بھابی کے لیے صرف الفاظ ہوں مگر انوشہ کے لیے گرم سلاخیں تھیں جو سیدھا اس کے دل میں اتر گئیں۔ تیمور نے آنکھوں کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کا حکم دیا۔ وہ چپ رہی۔

"اچھا مگر یہ کون ہے؟ تمہیں پتا ہے آج کل حالات اچھے نہیں۔ ایسے انجان عورت کو نوکری پر رکھنا....."

"ارے نہیں بھابی، یہ اعتبار والی ہے۔ گاؤں سے ہے بے چاری کا کوئی نہیں۔" وہ جھوٹ پہ جھوٹ بول رہا تھا جبکہ انوشہ سوچ رہی تھی۔ کیا واقعی اس کا کوئی نہیں تھا؟ جواب ہاں میں تھا۔ کون تھا اب؟ نہ ماں باپ نہ اکبر، کوئی اسے قبول نہ کرتا۔ اس لمحے انوشہ کو بازی اپنے ہاتھ سے نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں اسے کام سمجھا دیتی ہوں۔" بھابی نے آگے بڑھ کر اسے پورا کام سمجھایا۔ کپڑے دھونے سے گھر کی صفائی تک۔

قصہ مختصر، انوشہ وہاں رہنے پر مجبور ہو گئی۔ دن پر دن گزرتے چلے گئے۔ تیمور کبھی اس سے تنہائی میں ملتا تو بس اتنا جواب دیتا۔

"مجھ سے جو ہو سکتا تھا وہ میں نے کیا۔ اس سے زیادہ

میں نہیں کر سکتا۔'' گھر کا کام کرتے کرتے کبھی اس بھابی کی طرف سے دی جانے والی گالیوں تو کبھی ایک آدھ تھپڑ کا سامنا بھی کرنا پڑ جاتا۔ تیمور کی ماں البتہ نرم مزاج تھی لیکن بھابی نے ساری کسر پوری کر رکھی تھی۔ وہ صبح فجر کے وقت اٹھتی اور رات دس بجے تک مسلسل کام کرتی۔ پورے گھر میں صرف وہ ایک نوکرانی تھی۔ کپڑوں کے ڈھیر میں اکثر تیمور کے کپڑے دھوتی وہ سوچتی تھی کہ رانی سے نوکرانی کا سفر جلد ہی طے ہو گیا ہے۔ اس نے دنوں کا حساب رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ تو عمر بھر کی قید تھی شاید۔ کبھی کبھی اس کے دل میں آتا وہ سب کو سچ سچ بتا دے مگر اتنی ہمت نہ کر سکی۔ اگر یہ اسے گھر سے نکال دیتے تو وہ کہاں جاتی؟

اس شام وہ کچن کی صفائی کر رہی تھی جب بھابی کی چیختی آواز سنائی دی۔ ''انوشہ انوشہ؟''

''جی۔''

''میرے کمرے سے میری جیولری غائب ہے۔ تم نے آج صفائی کی تھی؟''

''جج جی صفائی تو کی تھی۔'' وہ ہکلائی۔

''پھر کہاں غائب کی ہے؟''

''میں نے نہیں کی۔'' اس نے انکار میں سر ہلایا۔ بھابی نے لپک کر اس کے بال پکڑ لیے اور دو تین جھٹکے دیے۔

''شرم نہیں آتی چوری کرتے ہوئے۔ بتا میری جیولری کہاں ہے؟'' اسی دوران تیمور کا بڑا بھائی شکور کچن میں داخل ہوا۔ اس نے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیا بات ہے نرمین؟ کیوں مار رہی ہو اسے؟''

''میری جیولری غائب ہے اور مجھے یقین ہے اس نے چوری کی ہے۔'' اس بار انوشہ سے اعتراف کروانے کے لیے دونوں نے مل کر تشدد کیا اور خوب کیا۔ اتفاق سے باقی گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے۔ انوشہ کی چیخیں گونجتی رہیں لیکن کسی کو رحم نہ آیا۔ اسے واپس اس کے کمرے میں بند کرنے کے بعد نرمین کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

''کل بلائیں گے پولیس کو تب تک بتا دے ورنہ.....'' وہ ورنہ کا مطلب جانتی تھی۔ بے گناہ ہونے کے باوجود وہ گناہ گار تھی۔ اسے سزا مل رہی تھی۔ رات کے تقریباً دس بجے تھے جب کمرے کا دروازہ کھلا اور تیمور اندر داخل ہوا۔

''باہر آؤ۔'' اس کے لہجے میں نرمی تھی۔ وہ اسے لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ وہاں باقی سب بھی موجود تھے۔

''انوشہ، مجھے یاد نہیں تھا جیولری میں نے خود امی کے کمرے میں رکھی تھی۔ اب مل گئی ہے۔ میں بھول گئی تھی۔ تم بیچاری کو بلاوجہ مار پڑ گئی۔'' الفاظ میں شرمندگی نہ شرم کا احساس۔ صرف اپنی غلطی تسلیم کی گئی۔ انوشہ کے اندر آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے تیمور کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیا اس لیے لائے تھے مجھے؟''

''کک کیا مطلب؟'' اس نے انوشہ کو نظروں ہی نظروں میں خاموش رہنے کا حکم دیا۔ سب انوشہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''اب میں چپ نہیں رہوں گی۔ یہ مجھے بھگا کر لایا تھا۔ میرا گھر، بچے سب پیچھے چھوڑ آئی صرف تیمور کے لیے۔'' الفاظ پر شاید کوئی یقین نہ کرتا مگر اس کے لہجے کی سچائی نے سب کو چونکا دیا۔

''جھوٹ بول رہی ہے یہ۔'' وہ چیخا۔

''ہاں ہاں سب جھوٹ ہے۔ مجھے استعمال کرنا۔ میرے شوہر کے ڈر سے مجھے بھگا لانا۔ پھر یہاں نوکرانی بنا دینا۔'' انوشہ کے آنسوؤں میں تیزی آ گئی۔ تیمور نے آگے بڑھ کر اس پر ہاتھ اٹھانا چاہا مگر درمیان میں کوئی آ گیا تھا۔ وہ تیمور کی ماں تھی۔ اس کا تھپڑ تیمور کا گال سرخ کر گیا۔

''اسے واپس چھوڑ آؤ اور تب تک گھر نہ آنا جب تک یہ بچوں کے پاس نہ چلی جائے۔''

تیمور نے چپ چاپ اسے ساتھ لیا اور باہر چلا آیا۔ گاڑی نکال کر وہ اسے ایک دوست کے فلیٹ پر لے آیا۔

وہ رات انوشہ پر پچھلے کئی ماہ سے زیادہ بھاری تھی۔ تیمور نے شراب پی کر اس سے اپنی بے عزتی کا انتقام لیا۔ وہ ساری رات اس کا تشدد سہتی رہی۔ صبح ہوتے ہی وہ اسے واپس اسی علاقے میں چھوڑ آیا جہاں سے لایا تھا۔

☆.....☆

ٹھوکنے کے بعد اکبر چلا گیا۔ وہ حیرت سے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ بارش میں تیزی آ گئی۔ وہ اٹھی اور بھاگتی چلی گئی۔ نجانے کتنا وقت گزر گیا، وہ بس بھاگے جا رہی تھی پھر وہ ایک جگہ رک گئی۔ اس جگہ بادل تھے۔ بارش تھم چکی تھی۔ ہوا کے جھونکے اس کے بال اڑا رہے تھے۔ وہ ایک پل پر کھڑی تھی۔ نیچے دریا بہہ رہا تھا..... اور کچھ دیر بعد وہ ہوا میں اڑتی ہوئی نیچے کا سفر طے کر رہی تھی۔ قصہ ختم ہو رہا تھا۔ ہوا تیز تھی۔

دفتر سے نکلتے ہی وہ مجھے نظر آ گئی۔ حسبِ معمول وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر فٹ پاتھ پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ وہ عورت ہوتے ہوئے کیسے اس شان بے نیازی سے خاک پر دھرنا دیے بیٹھی رہتی ہے۔ اس کے انداز سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ فٹ پاتھ اس کا سنگھاسن ہے اور شاہراہ اس کی مملکت۔

جون کے مہینے کی ڈھلتی ہوئی شام تھی۔ ہوا اب بھی گرم تھی اور اس کی تپش سانسوں میں محسوس ہو رہی تھی مگر وہ

جھولی

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم!

پردیس میں ایک ماہنامہ "سرگزشت" ہی ہے جو مجھے وطن کی خوشبو پہنچاتا ہے۔ اس کی آپ بیتیاں، جگ بیتیاں پڑھ پڑھ کر خیال آیا کہ میرے پاس بھی بہت سی کہانیاں ہیں اگر اسے قلم بند کر دوں تو قاری سے لکھاری کی کیٹیگری میں آجاؤں گی۔ بس قلم سنبھال لیا اور ایک "جھولی" کی سرگزشت بطور کہانی تیار کر دی۔ اُمید ہے قارئین میری حوصلہ افزائی ضرور کریں گے۔

مونا شہزاد

(کیلزگی، کینیڈا)

اس تپش سے قطعی بے پروا نظر آرہی تھی۔ میں نے مشاہدہ کیا کہ اس کی انگلیاں خوبصورت ہوں گی مگر ابھی ان پر میل کچیل کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ وہ مسلسل انگلیوں کو ایک خاص طرز پر حرکت میں رکھتی تھی جیسے وہ ٹریفک پولیس کی نقل کررہی ہو۔ ساتھ ساتھ زیرلب کچھ بڑبڑاتی بھی رہتی تھی۔ میں بہت دیر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اتفاق سے میں نے اسے جب بھی دیکھا اس کی آنکھیں بند دیکھیں، ایسا لگتا تھا جیسے وہ کوئی ذکر کررہی ہو۔ اس کی آنکھوں کے درشن کرنے کی مجھے بہت آرزو تھی، ایک روز جیسے میری مراد بر آئی اور میں اس کی چمک دار آنکھیں دیکھنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجب اسرار سا تھا۔ کوئی گم گشتہ طلسم نگری تھی جس میں کوئی بھی مسافر راستہ بھٹک سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر میں نے سوچا تھا۔

''ایک فٹ پاتھ پر رہنے والی کی آنکھیں کیسے اتنی اجلی ہوسکتی ہیں؟''

اس سوال کا جواب میں چاہ کر بھی ڈھونڈ نہیں پایا تھا۔ مجھے اس کی آنکھیں باوضو سی لگتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ آنکھیں کسی بھی روح کو بھی پاک کروانے کا وصف رکھتی ہیں۔

وہ شاید تیس سال کے لگ بھگ تھی، دھول مٹی میں اٹ کر بھی وہ حسین لگتی تھی۔ اگر اسے نہلا دھلا کر صاف کپڑے پہنا دیے جاتے تو وہ سوسائٹی کی بہت سی حسیناؤں کو مات دے دیتی۔

آج پتا نہیں مجھ میں کیسے اتنی ہمت آگئی کہ میں نے بے اختیار اس کے قریب گاڑی روکی اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔ نہ جانے کیسے اسے ادراک ہوگیا اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔ میں اس کی آنکھوں کی طلسم نگری میں گم ہونے والا ہی تھا کہ وہ کوئی سوال کیے بغیر خاموشی سے فرنٹ سیٹ پر آکر براجمان ہوگئی۔ میرے دل میں چبھن سے کچھ ٹوٹ سا گیا، مجھے یقین ہوگیا تھا کہ وہ جسم بیچ کر اپنی روٹی کماتی ہے اسی لیے بلا جھجک میری کار میں آبیٹھی ہے۔ شاید اسی لیے وہ فٹ پاتھ پر بیٹھی تھی گویا وہ اک ویشیا تھی، جسم کی سوداگر۔ میں جسے پُراسرار سمجھتا تھا اس کا اسرار یک دم ختم ہوگیا تھا۔ مجھے بہت طیش آیا دل کیا کہ میں اس کو جھنجوڑ ڈالوں اس سے پوچھوں کہ تو نے یہ راستہ کا انتخاب کیوں کیا؟

میں نے اسے کن انکھیوں سے دیکھا مگر اس کا تغافل عارفانہ ابھی بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں ادنیٰ سا اس کی ریاست کا کوئی کارندہ تھا جو اس کی خدمت پر مامور تھا۔ مجھے وہ کسی ریاست کی مغرور ملکہ لگی جس کو اس سے قطعی کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کی سواری کی باگ کس کے ہاتھ میں ہے۔

میں نے گاڑی کا رخ ساحل سمندر کی طرف کردیا۔ ساحل سمندر پر گاڑی روکی۔ سامنے ہی فوڈ اسٹریٹ آباد تھی۔ کئی منچلے اور منچلیاں شوخیاں کرتے، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اٹکھیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ ایک طرف بہت بڑا فیرس وہیل چل رہا تھا، اس میں بیٹھے لوگوں کی خوشی اور خوف سے ملی جلی چیخوں سے فضا گونج رہی تھی۔

ڈوبتے سورج کا منظر ساحل سمندر پر ہمیشہ ہی حسین ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسا کہ پگھلا ہوا تانبا لہروں میں گھل سا گیا ہو۔ ہوا میں تازگی اور تراوٹ آچکی تھی۔ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو وہ ایک عجب شان بے نیازی سے گاڑی سے اتر آئی۔ اس کا رخ فوڈ اسٹریٹ کی جانب نہیں تھا۔ میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر بے اختیار اس کے برابر پہنچ گیا۔ وہ سمندر کے کنارے چلتی ہوئی ایک جگہ ٹھہر گئی۔ یہ جگہ ہجوم سے دور تھی۔ سورج سمندر کی گود میں چھپ رہا تھا۔ وہ ساحل پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا اس کی چمکدار آنکھیں ڈوبتے سورج کی سمت جمی ہوئی تھیں۔ وہ ہولے سے بولی۔

''میں ویشیا ہوں، یہی سوچ رہے ہوگے تم..... تم مردوں کا قصور نہیں ہے۔ شاید ہم جیسی عورتوں کا قصور ہے جو تم لوگوں کو اخلاقیات وانسانیت ورثے میں نہیں دے پاتیں۔''

مجھے یہ سن کر بہت برا لگا۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا۔

''بھونک رہی ہے۔''

مگر جب میں نے اس ویشیا کی جانب دیکھا تو وہ بالکل پُرسکون تھی۔ اس کی چمکتی آنکھیں مجھے میری روح کو ٹٹولتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس کے لبوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ تھی۔ وہ نرمی سے بولی۔ ''میں تمہیں مختلف لگی تھی۔ مگر تم بھی ان کروڑوں مردوں میں سے نکلے جو سرراہ گالیاں بک کر درحقیقت اپنی ماں بہن کی عزت نیلام کررہے ہوتے ہیں۔ تمہارا خیال ہے کہ گالی دینے والا..... درحقیقت گالی کھانے والے کو کوئی نقصان پہنچا رہا

تا ہے؟"

میں بے اختیار ہی شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ مجھے لگا
ں نے مجھے گالیوں کی حقیقت کا آئینہ دکھا دیا تھا۔ جو گالیاں
ں مخالفین کو دیتے وقت اپنی بیمار انا کی تسکین کرتا تھا وہ
حقیقت میری ذات سے جڑے رشتوں کے تقدس کو بھی
مال کرتی تھیں۔ میں حیران تھا کہ اس معاشرے میں ایک
ورت کے بطن سے جنم لے کر، ایک عورت کی بانہوں میں
کھیل کر، ایک بہن کے سر پر چھاؤں بن کر، ایک عورت کے
پلو میں سو کر میں کب اتنا جنونی ہو گیا تھا کہ ماں بہنوں سے
وسوم گالیاں بکتے وقت خود کو دودھ کا دھلا سمجھتا تھا۔

وہ مشفقانہ انداز میں مسکرائی اور بولی۔ "کوئی بات
یں بادرے! ہم سب شیشے کے بنے ہوئے گھروں میں
تے ہیں مگر دوسروں کے شیشہ محل کو پتھر مار کر چور چور
کرنے سے باز نہیں آتے۔"

اب میرا غصہ غائب ہو چکا تھا اور میرا تجسس جاگ
گا تھا، وہ ایک عام سی دیہاتی یا فقیرنی ہرگز نہیں تھی۔ میں نے
بے لہجے میں جھجکتے ہوئے کہا۔ "آپ کون ہیں؟"

وہ مسکرائی اور بولی۔ "میں! میں جھوٹی ہوں۔"

میں ناسمجھی سے اسے تکتا رہا اور پھر بے یقینی سے بولا۔
"سچ سچ بتاؤ..... تم کون ہو؟ جھوٹی کیا نام ہوا بھلا؟"

وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی اور بولی۔ "بادرے! میری
استان سننا چاہتا ہے کہ میں جھوٹی کیسے بنی؟"

میں نے تعویم زدہ معمول کی طرح سر ہلایا۔ وہ سر جھکا
کر بولی۔ "میں نے جب ہوش سنبھالا تو ماں کی نصیحتوں کو
لے سے باندھ لیا۔ ماں ہمیشہ کہتی کہ سچ بولو۔ جھوٹے کا منہ
کالا۔ اللہ تعالیٰ سچ کو پسند کرتا ہے۔ جھوٹ برکت کو کھا جاتا ہے۔
میں اس کی ہر بات پر یقین کرتی تھی کہ وہ میری اماں جو تھی۔ ہم
تین بہنیں تھیں اور ایک بھائی مگر پھر مجھے پتا چلا کہ اماں تو خود
جھوٹ بولتی ہے۔ ہم بہنوں کے لیے قائم کردہ اخلاقی معیار
مختلف تھے جب کہ ہمارے بھائی کے لیے کوئی اخلاقی معیار
موجود ہی نہیں تھا۔ وہ مرد تھا جسے ہر بات کی کھلی اجازت تھی۔
میرا بھائی جب چاہتا کسی کو گالی دیتا، جتنی دیر چاہے باہر رہتا،
جب دل کرتا گھر آتا جب کہ میری تعلیم حاصل کرنا بھی شکوک
و شبہات کی نظر سے دیکھا جاتا۔ میرا سچ بھی جھوٹ تھا اور
میرے بھائی کا جھوٹ بھی سچ تھا۔ میرا وجود سچ اور جھوٹ
کے بیچ معلق ہی تھا کہ اسی کشمکش میں میرا رشتہ آیا اور تعلیم چھڑوا
کر میری شادی کر دی گئی۔ اب میرے سامنے پھر سچ اور

ڈاکٹر انصاری اور علامہ اقبال

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی بڑی خواہش تھی کہ غازی رؤف بے جو جنگ طرابلس و بلقان کے مشہور و معروف مجاہد تھے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تشریف لائیں اور توسیعی خطبہ دیں۔ چنانچہ غازی رؤف بے نے مارچ 1933ء میں دہلی آنے کی اطلاع دے دی۔ طے یہ ہوا کہ وہ جامعہ میں چھ لیکچر دیں گے۔ جن میں کم سے کم دو کی صدارت علامہ اقبال کریں گے۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس سلسلے میں ایک خط لکھا۔ چونکہ ڈاکٹر انصاری سے بھی علامہ کے بہت اچھے تعلقات تھے اس لیے انہوں نے بھی علامہ کو دہلی آنے کی دعوت دی۔

جلسہ کی صدارت کے لیے علامہ اقبال کی رضامندی آنے پر ڈاکٹر ذاکر حسین بہت خوش ہوئے۔ طے یہ ہوا کہ علامہ سے 18 مارچ کے لیے درخواست کی گئی جسے منظور کر لیا گیا جس کا شکریہ ڈاکٹر انصاری نے خط لکھ کر ادا کیا اور نذیر نیازی کو حکم دیا کہ لاہور جا کر علامہ کو اپنے ساتھ لائیں۔ نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں۔ "15 مارچ کی شام کو حکم ہوا اور ڈاکٹر صاحب نے بھی اصرار کیا۔ لہٰذا 17 کی صبح میں لاہور پہنچا۔ علامہ ایک طرح سے منتظر تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو اول ڈاکٹر انصاری اور غازی رؤف پاشا کی خیریت دریافت کی۔ پھر احباب جامعہ بالخصوص ڈاکٹر صاحب، عابد صاحب اور حبیب صاحب کا پوچھا۔

18 مارچ کی صبح دہلی پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن پر احباب جامعہ کے علاوہ کئی اور نیاز مندوں کا ہجوم تھا۔ اسٹیشن سے سیدھے ڈاکٹر انصاری کے دولت کدہ تشریف لے گئے جہاں علامہ کا قیام تھا۔ خواجہ حسن نظامی اپنے روزنامہ میں لکھتے ہیں۔ "18 مارچ بارہ بجے نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ملنے گیا جو ڈاکٹر انصاری صاحب کے مکان پر مقیم تھے۔ نواب بہادر یار جنگ ان کے مداح اور معتقد ہیں۔ علامہ اقبال شام کے وقت ڈاکٹر ذاکر حسین، غازی رؤف پاشا اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے ہمراہ جامعہ تشریف لائے جہاں محمد علی جوہر ہال میں جلسہ ہوا۔ ڈاکٹر انصاری نے جلسہ کی کارروائی شروع کرتے ہوئے علامہ اقبال کا شکریہ ادا کیا اور ان سے صدارت کی درخواست کی۔ علامہ صاحب نے چند کلمات میں ڈاکٹر انصاری کا اور غازی رؤف پاشا کا شکریہ ادا کیا اور ڈاکٹر صاحب کو مبارک باد دی کہ ان کی کوششوں سے عالم اسلام کے ایک فرزند جلیل نے اپنے ورود سے ارض ہند کو سرفراز فرمایا۔ پھر غازی موصوف سے درخواست کی کہ حاضرین جلسہ سے خطاب فرمائیں۔ چنانچہ غازی رؤف پاشا نے اپنا مقالہ پڑھا۔ جلسہ بہت کامیاب رہا۔ علامہ نے اپنا صدارتی خطبہ ارشاد فرمایا اور حاضرین کے اصرار پر اپنا کلام پڑھا۔ دو چار روز ڈاکٹر انصاری کے یہاں خوب چہل پہل رہی۔ دن بھر صحبتوں کا سلسلہ چلتا رہتا۔ اس میں غازی موصوف علامہ اقبال اور ڈاکٹر انصاری اور حاضرین مجلس بھی خوب خوب حصہ لیتے اور علامہ کے ارشادات سے مستفید ہوتے رہے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور علامہ اقبال از عبدالقوی دسنوی
مرسلہ: انور اعجاز خان۔ پشاور

جھوٹ کی جنگ چھڑ گئی تھی۔ میں دوبارہ سے ڈھیر سارے جھوٹوں میں گھر چکی تھی۔ میرا سچ بھی میرے لیے جھوٹ بن کر رہ گیا تھا اور ایک روز میں طلاق کا کاغذ لیے واپس بابل کے انگنا چلی آئی۔ میرے بابل کے انگنا میں بھی تبدیلی کی ہوا چل چکی تھی۔ میری بہنیں اور بھائی اب شادی شدہ تھے اور سب بیرون ملک مقیم تھے، اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف۔ اماں ابا تو اب ایک بیکار پرزہ تھے جس کی کسی بہن بھائی کو ضرورت نہیں تھی۔ میں بھی اب ایک استعمال شدہ، سیکنڈ ہینڈ چیز تھی جس کی خواہش اب کسی کو نہیں تھی۔ اماں ابا والدین تھے انھوں نے میرے رشتے کی بہت کوششیں کیں مگر کوئی کوشش بار آور ثابت نہیں ہوئی۔ میرے سچ گلے کا طوق بن گئے تھے۔

ہر جگہ پر جھوٹ کی حکمرانی تھی میرا سچ برہنہ چوراہے پر پڑا بین کر رہا تھا۔ میرے لبوں پر قفل لگ گئے تھے۔ سچ کا جنازہ نکل چکا تھا۔ میں باولی سی ہوگئی تھی۔

ایک روز ابا گھر سے گئے تو ان کی لاش ہی گھر آئی۔ کسی ڈرائیور کی تیز رفتاری انھیں کھا گئی تھی۔ اس کے بعد جیسے وقت تھم سا گیا تھا۔ بہنوں اور بھائی کے رسمی سے تعزیت کے فون آئے اور پھر سب ابا کو بھول گئے۔ میرے ابا، چار بچوں کے والد، ایک بھولی بسری داستان بن گئے۔

میں اکثر ابا کی لگائی ہوئی رات کی رانی کے پودے کے پاس بیٹھ کر سوچتی۔ "اس دنیا میں میرے قبیل کے لوگوں کی اب کیا ضرورت ہے؟ یہاں ہر شخص کا ایک اپنا ذاتی سچ ہے جسے وہ سائن بورڈ کی طرح پیشانی پر چسپاں کیے گھوم رہا ہے۔ جہاں اس کا سچ کسی دوسرے کے سچ سے متصادم ہوا، وہیں سے غارت گری کی ابتدا ہوئی۔ مغلظات، الزامات، گالیوں کا وہ گھمسان کا رن پڑا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دے گی۔ سب کے چہرے اور سفید لباس غلاظت میں اٹ جائیں گے۔"

میں یہ سوچ کر کھلکھلا کر بے تحاشا ہنس پڑتی۔ اماں مجھے ڈھونڈتی ہوئی باہر آجاتیں، اور ہول کر مجھے پکڑ کر کہتیں۔ "نامراد رات کے وقت کھلے سر رات کی رانی کی جھاڑی کے پاس بیٹھا کر۔ تجھ پر سایہ ہوجائے گا۔"

میں ہنستی جاتی اور کہتی جاتی۔

"اماں! میں سچ میں چاہتی ہوں کہ مجھ پر سایہ ہوجائے تاکہ میں سچ اور جھوٹ میں تمیز نہ کر پاؤں۔ اماں اتنے سارے جھوٹوں کے بیچ میرا دم گھٹتا ہے۔ یقین کرو اس دنیا میں، مجھ ایک جھوٹی کا وجود غنیمت ہے۔ مجھے لباس میں سیاہ رنگ ہی بھاتا ہے۔ اماں! دیکھو تو سچ کا جنازہ بے کفن پڑا ہے۔ میری چادر سے اسے اب ڈھک دو۔"

اماں پھر ماں تھیں مجھے تڑپ کر گلے لگا لیتیں اور رو رو کر کہتیں۔ "میری بچی! تو جھوٹی نہیں بس تو روتا ہے۔"

پھر اماں کو نہ جانے کیسے سب کے سچ کی خبر ہوگئی۔ انھوں نے ہر رشتے کا سچا روپ دیکھ لیا اور وہ بستر پر پڑ گئیں۔ بھائی آیا مگر صرف جائیداد کے کاغذات پر دستخط کروانے۔ اماں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے میری جانب دیکھا اور دستخط کردیے۔ میرے لب مہر بلب تھے۔ میں قصے کہانیوں کو عملی زندگی میں سچ ثابت ہوتے ہوئے جاگتی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ کیا مشکل اور اذیت ناک صورت حال تھی اور میں خود اس کی عینی شاہد تھی۔ ایک ایسی ہی شام تھی جب اماں بہت ہی لاچار تھیں، انھوں نے بیٹے کو روکنا چاہا تھا مگر جب دیکھا کہ رکنے والا کسی طور آمادہ نہیں تو پھر انھوں نے مٹھی کھول دی تھی۔ وہ جیتے جی مرنے دم تک بھی گردان کرتی رہی۔ "مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں ہر دفعہ یہ سفید جھوٹ سنتی رہی، ان کی شکستہ آواز کے لوٹے سنتی، ان کی آنکھوں کی بجھتی ہوئی لو دیکھتی اور دل کڑا کر کے جھوٹ بولتی۔ "ہاں! اب واقعی آپ کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں جانتی تھی کہ وہ دھڑلے سے جھوٹ بولتی تھیں مگر ان کی آنکھیں اور آواز کی کپکپاہٹ سچ بولتی تھی۔

میں نے بھی ان کی تصحیح نہیں کی کیونکہ مجھے ان کے جھوٹ کا بھرم اپنی جان سے بھی پیارا تھا۔ میں چپ ہو کر بھی ان سے ہر بار جھوٹ بولتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ لحد میں اتر گئیں اور میں جھوٹ کے بوجھ تلے ہمیشہ کے لیے دب گئی۔

اماں جب مریں تو ان کے چہرے پر سکون تھا کیونکہ انھیں بیٹے کا کاندھا نصیب نہیں ہوا تھا۔

بھائی اماں کے مرنے کے تیسرے دن آیا اور گھر بیچ کر چلا گیا۔ میں [illegible] پیچھے رہ گئی۔ مجھے بھابی نے اپنے پاس بلانے سے انکار کردیا تھا۔ میں رسوائے زمانہ جھوٹی خاموشی سے فٹ پاتھ پر آکر بس گئی۔

یہ کہہ کر وہ سر جھٹکتی اٹھی اور جھوٹی! جھوٹی! کا کلمہ پڑھتی دور چلی گئی۔ میں شل سا ریت پر بیٹھا رہ گیا۔ آج میں نے برہنہ آنکھ سے اس جھوٹی کے آگے تمام سچوں کو سجدہ نشین جو دیکھ لیا تھا۔

++

سرپرائز

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
ایک عرصے کے بعد ایک اور سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ عورت اتنی بھی کمزور نہیں ہوتی کہ جو بھی چاہے اسے بے وقوف بنا دے۔ مرد ازل سے عورتوں کو بے وقوف سمجھتا ہے لیکن وہ بے وقوف نہیں ہوتی۔ سحر نے مرد کے بہکاوے میں آکر اپنا ہی گھر تباہ کرنے، شوہر کو موت دینے کی پلاننگ کر لی تھی کہ حالات نے یکایک پلٹا کھایا اور کہانی نے ایک نیا رخ لے لیا۔ یاد رہے کہ سحر کا نام تبدیل شدہ ہے۔
فہمی فردوس
(گوجرانوالہ)

میں کچن میں رات کا کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ جب وقار کی جھلک نظر آئی۔ وہ لاؤنج سے گذر کر بیڈروم کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ آفس سے آتے ہی اس کا نہا کر کپڑے بدلنا موسم گرما کے معمولات میں شامل تھا۔
میں اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے مسکرا دی اور تیزی سے ہاتھ چلانے لگی۔ میں ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کے برتن لگا رہی تھی۔
وہ کپڑے چینج کر کے کمرے سے باہر آیا۔ سفید کاٹن کے شلوار قمیص میں وہ بہت ہینڈسم اور فریش دکھائی دے رہا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر اندازِ دلربائی سے مسکرائی تو اس

نے بھی میری مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔

وقار کہنے کو تو میرا شوہر تھا مگر مجھے شوہر سے زیادہ وہ ایک محبوب کے روپ میں دکھائی دیتا۔ وہی ایک دنیا میں میرا واحد، سب سے نزدیکی رشتہ تھا، جسے میں دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔ میرا شمار دنیا کی ان چند عورتوں میں ہوتا تھا جو اپنے شوہروں سے جنون کی حد تک محبت کرتی ہیں۔

''کیا بنایا ہے آج کھانے میں؟'' اس نے آستینیں چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''قیمہ مٹر۔'' میں نے خوش دلی سے جواب دیا اور اس کے لیے سالن پلیٹ میں نکالنے لگی۔

دونوں نے خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا۔

''چائے بیڈروم میں لے آؤ۔'' وقار یہ کہہ کر کمرے میں چلا گیا اور میں نے چائے بنانے کے لیے کچن کا رخ کیا۔

چائے پینے کے دوران بھی ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے اور پھر جلد ہی سو گئے۔

اگلے دن روزمرہ روٹین کے مطابق وقار کو ناشتا کروایا۔ وہ آفس کے لیے نکل گیا اور میں گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئی۔ کچن کا کام نمٹانے کے بعد، باقی گھر کی صفائی کا ارادہ کیا۔ بیڈروم میں گئی اور چیزیں سمیٹنے لگی۔

بیڈ شیٹ بچھائی۔ کمبل تہہ کر کے رکھے تو اچانک صوفے پر پڑے ہوئے وقار کے کوٹ پر نظر پڑی۔

لائٹ گرے کلر کا کوٹ بے ترتیبی سے پڑا تھا۔ وقار اپنی چیزوں کے معاملے میں ایسا ہی بے پروا تھا۔ اس کی ہر چیز کا مجھے ہی خیال رکھنا پڑتا تھا بالکل کسی بچے کی طرح۔

''وقار سے میری شادی کو پانچ سال ہونے کو آ رہے تھے۔ ابھی تک بچوں جیسی نعمت سے محروم تھی۔ کئی بار میں اسے ہنس کر کہہ چکی تھی کہ تم اپنی چیزیں اسی لیے جگہ جگہ بکھرائے رکھتے ہو..... تاکہ مجھے بچوں کی کمی محسوس نہ ہو۔''

وہ بھی فٹ سے جواب دیتا۔ ''جب اللہ تعالیٰ بچے دے گا تو میں سدھر جاؤں گا اور تب اپنی چیزیں خود ہی سمیٹ لیا کروں گا۔''

میں نے صوفے پر پڑا ہوا وہ گرے کوٹ اٹھایا اور الماری کی طرف بڑھی تاکہ اسے ہینگر کر سکوں۔ کوٹ کو ہینگر کرتے ہوئے اچانک ایک سرخ دھبے پر نظر پڑی، میں ٹھٹک گئی۔

غور سے اس سرخ رنگ کے داغ کو دیکھنے لگی۔ یہ کوٹ کی پشت پر کندھے کے پاس تھا۔ غور کیا تو پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

یہ سرخ رنگ کا دھبا لپ اسٹک کا نشان تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی عورت نے اپنے لپ اسٹک سے لتھڑے ہوئے ہونٹ اس جگہ پر رکھے ہوں۔

میں شاکڈ رہ گئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کچھ دیر تک لپ اسٹک کے نشان کو غور سے دیکھتی رہی پھر کوٹ کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ دو تین لمبے لمبے سنہرے بال بھی چپکے ہوئے دکھائی دے گئے۔

''او مائی گاڈ! کون ہو سکتی ہے وہ عورت جو وقار کے اس قدر قریب آئی کہ.....'' اس سے آگے سوچنے کی ہمت نہ پڑی۔

میرا پورا وجود جیسے زلزلوں کی زد میں تھا اور دماغ بھی ایک فقرے کے علاوہ مزید کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو چکا تھا اور وہ فقرہ کسی وزنی ہتھوڑے کی مانند پندار کو پاش پاش کر رہا تھا۔

''وقار مجھ سے بے وفائی کر رہا ہے۔'' اس فقرے کی بازگشت نے مجھے لمحوں میں جیسے ادھ موا سا کر دیا۔ جسم کی ساری انرجی جیسے کسی نے کھینچ لی۔

میں نڈھال سی وہیں صوفے پر گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔

وہ کوٹ ابھی تک میرے ہاتھوں میں تھا۔

''یہ تم نے کیا کیا وقار؟ اپنی چاہتوں اور وفاؤں کے بدلے صرف ایک چیز ہی تو مانگی تھی اور تم وہ بھی نہ دے سکے۔ تمہاری خاطر ہر قربانی دی۔ خود کو بھول گئی۔ رل گئی تمہارے پیچھے...... مگر کبھی کوئی ڈیمانڈ نہ کی۔ کبھی کوئی صلہ نہ مانگا۔ شروع دن سے ایک ہی چیز کی طلبگار رہی۔''

مجھے اپنی شادی کی رات یاد آ گئی۔ ''وقار میں تمہاری ہر خامی کو برداشت کر لوں گی مگر کبھی زندگی میں مجھے دھوکا مت دینا۔ مجھ سے بیوفائی مت کرنا۔ تمہارے وجود اور محبت میں کبھی شراکت برداشت نہیں کروں گی۔ اور کبھی اگر تم نے کوئی ایسا قدم اٹھایا تو تمہاری جان لے لوں گی اور ساتھ میں اپنی بھی۔''

اپنی سہاگ رات کو اپنے کہے ہوئے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

☆......☆

رو رو کے جب ہلکان ہو گئی تو خود کو سمیٹا۔ آنسو

پونچھے۔ گیلا کپڑا لے کر لپ اسٹک کا نشان اچھی طرح صاف کیا اور چپکے ہوئے بال بھی کوٹ سے اتار دیئے۔

کوٹ کو ہینگر کر کے الماری میں لٹکایا منہ دھو کر تولیے سے خشک کیا اور پھر سے ساری صورتِ حال پر غور کرنے لگی۔

یہ تو طے تھا کہ مرد ایسی صورتِ حال میں بیوی کی تفتیش اور جرح کرنے پر چڑ جاتے ہیں اور ایسے جھگڑے نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتے۔

میرے سامنے میری ماں کی پوری زندگی نمونہ تھی۔

وہ ساری عمر میرے باپ کی بے وفائی پر کڑھتی رہی، سلگتی رہی، جھگڑتی رہی مگر نتیجہ کیا نکلا؟

باپ نے چھپ کر دوسری شادی کر لی اور میری ماں کے سامنے ڈھٹائی سے یہی کہتا رہا کہ میرا کسی سے کوئی چکر یا افیئر نہیں ہے۔

وہ دوسری عورت سے بچے پیدا کرتا رہا اور ماں کے ہر الزام کو جھٹلاتا رہا۔

میں نے اپنا بچپن اور جوانی سخت تناؤ بھرے ماحول میں گزاری۔

میں نے اپنے گھریلو ماحول میں سکون نام کی کوئی چیز کبھی نہیں دیکھی۔

بچپن میں ہی ماں باپ کو آپس میں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے پر الزام تراشیاں کرتے دیکھا تھا۔

ماں کو روتا بلکتا دیکھتی تو مجھے اپنے باپ سے نفرت محسوس ہونے لگتی اور ماں سے ہمدردی۔

جب تک بات صرف شک و شبہات تک رہی۔ میں یہی سمجھتی رہی کہ ہو سکتا ہے کہ یہ صرف امی کا وہم ہو کہ ابو باہر کسی دوسری عورت میں دلچسپی لیتے ہیں۔

مگر جب باوثوق ذرائع سے یہ پکی خبر ملی کہ ابو دوسری شادی کر چکے ہیں اور اس دوسری بیوی سے ان کے دو بچے بھی ہیں تو سب کچھ کھل کر سامنے آ گیا۔

مجھے آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔

"ابو شام کو گھر آئے تو ہمارے گھر میں ایک خونریز معرکہ ہوا۔ امی نے یہ بات پورے ثبوتوں کے ساتھ سامنے رکھی تو ابو انکار نہ کر سکے اور وہ مان گئے کہ انہوں نے واقعی دوسری شادی کر لی ہے اور اس بیوی سے دو بچے بھی ہیں مگر جواز یہ بتایا کہ تم سے میرا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ صرف ایک بیٹی تھی اور میں نے بیٹے کی خواہش میں دوسری شادی کی ہے اور ایسا کرنا میرا فطری اور شرعی حق ہے۔"

میں جو پاس بیٹھی سب کچھ سن رہی تھی۔ تب زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے باپ سے بے انتہا نفرت محسوس ہوئی جس نے میری ذات کو بے توقیر سمجھا تھا۔ کیا ہوا میں بیٹا نہیں..... بیٹی تھی مگر تھی تو ان کی اولاد۔

وہ بے اولاد تو نہیں تھے اور پھر میری ماں جیسی وفا شعار، جان چھڑکنے والی بیوی کے ہوتے ہوئے انہوں نے دوسری عورت کی ضرورت کیوں محسوس کی آخر؟

دوسری شادی کا راز آشکار ہونے کے بعد ابو کھلم کھلا دوسری بیوی کے پاس آنے جانے لگے۔ وہ ہمارے گھر کم کم آتے۔

ان کا زیادہ وقت اپنی دوسری فیملی کے ساتھ گزرنے لگا۔ اب انہیں کسی بات کا ڈر نہیں تھا۔

تھوڑا بہت خرچا دے کر ہماری ہر ذمے داری سے گویا سبکدوش ہو جاتے۔ اس رقم سے ہم دونوں ماں بیٹی کی ضروریات بمشکل پوری ہو پاتیں۔ امی نے یہ بات ایسی دل پر لگائی کہ شوگر ہو گئی۔

دن رات روتی رہتیں۔ میرے باپ کی بے وفائی نے میری ماں کو توڑ ڈالا تھا۔ پھر ان پر ہسٹریا کے دورے پڑنے لگے۔ وہ بلند آواز میں چلانے لگتیں۔ "دنیا کا ہر مرد بے وفا ہوتا ہے۔ کوئی مرد عورت سے مخلص اور وفادار نہیں ہو سکتا۔ مرد محبت کے جذبے سے ہی نا آشنا ہوتے ہیں۔ یہ عورت ہی ہوتی ہے جو ٹوٹ کر مرد سے پیار کرتی ہے اور اپنی زندگی مرد پر لٹا دیتی ہے۔" پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں۔

مجھے ماں کو اس حالت میں دیکھ کر بہت زیادہ تکلیف محسوس ہوتی۔ "کیوں کرتی ہیں امی آپ ایسے؟ ابو نے آپ سے بے وفائی کی۔ بھول کیوں نہیں جاتیں آپ اس بات کو؟ آپ میری خاطر جییں، مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ ابو کو آپ کی ضرورت نہیں ہے۔ ان پر آپ کے اس طرح رونے اور تڑپنے کا کچھ اثر نہیں ہونے والا۔ مت ضائع کریں خود کو اس طرح۔" میں ان کے ساتھ لپٹ کر رونے لگتی تو وہ مزید شدت سے رونے لگتیں۔

میرے لاکھ سمجھانے کے باوجود، وہ یہ بات دل سے نکال نہ سکیں اور شوگر کے مرض میں گھل گھل کر موت کے قریب تر ہوتی گئیں۔

میں نے بی ایس سی کرنے کے بعد جاب کر لی۔ میرے دفتر کا ماحول اچھا تھا۔ باس بہت مہربان اور شریف تھا۔ وہیں میری ملاقات وقار سے ہوئی۔ وہ بھی اسی آفس

میں جاب کرتا تھا۔

میں جو مردوں سے نفرت کرتی تھی۔ وقار کے نزدیک کیسے آتی گئی خبر ہی نہ ہو سکی۔ شاید اس کے حالات جان کر دل میں جگہ بنتی گئی۔ وہ بھی میری طرح حالات کا ٹھکرایا ہوا تھا۔

اس نے بتایا کہ اس کے ماں باپ بچپن میں ہی فوت ہو چکے تھے اور اس نے چچا چچی کے گھر میں پرورش پائی تھی۔

چھوٹی موٹی محنت مزدوریاں کر کے پڑھائی کا خرچا اٹھاتا رہا۔ پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تو جاب کرنے لگا۔ چچا چچی اشاروں کنایوں میں جتلانے لگے تھے کہ اب اپنا گھر بسا ؤ میاں اور ہماری جان چھوڑو۔

انہی دنوں ایک دن ابو ہم سے ملنے آئے، تو میں نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا "برائے مہربانی آپ یہاں نہ آیا کریں۔ آپ کا آنا میری ماں کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ آپ کے جانے کے بعد کئی کئی گھنٹے روتی رہتی ہیں۔ اب میں اتنا کماتی ہوں کہ اس میں ہم دونوں ماں بیٹی کی گزر بسر ہو جاتی ہے۔"

ابو میری بات سن کر بے یقینی اور رنجیدگی کی ملی جلی کیفیت سے میری طرف دیکھتے رہے۔

میں انہیں حیران پریشان چھوڑ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ وہ چند منٹ صحن میں بے حس و حرکت کھڑے رہے اور پھر باہر نکل گئے۔ وہ میرے باپ سے میری آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ اس کے بعد دوبارہ اس نے ہمارے گھر میں قدم نہ رکھا۔

وہ تو نہ آیا مگر چھ ماہ بعد اس کی موت کی خبر آ گئی۔

ہم دونوں ماں بیٹی گئیں۔ چہرہ دیکھا۔ تدفین کے بعد واپس گھر آ گئیں۔

ابو کی موت نے میری زندگی میں تو کوئی خاص تغیر پیدا نہ کیا مگر امی نے ان کی موت کو دل سے لگا لیا۔

وہ مجھ سے چوری چھپے ان کو یاد کر کر کے روتیں۔

ایسے وقت میں مجھے ان پر بے پناہ غصہ آتا۔ میں انہیں بری طرح جھڑک دیتی۔ "کیسی عورت ہیں آپ؟ جس مرد نے ساری عمر آپ کو دھوکا دیا۔ غیر عورتوں سے معاشقے لڑاتا رہا اور پھر آپ سے اجازت لیے بنا چوری چھپے دوسری شادی کر لی۔ آپ اس کو یاد کر کے روتی ہیں۔ کیوں..... آخر کیوں امی؟"

وہ روتے ہوئے جواب دیتیں۔ "یہ میرے بس میں نہیں۔ کسی کو چاہنا..... کسی سے محبت کرنا اپنے بس میں کہاں ہوتا ہے۔"

اس وقت تک وقار اور میں ذہنی طور پر ایک دوسرے کے کافی قریب آ چکے تھے۔

ہم اب کبھی کبھار باہر ملنے لگے۔ اکثر کسی ریسٹورنٹ میں چائے وغیرہ پینے لگے۔ کبھی کبھار کھانا بھی کھانے لگے۔

میں ابھی تک اسے صرف ایک اچھا دوست سمجھتی تھی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں سوچا تھا۔

مگر ایک دن جب امی نے میری شادی کی بات چھیڑی تو وقار کا تصور ذہن میں آ گیا۔

"اب میں بہت بیمار رہتی ہوں۔ میری زندگی کا کچھ بھروسا نہیں۔ تم شادی کر لو سحر۔" وہ لجاجت بھرے لہجے سے مجھے کہہ رہی تھیں۔

اور میں نے بڑے تلخ لہجے میں جواب دیا تھا۔ "امی میں شادی نہیں کروں گی۔ میں کسی مرد پر بھروسا نہیں کروں گی۔ دنیا کے سب مرد بے وفا ہوتے ہیں۔"

امی نے جواب دیا۔ "نہیں سحر! دنیا کا ہر مرد بے وفا نہیں ہوتا..... کچھ وفادار اور محبت کرنے والے بھی ہوتے ہیں۔"

"کس محبت کی بات کر رہی ہیں امی؟ آج کل کے دور میں کون کسی سے محبت کرتا ہے؟ میں نہیں مانتی ان فرسودہ باتوں کو، اور پلیز میرے سامنے یہ بے سروپا باتیں مت کیا کریں۔" میں نے جھنجلا کر جواب دیا۔

"اچھا مت مانو۔ نہ کرنا کسی سے محبت۔ مگر..... پلیز شادی کر لو۔ میرے دماغ سے بوجھ اتار دو۔ میں اپنی زندگی میں تمہارا گھر بسا دیکھنا چاہتی ہوں۔"

میں نے امی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور آفس چلی گئی۔ اس ساری صورتحال پر غور کرنے لگی۔

☆—☆

آفس میں بھی سارا دن امی کی کہی ہوئی باتیں ذہن میں چکراتی رہیں۔ اب میں بھی اپنی شادی کے متعلق سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔ امی کی زندگی میں تو مجھے کسی سے کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر جانتی تھی کہ ان کے آنکھیں بند کرتے ہی، معاشرے میں کھلے عام پھرنے والے بھیڑیے اور گدھ میرا جینا حرام کر دیں گے۔

میرے لیے اپنی لائف کو سیکیور کرنے کی خاطر شادی کرنا ایک ناگزیر عمل تھا۔

بطور جیون ساتھی نظر انتخاب وقار پر ٹھہری اور

کے علاوہ کسی پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا کیونکہ ہر ایک کی نظر میرے پانچ مرلے کے مکان پر جمی تھی جو اس وقت میری ملکیت تھا۔

ان دنوں میرے لیے کئی پروپوزل آئے مگر میں سب کو انکار کرتی چلی گئی۔

ان ٹھکرائے ہوئے اُمیدواروں میں ایک نام عاطف کا بھی تھا۔

وہ میرا تایازاد تھا۔ پڑھا لکھا اور برسرروزگار تھا مگر ان ماں بیٹے کی آنکھوں میں کبھی مجھے، مجھ سے زیادہ میرے مکان کی حرص اور طلب دکھائی دی اور ویسے بھی ساری زندگی اس تایا اور اس کی فیملی نے پلٹ کر کبھی ہماری خبر نہیں لی تھی۔ باپ کے مرتے ہی رشتہ ماتھنے چلے آئے۔

چند دنوں اپنی بات پر سوچ بچار کرتی رہی اور پھر وقار سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

ایک دن ریسٹورنٹ میں ہلکے پھلکے موسموں اور کولڈ ڈرنکس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جب میں نے بات چھیڑی۔ میں اس کا عندیہ لینا چاہتی تھی۔ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ اس کی پسند کوئی اور ہو یا پھر وہ بچپن میں کسی سے منسوب ہو۔

''وقار مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے اُمید ہے کہ تم میری باتوں کا غلط مطلب نہیں نکالو گے۔''

''جی جی ضرور..... اور آج تم اتنا ڈپلومیٹک رویہ کیوں اپنائے ہوئے ہو؟ مجھ سے بات کرنے کے لیے بھی بھلا تمہیں کسی اجازت کی ضرورت ہے؟'' وہ حیران نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''میری بات سننے سے پہلے مجھے میرے ایک سوال کا جواب دو۔''

''پوچھو۔'' وہ پُراشتیاق نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''تمہارا شادی کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''مطلب؟'' وہ غیر متوقع سوال سن کر حیران رہ گیا۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ تم نے اپنی شادی کے متعلق کیا پلاننگ کر رکھی ہے؟ یعنی تم کب تک شادی کرو گے؟''

میری بات سن کر وہ چند لمحوں تک سوچتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''میں ابھی اپنی شادی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا..... میں بے گھر اور بے سروسامان ہوں۔ میرے پاس سوائے اس نوکری کے اور کوئی چیز نہیں ہے اور شادی کرنے کے لیے بہت سی چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔''

''مثلاً؟'' میں نے پوچھا۔

''مثلاً..... سب سے پہلی بنیادی چیز تو اپنا گھر ہے۔ کوئی بھی باعزت اور شریف گھرانا مجھ جیسے کنگلے کے ساتھ، کسی کرائے کے گھر میں اپنی بیٹی کیوں رخصت کرے گا؟''

''اگر کوئی رشتہ ایسا مل جائے جو تمہیں اس بے سروسامانی کے ساتھ بھی قبول کرلے تو کیا تم راضی ہوجاؤ گے؟'' میرے ہونٹوں پر اب شرارت آمیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

وہ الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''کیا کہنا چاہتی ہو...؟ کھل کر کہو۔''

''مجھ سے شادی کرو گے عاطف؟'' میں نے کھل کر کہہ دیا۔

وہ بھونچکا رہ گیا۔ اسے شاید اس قدر کھلنے کی اُمید نہیں تھی مجھ سے۔

''کیا کہہ رہی ہو سحر؟'' اس کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔

''وہی جو تم نے سنا ہے۔'' میں پُرسکون لہجے میں بولی۔ ''امی کچھ عرصے سے میری شادی کے پیچھے پڑی ہیں۔ انہوں نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔ سوچا کہ جب شادی کرنا لازم ہی ٹھہرا تو پھر تم کیوں نہیں..... کوئی اور کیوں..... تم تو میرے بہت اچھے دوست بھی ہو اور پھر عام مردوں سے بہت ہٹ کر اور الگ ہو۔ تو پھر تمہارے سنگ ہی کیوں نہ قسمت آزمائی جائے۔ بتاؤ..... کرو گے مجھ سے شادی؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔ وہ چند لمحوں تک ہونق چہرہ لیے میری طرف دیکھتا رہا۔ اور پھر مسکرا اٹھا۔ ''تمہیں ایک مشورہ دوں؟ تم انتہائی بے وقوفانہ فیصلہ کرنے جا رہی ہو..... تمہارے پاس یقیناً مجھ سے بہتر آپشنز بھی موجود ہوں گے۔ تو پھر میرے جیسے کنگلے کے ساتھ کیوں شادی کرنا چاہتی ہو؟''

''تم سے بہتر آپشنز شاید موجود ہوں مگر مجھے وہ بہتر نہیں لگے۔ مجھے تم ان سب سے بہتر لگتے ہو۔ تم اپنے دل کی بات کرو۔ اگر منظور نہیں، تو انکار کرسکتے ہو۔ وعدہ کرتی ہوں..... ہماری دوستی پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' میں سنجیدگی سے بولی۔ تو وہ بھی سنجیدہ ہوگیا۔

''تم اگر مجھے اپنی زندگی کا ہمسفر بنانا چاہتی ہو تو یہ یقیناً میرے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہوگا۔ کوشش کروں گا

کہ تمہاری اُمیدوں پر پورا اتر سکوں۔"

"تو پھر آج شام کو تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ امی سے ملوانا چاہتی ہوں تمہیں۔"

"اوکے۔"

آفس سے چھٹی ہونے کے بعد، میں اس کو ساتھ لے کر امی کے پاس آئی۔

امی اس سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔

اور پھر سب کچھ آناً فاناً طے پا گیا۔ میں نے دھوم دھام سے شادی کرنے کی بجائے، سادگی سے نکاح کرنے کو ترجیح دی۔

صرف چند قریبی رشتے داروں اور عزیزوں کو تقریب نکاح میں مدعو کیا مگر چند ایک محلے داروں کے اور کوئی نہیں آیا۔

امی رشتہ داروں کی بے حسی پر ملول دکھائی دیں مگر مجھے کوئی پروا نہیں تھی۔ میں پہلے سے ہی ذہنی طور پر تیار تھی۔

گھر کے ایک کمرے کو، جو پہلے بھی میرے تصرف میں تھا۔ حجلہ عروسی بنا دیا گیا۔

وقار حجلہ عروسی میں داخل ہوا۔ میرے پاس بیٹھا۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں سحر! تم نے مجھے اپنی زندگی میں شامل کر کے، اس غریب اور نادار

اور امی تو جیسے میری شادی کے انتظار میں تھیں۔

میری شادی کو ابھی صرف چھ ماہ ہوئے تھے کہ وہ ملک عدم کو سدھار گئیں۔

میں نے شادی کے بعد وقار کے کہنے پر جاب چھوڑ دی۔ اب میں نے گھر سنبھالنے اور وقار کی خدمت کو ہی اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا۔

میں جو اپنی ماں کی شوہر سے دیوانوں کی طرح محبت کرنے پر ہنسا کرتی تھی، اس کا مذاق اڑایا کرتی تھی، اب خود بھی اسی محبت میں مبتلا ہو چکی تھی۔

انہی دنوں میرے کزن عاطف نے، وقار سے راہ و رسم بڑھا کر ہمارے گھر میں اپنی آمد و رفت بحال کرنے کی کوشش کی۔

مگر میرے سرد مہر رویے کو دیکھتے ہوئے ایک دو بار کی کوشش کے بعد، اس نے آنا جانا متروک کر دیا۔

آج سے دو سال پہلے وقار پر فرجن کا کیس چلا۔ اس پر باقاعدہ ایک سازش کے ذریعے بھاری رقم خرد برد کرنے کا الزام عائد کیا گیا۔ اور بعد میں اس الزام کو کرایے کے خریدے گئے گواہان کے ذریعے سچ بھی ثابت کر دیا گیا۔

وہ وقت میرے لیے بہت کٹھن تھا۔ وقار حوالات

خوامخواہ ہی عاطف سے بدگمان رہا کرتی تھی۔ وہ برا نوجوان نہیں ہے۔

زندگی پھر سے اپنی مخصوص ڈگر پر چلنے لگی۔ شادی کو چار سال ہو گئے تو میں فکرمند ہو گئی۔ ڈاکٹرز اور حکیموں کے چکر لگانے لگی۔ ماں بننے کی خواہش دل میں جڑ پکڑنے لگی۔

ہم دونوں میاں بیوی کی ہر رپورٹ کلیئر آئی۔ کہیں کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ سب کچھ نارمل تھا۔ بس خدا کی طرف سے دیر تھی۔

جب اتنی بھاگ دوڑ کے بعد بھی کوئی آثار پیدا نہ ہوئے تو ایک دن وقار کے سامنے ڈھے سی گئی۔

''وقار تمہیں بچے کی خواہش ہے تو تم دوسری شادی کر لو۔ میں تمہیں منع نہیں کروں گی۔''

''مجھے بچے کی خواہش ضرور ہے مگر بچے اگر اللہ نے دینے ہوئے تو تم سے ہی دے گا اور میں خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔ اللہ ہمیں اولاد جیسی نعمت سے ضرور نوازے گا۔ انشاء اللہ۔''

اس وقت مجھے وقار پر بے پناہ پیار آیا اور ساتھ ہی فخر محسوس ہوا کہ شکر ہے کہ میرا انتخاب غلط نہیں تھا۔

''انشاء اللہ۔'' میں نے صدق دل سے کہا۔ ''مگر یہ یاد رکھنا وقار..... جب کبھی بھی دوسری شادی کی خواہش دل میں پیدا ہو تو میرے اعتماد اور بھروسے کو توڑتے ہوئے، چوری چھپے یہ کام مت کرنا۔ مجھے بتانا..... اپنے ہاتھوں سے تمہاری دلہن کو بیاہ کر اس گھر میں لاؤں گی۔''

میری بات کو سن کر وہ ہنسنے لگا اور بولا۔ ''پگلی کہیں کی..... سحر تم بہت بیوقوف ہو۔''

اور آج اس کے کوٹ پر لگے لپ اسٹک کے نشان اور نسوانی بالوں نے اس کی بے وفائی ثابت کر دی۔

وہ جو مجھ پر جان چھڑکتا تھا۔ مجھے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا مگر آج اس کا کوٹ بتا رہا تھا کہ وہ کسی اور کو اپنی بانہوں میں بھر کے پیار کرتا ہے۔

افلف..... یہ تصور ہی میرے لیے جان لیوا تھا۔

میں نے اذیت سے اپنی آنکھیں موند لیں اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا لی۔

☆.....☆

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نازک صورت حال میں کس سے مشورہ مانگوں۔ کس کو اپنا دکھ سنا کر دل کو ہلکا کروں۔ سہیلی تو کوئی بنائی نہیں تھی۔ ایسے میں عاطف کا خیال ذہن میں آیا۔ اپنا سیل فون اٹھایا اور عاطف کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

اس نے دوسری بیل پر فون اٹھا لیا۔

''ہیلو عاطف۔ مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ ایک معاملے میں تمہارا مشورہ درکار ہے۔ کیا تم تھوڑی دیر کے لیے ہمارے گھر آ سکتے ہو؟''

میری بات سن کر دوسری طرف چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر اس کی آواز ابھری ''اوکے۔ آ جاتا ہوں آفس سے کوئی بہانہ کر کے۔''

''اوکے..... میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ مگر ایک بات کا خیال رہے کہ وقار کو اس بات کا پتا نہیں چلنا چاہیے کہ تم مجھ سے ملنے کے لیے آ رہے ہو۔''

''نہیں چلے گا پتا اسے۔ اس کا سیکشن الگ ہے۔''

میں نے فون بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اب مجھے عاطف کی آمد کا انتظار تھا۔

اور یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ میرے سامنے موجود تھا۔

میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود بھی اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔

وہ میری متورم آنکھوں اور روئے روئے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

''خیریت تو ہے نا سحر؟ مجھے اس طرح اچانک کیوں بلایا؟''

''خیریت ہی تو نہیں ہے عاطف۔ وقار مجھ سے بے وفائی کا مرتکب ہو رہا ہے اور کب سے ہو رہا ہے۔ یہ میں نہیں جانتی۔'' میں بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''اور تم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو؟ کیا صرف شک کی بنیاد پر.....؟'' اس نے پوچھا۔

''صرف شک کی بنیاد پر نہیں بلکہ کچھ ایسے شواہد آنکھوں کے سامنے آئے کہ جنہیں چاہنے کے باوجود جھٹلا نہیں سکتی۔''

''ایسا کیا دیکھ لیا؟'' اس کا لہجہ تجسس لیے ہوئے تھا۔

میں نے اسے کوٹ پر لگے نشان اور بالوں کے بارے میں بتایا۔

''ہمم.....'' میری بات سن کر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ''مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ حقیقت وہ نہ ہو جو تمہیں دکھائی دے رہی ہے۔''

"اسی لیے تو تمہیں بلوایا ہے۔ تم بتاؤ ایسی صورتِ حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ وقار سے دو ٹوک بات کروں۔"

"ایسی غلطی کبھی مت کرنا۔ جو مرد باہر غیر عورتوں سے افیئر چلاتے ہیں... وہ اپنی بیویوں کی باز پرس سے چڑنے لگتے ہیں اور ان راہوں پر مزید آگے نکل جاتے ہیں۔"

"مگر یہ سوچ کر میں خاموش ہو کر بیٹھی رہوں، یہ تو کوئی مسئلے کا حل نہیں۔" میں جھنجلا گئی۔

"تم ایسا کرو..... مجھے صرف ایک ہفتے کا وقت دو۔ میں اچھی طرح ساری چھان بین کر کے، رپورٹ تمہارے سامنے رکھوں گا۔ اس کے بعد جو بھی فیصلہ کرنا چاہو..... کر لینا۔"

اس کی بات میرے دل کو لگی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"او کے..... مگر یہ بات ذہن میں رکھنا کہ تمہاری اس رپورٹ پر میرے مستقبل اور زندگی کا دار و مدار ہوگا۔" میری آواز رندھ گئی۔

"اس بات کی فکر مت کرو سحر! تم سے کوئی غلط بیانی نہیں کروں گا۔"

وہ رخصت ہو گیا اور میں پھر سے کسی مردے کی طرح صوفے پر گر گئی۔

وہ سارا دن میں نے اسی طرح بے دلی سے لیٹے، بیٹھے اور گھر میں چکراتے ہوئے گزارا۔ کسی کام میں دل ہی نہیں لگا۔

رات کا کھانا بھی بے دلی سے پکایا۔

وقار شام کے چھ بجے تک گھر آ جاتا تھا اور میں شام کے چھ بجے تک سینکڑوں بار وال کلاک کی طرف دیکھتی تھی۔ اس کے انتظار میں وقت کاٹنا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔

وہ گھر آتے ہی، فریش ہونے کے بعد چائے کی فرمائش کرتا۔ ہم دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے اور اس کے بعد رات کو آٹھ بجے کھانا کھاتے۔

مگر آج چھ بج گئے اور میں نے ایک بار بھی کلاک کی طرف نہیں دیکھا۔ آج مجھے کسی کے آنے کا انتظار نہیں تھا بلکہ دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وقار کا سامنا کروں یا اس کی شکل دیکھوں۔

جب سات بج گئے تو مجھے فکر لاحق ہونے لگی کیونکہ وقار تو چھ بجے تک آ جاتا تھا۔ پھر آج اتنی تاخیر کیسے ہو گئی۔ کہیں عاطف نے اسے سب کچھ بتا تو نہیں دیا؟ نہیں وہ میری اجازت کے بنا کچھ نہیں بتا سکتا۔

گھڑی کی سوئیاں سرکتی سرکتی سات سے آٹھ بجانے لگیں تو میری فکر عروج پر پہنچ گئی۔

"آخر کہاں رہ گیا اتنی دیر کیوں لگا دی؟"

میں وقار کا نمبر ملانے لگی۔ ابھی کال ادھر کے نہیں کی تھی کہ وہ گھر میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔

اس کا چہرہ مرجھایا سا لگ رہا تھا اور کندھے بھی جھکے جھکے سے تھے۔ وہ مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا میرے پاس سے گزر کر بیڈ روم میں چلا گیا۔

میں حیران بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ وہ نہا کر کپڑے چینج کر کے باہر آیا تو میں حسبِ معمول ٹیبل پر کھانا لگا چکی تھی۔

"کیسی ہو؟" اس نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ تو وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

میں اس کے لیے سالن نکال رہی تھی۔

"کیا ہوا تمہیں؟" اس نے پوچھا۔ اس کے لہجے سے میرے لیے فکرمندی جھلک رہی تھی۔

"کچھ نہیں..... کیوں؟" میں نے نوالہ توڑ کے منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارا چہرہ اترا ہوا کیوں ہے؟ تم ٹھیک تو ہو نا؟" اس نے بے تابی سے پوچھا تو میں دل میں خوب ہنسی۔

"مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم آج دو گھنٹے لیٹ کیوں آئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بس آفس کی ٹائمنگ بدل گئی۔ انہوں نے چھٹی کا ٹائم پانچ سے بدل کر سات بجے کا کر دیا۔" اس کی وضاحت مجھے مطمئن نہ کر سکی۔

"مگر کیوں؟ انہوں نے ٹائمنگ چینج کیوں کر دی؟"

"اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ کمپنی کی مرضی ہے اگر انہوں نے دو گھنٹے وقت بڑھایا ہے تو ورکرز کی تنخواہیں تو پانچ پرسنٹ بڑھا دی ہیں اور کمپنی کے اس فیصلے کو سب ورکرز نے بخوشی تسلیم کر لیا ہے تو میں اکیلا احتجاج کیسے کر سکتا ہوں۔"

یہ مرد کتنے بڑے ایکٹر ہوتے ہیں۔ عورت کی آنکھوں میں دھول جھونکنا کتنا آسان کام ہے ان کے لیے۔

میں خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آواز نے اس سکوت کو توڑا۔ "اب سے میں روزانہ

رات کو آٹھ بجے ہی گھر لوٹا کروں گا۔ تم کھانے پر میرا انتظار مت کیا کرنا۔ اکیلی کھا لیا کرنا۔ میں جب آؤں گا تب کھا لیا کروں گا۔"

اس کی بات سن کر میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس نے کتنی سہولت سے یہ بات کہہ دی تھی جبکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ شادی کے بعد میں نے کبھی اکیلے کھانا نہیں کھایا تھا۔ ہمیشہ اس کے ساتھ بیٹھ کر کھایا تھا اور اب... وہ مجھے اکیلی کھانے کا مشورہ دے رہا تھا۔

میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اٹھ کر برتن سمیٹنے لگی۔

☆.....☆

اگلے دن جب وقار آفس روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد چند ضروری کام نمٹائے اور گیارہ بجے کے قریب عاطف کو کال کی۔

ملیک سلیک کے بعد فوراً اپنے مدعے پر آ گئی۔

"عاطف تم سے ایک بات پوچھنا تھی۔"

"ہاں پوچھو!"

"کیا تمہارے دفتر والوں نے آفس کی ٹائمنگ چینج کر دی؟"

"نہیں تو..... کیوں؟ تم سے کس نے کہا؟"

"وقار کہہ رہا تھا کہ چھٹی کا وقت پانچ بجے کی بجائے سات بجے ہو گیا۔ آفس والوں نے دو گھنٹے ٹائم بڑھا دیا ہے۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آفس آف ہونے کا وقت اب بھی پانچ بجے ہی ہے۔"

"تو کیا کل بھی آفس پانچ بجے بند ہو گیا تھا؟"

"ہاں کل بھی اسی وقت بند ہو گیا تھا۔"

"مگر وقار تو گھر آٹھ بجے آیا تھا۔" میری آواز جیسے کسی اندھے کنویں سے برآمد ہوئی تھی۔

"اچھا..... مگر میرے ساتھ وہ پانچ بجے آفس سے نکلا تھا۔ ہم دونوں اکٹھے ایک ساتھ ہی نکلے تھے۔"

"اچھا..... ٹھیک ہے۔" اس کی باتیں سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔

ہماری شادی کو پانچ سال ہونے کو آ رہے تھے اور ان پانچ سالوں میں، میں نے کبھی وقار کو جھوٹ بولتے نہیں دیکھا تھا مگر کل وہ کس قدر ڈھٹائی سے اتنے بڑے بڑے جھوٹ بولتا رہا۔

جب آفس کا وقت پانچ بجے کا ہے۔ آدھا گھنٹا راستے میں لگتا ہے۔ یعنی وہ ساڑھے پانچ یا پونے چھ بجے تک گھر آ جاتا تھا جبکہ کل رات کو وہ آٹھ بجے گھر آیا تھا تو پھر اس نے یہ اڑھائی گھنٹے کس کے ساتھ گزارے؟ کیا کسی گرل فرینڈ کے ساتھ؟ مگر کیوں؟ مجھ میں ایسی کون سی کمی ہے۔ جو وقار کسی اور عورت کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوا۔

"میں خوب صورت ہوں، وفا شعار ہوں، محبت کرنے والی ہوں، شوہر کی اطاعت کرنے والی ہوں۔ تو پھر..... کیوں؟"

یہ "کیوں" میرے دماغ پر ہتھوڑا بن کر برسنے لگا۔ میں دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھ گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے۔

کیا میرا انجام بھی میری ماں کی طرح ہو گا؟ کیا میں بھی اسی طرح شوہر کی توجہ پانے کے لیے سسکتی رہوں گی۔ تڑپتی رہوں گی؟

نہیں..... ہرگز نہیں۔ مجھ میں اور میری ماں میں بہت فرق ہے۔ میں اپنی ماں جیسی کمزور اور بزدل نہیں ہوں۔ میں اپنا حق لینا جانتی ہوں۔ میں کافی دیر تک روتی رہی۔ سوچتی رہی اور کئی منصوبے بناتا کر توڑتی رہی۔

پہلے سوچا کہ وقار سے اس موضوع پر کھل کر بات کرتی ہوں۔ مجھ سے اب مزید برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

مگر پھر دل کو سمجھایا کہ عاطف کی رپورٹ ملنے تک صبر سے کام لینا ہو گا۔ میں اس پر یکا ہاتھ ڈالنا چاہتی تھی۔ پورے ثبوتوں کے ساتھ اس سے دو ٹوک بات کرنا چاہتی تھی تاکہ اسے بھاگنے کا موقع نہ ملے۔

☆.....☆

وہ کل کی طرح آج بھی آٹھ بجے گھر میں داخل ہوا۔ اس کے لیٹ آنے کی وجہ سے شام کی چائے گول ہو جاتی تھی۔ وہ فریش ہو کر کھانے کی ٹیبل پر آیا۔ میں نے خاموشی سے اس کی پلیٹ میں سالن نکالا اور ہم دونوں خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ اس نے دو تین مرتبہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر میں نے ہوں ہاں سے زیادہ کسی بات کا جواب نہ دیا۔ وہ میری بے رخی اور سرد مہری کو بھانپ گیا۔

"کیا بات ہے سحر؟ تم کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو۔" وہ لہجے میں ڈھیروں فکریں سموئے پوچھ رہا تھا۔

"پریشان تو نہیں..... ہاں بس طبیعت کچھ ناساز ہے۔" میں نے بہانہ بنایا مگر میرے بہانے نے اسے مطمئن

نہ کیا۔ وہ بار بار کن انکھیوں سے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔

کھانے کے بعد میں نے برتن سمیٹے۔ کچن میں رکھے اور خود آ کر بیڈ پر دراز ہو گئی۔

اسے چائے کے لیے بھی نہ پوچھا۔ حالانکہ میں یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ رات کے کھانے کے بعد اور سونے سے پہلے چائے ضرور پیتا ہے۔

وہ کچن میں گیا۔ اس نے دو کپ چائے تیار کی اور چائے والے مگ ٹرے میں رکھے، اندر بیڈ روم میں آ گیا۔

''آج ہماری بیگم کی طبیعت ٹھیک نہیں اس لیے مابدولت نے خود ہی چائے بنالی۔ اب ہماری بیگم ہمارے ہاتھ کی چائے پئیں گی تو بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔'' وہ خوب چہک رہا تھا۔ حالانکہ اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے اثرات ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئے تھے۔

اس نے میرا مگ میری سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور خود اپنی سائیڈ پر جا کر بیٹھ گیا۔ ''ویسے طبیعت کو ہوا کیا ہے سحر؟ چائے پی لو پھر ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔''

''نہیں ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تھکاوٹ اور کسلمندی سی محسوس ہو رہی ہے۔ رات کو سو دوں گی تو صبح تک ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' میں نے بے زاری سے جواب دیا۔

اس نے اپنا ہاتھ میری پیشانی پر رکھ کے ٹمپریچر چیک کرنے کی کوشش کی تو میں نے اس کا ہاتھ ہلکے سے جھٹک دیا۔ مجھے اس کی قربت سے کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ میری بیزاری اور بے رخی کو طبیعت کی خرابی پر محمول کرتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔

''اچھا اٹھ کر اپنی چائے تو پی لو۔'' اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا تو میں اٹھ کر چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگی۔

☆.....☆

دس دن یونہی اذیت سے لڑتے لڑتے گزر گئے۔ وقار کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا جبکہ میری بے رخی اور بیزاری میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ میری بے زاری اور بے رخی کو خنداں پیشانی سے برداشت کر رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لیے میرا ناز یہ رویہ برداشت کر رہا تھا۔

دسویں دن عاطف، ڈرائنگ روم میں میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس میرے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ میں کوئی بھی بری خبر سننے کے لیے اپنے ذہن کو تیار کر چکی تھی۔

آخر کار اس نے وہ دھماکا خیز خبر سنانے کے لیے اپنے لب کھولے۔ ''وہی ہوا سحر..... جس کا ڈر تھا تمہارے اندیشے بے بنیاد نہیں تھے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو عاطف؟'' میرا دل ڈوب گیا۔

''وقار کے کسی عورت کے ساتھ ناجائز مراسم ہیں۔''

یہ الفاظ تھے کہ پگھلا ہوا سیسہ، جس نے مجھے سر سے پاؤں تک جھلسا دیا۔

''کس بنیاد پر تم اتنی بڑی بات کر رہے ہو؟'' میں نے تند لہجے میں پوچھا۔

''دس دن پورے اسی بات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے، چھان بین کرتا رہا ہوں۔ ہوا میں تیر کیوں چلاؤں گا بھلا؟'' اس کے لہجے میں خفگی کی ہلکی سی آمیزش شامل ہو گئی۔

مجھے شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ میرے کہنے پر وہ بیچارہ اتنا تردد کر رہا تھا اور میں اسی پر بگڑ رہی تھی۔

''سوری عاطف! تم اپنی بات مکمل کرو..... میں اب خود پر قابو رکھوں گی۔'' میں آہستگی سے بولی، تو وہ بھی شرمسار سا نظر آنے لگا۔

''سوری کی کوئی بات نہیں سحر! تم آج کل جس عذاب سے گزر رہی ہو، اس کا اندازہ بخوبی لگا سکتا ہوں۔''

''کون ہے وہ عورت..... جس کے ساتھ وقار کے مراسم ہیں؟'' یہ بات کرتے ہوئے مجھے دانتوں پسینا آ گیا۔

ڈیفنس میں رہتی ہے۔ امیر ترین بیوہ ہے۔ دو بچوں کی ماں ہے... اور انتہائی خوبصورت بھی۔ یہ ہر روز شام کو پانچ بجے دفتر سے نکلتے ہی سیدھا اس کے گھر کا رخ کرتا ہے۔ پندرہ بیس منٹ تو اس کے گھر پہنچنے میں لگ جاتے ہیں..... پھر ساڑھے سات بجے اس کے گھر سے نکلتا ہے... اور آٹھ بجے تک اپنے گھر پہنچ جاتا ہے۔ دس دن تک اس کا پیچھا کرتا رہا ہوں..... اس کے معمولات کا جائزہ لیتا رہا ہوں۔ تب تمہارے پاس آیا ہوں۔''

''مگر اس عورت کے ہاں جانے کی کوئی اور وجہ بھی تو ہو سکتی ہے نا۔'' میں نے کمزوری آواز میں ایک بودی سی تاویل پیش کرنے کی کوشش کی۔

''عجیب بات کرتی ہو... سحر..... ایک جوان اور

خوبصورت بیوہ کے ہاں کوئی غیر مرد کیوں جائے گا بھلا؟ اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی؟" وہ تاسف بھری نگاہوں سے میری دیکھنے لگا۔

"اوکے..... اگر تمہاری بات کو مان بھی لیا جائے تو اب مجھے بتاؤ، اس سارے مسئلے کا حل کیا ہے آخر؟ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟" میں شکست خوردہ لہجے میں اس شخص سے رائے طلب کر رہی تھی جسے ایک زمانے میں ٹھکرا چکی تھی۔

"اب میں کیا رائے دے سکتا ہوں تمہیں؟ یہ خالصتاً تمہارا اپنا ذاتی مسئلہ ہے اور یہ شخص بھی تمہارا اپنا انتخاب ہے۔ اب تم خود ہی سوچ سکتی ہو کہ تم اس بے وفا انسان کے ساتھ ایسے گھٹ گھٹ کر زندگی گزار سکتی ہو یا نہیں۔"

"اگر تم میری جگہ پر ہوتے تو کیا کرتے؟"

میرا سوال سن کر وہ گڑبڑا گیا اور پھر سنبھل کر بولا۔

"اگر میں تمہاری جگہ پر ہوتا تو اس آدمی سے فوراً طلاق کا مطالبہ کر دیتا۔"

"ہمم..... مگر میں طلاق کا مطالبہ نہیں کروں گی۔"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"تو پھر کیا کرو گی؟"

"اس کی اور اپنی دونوں کی جان لے لوں گی۔" میرے لہجے میں اتر آئی سفاکی نے اسے شاکڈ کر دیا۔ چند لمحوں تک تو وہ کچھ بول ہی نہ سکا پھر اس کے حلق سے سرسراتی آواز برآمد ہوئی:

"تم ہوش میں تو ہو سحر؟ کیا کہہ رہی ہو۔"

"وہی جو تم سن رہے ہو۔ اگر یہ ساری باتیں سچ ثابت ہو گئیں تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی.. اور اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی اس لیے اپنی جان تو لینی ہی پڑے گی۔"

"پاگلوں جیسی باتیں مت کرو۔ باقی رہی ثبوتوں کی بات تو میں تمہیں ایک دو دن میں سارے ثبوت لا کر دے دوں گا۔ جو تم اس آدمی کے منہ پر مارنا اور طلاق کا مطالبہ کرنا۔ یہ مرنے مارنے والی باتیں مت کرو۔ مت بھولو کہ یہ گھر تمہارا ہے۔ تم اسے کسی بھی وقت گریبان سے پکڑ کر باہر پھینک سکتی ہو۔"

"اگر وہ اس گھر میں نہ رہا تو یہ گھر میرے لیے جہنم سے کم نہیں۔" میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا۔ تو وہ پھر سے حیران نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"کتنی عجیب عورت ہو تم! غلطی وہ کر رہا ہے اور سزا تم خود کو دے رہی ہو۔ اگر وہ تمہاری زندگی سے نکل جائے گا تو کیا تمہیں اور کوئی ایسا چاہنے والا نہیں ملے گا جو تمہارا ہاتھ تھام سکے۔ تمہارے پاس آج بھی اس کے علاوہ بہترین آپشنز موجود ہیں۔"

میں اس کی باتوں کا مطلب بخوبی سمجھ رہی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ اس نے میرے انکار سے دلبرداشتہ ہو کر ابھی تک شادی نہیں کی۔

"نہیں عاطف..... وقار میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور مرد کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ اسی کے ساتھ جیوں گی اور اسی کے ساتھ مروں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" میں نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔ تو وہ پریشان سا دکھائی دینے لگا۔

"اچھا میں چلتا ہوں، مگر جانے سے پہلے ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ جو بھی فیصلہ کرنا سوچ سمجھ کر کرنا۔ جذبات سے کام لینے کی بجائے ہوش سے کام لو۔ زندگی اتنی ارزاں نہیں ہے کہ اسے کسی بھی بے وفا کی بے وفائی کی بھینٹ چڑھا دیا جائے۔"

وہ خدا حافظ کہہ کر، لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

میں پھر سے صوفے پر گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی اور آنکھوں سے جیسے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔

زندگی مجھ سے اتنا بھیانک مذاق بھی کر سکتی ہے۔ کبھی تصور میں بھی سوچا نہ تھا۔

☆.....☆

وقار بیڈ پر نیم دراز ہیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے کسی کتاب کے مطالعہ میں محو تھا۔

میں پاس بیٹھی سوچوں میں گم تھی۔ اس سے بات کرنے کے لیے، اپنی ہمت کو مجتمع کر رہی تھی۔

آخر ایک گہری سانس لے کر تنے ہوئے اعصاب کو ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔

"وقار کتاب بند کرو..... مجھے آج تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"جانتا ہوں۔" اس نے کتاب سے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا تو میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا جانتے ہو؟"

"یہی کہ ہماری بیگم کو ہم سے کچھ کہنا ہے..... کچھ

پوچھتا ہے۔" اس نے کتاب بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور میری طرف دیکھنے لگا۔

اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

"مگر تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں؟"

"کافی دنوں سے تمہارا جائزہ لے رہا ہوں۔ بہت الجھی الجھی اور پریشان دکھائی دیتی ہو۔ اسی سے اندازہ لگایا کہ تمہارے دماغ میں کچھ نہ کچھ چل رہا ہے۔ اور میں انتظار کر رہا تھا کہ کب تم مجھ سے سوال و جواب کرو گی۔" اس کا لہجہ ابھی تک پُرسکون تھا۔

"پھر تو تمہیں یہ اندازہ بھی ہو گیا ہو گا کہ میں کون سے سوال کرنا چاہ رہی ہوں تم سے؟"

"ہاں شاید..... مگر پھر بھی تمہارے منہ سے سننا زیادہ اچھا لگے گا۔" اس کا پُرسکون لہجہ اور نارمل سا رویہ مجھے الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔

"اوکے تو پھر میں ٹو دی پوائنٹ بات کرتی ہوں۔ تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا کہ کمپنی نے آفس کی ٹائمنگ بڑھا دی ہے؟"

"اس لیے کہ کہیں اور جا کر دو ڈھائی گھنٹے کام کرتا ہوں۔ تمہیں سچ بتا دیتا تو تم کبھی مجھے یہ دوسری نوکری نہ کرنے دیتی۔"

"مگر تمہیں دوسری جگہ پر کام کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ تمہاری تنخواہ اتنی ہے کہ ہم دونوں کا گزارا اچھا ہو رہا ہے۔"

"ضرورت تھی، تبھی کر رہا ہوں۔" اس کا لہجہ قدرے خشک ہو گیا۔

"اگر میں کہوں کہ وہ دوسری جاب چھوڑ دو تو چھوڑ دو گے؟"

"نہیں۔" اس نے دو ٹوک لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں؟" میں نے تلخ ہو کر پوچھا۔

"دو اڑھائی سال یہ جاب کرنا میرے لیے بہت ضروری ہے۔ اس کے بعد چھوڑ دوں گا۔" اس نے بے زاری سے جواب دیا۔ اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ ان دو گھنٹوں میں ایسا کون سا کام کرتے ہو؟ جو تم چھوڑ نہیں سکتے۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں بتا سکتا... اور میرے کان مت کھاؤ۔ خاموشی سے سو جاؤ۔" یہ کہہ کر اس نے کروٹ بدل لی۔ اب میری طرف اس کی پشت تھی۔

اس کا بیزار سا اور بے گانگی بھرا رویہ مجھے سب کچھ سمجھا رہا تھا۔

مرد کا یہ روپ اور رویہ میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھے۔ بیس سال اپنے باپ کو اسی روپ اور رویے کے ساتھ دیکھتی آئی تھی اور اپنی ماں کو اسی طرح گھلتے اور سلگتے دیکھا تھا۔ جس طرح آج میں سلگ رہی تھی۔

اور آج، جب خود اس جان لیوا کیفیت سے گزر رہی تھی تو برسوں پہلے، اس کیفیت سے گزرنے والی، اپنی ماں کی اذیت کا احساس ہو رہا تھا۔

چار پانچ دن مزید اسی حال میں گزر گئے۔ وقار کا رویہ اب میرے ساتھ بہت سرد سا ہو گیا تھا۔

میں ابھی ان الجھنوں سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور ان کو سلجھانے کے لیے کوئی سرا ہاتھ میں پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی کہ عاطف ایک مزید بڑی دھماکا خیز خبر کے ساتھ پھر سے حاضر ہوا۔

اور وہ خبر یہ تھی کہ وقار اس مالدار بیوہ کے ساتھ نکاح کر رہا ہے۔ نکاح کی پوری تیاری ہو چکی ہے..... آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد کی ڈیٹ بھی فکس ہو چکی ہے۔

یہ خبر سن کر میں غصے سے پاگل ہو گئی۔ سوچنے سمجھنے کی سب صلاحیتیں جیسے سلب ہو گئیں۔ غصے کی شدت سے میرا پورا وجود کانپنے لگا اور جب میں بولی، تو میری بات سن کر، عاطف بھی خوفزدہ ہو گیا۔

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"وہی جو ابھی ابھی تم نے سنا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ مجھے کہیں سے زہر لا کے دو۔ تم جو قیمت مانگو گے۔ میں دینے کے لیے تیار ہوں۔ بس مجھے زہر چاہیے۔" میرا لہجہ اس وقت مجھے بھی اجنبی لگ رہا تھا۔

"میرا ایک دوست فارماسسٹ ہے۔ وہ یہ کام کر سکتا ہے مگر مگر..... یہ بہت مشکل کام ہے۔ میں بھی پھنس سکتا ہوں اس معاملے میں۔" اس کی آواز مرتعش تھی۔

"تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ میں مرنے سے پہلے یہ بیان لکھ کر مروں گی کہ میں اپنے شوہر کو زہر دے رہی ہوں اور خود بھی یہ زہر پی کر اپنی جان لے رہی ہوں۔"

"کوئی اور حل بھی تو نکالا جا سکتا ہے۔" اس نے

احتجاج کیا۔

"کسی اور حل سے تمہاری سزا طلاق ہے۔ تو میں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میں طلاق نہیں لوں گی اور نہ ہی اسے کسی اور عورت کا ہونے دوں گی۔"

"میں اپنے دوست سے بات کر کے ہی تمہیں کوئی حتمی جواب دے سکتا ہوں۔"

"اس سے کیا کہو گے؟"

"کوئی بھی بہانہ کر دوں گا مگر تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ اسی شرط پر میں تمہیں وہ زہر لا کے دے سکتا ہوں۔"

"کیسا وعدہ؟" میں ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"تم اپنی جان نہیں لو گی۔ صرف وقار کی جان لو گی۔ اگر میری یہ بات منظور ہے... تو پھر میں اپنے دوست سے بات کروں گا' اور اگر تمہیں یہ بات منظور نہیں ہے... تو پھر سوری..... میں تمہارا یہ کام نہیں کر سکتا۔" اس نے دوٹوک لہجے میں بات کی' اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

میں خاموش بت بنی بیٹھی رہی اور اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

☆.....☆

رات کو وقار گھر آیا۔ تو میں نے ایک بار بھی دانستہ طور پر اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ مجھے اس کی شکل سے ہی نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس شخص کے لیے کیا کچھ نہ کیا اور یہ اس قدر ہرجائی نکلا۔

اس نے بھی مجھے بلانا پسند نہ کیا۔ خاموشی سے کھانا کھایا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

میری جنت کو پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی تھی۔ گھر کا ماحول اب بہت کشیدہ اور تناؤ بھرا تھا۔

اگلے دن وقار کے آفس جانے کے بعد میں نے عاطف کو فون کیا۔

"مجھے تمہاری شرط منظور ہے عاطف..... میری مطلوبہ چیز مجھ تک پہنچا دو۔" میں نے ملفوف انداز میں اپنا پیغام اس کے کانوں تک پہنچایا۔

"اوکے..... شام کو آفس آف ہونے کے بعد آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

☆.....☆

عاطف نے کوٹ کی جیب سے وہ چھوٹے سائز کی سفید شیشی نکال کر میرے آگے رکھے ہوئے ٹیبل پر رکھی۔ میں نے لرزتے ہاتھ سے اسے اٹھایا اور آنکھوں کے سامنے لا کر اسے غور سے دیکھنے لگی۔ اس کے اندر پانی جیسا محلول تھا۔

"بہت ہی سریع الاثر زہر ہے۔ دودھ میں یا چائے میں چند قطرے ملا کر دے دینا۔ تقریباً آٹھ دس قطرے کافی ہوں گے۔ اسے پینے والا دس پندرہ منٹ میں اس جہان سے اس جہان میں منتقل ہو جاتا ہے، بنا کسی تکلیف اور اذیت کے۔ بس غنودگی محسوس ہوتی ہے..... بندہ آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اور ساتھ ہی اس کا دل کام کرنا بند کر دیتا ہے۔ اس زہر سے مرنے والے کی موت بالکل طبعی محسوس ہوتی ہے... مرنے کے بعد جسم کی رنگت بھی نیلی نہیں پڑتی۔ اس لیے کوئی بھی اسے قتل ثابت نہیں کر سکتا۔"

وہ بڑے اعتماد اور اطمینان سے اس زہر کی کوالٹیز پر روشنی ڈال رہا تھا جبکہ میرا دل کانپ رہا تھا اور دماغ میں ان گنت سوچیں ابھر ابھر کر معدوم ہوتی جا رہی تھیں۔

"اوکے میں سب سمجھ گئی۔ اب تم جا سکتے ہو۔" میں نے رکھائی سے کہا تو وہ حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"دیکھو سحر! تم مجھ سے وعدہ کر چکی ہو کہ اپنی جان نہیں لو گی۔" اس نے مجھے تنبیہ کی۔

"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ تم پریشان مت ہو۔ اسی کی جان لوں گی جو قصوروار ہے۔" میں نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ تو وہ مطمئن ہو گیا اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں صرف دس قطرے ڈالنا..... اور باقی محلول کو فلیش میں بہا دینا۔ کہیں بھی محفوظ کر کے نہیں رکھنا اور خالی شیشی کو توڑ کے چھوٹے چھوٹے پیسز میں تبدیل کر دینا اور ہو سکے تو گھر سے باہر رکھی ہوئی باسکٹ میں پھینک دینا۔"

میں نے بے دلی سے اس کی ہدایات سنیں اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور ہاں زہر ملا دودھ پلانے سے پہلے کوئی بھی غیر ضروری باتیں نہ شروع کر دینا جنہیں سن کر وہ شک میں مبتلا ہو جائے۔"

وہ باہر نکل گیا تو میں نے بیرونی دروازے کا بولٹ چڑھا دیا۔

اب مجھے وقار کے آنے کا انتظار تھا۔ دل بہت تیز اسپیڈ سے دھڑک رہا تھا۔

''کیا میں جو کرنے جا رہی ہوں، وہ ٹھیک ہے؟ ... میرے ضمیر نے مجھ سے پوچھا۔

''غلط ہے..... یقیناً بہت غلط ہے مگر میں نے اس شخص سے شروع دن سے یہ التجا کی تھی کہ تمہارا ہر جرم اور ہر غلطی سر آنکھوں پر ہوگی..... مگر کبھی مجھے دھوکا مت دینا۔ مجھ سے بے وفائی مت کرنا۔ تو پھر اس نے یہ جرأت کیسے کی؟''

☆---☆

سارا دن گھر کا کوئی کام نہ کیا۔ ویسے بھی، اب اس گھر کو کس نے دیکھنا تھا۔

آج مجھے ہر بات اور ہر کام بے معنی اور بے مقصد لگ رہا تھا۔ ذہن میں کئی اوٹ پٹانگ خیال آ رہے تھے۔

ہم دونوں میاں بیوی کے مرنے کے بعد پتا نہیں یہ گھر کس کے تصرف میں جائے گا۔ شاید عاطف کے قبضے میں..... کیوں کہ میرا سب سے قریبی عزیز وہی تھا۔

سارا دن بیڈ پر لیٹی روتی رہی اور یہ سوچتی رہی کہ جب میں اپنے محبوب کو اپنے ہاتھوں سے زہر ملا دودھ پلاؤں گی تو اس کی جان نکلتے ہوئے کیسے دیکھ سکوں گی۔ میں تو اس کی ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر پاتی تھی تو پھر اس کی موت کی اذیت کیسے سہہ پاؤں گی۔

میں نے عاطف سے وعدہ کیا تھا کہ میں صرف وقار کی جان لوں گی اپنی جان نہیں لوں گی مگر یہ وعدہ جھوٹا تھا۔

میں وقار کے بنا زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

ایک خیال اور ذہن میں آیا، تو میرے رونے میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔

مجھے یاد آیا کہ کل تیس مارچ ہے۔ ہماری شادی کی سالگرہ کا دن۔ ہماری شادی کو کل پورے پانچ سال ہو جائیں گے اور یہی دن ہماری برسی کا دن بھی ہوگا۔

یہ سوچ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆.....☆

رات کو وقار گھر آیا تو میں منہ سر لپیٹے پڑی تھی۔ وہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا جو آگ کی طرح تپ رہی تھی۔ وہ کھانا بھی باہر سے پکا پکایا لے آیا۔

مجھے زبردستی کھانا کھلایا اور پھر میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

آج مجھے وقار کے چہرے پر اپنے لیے محبت کی رمق دکھائی دی اور شاید پچھتاوے کی پرچھائیاں بھی مگر اب کیا فائدہ۔ میرے دل سے ہوک اٹھی۔

اس نے اپنے ہاتھوں سے مجھے دوا کھلائی اور پھر میرے پاس بیٹھ کر میرا سر دبانے لگا۔

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھے اور پوچھا۔

''سحر تم رو کیوں رہی ہو؟'' اس کا لہجہ بہت نرم اور محبت بھرا تھا۔

میں نے اس کا ہاتھ نرمی سے پرے کیا اور اٹھ کر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ میرے سامنے بیٹھا محبت پاش نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں آج تم سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں وقار..... کرو گے نا مجھ سے بات؟'' بات کرتے کرتے میری آواز رندھ گئی۔

''ہاں میری جان..... تم جتنی باتیں کرنا چاہو کر سکتی ہو..... اگر چاہو تو..... آج ہم ساری رات باتیں کریں گے۔'' اس نے میرا گال تھپتھپایا۔

میرا دل بھر آیا اور میں اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

مجھے اس طرح روتا دیکھ کر وہ گھبرا گیا... اور مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ''کیوں رو رہی ہو سحر؟ کافی دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم پریشان ہو۔ اب سیٹ ہو..... کیا چل رہا ہے تمہارے دماغ میں؟ آج کھل کر مجھے بتا دو پلیز.....'' وہ مجھے اپنے ساتھ لگائے میرے کندھے کو تھپک رہا تھا اور میں رو رو کر اپنے آنسوؤں سے اس کی شرٹ بھگو رہی تھی۔

اس نے مجھے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی۔ جب کافی دیر تک رو رو کر دل کی ساری بھڑاس نکال لی۔ تو خود ہی اس سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگا۔

''چلو اب بتا دو..... تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ شاباش۔''

''وقار تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو نا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں؟'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ہاں..... میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم مجھ سے بہت محبت کرتی ہو۔ اتنی محبت کہ شاید ہی کوئی دنیا میں کسی سے کرتا ہو۔'' اس کے لہجے سے تفاخر جھلک رہا تھا۔

''تو پھر تم مجھ سے بے وفائی کیسے کر سکتے ہو؟'' میں یکدم بپھر کر بولی۔ تو وہ حیران رہ گیا۔

''کس نے کہا کہ میں تم سے بے وفائی کر رہا ہوں۔'' وہ ناقابل یقین نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''تم ایک مالدار بیوہ سے دوسری شادی کر رہے ہو اور وہ بھی مجھ سے چوری چھپے..... کیوں..... آخر کیوں؟''

''او مائی گاڈ! تم سے یہ سب کس نے کہا؟'' وقار نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

''اس بات کو چھوڑو کہ مجھے یہ باتیں کہاں سے معلوم ہوئیں۔ مجھے اس بات کا پکا ثبوت ملا ہے۔ کہ تم اس بیوہ عورت سے نکاح کر رہے ہو اور نکاح کے لیے دن بھی فکس کر لیا ہے اور شام کو پانچ بجے دفتر سے نکل کر تم سیدھا اس بیوہ عورت کے پاس جاتے رہے ہو۔ دو اڑھائی گھنٹے اس کے پاس وقت گزار کر، گھر آتے رہے ہو اور مجھے تم نے یہ بتایا کہ میرا آفس ٹائم بڑھ گیا ہے۔ کہہ دو کہ یہ سب جھوٹ ہے۔''

وقار کے چہرے کی رنگت زرد پڑ چکی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے، حماقت چہرے پر سجائے میری طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں، یا میں نے اچانک کسی بھیانک چڑیل کا روپ دھار لیا ہو۔

چند لمحوں تک میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی مگر وہ خاموش بیٹھا رہا۔

اس کے پاس جیسے بات کرنے کے لیے الفاظ ختم ہو چکے تھے۔ میں پھر تڑاخ کر بولی۔ ''اب بولتی کیوں بند ہو گئی؟ بولو..... جواب دو۔ تم کیا سمجھتے تھے۔ میں گھر کی چار دیواری میں رہنے والی ایک سیدھی سادی عورت ہوں۔ جس کی آنکھوں پر تم نے اپنی محبت کی پٹی باندھ کر اسے اندھا کر رکھا ہے۔ میں مانتی ہوں۔ تمہاری محبت میں اندھی ہو چکی تھی میں، مگر اب آنکھیں کھل چکی ہیں میری۔ میں جان چکی ہوں تمہاری اصلیت۔ اب میرے سامنے شرمندہ ہونے کا ڈرامہ مت کرنا۔ اپنے منہ سے اپنا اقبال جرم بیان کرو۔ میں تمہارے منہ سے تمہاری بے وفائی کی کہانی سننا چاہتی ہوں۔'' میری زبان جیسے زہر اگل رہی تھی اور وہ خاموشی سے سر جھکائے میرے سامنے بیٹھا رہا۔ سب کچھ سنتا رہا اور پھر جب میں بول بول کے تھک گئی تو اس نے آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

میں بے چین ہو گئی وہ رو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''اس سے بہتر تھا کہ تم مجھے زہر دے دیتی سحر..... مگر یہ باتیں نہ کرتی۔ تمہاری باتوں نے میری روح کو چھلنی کر دیا ہے۔''

اس کی بات نے مجھے سرتاپا لرزا دیا۔ اسے کیا پتا تھا کہ میں یہ بندوبست پہلے ہی کر چکی ہوں، زہر دینے والا۔

''میں ساری بات کی حقیقت کھول کر تمہارے سامنے رکھتا ہوں۔ اس کے بعد تمہارا ہر فیصلہ سر آنکھوں پر ہوگا۔''

وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوا اور پھر بولنے لگا۔

''تمہیں یاد ہے سحر..... کچھ عرصہ پہلے میں غبن کے کیس میں پکڑا گیا تھا تو تم نے اپنا زیور بیچ کر مجھے چھڑایا تھا۔ باقی زیور سے رقم پوری نہیں ہو رہی تھی۔ تب تم نے سونے کی وہ چار چوڑیاں اپنی کلائی سے اتار کر پانچ لاکھ کی رقم پوری کی تھی۔ میں رہا ہو کر گھر آ گیا مگر تمہاری سونی کلائیاں مجھے احساس جرم میں مبتلا کر دیتی تھیں۔ تب میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ اگر باقی کا زیور تمہیں نہ بھی بنوا کر دیا مگر یہ سونے کی چوڑیاں ضرور بنوا کر دوں گا۔ دن رات اسی سوچ بچار میں گزرنے لگے، پھر دو ماہ پہلے میرے دفتر کے کولیگز نے ایک گریند کمیٹی ڈالی، تین لاکھ روپے کی جس کے لیے ہر ممبر کو بیس ہزار ماہانہ دینے پڑتے۔ میں نے بھی وہ کمیٹی ڈال لی تاکہ تین لاکھ روپے حاصل کر کے تمہاری چوڑیاں بنوا سکوں اور شادی کی پانچویں سالگرہ کے موقع پر جب یہ چوڑیاں اپنے ہاتھوں سے تمہارے ہاتھ میں پہناؤں، تو تمہارا خوشی اور مسرت سے چمکتا ہوا چہرہ دیکھ سکوں۔ پانچ سے ساڑھے سات بجے یہ دو اڑھائی گھنٹے میں اس مالدار بیوہ کے گھر جاتا تھا اس کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کے لیے۔ ان دو گھنٹوں کی محنت کے بدلے وہ مجھے پندرہ ہزار روپیہ ماہانہ دیتی تھی جس میں پانچ ہزار روپے اپنی تنخواہ سے ملا کر بیس ہزار پورا کر کے، کمیٹی والوں کو دے دیتا تھا اور میں نے ان سے منت سماجت کر کے دوسری کمیٹی بھی حاصل کر لی..... آج ہی جیولر کے پاس گیا۔ اور تمہارے لیے سونے کی چار چوڑیاں بھی بنوا لایا۔ آج میں خوش خوش گھر آیا تھا کیونکہ آج میرے سر سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ میرا خواب شرمندہ تعبیر ہونے جا رہا تھا۔ میں نے یہ چوڑیاں الماری میں بحفاظت رکھ دیں تاکہ کل شادی کی سالگرہ کے موقع پر تمہیں یہ تحفہ پیش کر سکوں مگر تم نے اپنی جلد باز طبیعت کی وجہ سے سب کچھ تلپٹ کر دیا۔ تم نے شک کی بنیاد پر پوری ایک عمارت کھڑی

کر دی۔" وہ اب باقاعدہ ہچکیاں لے کر رونے لگا اور میرے جسم میں سے، جیسے خون کا ایک ایک قطرہ کسی نے نچوڑ لیا ہو۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا..... اتنی بڑی غلط فہمی مجھے کیسے ہو سکتی ہے؟" میں زیر لب بڑبڑائی۔

"جب میں نے پوچھا تھا کہ تم دو گھنٹے کہاں گزارتے ہو۔ تب تم نے مجھے سیدھی طرح کیوں نہ بتا دیا؟"

"اس لیے نہ بتایا کہ تمہیں سن کر تکلیف ہوگی۔ تم مجھے اتنی محبت کرنے اور جان مارنے کی اجازت بھی نہ دیتیں اور اگر تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیتا تو میرے سرپرائز کا کیا ہوتا؟"

اس نے کچھ اس بھولپن سے جواب دیا کہ مجھے اس پر بے تحاشہ پیار آیا۔ میرا دل چاہا کہ اس سے لپٹ جاؤں۔ اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس سے معافی مانگ لوں مگر پھر ایک خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔ میرا جسم پھر سے سخت ہو گیا۔

"اور چودہ فروری والے دن تمہارے کوٹ پر لپ اسٹک کا جو نشان لگا تھا اور کسی عورت کے لمبے لمبے بال بھی چپکے ہوئے تھے۔ اس کی کیا وضاحت دو گے؟" میری بات سن کر وہ حیران نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اور پھر سوچ میں پڑ گیا۔

"چودہ فروری....." اس نے زیر لب دہرایا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

"اوہ ہاں..... یاد آیا۔ چودہ فروری کو ویلنٹائن ڈے تھا۔ اس دن دوپہر ایک سے تین بجے کے درمیان عاطف میرا کوٹ مانگ کر لے گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اپنی گرل فرینڈ سے ملنے جا رہا ہوں۔ آپ کا کوٹ بہت اچھا لگ رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے مجھے دے دیں۔ میں نے پہنے ہوئے کوٹ اتارا اور اسے دے دیا تھا۔ اس نے جب واپس کیا تو میں نے جلدی میں پہن لیا۔ یہ غور ہی نہیں کیا کہ اس پر لپ اسٹک کا نشان لگا ہوا ہے یا کوئی بال وغیرہ چپکے ہوئے ہیں۔"

اس کی وضاحت سن کر میں جیسے زمین میں گڑ گئی۔ سب پورا گیم میری سمجھ میں آ چکا تھا۔ میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ او مائی گاڈ..... اس کمینے عاطف نے مجھے برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ عین وقت پر ساری کہانی کھل کر سامنے آ گئی اور میری آنکھیں کھل گئیں۔

دل چاہ رہا تھا کہ زہر کی جو شیشی اس خبیث نے مجھے لا کر دی تھی۔ وہ پوری کی پوری اس کے حلق میں انڈیل دوں یا پھر اپنے حلق میں انڈیل لوں۔

میں اپنے دیوتا جیسے شوہر پر اتنے گھناؤنے الزام لگاتی رہی اور اس حد تک اس سے بدگمان ہو گئی کہ اس کی جان لینے کے درپے ہو گئی۔

اور وہ بیچارہ دن رات محنت مشقت کر کے میرے لیے سونے کی چوڑیاں بنواتا رہا۔ شادی کی سالگرہ کے لیے ایک گرینڈ "سرپرائز" تیار کرتا رہا اور میں شادی کی سالگرہ پر اس کی موت کی تیاری کرتی رہی۔

تف ہے میری زندگی پر۔ اس وقت مجھے اپنی ذات سے بے انتہا نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ میں وقار کے سامنے خود کو بہت کم تر اور گھٹیا ترین عورت محسوس کر رہی تھی۔

وقار اٹھا، اور کمرے میں رکھی ہوئی الماری کھولی۔ اس میں سے ایک مخملی چوکور ڈبا لیے میرے پاس آ بیٹھا۔ اس نے ڈبا کھولا۔ اس میں چار سونے کی چوڑیاں جگمگا رہی تھیں۔ ڈبا کھول کر وہ فخریہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی۔

پھر اس نے ایک چوڑی نکالی۔ میرا ہاتھ پکڑا اور اس پر چڑھانے لگا۔ میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی پھر بیڈ سے نیچے اتری اور اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

"مجھے معاف کر دو وقار۔ مجھے معاف کر دو۔ میں جانتی ہوں۔ میں معاف کیے جانے کے قابل نہیں ہوں کیونکہ میرا گناہ بہت بڑا ہے مگر پھر بھی مجھے یقین ہے کہ تم جیسا فرشتہ مجھے ضرور معاف کر دے گا۔" میں اس کے پیروں پر اپنا چہرہ رگڑ رہی تھی۔

وہ بدک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے میرے بازوؤں پر دونوں ہاتھ رکھے اور مجھے اوپر اٹھا لیا۔

"کیا کر رہی ہو سحر؟ آج کتنی اذیت دو گی مجھے؟ پاگل ہو گئی ہو کیا.....؟" وہ جھنجلا کر بولا۔ تو میں اس کے سینے سے لگ گئی۔

"ہاں میں پاگل ہوں۔ اور بہت بے وقوف بھی۔"

"جانتا ہوں۔" وہ ہنسا۔ اور مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"اسی پاگل پن اور بیوقوفی پر تو میں مرمٹا تھا۔"

"تو کیا تم نے مجھے معاف کر دیا وقار؟" میں نے اس

کے سینے پر چہرہ رگڑتے ہوئے سرگوشی کی۔

''ہاں میری جان میں نے تمہیں معاف کر دیا اور تم بھی مجھے معاف کر دو۔ میں نے ''سرپرائز'' دینے کے چکر میں، انجانے میں تم سے بہت بڑی زیادتی کر ڈالی۔ تم شک کی آگ میں جھلستی رہی اور میں اپنی دنیا میں بے خبر اور مگن رہا۔''

شک اور بدگمانی کے بادل چھٹ گئے۔ یقین اور اعتماد کا سورج طلوع ہوا تو محبت کی کرنوں سے ہم دونوں نہا گئے۔

وقار نے مجھے اپنے ہاتھوں سے وہ چوڑیاں پہنائیں۔

اگلے دن آفس روانہ ہونے سے پہلے اس نے میری پیشانی پر پیار کیا اور کہا کہ آج شام کو تیار رہنا۔ آفس سے سیدھا گھر آؤں گا۔ کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں کینڈل لائٹ ڈنر کریں گے اور پھر گھر آ کر کیک کاٹیں گے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''گڈ گرل۔'' اس نے میرا گال تھپتھپایا اور گھر سے نکل گیا۔

وقار کو رخصت کرنے کے بعد سب سے پہلا کام وہ زہر والی شیشی کو لیٹرین میں بہانے کا کیا۔ شیشی کو خالی کر کے اسے پانی سے اچھی طرح صاف کر کے ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔

مجھے اب عاطف کی کال کا انتظار تھا۔ جانتی تھی کہ وقار کو زندہ سلامت دیکھ کر سب سے پہلا کام مجھے کال کرنے کا ہی کرے گا۔

اور پھر وہی ہوا وقار کے آفس پہنچتے ہی عاطف کی کال آ گئی۔

''ہیلو سمر..... ایسا کیا ہوا تھا کہ تم نے اپنے پلان پر عمل نہیں کیا۔ وہ ابھی ابھی میرے پاس سے گزر کر اپنے سیکشن کی طرف گیا ہے۔''

اس کی آواز سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے خود کو کنٹرول کیا اور جواب دیا۔

''ہاں میں نے اس پلان پر عمل نہیں کیا بلکہ اپنے ذہن میں ایک نیا پلان سوچ لیا ہے۔''

''کیا۔'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''فون پر نہیں بتا سکتی۔''

''اوکے ..... میں ہر ایک ٹائم میں آؤں گا پھر مجھے ساری بات بتانا۔''

''اوکے۔'' میں نے فون بند کر دیا اور اپنے نئے پلان کے متعلق سوچنے لگی۔

جس شخص نے مجھے حاصل کرنے کے لیے، میرے گھر کو اور مجھے برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اسے میں بھلا اتنی آسانی سے کیسے معاف کر سکتی تھی۔

☆.....☆

دوپہر کے ڈیڑھ بجے وہ میرے سامنے بیٹھا تھا اور سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''اب بتاؤ کیا پلان آیا ہے ذہن میں؟''

''دیکھو عاطف! جس آدمی نے مجھے اتنا تڑپایا اور رلایا ہے۔ میری محبت کی اتنی توہین کی ہے۔ اسے اتنی آسان موت کیسے مار سکتی ہوں۔ تمہارے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ موت تو اس کے لیے بہت آسان سزا ہوگی۔ کیوں نہ اسے زندہ رکھ کے ہی کوئی ایسی سزا دی جائے کہ اس کی زندگی موت سے بھی بدتر ہو جائے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟'' میں نے تائید طلب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''تمہارا پلان سن کر ہی کوئی حتمی رائے دے سکتا ہوں۔''

''ٹھنڈے دماغ سے سوچا تو تمہارا مشورہ ہی مجھے زیادہ آسان اور کارآمد محسوس ہوا۔''

''کون سا مشورہ؟'' اس کے چہرے پر تجسس ابھر آیا۔

''یہی کہ اسے قتل کرنے کی بجائے طلاق کا مطالبہ کر دوں مگر طلاق لینے سے پہلے اسے کسی دوسری عورت کے قابل بھی نہیں چھوڑیں گے۔'' میرے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ آنکھوں میں الجھن بھرے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''کیا کوئی ایسی میڈیسن ایجاد نہیں ہوئی؟ جسے کھا کر کوئی بھی مرد نامرد بن جائے؟ وہ کسی بھی عورت کی قربت کے قابل نہ رہے؟''

''یقیناً ایسی میڈیسن بھی ضرور ہوگی۔ میں اپنے دوست سے پوچھوں گا۔'' اس کا چہرہ اندرونی مسرت سے چمکنے لگا۔

''کب تک یہ میڈیسن مجھے لا کر دے سکتے ہو؟''

''زیادہ سے زیادہ..... ایک دو دن میں۔''

''اوکے۔'' میں بے چینی سے انتظار کروں گی تمہارا۔''

''سحر! تم سے دل کی بات کہنا چاہتا ہوں کافی دنوں سے..... مگر ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔'' وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

''کہو..... کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے جبری مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی۔

کیونکہ میں جانتی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

''سحر..... میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ دل کی گہرائیوں سے تمہیں چاہتا ہوں.. مگر تم نے کبھی مجھے اپنی محبت اور توجہ کے قابل نہیں سمجھا۔'' وہ شکوہ کناں ہوا۔

''ہاں..... وہ اس لیے کہ میں تمہیں پہچان ہی نہ سکی۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

''اور اب؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''اب میں تمہیں اور تمہاری محبت کو پہچان گئی ہوں۔'' میں مسکرائی۔ وہ نہال ہو گیا۔

''جانتا تھا..... ایک دن تمہیں میرے جذبوں کی صداقت پر ضرور یقین آئے گا۔'' وہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

''جبکہ صاف ہوں اور ارادے پختہ ہوں تو منزلیں مل ہی جایا کرتی ہیں۔''

''بالکل صحیح کہہ رہی ہو۔ میں پرسوں وہ میڈیسن لے کر تمہارے پاس حاضر ہو جاؤں گا۔''

وہ مسکرایا تو اس کا چہرہ بھی جیسے خبیث انداز میں مسکرانے لگا۔

مجھے اس کے وجود سے حد درجہ کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔

وہ رخصت ہوا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

☆.....☆

اور پھر دو دن بعد وہ اپنے وعدے کے مطابق میڈیسن لیے میرے پاس پھر سے موجود تھا۔

یہ سفید رنگ کی گولیوں کا ایک پتا تھا۔

اس نے وہ پتا میرے سامنے میز پر رکھا۔

''چار یا پانچ گولیاں اسے کسی چیز میں گھول کر پلا دو۔ ساری زندگی کے لیے مفلوج ہو جائے گا اور اگر ایک گولی کھلاؤ گی تو ایک دو ماہ کے لیے بے ضرر ہو جائے گا۔'' وہ خباثت سے ہنسا۔

''اور اگر پورا پتا ہی گھول کر پلا دوں تو.....؟'' میں نے شوخ انداز میں ایک ادا سے پوچھا تو وہ گھائل ہو گیا۔

''تو..... تا زندگی، عورت کا نام سن کر دور بھاگا کرے گا۔ اور عورت کو سامنے دیکھ کر، خوف سے آنکھیں بند کر لیا کرے گا۔''

''واہ..... ویری گڈ۔ اوہ..... میں نے تمہیں چائے پانی کا تو پوچھا ہی نہیں۔ کیا پیو گے؟ چائے یا شربت؟''

''جو تم پیار سے پلا دو۔'' وہ نثار ہوتے ہوئے بولا۔

''تو پھر چائے ٹھیک رہے گی۔''

میں چائے بنانے کے لیے کچن میں گئی۔ دو کپ چائے تیار کی، پھر چائے کپوں میں انڈیلی، پتے میں سے تمام گولیاں نکال کر اس کے چائے کے مگ میں ڈال دیں پھر چمچ سے مکس کیا اور چائے لے کر واپس ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

گولیوں والا مگ اس کی طرف بڑھایا۔

اور خود بھی اس کے سامنے بیٹھ کر چائے پینے لگی۔

وہ چائے کے ساتھ ساتھ مجھے بھی نظروں سے پی رہا تھا۔

چائے پینے کے بعد میں نے اسے رخصت کیا۔

میرے ہونٹوں پر اب ایک زہریلی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

☆.....☆

اس واقعے کے دو ماہ بعد ہی عاطف نے خودکشی کر لی۔ کیونکہ اس کے ماں باپ اس پر شادی کے لیے بہت زیادہ جذباتی دباؤ ڈالنے لگے تھے۔ اسے ان کے کڑے سوالوں سے اور دنیا کے تمسخر سے بچنے کے لیے موت کی وادی میں پناہ لینا پڑی۔

جس ماہ عاطف نے خودکشی کر کے اپنی جان دی۔ اسی ماہ میرا پاؤں بھاری ہو گیا۔ اللہ نے اُمید کی کرن دکھا کر یہ ثابت کر دیا کہ میرے ہاں دیر ضرور ہے مگر اندھیر نہیں۔

گولیوں والی چائے پینے کے تیسرے چوتھے دن ہی عاطف پر یہ خوفناک حقیقت منکشف ہو گئی تھی کہ میں نے اس کی چال اسی پر الٹ دی تھی۔ چند دنوں تک وہ مجھے دھمکیاں دیتا رہا مگر جب میں نے اسے بتایا کہ اس کی جرائم بھری گفتگو میں ریکارڈ کر چکی ہوں جو اس کے ماں باپ کو بھیج دوں گی تو وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ ایک عورت کے ہاتھوں بری طرح شکست کھا چکا ہے۔

جہنم

محترم و مکرم مدیر اعلیٰ
سلامتی:
یہ ایک ایسی سچ بیانی ہے جو ہمارے دیہی معاشرے کا بین ہے۔ وہ نوحہ ہے جو تماچا بر رخسارِ سیاست داں ہے جو ووٹ لے کر کئی کئی لاکھ روپے تنخواہ لینے کے علاوہ اپنی تجوریوں کو بھی بھرنے کے لیے الٹے سیدھے کام کرتے اور کراتے ہیں مگر اپنے حلقے کے بارے میں اِک ذرا نہیں سوچتے، لوگ کیسی جہنم زدہ زندگی گزار رہے ہیں۔ ذرا ہٹ کر لکھی ہے اس لیے قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

محمد سلیم اختر
(راولپنڈی)

شکل و صورت اور مطب کی حالت سے ہی صاف پتا چلتا تھا کہ یہ صاحب حکیم کم اور عطائی زیادہ ہیں لیکن قصبے میں ان کا خاصہ شہرہ تھا۔ بیس تیس منٹ کا عرصہ جو میں نے ان کی دکان پر گزارا اس عرصے میں وہاں کم از کم دس بارہ مریض آئے جنہوں نے حکیم صاحب سے دوائی لی، دام دیئے اور چلتے بنے۔

گوہر آباد کے چھوٹے سے قصبے میں مجھے ایک کام تھا۔ رات وہاں ٹھہرا تو عجیب سکون کا احساس ہوا۔ پورا قصبہ سرِ شام ہی خاموشی کی گود میں میٹھی نیند سو گیا تھا۔ ہم جیسے شہروں میں رہنے والے جب ایسے خاموش اور پُرسکون علاقوں میں جاتے ہیں تو وہاں کی خاموشی دل پر عجیب سا اثر کرتی ہے۔ رات کو جی

بھر کر سویا، صبح اٹھے تو اخبار کی طلب محسوس ہوئی۔ اسے بھی ایک شہری عادت سمجھیے کہ صبح صبح اخبار کا منہ دیکھنا زندگی کا ایک لازمہ بن کر رہ گیا ہے۔ صاحب خانہ نے ہمیں بتایا کہ یہاں اخبار گیارہ بارہ بجے تک آتا ہے اور اخبار بھی گنے چنے آتے ہیں اگر اخبار پڑھنا ضروری ہو تو قصبے کے بازار میں حکیم نور دین کی دکان پر جا کر پڑھ لینا، اس کے ہاں اخبار آتا ہے۔

گیارہ بجے کے قریب ٹہلتے ٹہلتے میں قصبے کے بازار میں جا نکلا۔ قصبے کا بازار بے رونق تھا۔ کچی سڑک کے دونوں طرف پکی پکی دکانیں تھیں۔ دکانوں کے درمیان خاصہ فاصلہ تھا۔ شہروں کے بازاروں کی دکانوں کی طرح نہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہوں۔ حکیم نور دین کی دکان ڈھونڈنے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ دوائیوں کی شیشیوں اور مٹی کے مرتبانوں کے علاوہ ایک پرانا سا بورڈ بھی دکان کی نشاندہی کر رہا تھا۔ اس پرانے بورڈ پر لکھے ہوئے حروف اڑنے لگے تھے۔ پھر بھی "ہوالشافی ہوالکافی" کے نیچے سولے حروف میں لکھا ہوا "حکیم نور دین" کا نام صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ مجھے اپنے مطب کے سامنے کھڑے دیکھ کر حکیم نور دین نے قدرے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ میں جلدی سے دکان میں داخل ہوا۔ حکیم صاحب کو سلام کیا اور بتایا کہ اخبار دیکھنے آیا ہوں۔ حکیم صاحب ایک ٹوٹی پھوٹی بدوضع میز کے پیچھے ایک موڑھے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ موڑھے کی حالت بھی شکستہ تھی۔ میز کے دونوں طرف دو لکڑی کے بینچ رکھے تھے جن پر بیٹھو تو جھولتے تھے۔ ان پر حکیم صاحب کے مریض بیٹھتے تھے۔ حکیم صاحب نے ایک مریض کو قدرے سکڑنے کا حکم دیتے ہوئے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور مزاحتاً اخبار مجھے تھما دیا۔ اس دوران انہوں نے مجھ سے صرف یہ پوچھا کہ "آپ کہاں سے آئے ہیں؟" اور جواب "لاہور سے آئے ہیں۔" سن کر صرف ایک لمحے کے لیے مجھے حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور مریض کی نبض پکڑ لی۔

میں نے اپنے گرد و پیش نظر انداز کر دیا اور اخبار پڑھنے لگا۔ مریض آتے جاتے رہے اور جب آخری مریض چلا گیا تو میں نے حکیم صاحب سے پوچھا۔ "اس قصبے کی کتنی آبادی ہے؟"

حکیم صاحب نے اپنی میلی اور خشخشی داڑھی پر اپنا میلا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "چار پانچ ہزار کے درمیان ہوگی۔"

میں نے ان کا جواب سن کر بات بڑھائی۔ "کیا قصبے میں آپ کے علاوہ کوئی اور حکیم یا ڈاکٹر بھی ہے؟"

حکیم نور دین کو شاید یہ سوال پسند نہ آیا۔ روکھے سے لہجے میں بولے۔ "یہاں میرا ہی گزارہ نہیں ہوتا، دوسرا حکیم کیسے دکان چلا سکتا ہے۔ لوگ غریب ہیں۔ آس پاس کے دیہات سے بھی مریض آتے ہیں۔ میں اس قصبے میں اکیلا ہی حکیم ہوں۔"

"آپ نے طب کی تعلیم کہاں سے حاصل کی ہے؟"

حکیم نور دین صاحب یک دم جلال میں آ گئے اور بولے۔ "میں خاندانی طبیب ہوں۔ کئی پشتوں سے یہی پیشہ چلا آ رہا ہے، مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں کسی اسکول یا طبی مدرسے سے پڑھتا۔" یہ کہہ کر حکیم صاحب کچھ بڑبڑانے لگے جیسے مجھے کوس رہے ہوں۔ میں نے دل میں کہا کہ پھر ان چار پانچ ہزار انسانوں کے امراض کا علاج کرنے والا سند یافتہ نہیں ہے بلکہ عطائی ہے۔ اللہ ہی ان انسانوں پر رحم کرے۔ میں اخبار پڑھنے لگا۔

اچانک میں نے قدموں کی دھمک سنی، کچھ لوگ مطب میں داخل ہوئے۔ دو عورتیں، ایک بوڑھا، دو بچے۔ ان پانچوں انسانوں کے چہروں پر کوئی ایسی بات تھی کہ میں انہیں دیکھنے لگا۔ بوڑھا آدمی میلی سی، پھٹی ہوئی پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ پگڑی کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ بہت مدت پہلے یہ پوری پگڑی ہوگی۔ اب تو اصل پگڑی کا کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے اور بوڑھا اس سے اپنا سر چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ بوڑھے کی آنکھیں میلی تھیں اور ان میں سے پانی بہہ رہا تھا۔ وہ بار بار الٹے ہاتھ سے آنکھوں سے بہنے والے پانی کو پونچھتا تھا۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ سفید داڑھی میں میل گھلی تھی وہ بڑا لاغر اور کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا کرتہ بھی میلا تھا اور دھوتی بھی۔ اس نے ٹوٹی ہوئی دیسی جوتی پہن رکھی تھی۔

دو عورتوں میں سے ایک بوڑھی تھی۔ سر سفید ہو رہا تھا۔ چہرے کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ وہ بھی میلے لباس میں ملبوس تھی۔ اس کے ساتھ جو عورت تھی وہ بظاہر ادھیڑ عمر کی نظر آتی تھی لیکن اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ وقت سے پہلے بوڑھی ہو رہی ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ گہرا گندمی تھا۔ اس کا لباس بھی معمولی تھا، وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ دونوں بچوں کی حالت قابل رحم تھی۔ ایک بچہ چھ سال..... کا ہوگا اور دوسرا چار پانچ برس کا۔ دونوں نے میلی جیکٹ اور قمیص پہن رکھی تھیں جن پر میل اور چکنائی کے دھبے صاف نظر آ رہے تھے۔ ان کے بالوں میں خاک اٹی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں بھوک اور محرومی تھی۔ ان کے ہاتھ پاؤں ان کے کپڑوں سے زیادہ میلے تھے اور ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ ان دونوں کو کوئی دھوتی، کوئی نیکر، کوئی پاجامہ، کوئی پتلون یا شلوار جتنی کہ جانگیہ بھی میسر نہ تھا۔ ان کی ننگی ٹانگوں پر خراشیں تھیں جن پر میل جمی ہوئی تھی۔

میں انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ ایک عجیب منظر تھا۔ چھوٹا بچہ ماں کی چادر کا دامن کھینچ رہا تھا۔ بڑا بچہ بھی بوڑھی عورت سے لپٹا جا رہا تھا۔ ادھیڑ عمر عورت کی آنکھوں میں کرب کی شدت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو وہ بھی گہرے کتھئی رنگ کے نظر آئے لیکن چہرے اور ہاتھوں کے برعکس اس کی گردن کی رنگت گندمی تھی۔ ایک ہی انسانی جسم میں رنگوں کا یہ نمایاں تضاد مجھے حیران کر رہا تھا۔

بوڑھے نے قدرے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ "حکیم جی! تم تو کہتے تھے کہ اب سکینہ خون نہ تھوکے گی لیکن وہ تو اسی طرح کھانستی ہے اور کھانسی کے ساتھ خون تھوکتی ہے۔"

حکیم صاحب نے ان کی طرف بے پروائی سے دیکھا اور بولے۔ "آجائے گا آرام، تم کون سا روز دوائی لینے آتے ہو۔ تمہیں سمجھایا بھی تھا کہ یہ سوزی مرض ہے، اس کا مجھ سے ہی علاج کراؤ۔ تم دوسرے قصبے کے حکیم کے پاس کیوں گئے تھے؟ اس نے مرض بگاڑ دیا ہے۔"

بوڑھا اور بوڑھیا حکیم صاحب کے آگے گڑگڑانے لگے۔ کسی دوسرے حکیم کے پاس جانے کے جرم پر شرمندگی کا اظہار کرنے لگے۔ ادھیڑ عمر کی عورت جو مریضہ تھی، حواس باختہ سی کھڑی تھی۔ چھوٹا بچہ اسے جھنجوڑ رہا تھا۔ اس سے کچھ مانگ رہا تھا۔ حکیم نورالدین کے چہرے پر بے زاری دکھائی دے رہی تھی۔

"پچھلے پیسے لائے ہو؟" حکیم صاحب نے پوچھا۔

"ہاں حکیم جی!" بوڑھے نے کہا۔ "تم دوائی تو دو، اگلا پچھلا سارا حساب چکا دیں گے۔"

"اس مرض کی دوائی بڑی مشکل سے بنتی ہے۔" حکیم صاحب نے بڑی نخوت سے کہا۔ "قیمتی کشتے ڈالنے پڑتے ہیں۔ موتیوں کے کشتے، پچھلے پیسے اور ایک ہفتے کی دوائی کے پانچ سو روپے لگیں گے۔ نکالو پانچ سو روپے۔"

"پانچ سو روپے!" بوڑھے کے منہ سے نکلا۔

"پانچ سو روپے!" ادھیڑ عمر کی مریضہ تو گویا رو ہی دی۔

میں سب کچھ سن رہا تھا، دیکھ رہا تھا۔ بوڑھے نے بڑھیا سے کہا۔ "پیسے نکال بیے۔" حکیم نورالدین کے چہرے پر چمک آگئی۔ وہ شیشوں کو الٹنے پلٹنے لگا۔ مریض عورت سکینہ نے چیخ کر کہا۔ "اماں! رہنے دو اتنی مہنگی دوائی نہ لو، میں تو مر ہی جاؤں گی، پیسے کیوں ضائع کرتے ہو۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ اس کے کتھئی رنگ کے چہرے پر آنسو بہنے لگے۔ اپنی ماں کو روتا دیکھ کر چھوٹا بچہ بھی زور زور سے رونے لگا۔ جانے اس عورت کو کیا ہوا کہ وہ دھم سے دکان کے فرش پر بیٹھ گئی اور بچے کو گلے لگا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

حکیم نورالدین کے چہرے پر درشتی جھلک اٹھی۔ اس نے غصے سے کہا۔ "کیا رونا دھونا شروع کر دیا۔ دوائی لینی ہے تو پیسے نکالو ورنہ چلے جاؤ۔"

اس کی تحصیلی آواز سن کر بچہ خوف سے چپ ہو گیا۔ عورت بھی خاموشی سے رونے لگی۔ بوڑھی عورت نے اپنی چادر کا کونہ کھول کر مڑے تڑے ایک سو اور دس بیس روپے کے نوٹ اور سکے کانپتے ہاتھوں سے گننے شروع کر دیئے۔ سکے بار بار اس کے ہاتھوں سے پھسل جاتے تھے۔ بڑے بچے نے ایک سکہ اٹھا کر خوشی سے نعرہ لگایا تو بوڑھے کو جوش آگیا اس نے آگے بڑھ کر وہ سکہ اس سے چھین لیا۔ بڑا بچہ بھی رونے لگا۔ بوڑھے نے اسے ڈانٹ پلائی اور بوڑھی عورت سے سکے چھین کر خود جلدی جلدی گننے لگا پھر بڑی نرم سی مسکین آواز میں بولا۔ "حکیم صاحب! یہی ساری جمع پونجی ہے۔ پچاس روپے کم ہیں اگلی دفعہ دوا لینے آئے تو دے دیں گے۔"

حکیم صاحب دہاڑے۔ "پھر دے دیں گے۔۔۔ پھر دے دیں گے۔ کبھی دوائی کے پورے پیسے نہیں دیئے۔ میں قیمتی موتیوں اور سونے کا کشتہ کھلاتا ہوں اور یہ لوگ ہیں کہ قدر نہیں کرتے۔" یہ کہہ کر حکیم صاحب نے جھٹا مار کر سارے پیسے لے لیے اور سامنے رکھی ہوئی گندی اور میلی شیشیوں میں سے بدرنگ اور بھدی بھدی گولیاں نکال کر پڑیاں بنانا شروع کر دیں۔ گولیوں کا رنگ بتا رہا تھا کہ ان میں نہ سونے کا کشتہ ہے نہ موتیوں کا۔

بوڑھی عورت گڑگڑا رہی تھی۔ "حکیم جی! اچھی دوائی دینا، سکینہ بہت کھانسنے اور بہت خون تھوکنے لگی ہے۔"

سکینہ وہاں مطب میں بھی کھانسنے لگی تھی اور بچے تھے کہ

شمارہ جنوری 2020ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش..... آپ کا انتخاب

☆ اول: درد آشنا..... سیمن (لاہور)

☆ دوم: بھوک، روٹی اور دوستی..... جرار احمد جعفری (کراچی)

☆ سوم: کھیل قسمت..... کاوش صدیقی (لاہور)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بھی منتخب کیجیے

ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

اس سے لپٹے جا رہے تھے۔ اس نے اپنا میلا سا دوپٹا ہونٹوں سے لگا رکھا تھا اور جب اس نے دوپٹے کا وہ حصہ منہ سے ہٹایا تو مجھے سرخ نظر آیا۔ حکیم صاحب نے انہیں جلدی جلدی فارغ کر دیا۔ کچھ ہدایات دیں اور بقایا پیسے ادا کرنے کی تاکید کر کے انہیں رخصت کر دیا۔ ادھر وہ لوگ دکان سے باہر نکلے، میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"حکیم صاحب! اس عورت کو کیا تکلیف ہے؟" میں نے پوچھا۔

حکیم صاحب نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "تپ دق ہے۔ آخری مرحلے پر، بچے گی نہیں۔" اس کے لہجے میں کوئی ہمدردی نہ تھی۔ معالجوں جیسی کوئی بات نہ تھی۔ میں جلدی سے دکان سے نکلا، وہ لوگ سامنے جا رہے تھے۔ میں ان کے پیچھے چل پڑا۔ جانے مجھ میں اتنی جرأت اور ہمت کیسے پیدا ہو گئی کہ میں نے بوڑھے کو روک کر کہا۔ "مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

بوڑھے نے قدرے تعجب سے مجھے دیکھا اور پھر بولا۔

"رک جاؤ ذرا، یہ بابو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"

وہ سب رک گئے۔ دونوں بچے مجھے یوں دیکھنے لگے جیسے میں ان کے لیے کوئی عجوبہ ہوں۔ کوئی ایسی مخلوق جس نے انہیں حیرت زدہ کر دیا تھا۔ سکینہ کی آنکھوں میں ایک عجیب سی بے تابی اور بے قراری تھی۔ بوڑھی عورت نے ایک دو بار مجھے گھور کر دیکھا اور پھر لاتعلق سی ہو گئی۔ میں حیران تھا کہ اب کیا کہوں۔

"بابا جی!" میں نے کہا۔ "آپ اپنی بہو کو شہر لے جائیں، یہاں اس کا علاج نہ ہو سکے گا۔"

"شہر لے جاؤں؟" بوڑھے نے کہا۔ اس کی نگاہیں خلاؤں میں کھو سی گئیں۔ پھر بیٹھی ہوئی کرب آلود سی آواز میں بولا۔ "شہر کیسے لے جاؤں؟ تمہیں کیا پتا ہماری زندگی کیسے گزر رہی ہے۔" اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے چہروں، ان کے کپڑوں، ان کے حالات سے صاف پتا چل رہا تھا کہ ان کی زندگی کس طرح گزر رہی ہے۔ "میں بوڑھا ہو گیا ہوں، کوئی سہارا نہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "یہ بہو ہے، بیمار..... مرنے والی ہے اور اس کے دو بچے، ایک بڑھیا میری بیوی ہے۔ جوان بیٹا تھا۔ اسے روگ لگ گیا۔ مجھے پتا ہے کہ اسے بھی یہی روگ تھا۔ یہی روگ اس کی بیوی کو لگا ہوا ہے۔ وہ زندہ تھا تو تنور پر کام کرتا تھا۔ ہمارا اپنا تنور ہے۔ قصبے میں زیادہ تر لوگ اپنے گھروں میں ہی روٹی پکاتے ہیں، تھوڑی سی آمدن ہوتی ہے۔ لوگ روٹیاں لگانے کے پیسے کم دیتے ہیں۔ آٹا دے جاتے ہیں۔ اس طرح بری بھلی گزر اوقات ہو جاتی ہے۔ میرا بیٹا روگی بن گیا اور پھر ایک دن جب گھاسی کا دورہ پڑا تو اس سے سنبھلا نہ گیا اور تنور میں گر گیا۔ جب اسے باہر نکالا تو وہ جھلس چکا تھا۔ دوسرے دن وہ مر گیا۔ کئی دنوں تک تنور بند پڑا رہا۔ جب فاقے آنے لگے تو پھر بہو نے تنور سنبھال لیا۔ اب یہ روگی اور بیمار تنور جھونکتی ہے اور ہم سب کا پیٹ پالتی ہے۔ سوچتا ہوں یہ بھی مر گئی تو ہمارا کیا بنے گا۔ میں بوڑھی جان، یہ دو چھوٹے چھوٹے بچے۔"

بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ کچھ اور کہے بغیر چل پڑا۔ میں اسے روک نہ سکا۔ آخر میں اسے کیا کہتا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ جا رہے تھے۔ دور ہوتے جا رہے تھے۔ بعد دوپہر جب میں اسی قصبے سے جانے کے لیے لاہور کے لیے نکلا تو ایک گلی کی نکڑ پر میں نے ایک تنور دیکھا، وہاں دو تین عورتیں بیٹھی تھیں۔ وہ روٹیاں لگوانے آئی تھیں۔ سکینہ روٹیاں لگا رہی تھی۔ اب مجھے سمجھ میں آیا کہ اس کے چہرے اور ہاتھوں کا رنگ کتھئی کیوں ہے۔ یہ چہرہ اور ہاتھ مسلسل آگ کے سامنے جھلتے رہتے ہیں، اسی لیے جسم کے دوسرے حصوں کے برعکس ان کی رنگت پک گئی ہے۔ گندمی رنگت نے گہرے کتھئی رنگت کی صورت اختیار کر لی ہے۔

اس کے دونوں بچے تنور کے پاس کھیل رہے تھے۔ بوڑھا اور بڑھیا پاس ہی ایک چارپائی بچھائے بیٹھے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میں کانپ گیا۔ تپ دق کی مریضہ کا صحیح علاج نہ ہو رہا تھا۔ وہ ایک عطائی کے چکر میں پھنس گئی تھی۔ چھوت کا مرض تھا اور بچے پاس رہتے تھے۔ وہ لوگوں کی روٹیاں لگاتی تھی۔ مرض پھیل رہا تھا..... پھیلتا جا رہا تھا..... مجھے یوں لگا جیسے تپ دق کے جراثیم پورے قصبے کو حصار میں لے رہے ہیں۔

"تنور..... زندگی کا تنور۔"

اس تنور میں روٹیاں لگاتے لگاتے سکینہ کا شوہر گرا اور مر گیا تھا۔ اسی تنور میں سکینہ نے جھلس جانا ہے۔

"اے میرے خدا!" میرے دل نے کہا۔ "تیری یہ مخلوق کب تک یوں ہی جھلتی رہے گی، کب تک عطائی انسانوں کی زندگیوں سے کھیلتے رہیں گے، کب تک انسان صحیح علاج معالجے سے محروم رہیں گے، زندگی کے اس تنور میں کب تک انسان جھلتے اور مرتے رہیں گے؟"

اے میرے رب! اے میرے رب!

میرے دل سے پکار اٹھ رہی تھی اور میں انتظار کر رہا ہوں کہ میری پکار خدا تک پہلے پہنچے گی یا سکینہ کی موت!

وہ دوربین کے ذریعے دور دور تک کے مناظر دیکھا کرتا تھا۔

وہ ایک تنہا انسان تھا۔ اس کے پاس دولت بھی تھی لیکن اس کی تنہائی کا مداوا نہیں بن سکی تھی۔ وہ اپنی مثال آپ تھا۔

اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا، وہ بھی ایک حادثہ ہی تھا جس میں اس کی بیوی ہی نہیں بلکہ اس کا بیٹا تک مر چکا تھا۔

خدا کی پناہ! کتنی خوبصورت یادیں تھیں، مہوش سے جڑی ہوئی معطر یادیں۔

بچھڑا پیار

محترم مدیر

السلام علیکم!

میں ایک پاکستانی ہوں اور یہاں روم میں مقیم ہوں۔ یہاں پاکستانی رسائل آسانی سے نہیں ملتے۔ میں جرمنی سے منگواتا ہوں۔ گو کہ کئی ماہ بعد کے رسالے ملتے ہیں لیکن وطن کی خوشبو سے وہ معطر ہوتے ہیں۔ یہاں ڈینل کی کہانی بہت مشہور ہے مجھے جس نے سنائی ہے وہ اس سے مل چکا ہے۔ مجھے بھی یہ کہانی حیرت انگیز لگی ہے اس لیے قارئین کو بھی سنانا چاہتا ہوں۔ کہانی طویل نہ ہو جائے اس لیے اختصار سے کام لیا ہے اور اٹالین انداز میں کہانی بیان کی ہے۔

شہرام شاہ

(روم، اٹلی)

مہوش سے اس نے محبت کی تھی۔ بس ایک ہی کو چاہا اور وہ بھی اتنی شدت سے کہ موجودہ دور میں ایسی مثال کم ہی ملتی ہوگی۔

وہ کہا کرتا تھا کہ میں محبت میں بھی توحید کا قائل ہوں جس کو چاہا بس اسی کو چاہا کیا، زندگی بھر۔ اس میں کسی اور کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ بقول شاعر "جو وضع ہم نے بنالی نباہ دی اے عزم۔ کیا جو چاک گریباں تو پھر سیا بھی نہیں۔"

دونوں ایک ہی کالج میں تھے۔ ایک ساتھ تعلیمی مراحل طے کرتے رہے۔ مہوش کی طرف توجہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ایک معطر لڑکی تھی۔ ہمیشہ ایک خاص قسم کا پرفیوم استعمال کیا کرتی۔ وہ پرفیوم اس کی شناخت بن گیا تھا۔ وہ جس طرف سے گزر جاتی وہ راستہ مہکنے لگتا تھا۔

وہ خوب صورت بھی تھی۔ ایک خاص قسم کی طرح داری تھی۔ کالج کے نہ جانے کتنے لڑکے اس کے عشق میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن لاٹری انیل کے نام نکلی تھی۔ انیل ایک ذہین اور طرح دار نوجوان تھا۔ وہ اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتا تھا۔ موسیقی ہو یا کتابیں، شاعری ہو یا خوشبو۔ ہر میں اس کا مزاج اوروں سے مختلف تھا۔ شاید یہی مزاج اسے مہوش کے پاس لے گیا تھا۔ اس کا بھی مزاج کچھ ایسا ہی تھا۔

کہاں تو دونوں کالج میں ایک دوسرے سے دور دور رہتے تھے لیکن جب قریب آئے تو پھر ان کی دھڑکنیں تک ایک ہو گئیں۔

شادی کے ڈیڑھ سال بعد شرجیل کی پیدائش ہوئی تھی۔ وہ ایک خوب صورت بچہ تھا۔ اس نے حسن اپنی ماں سے لیا تھا اور مردانہ وجاہت باپ سے ملی تھی۔

انیل دفتر سے واپس آکر شرجیل کا ہی ہو کر رہ جاتا۔ اس کے ساتھ باتیں کرتا۔ اسے گود میں اٹھائے گھومتا رہتا۔ مہوش کبھی کبھی اس پر ناراض بھی ہو جاتی۔ "یہ کیا بات ہے یار۔ تم اب صرف اپنے بیٹے کے ہو کر رہ گئے ہو۔"

"یہ بیٹا تمہارا بھی تو ہے۔"

"یہ تو ہے۔" مہوش مسکرا دیتی۔

زندگی اسی طرح ہنستے کھیلتے گزر رہی تھی۔ انیل کو بزنس کے سلسلے میں کچھ دنوں کے لیے باہر جانا پڑا۔

اس کی غیر موجودگی میں وہ سانحہ ہو گیا جس نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا۔

آگ پڑوس کے گھر میں لگی تھی لیکن اس نے آس پاس کے کئی گھروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

جن لوگوں نے اس سانحے کو قریب سے دیکھا تھا انہوں نے بتایا کہ مہوش چیختی ہوئی گھر سے نکلی تھی۔ اس کی گود میں بچہ تھا یا نہیں کوئی بتا نہیں سکا تھا۔ گھر شعلوں میں گھرا تھا اس لیے سب کی توجہ گھر کی جانب تھی۔ خود مہوش کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ محلے کے کچھ لوگوں نے اسے بچانے کی کوشش کی لیکن وہ جھلس چکی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے دم توڑ دیا تھا۔

خود محلے والوں ہی نے لاش کی پوسٹ مارٹم کروائی تھی۔ مہوش اور انیل کے گھر والوں کی خبر دی گئی تھی۔ دونوں گھرانے روتے پیٹتے وہاں آئے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ بچہ اندر ہی جھلس گیا ہوگا۔

انیل ملک سے باہر تھا۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں کیسی قیامت گزر گئی ہے۔ واپس آیا تو سب کچھ لٹ چکا تھا۔ صرف مہوش کی قبر باقی تھی۔ جو اس کی بیوی ہی نہیں بلکہ محبوبہ بھی تھی جس نے نہ صرف خوشیوں میں انیل کا ساتھ دیا تھا بلکہ انیل کا حوصلہ بھی بڑھایا کرتی تھی۔

زندگی اسی کے نام تھی۔ وہی سب کچھ تھی۔ اسے اپنا بیٹا بھی بہت یاد آتا تھا جس کو وہ جی بھر کر دیکھ بھی نہیں سکا تھا جو اس کی گود میں آکر ہمک بھی نہیں سکا تھا۔

انیل کے پاس پیسے تھے۔ اس کا بزنس بہت اچھا جا رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ جب شرجیل بڑا ہوگا تو وہ کاروبار سنبھال لے گا۔ اور وہ خود دنیا کی سیاحت کے لیے چلا جائے گا لیکن اب شرجیل ہی نہیں رہا تھا۔

اس نے بہت دنوں تک خود کو سوگوار رکھا تھا۔ اب کسی کام میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔ وہ اپنا بزنس اپنے منیجر کو سونپ کر ملک سے باہر نکل آیا تھا۔ تب سے مسلسل سفر میں تھا۔

منیجر اس کے اعتماد کا آدمی تھا۔ انیل جانتا تھا کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں بھی اس کے بزنس کو خوش اسلوبی سے چلاتا رہے گا۔ یہی ہوا۔ اتنے ڈھیر سارے سال گزر گئے وہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں چکرا رہا ہے۔ منیجر پابندی سے اس کے اکاؤنٹ میں رقم جمع کراتا ہے اس لیے کہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔

انیل اٹلی کے ایک گاؤں اسٹونیا کے ریسٹ ہاؤس میں آکر ٹھہرا تھا۔ عرصے سے یہاں آنے کا سوچ رہا تھا مگر اب موقع ملا تھا۔

یہ گاؤں مہوش کا پسندیدہ تھا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ اگر میرے بس میں ہو تو اسی ریسٹ ہاؤس میں جا کر رہ جاؤں۔

"کیا خاص بات ہے وہاں؟"

"میں ایک بار بابا کے ساتھ دنیا کی سیاحت پر جا چکی ہوں۔" مہوش نے بتایا۔ "یوں تو پوری دنیا ہی خوب صورت ہے مگر اسٹونیا کا جواب نہیں، وہ مجھے بہت پسند آیا۔"

"وہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کیا خاص بات ہے وہاں؟"

"وہاں کی بے پایاں خاموشی۔" مہوش نے بتایا۔ "جیسے وقت نے آکر دم سادھ لیا ہو۔ جیسے ساری زندگی کسی mute فلم کی طرح خاموشی سے گزرتی جا رہی ہو۔"

انیل ڈھونڈ کر اس گاؤں میں آیا تھا، جہاں پہلے بھی اس کی مہوش آئی تھی۔

اسے ایک چھوٹا سا پُرسکون ہوٹل بھی مل گیا تھا جس کے کمرے کی کھڑکی پیچھے پہاڑیوں کی طرف کھلتی تھی۔ پہاڑ دور سے دھندلے دھندلے سے نظر آتے تھے۔ ان کی چوٹیوں پر برف جمی رہتی تھی اور ہلکے بادل دھویں کی طرح چکرایا کرتے تھے۔

انیل اسی کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر دوربین سے سامنے والی پہاڑیوں کو دیکھا کرتا تھا۔ سارا منظر اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس وقت وہ سوچتا کہ اس کی مہوش بھی شاید اسی کھڑکی سے ان پہاڑیوں کو دیکھتی ہوگی جن کو وہ دیکھ رہا ہے۔

شاید وہ ان ہی گلیوں اور بازاروں سے گزرتی ہوگی، جن سے گزر رہا ہے۔ نہ جانے کیوں اسے محسوس ہوتا کہ اس شہر میں ہر طرف مہوش کی یادیں بکھری ہوئی ہیں۔ شاید وہ یہاں کھڑی ہوتی ہوگی۔ شاید وہ اسی ہوٹل کے ڈائننگ روم میں بیٹھ کر اپنی پسند کے کھانے کھاتی ہوگی۔ پتا نہیں کیوں۔ اس شہر میں اس کے لیے ایک انجانی سی کشش تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب اس کا پاگل پن ہے۔ اس کے باوجود کھڑکی سے پہاڑیوں کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ وہ خود سے بلند آواز میں بولا کرتا۔ "مہوش! میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے دور بہت دور جا چکی ہو، شاید ہماری ملاقات اب قیامت میں ہو لیکن تم ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہو۔ اس وقت بھی میرے پاس ہو۔ وہ دیکھو، وہ سامنے کی پہاڑیاں دیکھ رہی ہو نا۔ تم کو تو یہ بہت پسند تھیں۔ ان پر چھائے ہوئے سرمئی بادل تمہیں یاد ہوں گے۔ تم ان کو دیکھا کرتی ہوگی.... کیوں کہ تمہارا مزاج ہی ایسا تھا، قدرت کے مناظر سے پیار کرنا۔ میں بھی انہیں تمہاری آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔"

اس شام بھی وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا بادلوں اور پہاڑیوں کو دیکھتا رہا تھا۔ کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک نے اسے چونکا دیا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے روم سروس کو کافی کا آرڈر دیا تھا۔

اس نے دروازہ کھولا تو ایک ویٹر کافی کی ٹرے لے کر دروازے پر کھڑا تھا۔ "سوسیڈ کافی" اس ویٹر نے ادب سے کہا۔

انیل کو وہ ویٹر بہت اچھا لگا۔ اس میں مشرقیت سی تھی۔ اس کے خدوخال بھی ایسے ہی تھے جیسے اس کا تعلق مشرق سے رہا ہو۔ "نام کیا ہے تمہارا؟" انیل نے نرمی سے پوچھا۔

"سر میرا نام دانیال ہے۔" اس نے بتایا۔ "ویسے تو مجھے ڈینیل کہا جاتا ہے لیکن جب آپ جیسا کوئی مشرقی مہمان آتا ہے تو میں اپنا نام دانیال بتاتا ہوں۔"

انیل مسکرا دیا۔ "بیٹے ایک بات بتاؤں۔ دونوں ایک ہی ہیں۔ دانیال یا ڈینیل۔ ہاں، تمہاری انگلش بہت اچھی ہے۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ اٹلی کے اس دور دراز علاقے میں انگلش جاننے والا کون ملے گا لیکن تم سے مل کر اچھا لگا۔"

"سر! میں نے یہ انگلش اپنی ماں سے سیکھی ہے؟"

"کیا تمہاری ممی انگلش ہیں؟"

"نو سر! وہ اٹالین ہیں لیکن لینگویج ٹیچر ہیں۔ انہیں اٹالین کے علاوہ انگلش اور جرمن بھی آتی ہے۔"

انیل کو اس سے باتیں کر کے اچھا لگا تھا۔ وہ اجازت لے کر چلا گیا تھا۔ میں دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ بہت مہذب لڑکا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ پھر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مہوش کو مخاطب کیا۔ "مہوش جانتی ہو آج کیا ہوا؟ میں جس ہوٹل میں رکا ہوں نا وہاں ایک نوجوان ویٹر ہے۔ بہت اچھا، خوبصورت۔ اس کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے وہ کوئی مشرقی لڑکا ہے لیکن وہ اٹالین ہے۔ ایک بات ہے۔ اٹالین میں بھی مشرق کی جھلک دکھائی دیتی ہے اگر تم ہوتیں نا تو تم بھی یہی کہتیں۔"

وہ جب بھی اس طرح مہوش کو مخاطب کرتا تو نہ جانے کیوں اسے احساس ہوتا جیسے مہوش اس کی باتیں بہت قریب سے سن رہی ہے اور جواب بھی دے رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی آواز انیل سن نہیں پاتا تھا۔

دوسری صبح وہی ویٹر دانیال اس کے لیے کافی لے کر آگیا۔ "گڈ مارننگ سر۔" اس نے سلام کیا۔

"گڈ مارننگ۔ کیسے ہو؟"

"او کے ہوں سر۔"

"یہاں تمہاری ڈیوٹی کب تک ہوتی ہے؟" انیل نے پوچھا۔

"سر میں دن کے دو بجے سے رات کے دس بجے تک ہوتا ہوں۔"

"اور صبح کیا کرتے ہو؟"

"اسٹڈی کر رہا ہوں سر۔" اس نے بتایا۔

"بہت خوب۔" انیل نے تعریف کی۔ "اسٹڈی کرتے رہنا۔ یہی زندگی ہے۔ کامیابی کا سفر جاری رہنا چاہیے۔"

"سر آپ سے ایک بات کہنی تھی۔"

"ہاں ہاں کہو۔"

"کیا آپ میرے گھر چلنا پسند کریں گے؟" اس نے پوچھا۔

"تمہارے گھر؟" انیل نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"یس سر۔ کل رات جب میں یہاں سے گھر واپس گیا تو میں نے ممی کو آپ کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔"

"اوہو! تم نے میرے بارے میں کیا بتایا؟"

"میں نے آپ کی تعریف کی تھی سر۔ میں نے کہا تھا کہ آپ بہت اچھے گیسٹ ہیں۔ پاکستان سے آئے ہیں سکون کی تلاش میں۔ دن بھر کھڑکی میں کھڑے پہاڑیوں کو دیکھتے رہتے ہیں تو ممی کو آپ سے ملنے کا شوق ہو گیا۔"

انیل ہنس پڑا۔ اسے اس نوجوان پر پیار آنے لگا تھا جس نے اتنی سادگی سے سب کہانی سنا دی تھی۔

"آپ چلیں گے نا سر؟" اس نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ جب تم اور تمہاری ممی اتنے خلوص سے بلا رہے ہیں تو ضرور چلوں گا۔"

"گریزیا۔" اس نے جھک کر کہا۔

"یہ کیا ہوا؟ گریزیا۔"

"اس کا مطلب اٹالین میں شکریہ ہوتا ہے سر۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

انیل نے اس کے شانے پر پیار سے تھپکی دی۔ "بس بیٹا۔ تم مجھے اپنے ساتھ لے جانا۔"

"میں ہوٹل مینجمنٹ سے آف لے لوں گا سر۔"

وہ ٹھیک نو بجے انیل کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ انیل اس کے انتظار ہی میں تھا۔ دونوں ہوٹل سے چل پڑے۔

"آپ کو پیدل ہی چلنا پڑے گا سر۔" اس نے بتایا۔ "میرا گھر قریب ہی ہے۔ سامنے جو چھوٹی سی پہاڑی نظر آ رہی ہے، بس اسی کے اوپر ہے۔"

انیل نے اوپر کی طرف دیکھا۔ بہت سے ستارے جھلملا رہے تھے۔ یہ ستارے پہاڑی کے اوپر بنے مکانوں سے نکلتی روشنیوں کے تھے۔ بہت خوب صورت منظر تھا۔ اس نے دانیال سے پوچھا۔ "بھائی تمہارا گھر تو بہت خوب صورت جگہ پر ہے۔"

"یس سر۔ بہت خوب صورت۔ وہاں کی کھڑکیوں سے بھی دور دور کی خوب صورتی دکھائی دیتی ہے۔ میں بھی اسی طرح کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر ان مناظر کو دیکھتا رہتا ہوں جس طرح آپ دیکھتے ہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ۔ خوب صورتی کو تمہاری اٹالین میں کیا کہتے ہیں؟" انیل نے پوچھا۔

"بلیزا۔" اس نے بتایا۔ "اگر آپ یہاں رہ گئے تو میں آپ کو اٹالین سکھا دوں گا۔"

"اور میں تم کو اردو سکھا دوں گا۔" انیل نے کہا۔

"اردو؟" وہ چونک گیا۔ "تو آپ کی زبان اردو ہے سر؟"

"ہاں۔ کیوں تم چونک کیوں گئے؟"

"ممی کو بھی تھوڑی سی اردو آتی ہے۔" انیل نے بتایا۔

انیل کو حیرت ہوئی تھی۔ "تمہاری ممی کو کہاں سے آتی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میری ممی لینگویج ٹیچر بھی ہیں اور ایک این جی او سے بھی تعلق ہے۔ وہ اسی این جی او کے ساتھ پاکستان بھی جا چکی ہیں۔"

"ارے واہ۔ پھر تو بہت اچھا ہے۔" انیل نے کہا۔

اس دوران دانیال کا گھر آ چکا تھا۔ کاٹج ٹائپ کا ایک خوب صورت گھر تھا جو ایک بلند جگہ پر بنا ہوا تھا۔ آس پاس کے نظارے بہت خوب صورت تھے۔ دانیال نے بتایا تھا کہ وہ اپنی کھڑکی سے پہاڑیوں کو دیکھا کرتا ہے۔

"سر یہ ہے میرا گھر۔" اس نے بتایا۔

"بہت خوب صورت ہے۔" انیل نے تعریف کی۔

"بس دو منٹ دیں سر۔ میں ممی کو بتا کر آتا ہوں۔"

دو منٹ بعد ہی انیل اس مکان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ بہت خوب صورتی اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ ایک

دیوار پر مشہور اٹالین آرٹسٹ جاکوپوپوشی کی پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔

یہ پینٹنگ انیل کے پاس تھی۔ وہ ایک آرٹسٹک مزاج کا آدمی تھا۔ اس کی وجہ سے مہوش کو بھی آرٹ سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ وہ کسی بھی پینٹنگ کے رموز سمجھنے لگی تھی۔ وہ پینٹنگ دیکھنے میں مصروف تھا کہ دانیال کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔

''خوش آمدید۔'' اس نے انیل کا استقبال کیا۔ ''میں مارتھا ہوں۔''

وہ ادھیڑ عمر کی ایک قبول صورت عورت تھی۔ ''آپ کا بیٹا مجھے یہاں لے آیا ہے۔'' انیل نے بات کا آغاز کیا۔

''ہاں، میرا ڈیٹیل بہت اچھا ہے۔ اس نے تمہاری بہت تعریف کی تھی۔ میں نے کہا کہ تم جس کی تعریف کر رہے ہو، مجھے بھی تو ملوادو۔ پرانی باتیں کروں گی۔''

ان کے درمیان انگلش ہی میں گفتگو ہو رہی تھی۔

''ڈیٹیل بتا رہا تھا کہ آپ نے پاکستان بھی دیکھا ہے۔'' انیل نے کہا۔

''ہاں، میں اپنے این جی او کے ساتھ گئی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''بہت اچھا لگا تھا۔ بہت مزہ آیا۔ وہاں کے لوگ بھی بہت اچھے ہیں۔ تمہارا تعلق کہاں سے ہے۔''

''میرا تعلق اسی ملک سے ہے۔'' انیل نے بتایا۔

''پاکستان اور انڈیا کے لوگ تو اس طرف نہیں آیا کرتے۔'' اس نے کہا۔ ''عام طور پر روم اور وینس وغیرہ دیکھ کر چلے جاتے ہیں۔ پھر تم کس طرح اسٹونیا کی طرف آنکلے۔''

اس دوران ڈیٹیل ایک ٹرے میں کافی لے آیا تھا۔

''سر یہ کافی میں نے بنائی ہے۔'' اس نے انیل کو مخاطب کیا۔ ''کافی میں خود ہی بلینڈ کرتا ہوں۔ آپ کو پسند آئے گی۔''

مارتھا ہنس پڑی۔ ''میرا ڈیٹیل بہت کام کر لیتا ہے۔ مجھے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''

''اچھے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔''

ڈیٹیل بھی ایک طرف بیٹھ گیا تھا۔ انیل نے کافی پینی شروع کر دی تھی۔ کافی واقعی خوش ذائقہ تھی۔ ''واہ'' اس نے ڈیٹیل کو دیکھا۔ ''بہت اچھی کافی ہے۔''

''شکریہ۔'' ڈیٹیل نے اردو میں کہا۔

مارتھا ہنس پڑی۔ ''میں جب پاکستان گئی تھی تو میں نے کچھ الفاظ اردو کے بھی سیکھ لیے تھے۔ وہ میں نے ڈیٹیل کو بھی سکھا دیئے۔''

''مسٹر انیل تم نے بتایا نہیں کہ تم اسٹونیا کی طرف کیوں آنکلے؟'' مارتھا نے پوچھا۔

''بہت پہلے یعنی شادی سے پہلے میری بیوی یہاں آئی تھی۔ اس کو یہ جگہ بہت پسند تھی۔ اکثر کہا کرتی تھی کہ اگر میرا بس چلے تو میں اسٹونیا میں جا کر آباد ہو جاؤں۔''

''ہاں، ہمارا یہ قصبہ بہت اچھا ہے۔ ویسے اب کہاں ہے تمہاری بیوی؟''

''وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی۔'' انیل نے بتایا۔ ''میں اسی کی یاد تازہ کرنے یہاں آیا ہوں۔ نہیں جانتا تھا کہ یہاں ڈیٹیل جیسے نوجوان اور آپ جیسی مہربان خاتون سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔''

''ہاں۔ زندگی کے سفر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کون کہاں مل جائے یا کون الگ ہو جائے۔''

''سچ کہتی ہیں۔ ہمارا سفر اندھیروں میں ہوتا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اگلا موڑ کہاں ہے اور کیسا ہے۔'' پھر رک کر وہ بولی۔ ''میں جب کمرے میں داخل ہوئی تو میں نے دیکھا کہ تم جاکوپی پینٹنگ کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔''

''ہاں اس لیے کہ اس کی پینٹنگ میرے پاس بھی ہے۔'' انیل نے بتایا۔

''واہ۔'' مارتھا خوش ہوگئی تھی۔ ''آرٹ سے دلچسپی رہی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت زیادہ۔'' انیل نے بتایا۔ ''گرچہ میں ایک بزنس مین ہوں لیکن میں نے بزنس کو اپنے جسم کی پرورش کے لیے اور آرٹ کو اپنی روح کی پرورش کے لیے رکھا ہے۔''

''بہت اچھی بات کی تم نے۔'' مارتھا خوش ہوگئی تھی۔ ''میرے بیٹے کو بھی آرٹ سے بہت دلچسپی ہے لیکن اس کی ڈائریکشن کچھ اور ہے۔ اس کو میوزک سے لگاؤ ہے۔ خود گٹار بہت اچھی بجاتا ہے۔ دو بار اٹالین کنسرٹ میں انعام لے چکا ہے۔''

''موسیقی بھی اظہار کا ایک وسیلہ ہے۔'' انیل نے کہا۔ ''یہ تمام چیزیں اس مادی دنیا سے ماورا ہوتی ہیں۔''

اور کچھ دیر اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر انیل نے اجازت چاہی۔

''تم کب تک ہو یہاں؟'' مارتھا نے پوچھا۔

"چند روز تک تو ہوں۔"

"تم کل بھی ضرور آنا۔ ڈنر ہمارے ساتھ کرنا۔ میں کچھ اٹالین کھانے بنالوں گی۔ اطمینان رکھو۔ ہمارے یہاں پورک نہیں ہوتا، ہم سبزیاں کھاتے ہیں۔"

"میں سر کو لیتا آؤں گا۔" ڈینیل نے کہا۔

وہ پھر ڈینیل کے ساتھ ہوٹل کی طرف پیدل چل پڑا۔ راستے میں دونوں کے درمیان باتیں ہوتی رہی تھیں۔ "میری ممی بہت اچھی ہیں۔" ڈینیل بتا رہا تھا۔ "بہت پیار کرتی ہیں۔ اتنا خیال رکھتی ہیں جیسے میں ایک چھوٹا سا بچہ ہوں۔ ادھر نہ جاؤ۔ یہ نہ کرو۔ سردی ہو رہی ہے۔ یہ کوٹ پہن لو۔ دستانے ساتھ رکھ لو۔ اب میں کیا کیا بتاؤں؟"

"نہیں بیٹا، بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔" نہ جانے کیوں اس وقت انیل کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "مائیں اسی طرح پیار کرتی ہیں۔ ان کے لیے ان کا بچہ ہی دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہوتا ہے۔ خدا کا بہترین تحفہ ہوتا ہے۔"

"سر! آپ یہیں رہ جائیں نا۔" ڈینیل نے کہا۔

"نہیں بیٹے مسافروں کو واپس جانا ہوتا ہے۔" انیل نے کہا۔ "بہت سے کام ہوتے ہیں۔ بہت سی مصروفیات ہوتی ہیں۔ commitments ہوتی ہیں، اسی لیے مسافر واپس چلے جاتے ہیں پھر ایک بات یہ ہے کہ میں یہاں رہ کر کروں گا کیا؟"

"اپنا بزنس کریں گے۔" ڈینیل نے معصومیت سے کہا۔

انیل ہنس دیا۔ ویسے اس کا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ وہ یہیں اس کے پاس رہ جائے۔ چھوڑ دے دنیا کے بکھیڑے۔

اس نے انیل کو ہوٹل تک پہنچا دیا تھا۔ "سر آپ کل میرے ساتھ چلیں گے نا؟" اس نے پوچھا۔

"کہاں لے چلو گے؟"

"واک کرتے سر۔" اس نے کہا۔ "میں آپ کو یہاں کی خاص چیزیں دکھاؤں گا۔ یہ جگہ بہت خوب صورت ہے سر کیوں کہ یہاں میری ماں رہتی ہے۔"

انیل نے بے ساختہ اسے پیار کر لیا۔ "بیٹے تم نے ایک ایسی بات کہہ دی ہے جو نہ جانے کتنے دانشوروں کے اقوال پر بھاری ہے۔"

"گریزیا۔" ڈینیل نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

[illegible]

تھا۔ "سر میرے پاس چار گھنٹے ہیں۔ دو بجے سے میری ڈیوٹی شروع ہو جائے گی۔ جب تک میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔"

انیل دوسرے دن دس بجے سے اس کے ساتھ ہی رہا۔ اس کے ساتھ گھومتے ہوئے انیل کو کچھ عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کو خیال آیا کہ اگر اس کا بیٹا زندہ ہوتا تو وہ اسی کی عمر کا ہوتا۔

اس نے سوچا اگر شرجیل اس کے ساتھ ہوتا تو وہ اس کی انگلیاں تھام کر اس کے ساتھ چلتا۔ دونوں باپ بیٹا اسی طرح گھومتے ہوئے بہت دور نکل جاتے اور نہ جانے کیا کیا باتیں کرتے۔

اسٹونیا میں گھومنے کی کوئی خاص جگہ تو نہیں تھی۔ ایک پرسکون علاقہ تھا۔ ٹریفک کا بے ہنگم شور بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ زندگی یہاں آ کر رکی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ ڈینیل اسے لے کر ایک اسٹور پر رک گیا۔ "سر اس اسٹور میں ہینڈی کرافٹ ملتا ہے۔" اس نے بتایا۔ "یہاں کی مقامی عورتیں یہ سب کچھ بناتی ہیں جو بھی ان علاقوں کی طرف آتا ہے وہ سوونیر کے طور پر اس اسٹور سے کچھ نہ کچھ لے جاتا ہے۔"

"تو تم یہ چاہتے ہو کہ میں بھی کچھ لے لوں۔"

"یس سر۔" ڈینیل شرما کر بولا۔ "بات یہ ہے سر کہ یہ اسٹور میری ایک دوست کا ہے۔"

"صرف دوست یا کچھ اور؟"

ڈینیل نے شرما کر اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ انیل کو اس کی یہ ادا بھی بہت پیاری لگی۔ بالکل مشرقی ادا تھی۔

"چلو اندر چلتے ہیں۔" انیل نے کہا۔

دونوں اسٹور میں داخل ہوئے۔ خاصا بڑا اسٹور تھا جس میں ہاتھوں سے بنائی ہوئی بہت سی چیزیں رکھی تھیں۔ ایک طرف مردانہ اور زنانہ ہینڈ بیگز لٹک رہے تھے۔ ایک طرف [illegible] تھے۔ دیگر اور بھی بہت کچھ تھا۔ کاؤنٹر پر ایک لڑکی کھڑی تھی جس کی آنکھیں ڈینیل کو دیکھ کر چمکنے لگی تھیں۔ دونوں نے اٹالین میں کچھ باتیں کیں۔ جو انیل کی سمجھ میں نہیں آسکی تھیں۔

ڈینیل نے انیل کا تعارف کروایا۔ لڑکی نے ہاتھ ملانے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ انیل نے بہت پیار سے مصافحہ کیا۔

"سر کرسٹینا کو انگلش نہیں آتی۔" ڈینیل نے بتایا۔

"کوئی بات نہیں۔ میرے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ یہ لڑکی تمہیں چاہتی ہے۔" انیل نے کہا۔

"یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا سر؟" ڈیبلی نے پوچھا۔

"اس کے چہرے کے تاثرات اور اس کی آنکھیں بہت کچھ بتا رہی ہیں۔" انیل نے کہا۔

"یہ تو ہے سر۔" ڈیبلی پھر شرما گیا۔

اس کا بار بار شرمانا انیل کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ انیل نے اس لڑکی کے اسٹور سے بہت کچھ خرید لیا۔ اس نے یہ سب کچھ ڈیبلی کے حوالے کر دیا۔ "یہ لو بیٹا۔ یہ تمہارا ہے؟"

"میرا.....! وہ کیوں سر؟"

"اس لیے کہ یہ میری خواہش ہے۔" انیل نے کہا۔ "کچھ تمہارے لیے ہے۔ کچھ تمہاری ممی کے لیے اور کچھ....."

انیل نے اِدھر اُدھر نظریں گھمائیں۔ ایک خوب صورت ڈریس دکھائی دیا۔ اس نے ڈیبلی سے اس ڈریس کی قیمت پوچھی۔ ڈریس خرید کر اس نے اس لڑکی کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ لو۔ یہ تمہارے لیے ہے۔"

لڑکی ہاتھ کے اشارے سے انکار کرتی رہی لیکن انیل نے زبردستی وہ پیک لڑکی کو پکڑا دیا۔ لڑکی نے جذبات سے مغلوب ہو کر انیل کا ہاتھ تھام لیا۔

خود ڈیبلی بھی اس وقت جذباتی سا ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ ہوٹل واپس آ گئے۔ رخصت ہوتے ہوئے ڈیبلی نے پوچھا۔ "سر آؤ نر پر چلیں گے نا؟ ممی نے کہا ہے۔"

"ضرور چلیں گے۔"

اپنی ڈیوٹی آف کر کے ڈیبلی انیل کے پاس آ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد دونوں ڈیبلی کے گھر پہنچ چکے تھے جہاں اس کی ممی انتظار کر رہی تھیں۔ اس نے انیل کے لیے بہت سی ایسی چیزیں بنا رکھی تھیں جن کا تعلق مشرق ہی سے تھا۔

ڈیبلی نے جب وہ تحفے اپنی ماں کو دیے تو وہ بہت خوش ہوئی۔ "ارے اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہ ہماری مشرقی روایت ہے میڈم۔ ہم جب کسی کے یہاں جاتے ہیں تو کچھ لے کر جاتے ہیں۔ پہلی بار تو میں یوں ہی چلا آیا تھا۔"

"بہت بہت شکریہ۔" یہ اس نے اردو میں کہا تھا۔

اسی دوران ڈیبلی کا فون آ گیا۔ ہوٹل والوں نے اسے کسی کام سے بلایا تھا۔ "بیٹا تم ان سے کہہ دو کہ تم اس وقت بزی ہو۔" مارتھا نے کہا۔

"ممی وہ کہہ رہے ہیں کہ بس دس منٹ کا کام ہے۔ آپ جب تک مسٹر انیل سے باتیں کریں۔ میں آتا ہوں۔"

"اوکے۔"

ڈیبلی کے جانے کے بعد مارتھا نے کہا۔ "مسٹر انیل آپ کے لیے ڈنر لگا دوں؟"

"نہیں ابھی نہیں۔ ڈیبلی کو آ جانے دیں۔"

"بہت اچھا بچہ ہے۔" مارتھا نے ماتا بھرے لہجے میں کہا۔ "دس منٹ کے لیے بھی کہیں جاتا ہے تو پوچھ کر جاتا ہے۔"

"کیوں نہ ہو۔ اس کی تربیت ہی آپ نے ایسی کی ہو گی۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ میں نے اس کو بہت توجہ سے پالا ہے۔"

"میڈم! اگر برا نہ مانیں تو میں ایک بات پوچھوں؟"

"کیوں نہیں؟ ضرور پوچھو۔"

"ڈیبلی کے فادر کہاں ہیں؟" انیل نے پوچھا۔

مارتھا انیل کے سوال پر کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا۔ "میں نہیں جانتی۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ بہت عجیب کہانی ہے۔" مارتھا نے ایک گہری سانس لی۔ "ڈیبلی مجھے ملا تھا۔ میں اس کی ماں نہیں ہوں۔"

"کیا؟" انیل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ یہ مجھے پاکستان میں ملا تھا۔ کراچی میں۔"

"میڈم۔ یہ تو آپ عجیب انکشاف کر رہی ہیں۔"

"ہاں مسٹر۔ میں ان دنوں اپنی این جی او کے ساتھ کراچی میں تھی۔ میں ایک دن اپنے تو نصل خانے کی گاڑی میں کہیں جا رہی تھی کہ میں نے ایک بلڈنگ دیکھی جس میں آگ لگی ہوئی تھی۔ لوگ نکل نکل کر بھاگ رہے تھے۔ عجیب قیامت کا منظر تھا۔ میں نے ایک عورت کو دیکھا جو اس بلڈنگ سے ایک بچے کو اپنے سینے سے لگائے چیختی ہوئی بھاگ رہی تھی۔ اس بے چاری کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح اس کا بچہ بچ جائے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ مجھ سے یہ سب دیکھا نہیں گیا۔ میں نے گاڑی رکوائی اور اس عورت کے پاس جا کر میں نے وہ بچہ اپنی گود میں لے لیا۔ پھر میں چیختی ہی رہی کہ یہ کس کا بچہ

ہے۔ کیوں کہ اس کی ماں تو میرے سامنے کچھ دور جا کر مر گئی تھی۔ بہت سے لوگ آ گئے تھے۔ ایک افراتفری مچی ہوئی تھی۔ میں نے اس بچے کی حفاظت کے پیشِ نظر یہی مناسب سمجھا کہ اس کو اپنے ساتھ لیتی آؤں اور بعد میں اپنی ایمبیسی کے ذریعے اس کے گھر والوں کا پتا لگاؤں۔ ہم نے اخبارات میں اعلان بھی کروایا۔ لوگوں کو بھی تلاش میں روانہ کیا لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ گھر میں صرف دو میاں بیوی تھے اور شوہر کہیں ملک سے باہر گیا ہوا ہے پھر میں نے مجبوراً اس بچے کو قانونی کارروائیوں کے بعد اڈاپٹ کر لیا۔"

انیل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ ایک سناٹے کے عالم میں یہ کہانی سن رہا تھا۔

مارتھا پھر کہہ رہی تھی۔ "میں اس بچے کو مکمل کارروائی کے بعد اپنے ساتھ ہی اٹلی لے آئی۔ لوگوں نے کہا کہ میں کیا حماقت کر رہی ہوں۔ واپس کر دوں اس کو، لیکن نہ جانے کیوں اس بچے سے مجھے اتنی محبت ہو گئی تھی کہ میں اس کو خود سے الگ کرنا نہیں چاہتی تھی اسی لیے اسے سینے سے لگائے اس کی پرورش کرتی رہی۔ اس کے لیے میں نے شادی بھی نہیں کی۔ بس اسی کی دیکھ بھال کرتی رہی۔ یہ ہے میری کہانی۔"

انیل بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس عورت کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اب وہ مچل کر رو رہا تھا۔

"ارے کیا ہو گیا مسٹر انیل؟" مارتھا حیران رہ گئی۔

انیل اب ہچکیوں سے رو رہا تھا۔

"پلیز بتائیں نا۔ کیا ہوا؟" مارتھا نے پوچھا۔

"ڈیٹیل..... میرا..... میرا بیٹا ہے۔" انیل نے روتے ہوئے بتایا۔

"کیا؟ آپ کا بیٹا؟"

"جی ہاں۔ میں اس وقت اپنے ملک سے باہر تھا جب میرے گھر میں آگ لگی تھی۔ مہوش ہی اس بچے کو گھر سے لے کر نکلی تھی۔ میں جب واپس آیا تو مجھے پتا چلا کہ مہوش کے ساتھ میرا بیٹا بھی اس دنیا میں نہیں رہا۔ اس کے بعد سے اب تک میرے پاس صرف اس کی یادیں ہی رہی تھیں۔ ہم نے اس کا نام شرجیل رکھا تھا اور اب برسوں کے بعد میرا بیٹا میرے سامنے آیا ہے۔"

مارتھا بھی رو رہی تھی۔

"میرے یہاں آنے کی وجہ یہ ہے کہ میری بیوی مہوش بھی اس شہر کی سیر کر کے گئی ہے۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ میری شادی سے بہت پہلے آئی تھی اسی لیے میں اس کی یادوں کو اپنے سینے سے لگائے یہاں آیا تھا لیکن یہاں آ کر کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ ایسا لگا کہ جیسے اس شہر میں کوئی میرا اپنا موجود ہے۔ چاروں طرف کسی اپنے کی خوشبو محسوس ہونے لگی۔ پھر جب میں نے ڈیٹیل کو دیکھا تو اچانک پیار کا ایک دھارا سا میرے سینے میں امڈ پڑا۔"

"دیکھو قدرت کے بھی کیسے کھیل ہوتے ہیں۔" مارتھا نے کہا۔ "یہ سب کچھ پلاننگ سے ہوتا ہے۔ تم یوں ہی اسٹونیا نہیں آئے ہو بلکہ قدرت اور خون کی کشش تمہیں کھینچ کر لائی ہے۔ قدرت تمہیں اپنے بیٹے سے ملوانا چاہتی تھی۔ اسی لیے تم کو یہاں پہنچایا گیا ہے۔ تم کو اپنا بیٹا مبارک ہو۔"

"نہیں میڈم۔ وہ آپ کا بیٹا ہے۔ وہ آپ کے پاس ہی رہے گا۔ میرے لیے یہ اطمینان ہی بہت ہے کہ میرا بیٹا زندہ ہے اور آپ جیسی مہربان اور پیار کرنے والی ماں اس کی پرورش کر رہی ہے۔ اب میں کل یہاں سے چلا جاؤں گا۔ قدرت مجھے جس کام کے لیے یہاں تک لائی تھی۔ وہ کام پورا ہو چکا ہے۔ بس میری خواہش ہے کہ صرف ایک بار آپ کا ڈیٹیل میرے سینے سے لگ جائے۔ بس۔"

مارتھا رو رہی تھی۔ اسی دوران ڈیٹیل بھی واپس آ گیا تھا۔ وہ مارتھا کو روتے دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ "کیا ہوا می؟ کیوں رو رہی ہیں؟"

"بیٹے تمہارے یہ انکل کل یہاں سے جا رہے ہیں۔ اسی لیے رونا آ گیا تھا۔"

ڈیٹیل نے حیران ہو کر انیل کو دیکھا۔ انیل نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ ڈیٹیل اس سے لپٹ گیا۔

اب سب رو رہے تھے۔ انیل دوسری صبح کی فلائٹ سے واپس آ گیا تھا۔ اس نے ائرپورٹ سے نکلتے ہوئے مہوش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ "دیکھ لو مہوش۔ میں تمہارے بیٹے کو اپنے سینے میں چھپا کر اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اور ہاں، آتے وقت میں ڈیٹیل کا بینک اکاؤنٹ نمبر لے آیا تھا جس پر ہر ماہ ایک بڑی رقم ٹرانسفر ہوتی رہے گی۔ پاکستان جا کر کاغذی کارروائی پوری کر دوں گا تاکہ وہ میرے بزنس کا بھی مالک بن جائے۔ اسے مارتھا نے پروان چڑھایا ہے اس لیے اس سے ڈیٹیل کو جدا کرنا ناانصافی ہوتی ناں!

++

بھرم

جناب ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم،

ایک نئی سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ لوگ بھرم رکھنے کے لیے کیا نہیں کرتے۔ نفسیاتی گتھیوں سے گتھی یہ سچ بیانی قارئین کو ضرور پسند آئے گی کہ شمس کے گھر سے بیوی کے پٹنے کی جو آواز آتی تھی اس کا راز کیا تھا۔

فرح انیس

(کراچی)

"ڈکی بیٹا! اپنا سامان باندھ لیا تونے؟"

میں کمرے میں پلنگ پر بیٹھا بوجھل دل سے اپنا سامان پیک کررہا تھا کہ ماں جی کی آواز پر چونک کر ان کو دیکھنے لگا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑی مجھے مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔

"جی، آرہا ہوں بس۔" میں بیگ گھسیٹتا ہوا صحن میں آگیا۔

"بیٹا تو پریشان نہ ہو میری دعائیں تیرے ساتھ

ہیں۔" ماں جی میرے چہرے پر بکھری اداسی دیکھتے ہوئے بولیں۔

"ماں جی دعا کرنا۔" میں ان کے گلے لگتے ہوئے بولا۔

"رب ضرور میرے پتر کے لیے آسانیاں کرے گا۔" ماں جی میرا ماتھا چومتے ہوئے نمناک آنکھوں سے مجھے رخصت کرتے ہوئے بولیں۔

میں دونوں چھوٹی بہنوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ان سب کو خدا حافظ کہتے ہوئے بوجھل قدموں سے گھر کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

"جا رہا ہے تو۔" سامنے سے آتی روحی مجھے دیکھ کر اداسی سے بولی۔

اس کو دیکھ کر میرے قدم بے اختیار رک گئے۔

"دعا کرنا میرے لیے۔" میں اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"تو میری دعاؤں میں رہتا ہے، مجھے تیری بہت یاد آئے گی۔" وہ بھرائے لہجے میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"یاد تو مجھے بھی بہت آئے گی۔" اس کی بات پر میں یاسیت سے بولا۔

"اچھا چل زیادہ اداس نہ ہو، بس شہر جا کر مجھے بھول نہ جانا اور مجھے خط لکھتے رہنا۔" وہ مسکراتے ہوئے میرا دھیان بٹاتے ہوئے بولی۔

"تجھے کیسے بھول سکتا ہوں پگلی، بھلا کوئی اپنی بچپن کی محبت کو بھول سکتا ہے؟"

میری بات پر وہ شرما سی گئی۔

روحی میری چچا زاد تھی۔ ہماری بات ہمارے بچپن میں ہی بڑوں نے پکی کر دی تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ محبت میں تبدیل ہو گئی۔

"چلتا ہوں دیر ہو رہی ہے۔" میں اسے بغور دیکھتے ہوئے اجازت لیتے ہوئے بولا۔

"اچھا اپنا دھیان رکھنا اور خط لکھتے رہنا۔" وہ آنکھوں میں آئی نمی کو پونچھ کر یاد دہانی کراتے ہوئے بولی۔

میں اثبات میں سر ہلاتا ہوا خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گیا اور الوداعی نظروں سے اپنے گاؤں کو دیکھتا ہوا بس سٹینڈ تک آ گیا۔

بس چلنے پر میرا ہاتھ خود بخود فضا میں بلند ہوا اور میں کھڑکی سے لگا بیٹھا اپنے گاؤں کو خدا حافظ کرنے لگا، جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ بس کے آگے بڑھنے پر میں نے سیٹ سے سر لگا کر آنکھیں موند لیں۔ گو کہ گاؤں کو الوداع کہنا میرے لیے مشکل ترین امر تھا مگر میرا شہر جانا بھی اشد ضروری تھا۔

☆.....☆

میرا نام ذکی ہے۔ میں تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں۔ باپ کا انتقال تب ہی ہو گیا تھا جب ہم بہت چھوٹے تھے۔ میری ماں نے ہمارے لیے اپنے دن رات ایک کر دیے تھے۔ دن بھر بڑی حویلی میں کام کرتی، رات محلے کی عورتوں کے کپڑے سیتی۔ میں اپنی ماں کو یوں کام میں جتا دیکھتا تو میرا دل چاہتا کہ جلدی سے بڑا ہو جاؤں اور ان کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر لے لوں۔

ماں نے مجھے بہت مشکل سے بی کام تک تعلیم دلائی تھی۔ مجھ سے بڑی بہن کی شادی ہو گئی تھی۔ باقی دو چھوٹی تھیں اور اب ان دونوں کی ذمے داری مجھ پر تھی۔

بی کام کے بعد میں نوکری کے لیے کافی تگ و دو میں لگا ہوا تھا اور چاہتا تھا کہ اچھی نوکری لگ جائے۔ اس سلسلے میں مجھے میرے دوست کامران نے شہر میں نوکری کا مشورہ دیا۔ وہ میرے گاؤں کا ہی تھا اور چھٹی پر شہر سے آیا ہوا تھا، اس نے جو مجھے پریشان دیکھا تو بولا۔ "اس کے آفس میں جگہ ہے میں وہاں اپلائی کر کے دیکھوں۔" یوں ماں کے ہمت دلانے پر اور کامران کے کہنے پر میں اس کے ساتھ شہر آ گیا اور اس کے آفس میں جاب انٹرویو کے لیے گیا اور اگلے دن گاؤں آ گیا مگر تین ماہ تک آفس والوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں مایوس ہو گیا تھا۔ میری اداسی دیکھ کر ماں جی مجھے تسلی دیتیں۔

اس دوران میری دونوں بہنوں کی بھی منگنی ہو چکی تھی اور میں چاہتا تھا ان کو جہیز میں ضرورت کی ہر چیز دوں۔ دن بہ دن میری مایوسی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں اب کہیں اور نوکری کے لیے سوچ ہی رہا تھا کہ ایک شام کامران خود چلا آیا اور اس نے مجھے نوکری لگنے کی خوشخبری سنائی تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ شہر جانے کے خیال سے اگرچہ میں افسردہ بھی تھا مگر یہ خیال کہ اب میری ماں آرام کرے گی اور میں ہر ماہ پیسے بھیج دیا کروں گا جس سے وہ میری بہنوں کا جہیز بنائے گی۔ یہ سوچ میری افسردگی کو ختم کر دیتی۔

میں جانتا تھا اب میرا گاؤں آنا وہ بھی جلدی جلدی آسان نہیں تھا مگر ماں کے سکھ کی خاطر مجھے یہ بھی منظور تھا۔

پھر میں یہ بھی چاہتا تھا کہ جب روحی بیاہ کر آئے تو اسے کسی قسم کی تنگی کا سامنا نہ ہو۔

میں سارا راستہ سوچوں کا تانا بانا بنتا رہا۔ بس کے رکتے ہی میری سوچوں کا سلسلہ بھی رک گیا۔

میں بہت سے خواب لے کر شہر آ گیا تھا۔ اب اصل مسئلہ میری رہائش کا تھا جہاں جاتا اتنا کرایہ منہ کھول کر مانگتے کہ میری تو آدھی تنخواہ ہی کرائے میں نکل جاتی۔ اس موقع پر بھی کامران میرے کام آیا۔

"دیکھو ذکی ایک گھر ہے مگر وہ تم کو آفس سے کافی دور پڑے گا مگر کرایہ اس کا بہت کم ہے۔" شام آفس سے واپسی پر ہم دونوں چائے کے ہوٹل پر آ گئے تھے۔ میرے سامنے کرسی پر بیٹھا چائے کے سپ لیتا کامران بولا۔

میں جب سے شہر آیا تھا یعنی پچھلے ایک ہفتے سے کامران کے ساتھ رہ رہا تھا۔ کامران کرائے کے ایک کمرے میں پانچ لڑکوں کے ساتھ رہ رہا تھا جس میں سے تین کا تعلق تو گاؤں سے تھا باقی جو دو تھے وہ بھی کسی چھوٹے شہر سے آئے ہوئے تھے اور اب پچھلے ایک ہفتے سے ان سب کو میری موجودگی کافی ناگوار گزر رہی تھی۔

"یار میں بہت شرمندہ ہوں ورنہ میری پوری کوشش تھی کہ تو میرے ساتھ رہ۔" کامران شرمندگی سے بولا۔

"شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔ میں بھی سمجھ رہا ہوں تیری مجبوری کو، تو کون سا اکیلا ہے اس کمرے میں، تو پریشان نہ ہو بس مجھے اس گھر کا پتا جس کا ابھی تذکرہ کر رہا تھا۔" میں کامران سے بولا۔

"یار جب میں نیا نیا یہاں شہر آیا تھا تو میں نے کچھ ماہ ہی بمشکل اس گھر میں گزارے تھے کیونکہ میں پہلے ہی صاف بات بتا دیتا ہوں تجھے کہ اس گھر کا مالک مکان بہت سنکی ہے۔ بہت دماغ خراب کرتا ہے۔" کامران منہ بناتے ہوئے بولا۔

"مجھے کیا غرض اس مالک مکان سے میں اپنے کام سے کام رکھوں گا۔" میں کامران کی بات پر بولا۔

"تجھے غرض ہو نہ ہو مگر اسے تجھ سے بہت غرض ہوگی۔" کامران ہنستے ہوئے بولا۔

"خیر ہے کم کرایہ ہوگا تو بندہ یہ کڑوا گھونٹ بھی پی لے گا۔ چل ابھی چلتے ہیں۔" کھڑے ہوتے ہوئے میں نے کہا۔

اور ہم دونوں بس میں سوار ہو گئے۔ گھر واقعی آفس سے کافی دور تھا۔ اسٹاپ پر اترنے کے بعد بھی کافی چلنا پڑا۔ بہت سنسان علاقہ تھا اور آبادی بھی زیادہ نہ تھی۔

"آجاؤ۔" وہ مجھے لے کر ایک دروازے کی جانب بڑھا۔ کالا زنگ آلود سا دروازہ جس پر زور زور سے کامران ہاتھ مار کر بجانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کوئی چپل گھسیٹتا ہوا دروازے تک آیا۔ وہ ایک عمر رسیدہ آدمی تھا۔

"شمس بھائی یہ میرا دوست ذکی ہے، کرائے کے لیے اسے اوپر کا کمرا چاہیے۔" کامران میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"اندر آجاؤ۔" وہ دروازے کے آگے سے ہٹتے ہوئے بولا۔

"آؤ بیٹھو۔" صحن کے ایک کونے میں بچھے تخت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ بولا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ میں اپنے اردگرد طائرانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

صحن کے دائیں جانب پتلی سی گلی نظر آ رہی تھی جہاں پر ایک سے دو کمرے بنے ہوئے تھے جبکہ باہر دروازے سے صحن میں داخل ہوتے ہی بائیں جانب لکڑی کے پتلے اسٹیپ کی سیڑھی بنی ہوئی تھی جو اوپر کی جانب جا رہی تھی۔

شمس مجھے بغور جانچتی نظروں سے اوپر سے نیچے تک دیکھ رہا تھا۔ اس آدمی کے دیکھنے کے انداز پر مجھے کوفت سی ہوئی۔

"شادی شدہ ہو؟" شمس کے سوال پر میں گڑبڑا سا گیا۔

"جی نہیں۔"

"دیکھو یہ شریفوں کا محلہ ہے اور ہم سب عزت دار لوگ ہیں۔ رات دیر گئے مجھے یوں لڑکوں کا گھر سے باہر رہنا پسند نہیں۔ وقت پر گھر پر موجود ہونا ورنہ دیر سے آنے پر دروازہ نہیں کھولوں گا۔ اس کے علاوہ صحن کے اس حصے میں آنے کی کوشش نہ کرنا۔" وہ پتلی گلی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ہمارے ہاں پردے دار لوگ ہیں۔ اگر تم کو میری شرائط منظور ہو تو بولو۔" میاں شمس منہ میں پان رکھتے ہوئے بولا۔

"آپ بے فکر رہیں۔ میرا تعلق بھی شریف گھرانے سے ہے اور میری ماں نے ہمیشہ عورت کی عزت کرنا سکھایا ہے۔" میں شمس کی بات کے جواب میں تحمل سے بولا۔

"چلو ٹھیک ہے آجاؤ میں کمرا دکھاؤں تم کو۔" وہ میری بات پر بنا متاثر ہوئے بولا۔

میں اور کامران اس کے پیچھے چل دیے اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آ گئے۔ چھوٹی سی جگہ تھی جہاں چھوٹا سا باورچی خانہ تھا پھر ذرا سا فاصلے پر دروازہ تھا جو بند تھا۔ شمس نے اس دروازے کو کھولا تو میں اور کامران اندر داخل ہو گئے۔

وہ درمیانے سائز کا چوکور کمرا تھا جہاں براؤن رنگ کا قالین بچھا تھا۔ ایک کونے میں سنگل بیڈ رکھا تھا جبکہ بیڈ کے سامنے دیوار پر آئینہ نصب تھا۔

بیڈ کے دائیں جانب چھوٹی سی رائٹنگ ٹیبل رکھی تھی کمرے میں اٹیچ باتھ تھا۔ مجھے کمرا بے انتہا پسند آیا اور میں نے آج ہی شفٹ ہونے کی بات کی اور یوں رات تک میں اپنا سامان لیے یہاں موجود تھا۔ میں بہت خوش تھا مناسب کرائے کے ساتھ کوئی تنگی بھی نہ تھی۔

میں نے کمرے میں بنی واحد کھڑکی کھول دی جو نیچے صحن میں کھلتی تھی۔ تازہ ہوا اندر آئی تو سکون کا احساس ہوا۔ میں بیڈ پر آ کر لیٹ گیا اور جلد ہی گہری نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

صبح جب آنکھ کھلی تو میں خود کو کافی فریش محسوس کر رہا تھا۔ چائے بنا کر ناشتا کر کے میں آفس جانے کے لیے نیچے آ گیا جہاں مجھے شمس نظر نہیں آیا۔ میں دروازہ کھول کر آفس کے لیے نکل گیا۔

شام آفس سے واپسی پر مجھے شمس صحن میں بچھے تخت پر بیٹھا نظر آیا تو میں سلام کی غرض سے اس کی جانب چلا آیا جس کا اس نے کافی خوشگواری سے جواب دیا۔ میں وہیں اس کے پاس تخت پر بیٹھ گیا۔

''آنٹی کیا بالکل باہر نہیں آتیں۔'' میں سادگی سے بولا۔ کیونکہ میرے اندازے کے مطابق شمس کی بیوی میری ہی والدہ جتنی تو ہوں گی مگر میرے سوال پر شمس کے چہرے پر ایسی ناگواری آئی جیسے میں نے آنٹی کا نہیں صاحبزادی کے بارے میں پوچھ لیا ہو۔ میں جھینپ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ور مجھے کڑے تیوروں سے گھور رہا تھا مجھے اپنا آپ اس مجرم کی طرح لگا جس سے کوئی بہت بڑا جرم سرزد ہو گیا ہو۔ میں خاموشی سے اوپر آ گیا۔

''سچ کہتا ہے کامران کہ یہ آدمی سنکی ہے۔'' میں بیڈ پر لیٹ کر بڑبڑانے لگا۔

''یار یہ شمس کچھ عجیب آدمی نہیں ہے...'' میں شام کو آفس سے گھر جانے کے بجائے کامران کے چائے کے ہوٹل پر آ گیا تھا اور کل والی بات کامران کو بتانے لگا جسے سن کر کامران قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ اس کے اس طرح سے ہنسنے پر آس پاس کے لوگ اس کی جانب متوجہ ہو کر اسے دیکھنے لگے۔

''بس کر دے سب دیکھ رہے ہیں۔'' میں دبے لہجے میں سامنے کرسی پر بیٹھے کامران کو گھور کر بولا۔

''افسوس نہیں تو کیا کروں، تو نے بھی لطیفہ سنا دیا مجھے۔'' وہ ہنستے ہوئے دوبارہ بولا جس پر میں چڑ سا گیا۔

''دیکھ تو نے ایک تو اس کی بیوی کو آنٹی بول دیا اوپر سے پوچھا بھی اس کی بیوی کے بارے میں جس کو وہ سات پردوں میں چھپا کر رکھتا ہے۔''

''کیا مطلب، آنٹی نہ بولتا تو کیا بے بی بولتا۔'' کامران کی بات پر میں حیرانگی سے بولا۔

''ہاں کوئی مضائقہ نہیں بول دیتے مگر اس کے بعد تمہاری زندگی کی گارنٹی میں دے نہیں سکتا تھا۔'' کامران شرارت سے بولا۔

''کیا مطلب؟'' کامران کی بات پر میں الجھن بھرے انداز میں بولا۔

''تیری پہلی بات کا جواب یہ کہ شمس کی بیوی آنٹی نہیں، لڑکی ہے۔ شمس کے آگے وہ کم عمر لڑکی ہے میری تمہاری عمر جتنی اور دوسری بات کا جواب یہ وہ بہت سخت ہے سمجھ لو پردے میں چھپا کر رکھتا ہے اپنی بیوی کو اور ہر کرائے دار کو مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے جیسے اس کی بیوی کے سب ہی پیچھے لگے ہیں۔''

کامران کی بات پر میں بھی زور سے ہنس دیا واقعی وہ نفسیاتی آدمی ہے۔

☆......☆

مجھے یہاں آئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔ روحی اور گھر والے مجھے پابندی سے خط لکھتے جس کا جواب میں بھی پابندی سے دیتا۔

میری پہلی تنخواہ جب ماں کو ملی تو وہ بہت خوش تھی جس قدر رنگ و درد انہوں نے میرے لیے کی اس کا میں حق تو ادا نہ کر سکتا تھا مگر ان کو اپنی کوشش سے تھوڑا بہت تو آرام و چین دے سکتا تھا۔

اس ایک ماہ میں، میں نے شمس کی بیوی کو تو نہیں دیکھا، البتہ شمس مجھے آتے جاتے اکثر صحن میں بچھے تخت پر بیٹھا ضرور نظر آتا تھا مگر اس دن کے بعد سے میں نے دوبارہ

کوئی بات نہیں کی تھی۔ اکثر اوپر آتے جاتے نیچے کمروں والے حصے سے نسوانی آواز صحن تک آتی تھی جو یقینی طور پر اس کی بیوی ہی کی تھی۔

مجھے آج شمس کو کرائے کے پیسے دینے تھے۔ میں اس ہی غرض سے نیچے چلا آیا۔

شمس مجھے صحن میں نظر نہیں آیا۔ میں تخت پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا جب مجھے بیٹھے کافی دیر ہوگئی تو مجھے تھوڑی بے چینی ہوئی کہ کدھر ہے میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کمروں والے حصے کی جانب آگیا ادھر ہنوز خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

"کس کو دیکھ رہے ہو؟" پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے شمس بولا جس پر میں بوکھلا سا گیا۔

"وہ۔۔۔ وہ آپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔" میں جلدی سے بولا۔

"تم مجھے میرے کمروں میں ڈھونڈ رہے تھے۔" وہ کمروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"میں کمروں کے اندر نہیں گیا تھا میں باہر ہی کھڑا ہوں۔" میں آرام سے بولا۔

"ابھی تم کمروں کے باہر تھے، میں نہ آتا تو تم کمروں میں داخل بھی ہو جاتے۔" شمس کی بات پر مجھے غصہ آگیا مگر میں ضبط کر گیا۔

"میں کیوں داخل ہوتا۔ اتنی تمیز مجھ میں بھی ہے میں صرف ادھر تک آیا تھا آپ کو دیکھنے جو میری غلطی ہے۔" میں خفگی سے بولا۔

"آپ کا کرایہ دینے آیا تھا، میں اس کے ہاتھ میں پیسے تھماتے ہوئے وہاں سے جانے لگا۔

"سنو میاں میں پہلے ہی بول چکا ہوں میری بیگم اکیلی ہوتی ہے اس لیے ذرا خیال رکھا کرو۔ کوئی کام ہو تو یہاں صحن میں رک کے میرا انتظار کر لیا کرو۔"

شمس کی بات پر میرا خون کھول اٹھا مگر میں خون کے گھونٹ پیتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

"بیگم بیگم عجیب دماغ خراب کر دیا ہے اس نے جیسے میں تو مر رہا ہوں اس کی بیوی دیکھنے کو۔" میں تن فن کرتا ہوا کمرے میں ادھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔ رات تک مجھے شمس پر غصہ آتا رہا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں بیزاریت سے بستر پر پڑا تھا کہ نیچے سے آنے والی چیخ کی آواز پر میں بدحواس سا ہو گیا۔ وہ نسوانی چیخ تھی اس آواز میں گھبرا کر میں دروازہ کھول کر نیچے آگیا۔

کمرے کی جانب سے آتی آوازوں پر میں شش و پنج میں مبتلا تھا کہ آگے بڑھ کر دیکھوں یا نہیں۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ شمس کی آواز پر چونکا، وہ بری طرح سے اپنی بیوی پر چلا رہا تھا۔

مجھے اس عورت پر بے ساختہ ترس آیا جو بس اب روئے جا رہی تھی۔ میں واپس اوپر آگیا کیونکہ اُدھر جا کر میں نے اپنی شامت کو دعوت نہیں دینی تھی۔

میرا یہاں رہنا میری مجبوری تھی کیونکہ مجھے اتنے کم کرائے کا کمرا نہیں مل رہا تھا۔ مجھے شمس سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ کچھ عجیب قسم کا انسان معلوم ہوتا تھا جس طرح وہ مجھے آتے جاتے سیڑھیاں اترتے چڑھتے مشکوک نظروں سے دیکھتا تھا اس کی نظریں مجھے کوفت میں مبتلا کر دیتی تھیں، میں بعض اوقات جھنجلا کے رہ جاتا تھا وہ بولتا کچھ نہیں تھا مگر اس کی نظریں مجھے بہت کچھ بولتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

☆۔۔۔☆

سردیوں کا موسم آگیا تھا اب جبکہ کمروں کے پنکھے بند

ابراھیم لودھی

(دورِ حکومت 1517-1526)

خاندان لودھی کا آخری بادشاہ۔ سکندر لودھی کا بڑا بیٹا۔ باپ کے بعد بادشاہ بنا۔ باپ دادا کے برعکس مزاج کا اکھڑ اور غصیلا تھا۔ امراء ناراض ہو گئے۔ بزور دبانا چاہا تو زیادہ بگڑ گئے اور بغاوتیں کیں۔ اس کے بھائی جلال خاں نے بغاوت کی اور مارا گیا۔ چچیرے بھائی اعظم ہمایوں کو شبے کی بنا پر پکڑا۔ اس کے بیٹے فتح خاں کو بھی قید میں ڈال دیا۔ ان واقعات سے مشتعل ہو کر سب افغان باغی ہو گئے۔ خانہ جنگی میں قوت ضائع ہوئی۔ میواڑ کے رانا سانگا کو شکست دی۔ بہادر خان بہار میں خود مختار ہو گیا۔ ابراہیم اس کی سرکوبی نہ کر سکا۔ اسی اثنا میں رانا سانگا نے کابل سے بابر کو بلایا۔ پانی پت کی پہلی لڑائی میں ابراہیم مارا گیا 1526ء اور ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا آغاز ہوا۔

مرسلہ: راشدہ نواز، لیہ

ہوتے تھے تو ایسے میں نیچے سے آنے والی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ اکثر اب رات کے وقت نیچے سے اس کے اپنی بیوی پر چلانے کی آواز آتی تھی اس کی بیوی یا تو بس روئے چلی جاتی تھی یا کبھی کبھی سسکی سی آواز سنائی دیتی تھی۔

اس خبطی انسان کو لگتا ہے کہ اس کی بیوی پر سب ہی نظریں لگائے بیٹھے ہیں، کہیں کی ملکۂ حسن ہو جیسے جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لوگ پاگل ہوں۔ رات ہم دونوں فلم دیکھ رہے تھے کہ شمس کی بات یاد آنے پر میں چپ کر کامران سے بولا۔

☆......☆

کل اتوار تھا۔ میرے کافی اصرار پر کامران میری طرف آ گیا تھا ورنہ وہ شمس کی وجہ سے کافی گھبراتا تھا۔

''بیٹے ملکۂ حسن ہی سمجھ لے۔'' کامران کی بات پر میں منہ کھولے حیرت سے اس کو دیکھنے لگا۔

''تو نے کب دیکھ لیا وہ تو اپنی پردے میں رہتی ہے۔'' میں حیرانگی سے بولا۔

''ایک بار صحن میں اس کی جھلک دیکھی تھی۔ میں مبہوت سا اس کو تکتا رہ گیا۔ وہ سفید آنچل سر پر اوڑھے کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ ساحرہ ہے جو دیکھ لے اس کے سحر میں گرفتار ہو جائے۔''

''مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی شمس اتنی واجبی صورت کا عمر رسیدہ آدمی ہے اس میں ایسی کیا بات ہے جو اس لڑکی نے اس سے شادی کر لی، وہ اتنا دولت مند بھی نہیں کہ دولت کے لالچ میں کی ہو۔'' کامران کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''اوپر سے اس بے چاری پر ظلم بھی کرتا ہے۔ اکثر رات شمس کے چیخنے چلانے کی آوازیں آتی ہیں۔'' مجھے بھی اب اس اَن دیکھے وجود سے ہمدردی ہونے لگی تھی۔

انسانی فطرت میں تجسس چھپا ہے۔ میرے اندر بھی اب یہ خواہش انگڑائی لینے لگی تھی کہ میں بھی شمس کی بیوی کی ایک جھلک دیکھوں جس کی ایک جھلک دیکھ کر سامنے والا مبہوت رہ جائے مگر مجھے وہاں رہتے ہوئے چھ ماہ ہو گئے تھے اس دوران میں ایک بار بھی اسے نہیں دیکھ سکا تھا۔

رات عجیب سی آوازوں پر میری آنکھ کھل گئی۔ دیوار پر لگی گھڑی میں وقت دیکھا تو رات کے تین بج رہے تھے۔ آوازیں یک دم بلند ہو گئیں جیسے کوئی لڑ رہا ہو۔ میں گھبرا کر نیچے آیا۔

''میں زندہ نہیں چھوڑوں گا آج تجھے۔'' شمس کی کرخت آواز میرے کانوں سے ٹکرائی میں گہرا سانس بھر کر رہ گیا۔

یہ شمس کے الفاظ اور جواب میں اس مظلوم عورت کی سسکیاں تو روز کا معمول تھا۔ میں واپس پلٹنے لگا کہ کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔

''آج قصہ ختم کر دوں گا تیرا۔'' شمس کی دہاڑ پر بنا کچھ سوچے سمجھے میرے قدم اس کے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ مجھے اب اس بے بس عورت کی جان بچانی تھی۔

جس کمرے سے آواز آ رہی تھی میں نے بنا سوچے سمجھے اس دروازے پر زور سے ہاتھ مارا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔

شمس کی پھٹی پھٹی سی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں جیسے وہ توقع نہ کر رہا ہو میرے وہاں آنے کی مگر سامنے کے منظر نے تو مجھے اپنی جگہ ساکت کر دیا تھا۔

☆......☆

میں آفس سے آیا تو دروازہ کھولتے ہی سامنے تخت پر مجھے شمس بیٹھا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر میرے چہرے پر ناگواریت آ گئی۔ میں اس کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے لگا کہ اس کی آواز پر سیڑھی چڑھتے میرے قدم رک سے گئے۔

''کیسے ہو؟'' وہ آج خلاف توقع مجھے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ اس کے مسکرانے پر میں بے یقینی سے اس کی مسکراہٹ دیکھنے لگا حیرت کا جھٹکا تب لگا جب اس نے اپنے برابر بیٹھنے کو کہا۔

میں خاموشی سے چلتا ہوا اس کے برابر بیٹھ گیا۔ وہ سر اٹھائے آسمان کو دیکھنے لگا ہم دونوں کے بیچ بس خاموشی تھی۔

''جانتے ہو بھرم کیا ہوتا ہے، جب آپ سب کچھ کھو بیٹھو، آپ کا دامن خالی ہو مگر لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرنا کہ آپ تہی دامن نہیں ہو بلکہ آپ سب سے زیادہ خوش نصیب ہو تاکہ لوگ آپ کا خالی دامن دیکھ کر ہمدردی کے سکے آپ کی جھولی میں نہ ڈالیں... کیونکہ ان کے ہمدردی کے سکے ہمدردی کے نہیں ہوتے۔ یہ تو وہ کھوکھلے نشتر ہوتے ہیں جو ہوتے تو گز کی ڈلی ہیں مگر چیرتے دل کو ہیں۔ میں نے بھی دنیا کی نظر میں اپنا بھرم رکھا ہے، اب تم سے التجا ہے اس جھوٹے بھرم کو توڑنا مت۔'' شمس میرے آگے ہاتھ جوڑ کر رو دیا۔

میں حیرت سے اس کو روتا دیکھ رہا تھا۔ کتنا عجیب لگتا ہے ایسا انسان جو ہر وقت غوں غاں کرتا پھرے اور بے بسی

کی انتہا پر آ کر رو دے۔ مجھے اس کی بے بسی پر ترس سا آ گیا۔

''آپ بے فکر رہیں، آپ کا بھرم قائم رہے گا۔'' اس کے بندھے ہاتھوں کو میں نرمی سے کھولتا ہوا بولا اور اوپر چلا آیا۔

کافی دیر بے مقصد سا بیٹھا رہا پھر تھک کر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ کل شام میں گاؤں جا رہا تھا گھر والوں سے ملنے جس کی مجھے کافی خوشی تھی مگر اب اس رات کے بعد سے میری کیفیت بہت عجیب تھی جس کو میں سمجھنے سے قاصر تھا۔

جس رات میں نے دروازہ کھولا تھا اس رات شمس کو توقع نہیں تھی مجھ سے میں یوں دروازہ کھول دوں گا۔ میں خود پر شمس کی بھی حیرت بھری نگاہوں کو محسوس تو کر رہا تھا مگر میری نگاہیں سامنے کے منظر پر تھیں جہاں خالی بیڈ پر قدیم زمانے کا ٹیپ ریکارڈ رکھا تھا جس میں سے عورت کی سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ پورا کمرا خالی تھا بس اس خالی کمرے میں شمس اور وہ ٹیپ ریکارڈ تھا۔ میں نے شمس کو دیکھا جو مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ میرے دیکھنے پر اس نے اپنا سر جھکا لیا اس وقت مجھے وہ بہت شکست خوردہ سا معلوم ہوا۔ میں بنا کچھ کہے پلٹ گیا تھا مگر ان تین دنوں میں میری کیفیت بہت عجیب ہو گئی تھی میں نے اس کا ذکر کامران سے نہیں کیا تھا۔

اگلے دن میں بیگ میں ضروری سامان رکھ رہا تھا آج مجھے گاؤں کے لیے نکلنا تھا۔ دروازے پر کھٹکے کی آواز پر میں چونکا۔

''میں اندر آ جاؤں؟'' دروازے کے باہر کھڑا شمس مجھ سے اجازت طلب کر رہا تھا۔

''جی آ جائیں۔'' میرے کہنے پر وہ اندر آ گیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھ گیا جب سے میں یہاں کرائے پر آیا تھا وہ آج پہلی بار یہاں آیا تھا۔

''جا رہے ہو تم!''

شمس کی بات پر میں اثبات میں سر ہلانے لگا۔

''کب تک آؤ گے واپس؟'' وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔

''کچھ دنوں میں آ جاؤں گا۔''

میری بات پر وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔

''عاشی کا تعلق وہاں سے تھا جہاں دن سوتے ہیں اور رات جاگتے ہیں۔'' تھوڑی دیر بعد وہ بولا تو میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''اس سے میری ملاقات اپنے ایک دوست جمال کے گھر ایک تقریب میں ہوئی تھی، جمال میرا بچپن کا دوست تھا۔ دولت اس کے گھر کی باندی تھی۔ خدا نے شکل و صورت بھی اچھی نوازی تھی اس کے لیے کچھ بھی حاصل کرنا مشکل نہیں تھا جبکہ میرا تعلق درمیانے طبقے سے تھا۔ اس دوستی میں زیادہ ہاتھ جمال کا تھا۔ جمال کے گھر پارٹی میں میری پہلی ملاقات عاشی سے ہوئی تھی۔ سرخ رنگ کی میکسی میں کھلے بالوں میں سرخ گلاب لگائے وہ اس تقریب میں سب ہی کی نظروں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ وہ اس محفل کی جان تھی۔ اس کا حسین وجود جس کو ہاتھ لگاؤ تو میلا ہو جانے کا ڈر ہو اس کے لبوں پر تو مسکراہٹ تھی مگر اس کی آنکھوں میں چھایا حزن و ملال اس کی مخمور آنکھوں کے حسن میں چار چاند لگا رہا تھا۔ میری نگاہیں چپکے چپکے اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں، میں جو زندگی کی پچاس بہاریں دیکھ چکا تھا اور ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ ماں باپ تھے نہیں، میں اکلوتا تھا بہن بھائی کوئی تھے نہیں کبھی شادی کا خیال بھی نہیں آیا، اکیلے زندگی بسر کرنے کی عادت سی ہو گئی تھی مگر اب جو عاشی کو دیکھا تو دل نجانے کیوں اس کی ہمراہی کے خواب بننے لگا۔ جمال لگتا ہے آپ کو پسند کرتا ہے وہ جو لان میں ایک کونے میں کھڑی جوس پی رہی تھی میری بات پر چونک کر مجھے دیکھنے لگی اور پھر ہنستی چلی گئی۔ اس کی نقرئی ہنسی میرے کان میں رس گھول رہی تھی میں مبہوت ہوئے بس اسے تک رہا تھا۔

''ہم جیسی لڑکیاں پسند نہیں ہوتیں صرف دل بہلتا ہے۔'' وہ زخمی مسکراہٹ سے بولی اس کی بات پر میں خاموش سا ہو گیا۔

جدھر وہ رہتی تھی ادھر جانے کا سوچنا بھی میں گناہ تصور کرتا تھا مگر اب میرا دل مجھے سمیٹ کر صرف اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لے جاتا تھا اور میں اس کی ایک جھلک کے لیے ہزاروں لٹا کر آ جاتا تھا۔

اس کی آنکھوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔

''آپ کی آنکھوں میں اتنی اداسی کیوں ہے؟'' ایک دن مجھے اس سے بات کا موقع مل گیا۔ وہ سنہری لباس میں کسی ریاست کی شہزادی معلوم ہو رہی تھی۔

میں محویت سے اس کی آنکھوں میں لگا کاجل دیکھ رہا تھا۔

''پنجرے میں قید پرندے سے پوچھتے ہیں

پھڑ پھڑاتے کیوں ہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''آزاد کرادیں آپ کو کیا؟'' میری بات پر اس کی آنکھیں یک دم جیسے دمک اٹھی تھیں۔

پہلے جب جاتا تھا تو لگتا تھا کہ اس میں ہی میں اسے دیکھتا تھا مگر اب لگتا تھا جیسے وہ بھی مجھے دیکھتی ہے اس کی نظروں میں اب دلچسپی نظر آتی تھی۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جو قندیلیں جلتی تھیں وہ مجھے اندر تک شاد کر دیتی تھیں۔

''آپ نے کہا تھا ہم سے آزاد کرادیں، کیا یہ آزادی ہمیں دیکھنا نصیب ہوگی؟'' وہ مجھے دیکھتے ہوئے اداسی سے بولی۔

''ایک در سے آزادی مل کر دوسرے در کی قید منظور ہے؟'' میں اس کی آنکھوں میں شرارت سے جھانکتے ہوئے بولا جس پر وہ شرما کر نظریں جھکا گئی۔

''ہمیں وہ قید دل و جان سے منظور ہے۔'' اس کے شرمیلے لہجے پر میں دل و جان سے فدا ہو گیا۔

اس کو حاصل کرنا میرے لیے آسان نہ تھا جس گھر میں تھا وہ بھی بیچ کر چھوٹا سا گھر لیا صائقہ بائی کو میں نے اپنی ساری جمع پونجی دے دی تھی۔

اس کے بعد میں نے اس سے نکاح کیا اور عزت سے اپنے گھر لے آیا۔

''جو تم پہلے تھی وہ تمہارا ماضی تھا، ماضی کے اوراق کو اپنی زندگی سے نکال دو اب جو تمہارا حال ہے وہ بہت معتبر ہے اب تم میری بیوی ہو، میری عزت ہو جس کو میں معاشرے میں عزت دلاؤں گا جو میرے نام سے پہچانی جائے گی۔'' میں شادی کی رات اسے دیکھتے ہوئے نرمی سے بولا۔

''میں آپ کی تا عمر شکر گزار رہوں گی۔'' وہ میرا ہاتھ تھام کے بولی۔

زندگی عاشی کے آنے سے حسین ہو گئی تھی میں اسے پا کر بہت خوش تھا۔ میری چھوٹی سی کریانے کی دکان تھی ہمارا گزر بسر اچھا ہو جاتا۔ ہم صرف دو ہی تو تھے۔ میری پوری دنیا اس تک محدود تھی۔ عاشی کا بھی زیادہ کسی سے میل جول نہ تھا۔ وہ باہر جاتی بھی تو پردے میں جاتی تھی۔ میرا بس چلتا میں اسے سات پردوں میں چھپا کر رکھتا تاکہ کسی کی میلی نظر بھی اس پر نہ جائے۔

نہ جانے کیوں عاشی کی آنکھوں میں جو انتظار میں نے روز اوّل دیکھا تھا وہ اب بھی نظر آتا تھا اس کی نگاہیں اب بھی دروازے کے پاس بھٹکتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

''کس میں سوچ رہی ہوں ہم کیوں نہ اوپر والا کمرا کرائے پر چڑھا دیں۔'' رات وہ کھانے کے بعد مجھ سے بولی۔ ''خالی پڑا ہے اچھا ہے ہر ماہ کرایہ ہی آجایا کرے گا۔''

عاشی کا مشورہ میرے دل کو لگا اور کچھ ہفتوں بعد کرائے کے لیے میں نے تمہارے دوست کامران کو کمرا دے دیا مگر اس کی سرگرمیاں مجھے مشکوک لگیں جب دیکھو کمرے کی کھڑکی سے لگا گگن کا معائنہ کرتا رہتا تھا جو مجھے بہت ناگوار گزرتا تھا اور پھر ایک بار حد ہو گئی وہ اوپر کھڑا گگن میں رسی سے کپڑے اتارتی عاشی کو ٹکٹکی باندھے جیسے دیکھ رہا تھا میرا خون کھول اٹھا اور پھر میری سختی پر وہ کچھ دنوں میں ہی گھر چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔

''بس میں نہیں رکھوں گا اب کوئی کرائے دار۔ حد ہوتی ہے بے غیرتی کی۔'' میں غصے سے بولا۔

''جانے دیں اتنا غصہ نہیں کرتے۔'' عاشی میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتی ہوئی بولی۔ میں اپنے سانولے بھدے ہاتھوں پر اس کا سفید نازک سا ہاتھ دیکھنے لگا اور اسے غور سے دیکھنے لگا جو اس قدر حسین تھی جس کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کسی سلطنت کی شہزادی ہو۔

کچھ عرصے تک میں نے کوئی کرائے دار نہیں رکھا مگر پھر کچھ عرصے بعد عاشی کے بہت اصرار پر میں نے وقار کو رکھا حالانکہ میرا دل نہیں تھا۔ وقار دوسرے شہر سے آیا ہوا تھا کام کے لیے وہ بیس تینتیس سال کا کافی خوبرو لڑکا تھا۔ پہننے اور بات چیت کے سلیقے نے اس کی شخصیت کو اور چار چاند لگا دیے تھے۔ اس نے کبھی تانکا جھانکی کی کوشش نہیں کی تھی، اس کی یہی عادت مجھے پسند تھی وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا لڑکا تھا۔ اسے رہتے ہوئے پانچ ماہ ہو گئے تھے میں نے اس دوران عاشی میں رونما ہونے والی تبدیلیاں محسوس ہی نہیں کی تھیں میں تو اس سے محبت کرتا چلا آرہا تھا ہاں مگر ایک چیز تھی جو بہت واضح محسوس کی تھی وہ تھا عاشی کی آنکھوں میں سکون جیسے اس کا انتظار ختم ہو گیا ہو۔ اس کے انداز میں اب کھنچاؤ آنے لگا تھا وہ مجھ سے کترائی کترائی سی رہنے لگی تھی اس کا سجنا سنورنا جو شادی کے بعد ختم ہو چکا تھا اب دوبارہ سے وہ سنورنے لگی تھی۔ اس کا انداز مجھے بے چین کر رہا تھا۔ ایسا کچھ تھا جس کو کوئی نام دینے سے میں بھی

قاصر تھا۔

رات میری آنکھ ایک بھیانک خواب پر کھلی میں گھبرا کر بیٹھ گیا اور اپنے برابر دیکھنے لگا جہاں عاشی موجود نہ تھی۔ میں ماتھے پر آئے پسینے کے قطرے صاف کرنے لگا مجھے لگا عاشی کمرے سے باہر یا اور پچی خانے میں گئی ہوگی مگر جب کافی دیر ہوگئی تو میں اٹھ کے باہر گیا تو وہ مجھے باہر نظر نہ آئی میں نے اسے نیچے سب جگہ ڈھونڈ لیا وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ میرا دل میری کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا میں کمرے میں آکر بستر پر نیم دراز ہوگیا وہ پوری رات میں نے انگاروں پر گزاری مجھے اپنا آپ اس کبوتر کی مانند لگ رہا تھا جس نے بلی کے خوف سے آنکھیں بند کرلی ہوں۔

☆......☆

''وقار کو آج کمرا خالی کرنے کو بولا ہے میں نے۔'' میں نے چائے پیتے ہوئے بنا دیکھے اس سے کہا۔

''ہائے اپر کیوں؟ اچھا خاصا کرایہ آرہا ہے۔'' عاشی بولی۔

اس کی بات پر میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور دکان جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔

''آج شام تک آپ کمرا خالی کردیجیے گا۔'' میں دکان کے لیے جاتے ہوئے سیڑھی پر کھڑے وقار کو دیکھتے ہوئے بولا۔

دکان میں بھی کام میں دل نہ لگا۔ جلدی ہی واپس آگیا۔ میری متلاشی نظریں عاشی کو ڈھونڈ رہی تھیں مگر وہ نیچے کہیں بھی نہ تھی میں کافی دیر نیچے کھڑا خود پر قابو پاتا رہا پھر دبے قدموں اوپر سیڑھی کی جانب بڑھ گیا۔

''میں کیسے رہوں گی تمہارے بنا، مجھے نہیں رہنا اس شخص بڈھے کے ساتھ۔'' عاشی کی بھرائی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے سہارے کے لیے کچھ پکڑنا چاہا کہ میں لڑکھڑا سا گیا جس پر میرا ہاتھ دروازے پر لگا جو کھلتا چلا گیا۔ سامنے کے منظر نے مجھے ساکت کردیا وقار کے کندھے پر سر رکھے روتی عاشی مجھے دیکھ کر ایک لمحے کو گڑبڑائی تھی، اس کے چہرے پر میں نے ایک لمحے کو بس ندامت دیکھی تھی۔

''وقار اور میں ایک عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے وہ وہاں صرف میرے لیے آتے تھے میں وقار سے محبت کرتی تھی مگر وقار کے پاس اتنے پیسے نہ تھے جو وہ مجھے صائقہ بائی سے آزاد کرواتا مگر جب میں نے آپ کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت دیکھی تو میں نے جھوٹی محبت کا ناٹک رچا کر وہاں سے آپ کے ساتھ نکل آئی اور پھر میں نے چھپ کر آپ کے ہی فون سے اس کو یہاں کا ایڈریس دیا تھا ہم دونوں ایک دوجے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔'' عاشی کی سسکی کمرے میں گونجی میری نگاہ وقار کے ہاتھ پر تھی جو بہت استحقاق سے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔

''عاشی ٹھیک بول رہی ہے میں اور عاشی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔'' وقار مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میرا دل چاہا ان دونوں کے منہ پر اتنے تھپڑ ماروں کہ ان کا چہرہ لہولہان ہوجائے۔

''اب کیا چاہتے ہو؟'' مجھ سے میں خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔

''طلاق۔'' عاشی کی آواز پر میں نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔ جس کے لیے میں نے عمر بھر کی متاع داؤ پر لگائی تھی اس نے تو مجھے کبھی محبت کے قابل ہی نہیں سمجھا تھا اس کے لیے تو میں بس ایک مہرہ تھا میں نے اسے طلاق دے دی مگر اس شرط پر کہ رات کی تاریکی میں یہاں سے جائے گی تاکہ کسی کو خبر نہ ہو اور ایسا ہی ہوا۔ آج تک لوگ سمجھتے ہیں وہ میرے ساتھ رہتی ہے۔ میں بھی اپنی جھوٹی شان و شوکت کے لیے زور زور سے بولتا ہوں کہ لوگ سمجھتے ہیں میرا بڑا رعب ہے حالانکہ جب تک ساتھ تھی کبھی اونچی آواز میں نہیں بولا۔ اب جب نہیں ہے تو خوب اونچی آواز میں بول کر اپنے دل کے ارمان نکالتا ہوں۔'' شخص مجھے دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔

مگر اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی بہت کچھ عیاں کرگئی تھی۔

''آپ کی بیوی ہے، پورا حق ہے آپ کو اس سے جیسے چاہیں بولیں۔''

میں شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولتے ہوئے کھڑا ہوگیا اور سیڑھیاں اترنے لگا وہ بھی آہستہ آہستہ میرے پیچھے سیڑھی اترنے لگا اور نیچے آکر اپنے گالوں پر بہتے آنسو صاف کرتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد شخص کی غصیلی آواز اندر سے آئی جس پر پہلی بار میرے لبوں پر مسکراہٹ آگئی میں نے شخص کا بھرم ٹوٹنے سے بچالیا تھا میں مسکراتے ہوئے باہر کی طرف بڑھ گیا۔

++

نرالی

محترم مدیر

السلام علیکم !

میں کافی عرصے سے سوچ رہا ہوں کہ اپنی روداد حیات لکھوں لیکن حوصلے کا فقدان ہے کیونکہ میری کہانی جو بھی سنتا ہے اسے یقین نہیں آتا ہے کہ یہ سب سچ ہے۔ سب اسے گپ کہتے ہیں کہ میں کبھی معمولی سا ٹیلر ماسٹر تھا۔ میرا بوتیک اور بنگلا دیکھ کر یہی سمجھتے ہیں کہ میں ہمیشہ سے دولت مند رہا ہوں کیونکہ میں جن حادثوں سے گزرا ہوں وہ کسی فلمی کہانی سے کم نہیں ہے۔

شوکت حیات

(کراچی)

جمعہ کا دن تھا۔ شام کا وقت تھا میں گھر میں اکیلا تھا۔ ری بھابی شیریں اپنی تین برس کی بچی کو لے کر میکے گئی ہوئی ں، اس روز بھابی کی بہن صنوبر کی منگنی تھی۔ اس تقریب ں شرکت کے لیے مجھے بھی دعوت دی گئی تھی۔ بھائی جان نے بھی بڑا اصرار کیا تھا لیکن میرا ارادہ اس تقریب میں ریک ہونے کا بالکل بھی نہیں تھا اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ہ بھی اس تقریب میں شرکت نہیں کرتا۔ بھائی جان کی اہش تھی کہ صنوبر سے میرا رشتہ طے ہو جائے۔ صنوبر کے الدین نے بھی عندیہ ظاہر کیا تھا کہ وہ بھی صنوبر کا ہاتھ رے ہاتھ میں دینا چاہتے ہیں۔ کسی کنوارے کے ساتھ ب کسی لڑکی کا نام منسوب ہوتا ہے تو کنوارہ اسی کا ہو کر رہ جاتا ے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ میں بھی صنوبر کے خواب یکھنے لگا تھا۔ صنوبر اپنی بڑی بہن سے کہیں خوب صورت ی۔ اس کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو اس کا نکلتا ہوا د تھا۔ اس کے سرو قامت نے اس کے چہرے پر متناسب ن کی دل کشی میں اضافہ کر دیا تھا۔ انگ انگ سے مستی ل پڑتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے جسمانی نشیب و فراز یں بجلیاں بھری ہوئی ہیں۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں سیاہ یں اور سیاہ ریشمی بال بھی بے حد لمبے تھے۔ اس کی دودھیا ت تھی۔ سب سے بڑھ کر اس میں جو خوبی تھی وہ اس کا یقہ اور معصوم پن تھا۔ اس کی سادگی میں ایسا حسن تھا جو ہر کسی و متوجہ کرتا تھا۔ جب کہ اس کے برعکس میری بھابی شیریں ک دم پھوہڑ عورت تھی۔ اسے سارا دن میک اپ اور ایک ے ایک لباس پہننے سے فرصت نہیں تھی۔ کھانا پکانا نہیں آتا تھا۔ البتہ بسیار خوری کی عادی تھی۔ وہ مجھ سے بڑا خار کھاتی تھی۔ جلتی تھی۔ یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ مجھ سے نفرت کرتی تھی۔

میں ایک اہم فیصلہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ میرے اور شیریں بھابی کے درمیان اختلاف کی خلیج روز بہ روز بڑھتی جارہی تھی۔ اب میرا اس گھر میں رہنا دوبھر ہونے لگا تھا۔ حالات خراب سے خراب تر ہو جائیں گے میں نے کبھی بھولے سے سوچا بھی نہیں تھا۔ میری شادی صنوبر سے طے نہ ہونے اس کی منگنی کسی اور جگہ طے ہونے کی وجہ بھابی کی نفرت تھی۔ اس نے دانستہ اور ضد میں آکر صنوبر کی منگنی طے کر کے مجھ سے انتقام لیا تھا۔ یہ ایک ایسا زہر تھا جسے میں پی نہیں سکتا تھا۔ اس شکست اور ذلت نے میرے اندر ایک آگ سی بھڑکا دی تھی۔ میرے وجود میں ایک آتش فشاں دہکنے لگا تھا۔ نفرت کا لاوا کسی بھی لمحے ابل سکتا تھا۔

یہ بھی بتا دوں کہ میری بھابی شیریں چار برس پہلے میری محبوبہ تھی۔ میں اس کی پہلی محبت تھا۔ شیریں سے جب میری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو مجھے اس روز ہوشیار ہو جانا چاہیے تھا کہ یہ عورت محبت کے قابل نہیں ہے۔ یہ عورت اپنی غرض پوری کرنے کی خاطر مجھ سے محبت کر رہی تھی اور پینگیں بڑھا رہی تھی۔ وہ میری دکان پر کپڑے سلوانے کے لیے آتی تھی۔ ہفتے میں دو تین جوڑے بنواتی تھی۔ نہ تو کپڑے کے پیسے ملتے تھے اور نہ ہی سلائی کی اجرت۔ وہ بہت حسین تو نہیں تھی لیکن تھی پرکشش.................. میں نے اپنی زندگی میں بہت کم ایسی عورتیں.... دیکھی ہیں۔ اس کے جسم

کے نشیب و فراز نے مجھے اس کا دیوانہ بنا دیا تھا۔ میں اس سے اتنی شدید محبت کرتا تھا کہ اس سے کبھی رقم کا مطالبہ نہیں کیا۔ میں دکان کی تنہائی میں بہک جاتا اور من مانیاں کرتا تو وہ اعتراض نہیں کرتی بلکہ خود سپردگی سے پیش آتی۔ میں نے کبھی حد سے تجاوز نہیں کیا اور نہ ہی سوچا تھا اس لیے کہ محبت پر وحشیانہ آ جائے۔ جب کہ محبت اور جنگ میں ہر بات جائز ہوتی ہے، میں اسے سیر و تفریح کی غرض سے بھی لے جاتا۔ اچھے ہوٹلوں میں کھلاتا، فلموں کا اسے بہت شوق تھا۔ ہر نئی فلم کا پہلا شو وہ دیکھتی تھی۔ میں اپنی آمدن اس پر دل کھول کر خرچ کرتا تھا جس کی وجہ سے میں مقروض ہو گیا تھا۔

یہ دکان بھائی جان کی تھی۔ بھابی کے انتقال نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان کے غم کو کم کرنے کے لیے دوستوں نے مشورہ دیا تھا کہ وہ باہر چلے جائیں۔ دوستوں کی کوشش سے بھائی جان کویت گئے تھے۔ مجھے اس دکان کی ذمے داری سونپ گئے تھے۔ یہ دکان انارکلی میں تھی۔ وہ تین برس کے بعد وطن لوٹے تو اپنے ساتھ جوئے شیر لائے تھے۔ میں ان کے آنے اور دکان سنبھالنے کے بعد پندرہ دن کے لیے اپنے دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کی غرض سے مری چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو بھائی جان نے شیریں سے اپنی شادی کی خوش خبری سنائی۔ اسے میری نہیں ایک امیر کبیر شوہر کی ضرورت تھی۔ بھائی جان کی عمر چالیس برس سے اوپر تھی۔ شیریں اکیس برس کی تھی۔ ان میں کسی بھی لحاظ سے ایسی کوئی کشش نہیں تھی جو ایک عورت متاثر ہو سکے اور پھر وہ اپنی عمر سے دس بارہ برس بڑے دکھائی دیتے تھے۔ ان کا اور شیریں کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ وہ شیریں کے باپ دکھائی دیتے تھے۔ البتہ ان کے پاس جو دولت تھی وہ جوان سال عورت کیا کسی بھی نوجوان کنواری لڑکی کو متاثر کر سکتی تھی جو خوابوں کی دنیا میں رہتی ہو اور ایک شاہانہ زندگی گزارنا چاہتی ہو۔ دولت نے ان کی ہر کمزوری کو چھپا لیا تھا۔ شیریں مجھے یہ تاثر دیتی رہتی تھی کہ وہ اپنی عمر سے بڑے شوہر کے ساتھ بہت خوش ہے، اتنی خوش ہے جیسے ایک عورت خوش قسمتی کے ساتوں در کھلنے سے خوش رہتی ہے لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس نے خود کو کھو کر جو پایا ہے اس پر اندر ہی اندر وہ الجھتی رہی ہے، جب کبھی میں نے اسے جوان جوڑوں کو دیکھتے پایا اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی حسرت اور چہرے پر کرب محسوس کیا تھا۔

میں اٹھائیس برس کا ایک خوبرو جوان ضرور تھا۔ میری قامت کسی امریکی ہیرو کی طرح تھی جو لڑکیوں عورتوں کو متوجہ کر لیتی تھی اور ان کے بشرے سے ایسا لگتا تھا کہ ان کے سینے میں سرد آہوں کا غبار بھر جاتا ہے۔ میں صحت مند توانا بدن کا چاق و چوبند جوان تھا۔ ورزش نے میرے بدن کو مضبوط اور خوب صورت بنا دیا تھا۔ چونکہ میرے محلے میں جوڈو کراٹے اور باکسنگ کلب تھا اس لیے وقت نکال کر بہت کچھ سیکھ لیا اور تربیت پائی تھی۔ یوں تو میں ایک ٹیلر ماسٹر تھا۔ زنانہ کپڑوں کا ماسٹر تھا۔ مجھے اپنے کام میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ بھائی جان بھی ٹیلر ماسٹر تھے لیکن وہ میری مہارت کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ مجھے ہر ماہ پانچ سو روپے تنخواہ دیا کرتے تھے۔ اس میں سے تین سو روپے بھابی لے لیتی تھی۔

وہ مجھ سے ملنے اور نفرت کیوں کرنے لگی تھی میں سمجھ نہ سکا تھا۔ جب کہ اس نے اپنی مرضی اور خوشی سے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ جب میں بہت زیادہ سوچ بچار کرتا تو میرے ذہن میں ایک ہی بات ہوتی تھی کہ اسے مجھے کھو دینے کا غم مارے ڈال رہا ہے اس لیے کہ مجھ پر جوانی ٹوٹ کر برس رہی تھی جب کہ بھائی جان بڑھاپے کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے اور ان کے شانے جھکتے جا رہے تھے۔ وہ کسی سردلاش کی طرح تھے جو اس کی ہر فرمائش پوری تو کر سکتے تھے لیکن خوب صورت، جوان اور وجیہہ نہیں بن سکتے تھے اور پھر وہ بھابی میں دلچسپی لینے سے زیادہ دولت میں اضافہ کرنے لگے تھے۔ وہ جس محبت گرم جوشی اور جذبے کی بھوکی تھی، اب وہ ان میں رہی نہیں۔ وہ اس کھلونے کی طرح ہو کر رہ گئے تھے جسے کھیلنے کے بعد بچے کا دل بھر جاتا ہے۔ میری خوب صورتی اور وجاہت نہ صرف اس کی احساس محرومی میں اضافہ کر رہی تھی بلکہ اس کے پچھتاوے کا سبب بن گئی تھی۔ کیونکہ بھائی سے شادی کرنے کے بعد میں نے تنہائی میں کبھی بھولے سے فائدہ نہیں اٹھایا اگر میں پیش قدمی کر کے ماضی کے لمحات کی یاد تازہ کرنا چاہتا تو شاید وہ تعرض نہیں کرتی بلکہ آلودہ... ہو جاتا لیکن میں نے اسے ہمیشہ بھابی ہی کہا اور میلی نظر سے نہیں دیکھا۔ میں چار برس تک اس کی نفرت اور سرد مہری برداشت کرتا رہا۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے اس لیے اب اس گھر میں رہنا ناقابل برداشت ہونے لگا تھا۔ میں اس اُمید پر تھا کہ صنوبر سے میرا رشتہ طے ہو جائے گا لیکن شیریں نے مجھے اس محاذ پر بھی شکست دے دی تھی۔ لہٰذا اب میرا اس گھر میں ایک دن بھی رہنا میرے لیے توہین اور ذلت کا باعث تھا۔ مجھے شیریں سے اس روز شدید نفرت ہو گئی تھی جب وہ میری بھابی بن کر آئی تھی۔ اگر مجھے اس سے اس ہرجائی پن کا انتقام لینا مقصود ہوتا تو اس پر آنچ آ جاتی۔ اس میں اتنی ہمت کہاں ہوتی کہ بھائی جان سے میری زیادتی کی شکایت کرتی۔ شاید وہ غیر محسوس انداز سے مجھے غلاظت کی دلدل میں گرانے کے لیے ایسے لباس پہنتی، بھائی جان کی غیر موجودگی میں بغیر دوپٹے کے رہتی اور نہاتے وقت غسل خانے کا دروازہ اتنا کھلا رکھتی کہ میں بے دھڑک اندر گھس آؤں لیکن میں ایسے وقت گھر سے نکل جاتا تھا کہ اس کی بے حجابی، بے حیائی اور بے شرمی سے میں شیطان بن جاؤں۔

میں نے بہت سوچ بچار کی۔ پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے یہ شہر ہی چھوڑ دینا چاہیے۔ اس شہر میں کسی دوسری جگہ ملازمت کرنے سے میرا مستقبل نہیں بن سکتا تھا۔ یہاں اُجرت اور تنخواہ بہت کم ملتی تھی۔ میرے بہت سارے دوست جو کراچی جا کر آباد ہو گئے تھے ان کا مستقبل بن گیا تھا۔ زندگی سنور گئی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ وہاں اجرت اور تنخواہ بہت اچھی ملتی ہے۔ بھائی جان نے میری تنخواہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا تھا جب کہ وہ دوسرے ماسٹر کو بارہ سو روپے ماہانہ دے رہے تھے اور میں پانچ سو روپے پر ہی رکا ہوا تھا۔ جب میں نے اپنی کل پونجی کا جائزہ لیا تو سات سو دس روپے تھے۔ یہ پونجی میرے لیے کافی تھی۔ اگر میں نے ماضی میں رقم شیریں پر لٹائی نہ ہوتی اور مقروض نہ ہوا ہوتا تو آج میرے پاس ہزاروں کی رقم ہوتی۔ کیونکہ میں فضول خرچ نہ تھا اور پس انداز کرنے کا عادی تھا۔ یہ پونجی میرے لیے کافی تھی۔ میں بھائی جان سے ایک پیسا لینا نہیں چاہتا تھا۔ مانگنے پر وہ دے تو دیتے لیکن بھابی اپنی ٹانگ اڑا دیتی۔ ایک روپیا بھی نہیں ملتا۔ کیوں کہ بھائی جان دکان کی آمدنی بھابی کے پاس رات کو جمع کر دیتے تھے۔ وہ کسی ناگن کی طرح الماری کے پاس کنڈلی مار کے بیٹھی ہوتیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اتوار کے روز یہ شہر چھوڑ دوں گا۔ کل ریلوے اسٹیشن جا کر نہ صرف کراچی کے لیے ٹکٹ بک کروا کر آؤں گا اور بھائی جان کو اپنے فیصلے سے مطلع بھی کر دوں گا۔ بھائی جان مجھے روکیں گے... نہیں میں جانتا تھا۔ شیریں کے کان بھرنے کی وجہ سے وہ مجھے ہرگز ہرگز نہیں روکیں گے۔ وہ مجھ سے بیزار اور نالاں بھی تھے۔ جب کہ

میں نے انہیں کبھی بھی شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔

میں رات آٹھ بجے گھر مقفل کر کے اس کی چابی پڑوس میں دے کر اپنے ایک دوست چودھری برکت علی کے گھر کی طرف روانہ ہوا تاکہ اس سے صلاح مشورہ کر سکوں۔ میرے پاس موٹر سائیکل تھی۔ یہ موٹر سائیکل بھائی جان نے کویت جانے سے پہلے مجھے خرید کے دی تھی۔ میں نے اسے بڑا سنبھال کے رکھا ہوا تھا جیسے یہ کوئی قیمتی شے ہو۔ اس موٹر سائیکل پر میں نے شیریں کو بٹھا کے خوب گھمایا اور سیر و تفریح کرائی تھی۔ وہ ایک بیوی کی طرح مجھ سے چپک کر بیٹھتی تھی تو میرے بدن میں سنسنی دوڑ جاتی۔ اس کے باوجود میں نے بھولے سے اس سے سرفراز ہونے کا سوچا نہ تھا۔ یہ ہم دونوں کی محبت اور قرب کے لمحات کی گواہ تھی مگر یہ محبت تو کبھی کی فنا ہو چکی تھی۔ اب اس موٹر سائیکل کا ہی ساتھ چھوٹنے والا تھا۔ میں چودھری برکت علی کے ہاں جانے کی بجائے گلبرگ روانہ ہو گیا۔ گلبرگ کی ایک دکان میں رحمان بٹ کام کرتا تھا۔ اس کے پاس میرے بچپن کے دوست حمزہ کا پتا تھا جو کراچی چلا گیا تھا اور اس نے وہاں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی۔ رحمان بٹ سے مل کر کھانا کھا کر اور حمزہ کا پتا لے کر نکلا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ پھر جانے کیوں چشم تصور میں شیریں ابھر آئی۔ وہ مجھ پر ڈورے ڈالنے لگی تھی۔ وہ ایسا بھڑکیلا لباس پہنتی تھی کہ بے لباس لگتی تھی۔ قمیص کا گریبان اتنا کھلا ہوتا تھا کہ اسے شرم نہیں آتی تھی مگر مجھے آجاتی تھی۔ بستر پر ایسی آڑھی ترچھی ہو کر لیٹتی تھی کہ انگ انگ سے اتھی مستی دعوت گناہ دیتی تھی۔

پھر میں نے اس کا خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ اس وقت میں ایک سنسان سڑک سے گزر رہا تھا اور مستقبل کے خواب دیکھ رہا تھا۔ میں کراچی جا کر قسمت آزمائی کرنے کے خیال سے بہت خوش تھا۔ کیونکہ وہاں میرا جانی حمزہ تھا جو ہر طرح سے میری مدد کر سکتا تھا۔ وہاں جا کر کوئی مشکل نہ ہوتی۔ اچانک خیالوں کی دنیا سے نکل آنا پڑا۔ میں نے سڑک کے بیچوں بیچ ایک نقاب پوش کو کھڑے دیکھا تو اچھل پڑا۔ وہ اپنے بازو پھیلا کر مجھے رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

اس سڑک کے کنارے جو بجلی کے کھمبے تھے اور اس میں جو بلب لگے ہوئے تھے وہ کسی بوڑھے کی طرح اونگھ رہے تھے۔ یہ سڑک سائٹ فٹ چوڑی تھی۔ میں چاہتا تو دائیں بائیں سے اپنی موٹر سائیکل نکال کر لے جا سکتا تھا لیکن اس میں جان جانے کا خطرہ تھا کیونکہ وہ مسلح بھی ہو سکتا تھا اس لیے کہ وہ مجھے رہزنی کے ارادے سے روک رہا تھا۔ میرے رک جانے میں ہی میری عافیت تھی۔ اس وقت میری جیب میں کل پونجی تھی جو میں نے گھر سے نکلتے وقت کسی خیال سے نکال کر رکھ لی تھی۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ نہ صرف میری پونجی چھین لے گا بلکہ موٹر سائیکل بھی۔ تاہم میں نے ذہنی طور پر اس سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر لیا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا اس لیے کہ وہ جسمانی طور پر چھریرے اور متناسب بدن کا دکھائی دیتا تھا۔ جب میں نے اس کے قریب جا کر موٹر سائیکل روکی تو مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ نقاب پوش مرد نہیں، عورت ہے۔ اس نے کالے رنگ کا برقع پہنا ہوا تھا جو تنگ و چست لبادہ سا معلوم ہوتا تھا۔ برقع میں سے اس کی آنکھیں اور گورے گورے سڈول خوب صورت مرمریں ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ وہ متوحش سی نظر آ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جو بے حد خوب صورت تھیں وہ ہیرے کی سی چمک لیے ہوئی تھیں ان میں سے خوف جھانک رہا تھا۔ جیسے ہی میں نے موٹر سائیکل روکی وہ میرے پاس آ کر لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "پلیز! میری مدد کیجیے۔ بدمعاش میرا تعاقب کر رہے ہیں۔"

اس نے بڑی درد بھری آواز میں مجھ سے التجا کی تھی۔ اس کی آواز کھنکتے ہوئے سکے کی طرح تھی، مجھے ایک لمحہ میں فیصلہ کرنا تھا۔ وہ مجھے سراسیمہ، حد درجہ خائف ہو کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی جیسے اس کے دشمن کسی بھی سمت سے نمودار ہو سکتے ہیں۔ اس کے سراپا میں ایک ارتعاش سا تھا۔

میں نے بادل نخواستہ اس سے کہا۔ "بیٹھ جائیے۔"

اس نے ایک پل کی بھی تاخیر نہیں کی لپک کر میرے پیچھے بیٹھ گئی۔ چونکہ میرے دل میں بھی ان بدمعاشوں کی دہشت بیٹھ گئی تھی جو اس کے تعاقب میں تھے وہ اب مجھے نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اس کے سینے میں سانسوں کا زیر و بم جو تھا اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ان سے بچنے کے لیے بہت تیز دوڑتی رہی ہے۔ دوسرے لمحے میری موٹر سائیکل ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اس وقت میرے ذہن میں نہیں تھا کہ اس لڑکی کو کہاں لے جانا ہے۔ میرے ذہن میں ایک ہی بات سمائی ہوئی تھی کہ اس علاقے سے جتنی جلد ممکن ہو نکل جانا چاہیے۔ میں خود اس قدر سراسیمہ تھا کہ اس سے پوچھ ہی نہیں سکا تھا کہ کہاں پہنچاؤں۔ میں نے یاد آتے ہی اس سے فوراً پوچھا۔

''بدمعاش کس میں ہیں؟ گاڑی میں ہیں یا موٹر سائیکلوں پر... ؟''

''کار میں ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''سرخ رنگ کی ٹویوٹا کرولا ہے۔''

''کل کتنے بدمعاش ہیں وہ؟''

''تین۔'' وہ بولی۔ ''وہ پوری طرح مسلح ہیں۔ ان کے پاس پستول اور ریوالور ہیں۔''

میرے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ ان کے مسلح اور گاڑی ہونے کی اطلاع نے مجھے اور بھی خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ مجھے پالینے کی صورت میں بڑی آسانی سے روک سکتے تھے اور چند گولیاں میرے بدن پر داغ کر فرار ہو سکتے تھے۔ میں تیزی سے موٹر سائیکل چلا رہا تھا اور بار بار عقبی آئینے میں دیکھتا بھی جا رہا تھا۔ کوئی گاڑی تعاقب میں نظر نہیں آئی۔ پھر میں نے یہ کیا کہ رفتار کم کر کے ایک بغلی سڑک پر موڑ لیا۔ وہ بھی کسی متوحش ہرنی کی طرح بار بار پلٹ پلٹ کر دیکھے جا رہی تھی۔ میں نے مین روڈ پر آنے کے بعد اس سے پوچھا۔ ''آپ کو کہاں جانا ہے؟''

''مجھے خود نہیں معلوم کہ کہاں جانا ہے؟'' اس نے خود کلامی کے انداز میں جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' میں اچھل پڑا۔

''میرا ذہن اس وقت اتنا ماؤف ہے کہ میں بتا نہیں سکتی کہ مجھے کہاں جانا ہے؟'' اس کی آواز میں لرزیدگی تھی۔

''آپ اپنے گھر تو جا سکتی ہیں؟ آپ کا گھر کہاں ہے؟''... میں نے مڑ کے اسے دیکھا۔

''اگر میرا گھر ہوتا تو میں بے گھر کیوں ہوتی؟'' اس نے بڑی اداسی سے کہا۔ ''میں اپنے گھر کے ہوتے ہوئے بھی بے گھر ہوں۔''

''تو میں آپ کو کہاں لے جا کر چھوڑوں؟'' میں گھبرا سا گیا۔ ایک مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔ ''آپ کہیں تو جائیں گی؟ آخر کہیں تو رہتی ہوں گی؟'' میں نے کہا۔

''کیا آپ کا گھر نہیں ہے؟'' اس نے جیسے چونک کر پوچھا۔

میری نظروں کے سامنے کوند سا لپک گیا۔ اب میری سمجھ میں آ گیا کہ وہ کس قماش کی لڑکی ہے۔ اس نے شکار کو پھانسنے کے لیے یہ سارا کھیل کھیلا تھا۔ مجھے بڑی خوب صورتی سے بے وقوف بنایا تھا۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو آوارہ اور بازاری عورتوں کے پیچھے بھاگتے ہیں اور نہ ہی کبھی میری کمزوری رہی تھی۔ بالفرض محال اگر ایسا ہوتا تو میں شیریں کی محبت سے فائدہ اٹھا چکا ہوتا۔ ایسے کئی لمحات آئے تھے کہ میرا پیر پھسل سکتا تھا مگر میں نے کبھی محبت کے دامن پر کوئی دھبا آنے نہیں دیا تھا۔ میں نے فوراً ہی سڑک کے کنارے موٹر سائیکل روک لی۔

''کیا ہوا؟ آپ نے بائیک کیوں روک لی؟'' اس نے گھبرا کے پوچھا تو اس کی آواز میں لرزش تھی۔

''نیچے اترو۔'' میں نے نفرت اور حقارت سے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ ''میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو لڑکیوں یا عورتوں سے دل بہلاتے ہیں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ تم نے ایک غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے۔'' میں ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

''آپ نے میری بات سے غلط اندازہ لگایا ہے اور مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔'' وہ بلکتے ہوئے بولی۔

''کیا اب بھی سمجھنے میں کوئی کسر رہ گئی ہے؟'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''تم اس سڑک کے کنارے کھڑی ہو جاؤ۔ ایسے مردوں کی کوئی کمی نہیں جو تمہیں اپنے گھر لے جائیں گے اور تمہیں کہنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔''

''خدا کے لیے میری بات پوری تو سن لیجیے۔'' وہ گڑگڑائی۔ ''اس کے بعد جو مرضی آئے کہہ لیجیے، فیصلہ کر لیجیے۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ مجھ پر کیا افتاد آ پڑی ہے۔ میرے دشمن میری جان کے دشمن ہوتے تو میں نہیں ڈرتی۔ وہ میری عزت و آبرو کے دشمن ہیں۔ میں نے اس خیال سے آپ کو اپنے گھر لے جانے کے لیے کہا کہ آپ کے گھر میں آپ کی ماں ہوں گی، بہن بھائی ہوں گے وہاں پہنچ کر مجھے تحفظ ملے گا۔ میں پناہ میں آ جاؤں گی کہ میری عزت و آبرو محفوظ رہے گی۔''

اس کی باتوں نے مجھے عجیب تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ وہ لب و لہجے کی نفاست سے کسی اعلیٰ گھرانے کی لڑکی لگ رہی تھی۔ کسی شائستہ لڑکی کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ میری دکان پر ہر قسم کی لڑکیاں اور عورتیں آتی تھیں۔ ان کی بات چیت ہی سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ کس طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک بازاری عورت چاہے کتنی ہی پڑھی لکھی اور اونچی سوسائٹی میں کیوں نہ اٹھتی بیٹھتی ہو اس کا بازاری پن اور باطن کسی نہ کسی جملے یا حرکت سے ظاہر ہو جاتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اسے کہاں لے جاؤں؟ کہاں پناہ دلاؤں؟ گھر لے جا سکتا تھا۔ بھائی جان کہہ گئے تھے کہ وہ صبح ہی آئیں گے اس لیے کہ تقریب رات بارہ ایک بجے سے

قبل ختم نہیں ہوگی۔ بھروسا نہیں تھا۔ وہ رات کو بھی لوٹ سکتے تھے۔ بھائی جان کا کوئی ڈر اور خوف نہیں تھا جتنا شیریں کا تھا۔ وہ ایک فتنہ اور ہنگامہ کھڑا کر سکتی تھی۔ میں تو اس کی زبان سے نکلے زہریلے تیر سہہ سکتا تھا لیکن یہ لڑکی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ یہ لڑکی شیریں کی باتوں کا نشانہ بنے۔ وہ مجھے سوچ، تذبذب اور پریشانی میں مبتلا دیکھ کر بولی تو اس کی آواز بڑی دھیمی تھی۔ ''میں بڑی بدنصیب ہوں۔ میرے بارے میں کوئی بدگمانی مت کیجیے۔ میں صرف چند گھنٹوں کے لیے پناہ میں رہنا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد بوجھ نہیں بنوں گی۔ میری بات کا یقین کریں۔''

''کسی اچھے سے ہوٹل میں چل کر بیٹھا جا سکتا ہے جو نصف رات تک کھلا رہتا ہے اور بھرا بھی رہتا ہے۔'' میں نے تجویز پیش کی۔ ''وہاں کچھ وقت آسانی سے گزارا جا سکتا ہے۔''

''ہوٹل......؟'' اس نے پل بھر کے لیے سوچا پھر اپنا سر نفی کے انداز میں ہلایا اور خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''وہ بدمعاش میری تلاش میں شہر کا کونا کونا چھان ماریں گے۔ ہوٹلوں میں بھی جھانک سکتے ہیں۔''

''پھر کہاں جایا جا سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''کیا آپ کا گھر نہیں ہے؟ کیا آپ کے گھر میں ماں باپ اور بہن بھائی نہیں ہیں؟'' اس کا لہجہ پژمردہ تھا۔ ''آپ مجھے اپنے گھر لے چلیے۔ میں آپ کے گھر والوں سے بات کروں گی، انہیں نہ صرف میری بات کا یقین آ جائے گا بلکہ وہ میرے ساتھ......؟''

میں نے درمیان میں کہا۔ ''اگر میرا گھر ہوتا، میرے گھر والے ہوتے تو میں اتنا سوچتا کیوں۔''

''آپ کا گھر نہیں ہے؟'' اس کا لہجہ حیرت اور مایوسی بھرا تھا۔ ''پھر آپ کہاں رہتے ہیں؟''

''میں جہاں رہتا ہوں وہ گھر میرے بھائی جان اور بھابی کا ہے۔ اس گھر میں میرا وجود کانٹے کی طرح ہے۔ ان کا بس نہیں چلتا ہے کہ وہ کانٹے کو نکال پھینکیں۔'' معلوم نہیں کیوں میں جذباتی ہو گیا اور دل کی بھڑاس نکالنے لگا۔

دفعتاً سڑک پر تیز روشنی کا جال بچھ گیا۔ مخالف سمت سے کوئی گاڑی آ رہی تھی۔ وہ نصف فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ لڑکی بجلی کی تیزی سے موٹر سائیکل پر سے اتر کے سامنے والے بنگلے کی طرف لپکی، جس کی دیوار کے سامنے بڑا سا لان تھا اور اس لان کے اطراف میں نفاست سے تراشی روشیں تھیں۔ وہ لان میں پہنچ کر عقب میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ وہ مجھے بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ سڑک سے بھی کسی کو نظر نہیں آ سکتی تھی۔

وہ کار میرے پاس آ کر رکی تو میرا سینہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ یہ سرخ رنگ کی ٹویوٹا کرولا تھی۔ اس میں اگلی سیٹ پر میرے ہم عمر دو مرد بیٹھے تھے۔ پچھلی نشست پر بیس بائیس برس کا ایک خوب صورت سا جوان لڑکا بیٹھا تھا۔ وہ چہرے مہروں اور وضع قطع سے اچھے گھرانوں کے لگ رہے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں درندگی چھائی ہوئی تھی۔ اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے ایک مرد نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر بڑی بدتمیزی سے پوچھا۔

''اوئے کیا تم نے کسی لڑکی کو جاتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟''

''ایک لڑکی کو تو دیکھا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ لڑکی تو نہیں جو کالے رنگ کے برقع میں تھی؟''

''ہاں...... ہاں وہی لڑکی!!'' اسٹیئرنگ پر بیٹھے

جنوبی وزیرستان سے تعلق رکھنے والی ماریہ طور نے 2015ء میں نیشن کپ اسکواش ٹورنامنٹ میں غیر ملکی ٹائیٹل جیت لیا۔ احمد زئی وزیر قبیلے سے تعلق رکھنے والی اس کھلاڑی نے اسکواش کی دنیا میں اپنا ایک مقام بنایا ہے۔ ماریہ نے برطانیہ کی تام لنسن کو 3-2 سے شکست دی اور اپنے اعزاز کا دفاع کیا۔

***

جرمنی کی میری کرسٹائن مقناطیسی شخصیت کی حامل ہے۔ وہ درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہے اور اس نے اپنے طلبہ کو تعلیم برائے تکمیل سے متعارف کروایا۔ میری قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر مقبول ہے۔ جرمنی کے علاوہ نائیجیریا اور دیگر افریقی اسکولوں کے باہمی تعلیمی منصوبوں کی تکمیل کے لیے انتخاب کا پہلا انتخاب میری ہی ہوتی ہے۔ میری کو گلوبل ٹیچرز پرائز میں نامزدگی کے علاوہ سرکاری طور پر بہترین ''رہنما معلم'' کے اعزاز سے نوازا گیا۔

مرسلہ: منشی محمد عزیز میمن۔ وہاڑی

ہوئے مرد نے سر ہلاتے ہوئے فوراً کہا۔ ''لمبے سے قد کی خوب صورت سی لڑکی..... کدھر گئی؟''

''ایک سفید رنگ کی ٹویوٹا کرولا والے سے لفٹ لے کر ابھی ابھی گئی ہے۔'' میں نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ مجھے جھوٹ بولتے ہوئے بڑی ہنسی آرہی تھی۔ ''اس لڑکی نے مجھ سے لفٹ مانگی تھی چونکہ میری موٹر سائیکل خراب ہوگئی تھی اس لیے سفید کار والے نے اسے لفٹ دی تو وہ اس کے ساتھ چلی گئی۔ اس لڑکی نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے ماڈل ٹاؤن جانا ہے۔ پہنچا دو تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

''اس کار میں کیا اور بھی لوگ تھے؟'' اسٹیئرنگ والے نے گیئر بدلتے ہوئے پوچھا۔

''اس کار میں صرف ایک ہی مرد تھا۔ وہ فلم انڈسٹری کا نامور اداکار تھا۔''

''اداکار کا کیا نام تھا؟''

''شان!'' میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے اس سے آٹوگراف بھی مانگا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا۔''

''شان.....!!''

ان تینوں کے چہروں پر حیرت چھا گئی۔ وہ بری طرح چونک اٹھے تھے۔ دوسرے لمحے ان کی گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ میں اس گاڑی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی تو میں نے روش کے پاس جا کر چھلانگ لگا۔ وہ پیٹ کے بل گھاس پر جھاڑیوں کے پاس لیٹی ہوئی تھی۔ گاڑی اس تیز رفتاری سے گئی تھی کہ ایکسیڈنٹ کا ہونا ممکن تھا۔ میں نے دل میں دعا کی کہ وہ کسی کھمبے سے ٹکرا جائیں' پھر میں نے دبی زبان میں کہا۔ ''آجائیں وہ بدمعاش رفع ہوگئے ہیں۔''

وہ ایک لمحے میں اٹھ کھڑی ہوئی' پھر اپنا برقع جھاڑتی ہوئی نکل آئی۔ اس کی آنکھوں سے خوف و ہراس جھانک رہا تھا۔ وہ اس سمت دیکھتی ہوئی جہاں سے گاڑی آئی تھی بولی۔ ''آپ کی باتوں نے مجھے ڈرا دیا تھا۔ میں یہ سمجھی کہیں آپ مجھے ان کے حوالے نہ کر دیں۔''

''مجھے کیا فائدہ ہوتا؟ اگر انہوں نے انعام کا لالچ دیا ہوتا بھی تو میں ہرگز ان کے حوالے نہ کرتا۔ وہ لوگ اچھے نہیں تھے۔ ایک تسبری بدمعاش لگ رہے تھے۔'' میں نے کہا۔

''خدا کے لیے یہاں سے جلد نکل چلیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ پھر لوٹ آئیں؟'' وہ دہشت زدہ سی ہو کر بولی۔

''مگر جائیں کہاں؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے؟'' میں نے موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کہیں بھی چلیں مگر یہاں سے نکلیں۔'' اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دل بری طرح گھبرا رہا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہو۔''

وہ موٹر سائیکل کے اسٹارٹ ہوتے ہی پیچھے بیٹھ گئی۔ میں نے اس کی طرف گردن گھما کر دیکھا اور کہنے لگا۔

''میں آپ کو اپنے گھر لے جا رہا ہوں۔ میرے بھائی جان اور بھابی منگنی کی تقریب میں گئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کل صبح آنے کو کہا ہے۔ اگر وہ کسی وجہ سے جلد لوٹ آئے تو پھر کوئی اور ٹھکانا ڈھونڈنا پڑے گا۔ اگر نہیں آتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ صبح نو دس بجے ہی آئیں گے' پھر آپ چاہیں تو صبح تک رک سکتی ہیں؟''

میں آپ سے تم کے تخاطب پر آگیا تھا اس لیے کہ اب نفرت ہمدردی میں بدل گئی تھی۔ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ بدمعاش واقعی اس کے تعاقب میں تھے۔ اسے اغوا کر کے شاید اجتماعی زیادتی کرنا چاہتے تھے۔

''آپ اپنے بھائی جان اور بھابی سے مجھے ملوا دیں۔ میں ان سے بات کر کے ان کی تسلی کر دوں گی۔''

''گھر میں کوئی نہ ہوا تو آپ کو مجھ سے کوئی خطرہ تو محسوس نہیں ہوگا؟'' میں نے کہا۔ ''اس لیے کہ ناگ اور مرد ذات کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔''

''جی نہیں۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ آپ ایک شریف النفس ہیں۔''

''آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟'' میری آواز میں شدید حیرانی بھر گئی۔ ''میری آپ کی پہچان دس منٹ سے بھی زیادہ نہیں ہے؟''

''عورت ایک نظر میں مرد کو جان لیتی ہے کہ وہ کس فطرت اور قماش کا ہے اس لیے مجھے آپ پر بھروسا ہے۔''

میں مسکرا دیا۔ یہ اندازے کی غلطی تھی یا پھر عورت واقعی پہچاننے میں غلطی نہیں کرتی لیکن اس کے باوجود وہ دھوکا کھا جاتی ہے۔ اس مختصر سی شناسائی میں اس کا بھروسا اور اعتماد حیرت کی بات تھی۔ ویسے اس نے مجھے سمجھنے میں غلطی نہیں کی تھی۔ موٹر سائیکل چل پڑی۔ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد ہم اپنے گھر پہنچ گئے۔ دروازے پر تالا اس بات کا ثبوت تھا کہ بھائی جان اور شیریں تقریب سے نہیں لوٹے ہیں

چونکہ یہ تقریب شادی ہال میں منعقد تھی اور روایتی انداز سے بڑی دھوم دھام سے ہو رہی تھی لہٰذا دو تین بجے سے پہلے واپسی بہت مشکل تھی۔ ان کے نہ آنے سے مجھے ایک طرح سے بہت خوشی ہوئی۔ میں پڑوس سے چابی لے آیا۔ تالا کھول کے اندر داخل ہوا۔ روشنی کر کے اسے اندر آنے کے لیے کہا۔ موٹر سائیکل اندر لا کر کھڑی کی۔ بیرونی دروازہ بند کیا۔ پھر اسے اوپر اپنے کمرے میں لے آیا۔ تیز روشنی میں اسے دیکھا۔ اس نے اپنے چہرے سے نقاب نہیں ہٹائی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ہیرے کی طرح دمک رہی تھیں۔ نقاب اتنی دبیز تھی کہ چہرہ جھلک نہیں رہا تھا، صرف گورے گورے ہاتھ کسی بے نیام تلوار کی طرح نظر آ رہے تھے۔ ان گورے گورے مرمریں ہاتھوں کی خوب صورتی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ حسین ہو گی۔ اس کی آواز بڑی خوب صورت تھی۔ گلے میں جیسے سُر بول رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ سات سُروں کی دنیا آباد ہو۔

لمحوں تک کمرے کے ماحول پر سناٹا مسلط رہا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان خاموشی کی دیوار کھڑی تھی۔ وہ کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ شاید وہ اسی لیے کھڑی تھی۔ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ دلفریب انداز سے مسکراتی ہوئی بیٹھ گئی۔

کمرے میں اکلوتی کرسی تھی اس لیے میں اپنے بستر پر بیٹھا پھر پوچھا۔ ''اگر آپ نے کھانا نہیں کھایا ہے تو میں بندوبست کروں؟''

''شکریہ۔'' اس نے بڑے مہذبانہ انداز میں جواب دیا۔ ''میں کھانا کھا چکی ہوں۔ آپ زحمت نہ کریں۔ آپ صرف ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دیجیے۔ پیاس سے حلق خشک ہونے لگا ہے۔''

میں فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل اور کانچ کا گلاس لے آیا تو اس نے گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میں اسے نیچے سے ہی بھر لایا تھا۔ چہرے سے نقاب نہیں ہٹائی بلکہ نقاب اٹھا کر پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ اتنے سخت پردے کی وجہ میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ جب کہ میں اس کا دشمن نہیں تھا بلکہ تقریباً ہمدرد تھا اور پھر وہ میرے گھر میں میری پناہ میں تھی۔ میں اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے سخت بے تاب ہو رہا تھا۔ بڑا اشتیاق تھا۔ تجسس میں مبتلا تھا۔ اس نے میری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا تھا مگر میں مایوس نہیں ہوا تھا۔ دیدار کی نوبت ضرور آئے گی۔ جب وہ پانی پینے کے بعد گلاس واپس کرنے لگی تو میں نے کہا۔

''آپ برقع اتار کر آرام سے بیٹھ جائیں۔ اگر منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہونا ہے تو غسل خانہ اس طرف ہے۔ چلی جائیے۔''

''میں آرام سے ہی بیٹھی ہوئی ہوں۔'' وہ اسی آواز میں بولی۔ ''رات ایک بجے آپ کو زحمت دوں گی۔ آپ کو مجھے میرے گھر لے جا کر چھوڑنا ہو گا۔ میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔''

''مگر آپ نے تو یہ کہا تھا کہ میرا کوئی گھر نہیں ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''میں نے غلط نہیں کہا تھا۔'' اس نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ ''میرا گھر ہے لیکن اب وہ میرے بہترین دشمن کے قبضے میں ہے۔ میں اپنے گھر کے ہوتے ہوئے بھی بے گھر ہوں۔''

''گھر جب دشمن کے قبضے میں ہے تو جانا کیوں چاہتی ہیں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا وہ آپ کو پریشان نہیں کریں گے؟ جب آپ کو وہاں دوبارہ جانا ہی تھا تو ان سے خوف زدہ ہو کر بھاگنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟''

''وہ لوگ رات بارہ بجے فیصل آباد بذریعہ کار جانے والے ہیں۔ ان کا جانا بے حد ضروری ہے اور وہ ہر قیمت پر جائیں گے۔ چاہے میں ان کے ہاتھ لگوں یا نہ لگوں۔ وہ میری تلاش میں اس لیے ہیں کہ مجھے بھی فیصل آباد لے جا کر میرا حشر نشر کر سکیں۔ خدا نے بڑا کرم کیا کہ ان کے ہاتھوں سے بچا لیا اور میں فرار ہو گئی۔'' اس نے توقف کر کے گہری سانس لی۔ ''میرا آج کی رات گھر پر پہنچنا بے حد ضروری ہے۔ ایسا سنہرا موقع پھر کبھی نہیں ملے گا۔''

''آپ گھر کس لیے جانا چاہتی ہیں؟ گھر جا کر کیا کریں گی؟ اس گھر میں کوئی تو ہو گا جو پہرہ دے رہا ہو گا؟'' میں ایک سانس میں بول گیا۔

''میں گھر کس لیے جانا چاہتی ہوں یہ ایک راز ہے۔ گھر جا کر مجھے کچھ کرنا ہے۔ اس رات کا ایک ایک لمحہ میرے لیے قیمتی ہے۔ اگر میں نے اس رات کو کھو دیا تو ساری زندگی پچھتاتی رہوں گی اور پھر میری زندگی بے معنی ہو کر رہ جائے گی اس لیے میں اس گھر میں جانا چاہتی ہوں۔ آج کی رات گھر پر کوئی نہیں ہو گا۔ وہ فیصل آباد سے کل شام لوٹیں گے۔''

''پھر آپ وہاں سے نکل کے کہاں جائیں گی؟ آپ

اس گھر میں ایک رات سے زیادہ گزار نہیں سکیں گی۔"

"میں اس کا جواب آپ کو بعد میں دوں گی۔" اس نے گہری سانس لی۔ "پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کرتے کیا ہیں؟ میری مراد آپ کی مصروفیت سے ہے۔ کس دفتر میں ملازمت کرتے ہیں یا کوئی اور...؟" وہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"میں ٹیلر ماسٹر ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں زنانہ کپڑوں کی کٹنگ کرتا ہوں۔"

"کیا آپ کی اپنی دکان ہے یا کسی اور کی دکان پر ملازمت کرتے ہیں؟" وہ بڑی سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔ جیسے لڑکی والے رشتہ دینے سے پہلے پوچھتے ہیں۔ "دکان کہاں پر ہے؟"

"دکان میرے بھائی جان کی ہے۔ میں ان کی دکان پر ملازمت کرتا ہوں۔ یہ دکان انارکلی میں واقع ہے۔" میں نے بتایا۔

"آپ نے تو مجھ سے کہا تھا کہ میرا گھر نہیں ہے اگر میرا گھر ہوتا تو میں سوچتا کیوں؟" اس کی حسین آنکھیں مسکرانے لگیں۔

"میں نے غلط نہیں کہا تھا۔" میں کہنے لگا۔ "گھر اس کا ہوتا ہے جس کے نام لکھا ہوتا ہے۔ جس نے خریدا ہوتا ہے۔ یہ گھر میرے بھائی کی ملکیت ہے۔ اس گھر میں حکم میرے بھائی سے زیادہ میری بھابی کا چلتا ہے۔ میرا زور اس گھر پر کبھی چلتا اگر میرے پاس دولت ہوتی۔ میرے پاس دولت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

"آپ کو تنخواہ کیا ملتی ہے؟" وہ میری باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔

"پانچ سو روپے صرف۔" میں نے اپنی صحیح تنخواہ چھپانا مناسب نہیں سمجھا۔ جھوٹ بول کر کیا کرتا۔ میں نے صاف صاف بتا دیا۔

"صرف پانچ سو روپے؟" اس کی زبان سے تحیر زدہ آواز نکلی۔ "ایک ٹیلر ماسٹر کی تنخواہ صرف پانچ سو روپے؟"

"تنخواہ بہت کم ہے جس کا مجھے احساس ہے۔" میں اسے بتانے لگا۔ "اگر میں کہیں اور جا کر ملازمت کروں تو تنخواہ معقول مل سکتی ہے لیکن اس صورت میں مجھے بھائی جان سے الگ ہونا پڑے گا۔ الگ ہونے کی صورت میں رہائش اور طعام کا بندوبست کرنا ہوگا۔ لہٰذا بچیں گے پانچ سو روپے ہی اس لیے میں نے کہیں اور ملازمت کرنے کے بارے میں سوچا نہیں۔ گاڑی جیسے تیسے چل رہی ہے چلنے دو۔"

"پانچ سو روپے میں گزارہ ہو جاتا ہے؟"

"اللہ کا فضل ہے۔ بڑے مزے سے گزر رہی ہے۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "اس لیے کہ رہائش اور طعام کی سہولت جو ہے۔"

"پانچ سو کی رقم ہوتی کتنی ہے؟ اس سے مستقبل تو بن نہیں سکتا؟ زندگی کیسے اس تنخواہ میں گزاریں گے؟"

"گھر کا ماحول روز بہ روز میرے لیے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ میں دو ایک دن میں شاید الگ ہو جاؤں۔ کسی اور جگہ قسمت آزمائی کروں گا۔ رہائش بھی کہیں اور اختیار کر لوں گا۔" میں نے اسے کراچی جانے کے پروگرام کے بارے میں نہیں بتایا۔

"اگر میں آپ کے لیے کسی اچھی جگہ اچھی سی ملازمت کا بندوبست کر دوں تو کیا آپ کر لیں گے؟"

"کیوں نہیں؟" میں نے خوش ہوتے ہوئے جواب دیا۔ "اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ لیکن آپ مجھے ملازمت کیسے دلا سکتی ہیں؟ خود تو مصیبت میں پھنسی ہوئی ہیں۔"

"اس سے آپ کو کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ یہ میرا مسئلہ ہے۔" اس نے کہا۔

"کس قسم کی ملازمت ہو گی؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر دیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں ایک ٹیلر ماسٹر ہوں۔ میری تعلیم بس واجبی سی ہے۔ صرف میٹرک پاس ہوں۔"

اس ملازمت کے لیے تعلیمی قابلیت کی نہیں شرافت کی ضرورت ہے — خلوص اور جذبے کی ضرورت ہے۔ میں آپ میں یہ تمام خوبیاں دیکھ رہی ہوں۔ آپ کو میرے پاس ملازمت کرنی ہو گی۔"

"آپ کے پاس؟" میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ "آپ کے پاس میرے لیے کس قسم کی ملازمت ہو گی۔"

"یہ تو میں آپ کو کراچی چل کر بتا سکوں گی کہ آپ کو کس قسم کا کام کرنا ہو گا؟"

"کیا مجھے آپ کے ساتھ کراچی چلنا ہو گا؟" میں نے بظاہر حیرت سے پوچھا اور دل میں خوش ہو گیا تھا کہ کراچی جانے کی مراد بر آئی۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ اللہ نے کراچی جانے کا وسیلہ اچانک اور غیر متوقع طور پر

آپ ہی آپ بنا دیا تھا۔ وہ کتنا بڑا کار ساز ہے۔

"جی ہاں۔" وہ بولی۔ "میں یہاں اب ایک دن بھی رکنا نہیں چاہتی اس لیے کہ میری عزت اور جان کو سخت خطرہ ہے۔ اب کراچی جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میری آبرو کے دشمن خون آشام بھیڑیوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ کیا آپ کل میرے ساتھ کراچی چل سکتے ہیں؟"

میں نے اثباتی انداز میں اپنا سر ہلایا۔ "جب اور جس وقت جس گاڑی سے چلنے کے لیے کہیے میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔ کیا ملازمت کراچی میں کرنی ہوگی؟"

"آپ ابھی اور اسی وقت سے میرے پاس ملازمت پر ہیں۔" اس کی آنکھوں میں چمک کوند گئی۔

"مجھے کیا تنخواہ ملے گی؟" میری زبان سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

"پانچ ہزار روپے....." وہ بولی۔ "گو اس گرانی میں تنخواہ کم ہے لیکن رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جائے گا۔"

"پانچ ہزار روپے؟" میں حیرت اور خوشی سے اچھل پڑا۔ مجھے اپنی سماعت پر اعتبار نہ آیا اس لیے کہ اس دور میں یہ بہت بڑی رقم تھی۔

میں نے اس کی بات کو مذاق سمجھا۔ ایک لمحے کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ یہ کوئی پاگل لڑکی ہے جو مجھے بھی اپنے پاگل پن سے پاگل بنا رہی ہے۔ پانچ ہزار کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ اس نے پانچ ہزار روپے اس طرح سے کہہ دیا تھا جیسے یہ پانچ ہزار روپے نہ ہوں بلکہ پانچ روپے ہوں اگر وہ سات آٹھ سو روپے بھی کہتی تو میں تیار ہو جاتا اور اس کی بات کا یقین کر لیتا۔ میں نے اس کی طرف شدید حیرت سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر نقاب پڑا تھا۔ اگر اس کا بے نقاب چہرہ ہوتا تو اس کے چہرے سے کچھ اندازہ کر لیتا کہ وہ پاگل ہے یا نہیں۔ اس کی آنکھوں سے کتنا معلوم کر سکتا تھا؟ تاہم اس کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی چھائی تھی۔

"کیا آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے؟" اس کی آنکھوں سے گہری سنجیدگی بدستور جھانک رہی تھی۔

"جی ہاں۔" میں نے بڑی سچائی سے اعتراف کیا۔ "واقعی یقین نہیں آ رہا ہے۔ یقین آ بھی کیسے سکتا ہے۔ یقین آنے والی بات بھی نہیں ہے۔"

"آپ کا کہنا بجا ہے۔" اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے برقع کے کف کے بٹن کھولے۔ آستین کو کہنی کے قریب تک الٹا تو اس کی خوب

غزل

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
ہو عمرِ خضر بھی تو معلوم وقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے
ہم سے بھی اس بساط پہ کم ہوں گے بدقمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے
نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہے ہو وہی
دانش تری نہ کچھ مری دانش وری چلے
دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے
جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

صورت اور مرمریں سڈول کلائی کسی خنجر کی طرح بے نیام ہو گئی۔ اس کی کلائی میں سونے کا ایک جڑاؤ کڑا تھا۔ اس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس تیز روشنی میں ان کی چمک آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی۔ اس کے ہاتھ کی انگلی میں ایک ہیرے کی انگوٹھی بھی تھی۔ اس نے انگوٹھی اور کڑا نکال کر میری طرف بڑھایا۔

"آپ اسے اپنے پاس رکھ لیں۔ یہ دونوں چیزیں ساٹھ ہزار کی مالیت کی ہیں۔ کل جس وقت ہم کراچی کے لیے روانہ ہوں گے تب میں آپ کو ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی دوں گی۔ تب آپ یہ چیزیں واپس کر دیں۔"

"آپ اتنی قیمتی چیزیں میرے پاس ضمانت کے طور پر جمع کروا رہی ہیں؟" میں نے اس کے ہاتھ سے اس کی چیزیں نہیں لیں۔ "اگر یہ چیزیں میں دبا کر بیٹھ گیا تو آپ کیا کریں گی؟"

"ایک عورت کے لیے اس کی عزت سے زیادہ کوئی چیز قیمتی نہیں ہوتی۔" اس کی آنکھوں میں ایک شعلہ سا لپک

گیا۔ ”میں اتنا جانتی ہوں جب یہاں میری عزت محفوظ ہو سکتی ہے تو یہ چیزیں بھی واپس مل سکتی ہیں۔ مجھے چونکہ اپنی ذات پر بھروسا ہے اس لیے آپ پر بھی بھروسا ہے اگر میرے پاس اس وقت ایک لاکھ کی رقم بھی ہوتی تو میں آپ کے پاس رکھ دیتی۔“

”اب مجھے آپ کی بات کا یقین آ گیا۔“ میں۔۔۔ اپنے دل میں بڑی ندامت محسوس کرنے لگا تھا۔ ”آپ یہ چیزیں اپنے پاس ہی رکھ لیں۔“

وہ انگوٹھی اور کڑا پہننے لگی۔ میں اس ملازمت کے ملنے پر ششدر رہ گیا تھا۔ میں خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ مجھے بیٹھے بٹھائے پانچ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پر ملازمت مل جائے گی۔ ملازمت کس نوعیت کی ہوگی یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا اور نہ ہی وہ نہ جانے کس وجہ سے بتانے پر تیار تھی۔ یہ لڑکی اور اس کی باتیں نہ صرف بے حد عجیب بلکہ پُراسراری لگ رہی تھیں لیکن پانچ ہزار روپے کی تنخواہ کی پیشکش میں ایسی سنسنی خیزی اور کشش تھی کہ وہ پُراسراریت پر غالب آ گئی۔ اس رقم کو سن کر میرے منہ میں پانی آنا فطری امر تھا۔ میں نے چند لمحوں میں اتنے خواب دیکھ لیے کہ مہینوں میں بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔ اب مجھے اس زندگی سے نجات ملنے والی تھی جسے میں کسی عذاب کی طرح جھیلتا آ رہا تھا۔ ایک نئی اور خوشگوار زندگی طلوع ہونے والی تھی جو خوابوں کی طرح حسین تھی۔ جس وقت وہ اپنی کلائی میں کڑا ڈال رہی تھی۔ میں اس کی مرمریں گداز کلائی کو دیکھنے لگا۔ یہ بھری بھری دودھیا کلائی اتنی خوب صورت تھی کہ میرے دل پر بجلی گرا رہی تھی۔ اس نے کڑا پہننے کے بعد اپنی آستین درست کر کے کف لگایا۔ میری طرف دیکھا تو میں گڑبڑا سا گیا۔ اس نے میری نظروں کی چوری پکڑ لی۔ میں بدحواس سا اپنی جگہ سے اٹھا تو وہ بولی۔ ”کیا میں اپنے محسن کا نام پوچھ سکتی ہوں؟“

”میرا نام شوکت حیات ہے۔“ میں نے اپنا مختصر سا تعارف کرایا۔ ویسے وہ مجھ سے میرے خاندان سے اور میرے کام سے واقف ہو چکی تھی۔

”میرا نام نغمہ ہے۔“ اس کے لہجے میں افسردگی سی تھی۔ ”میرے خیال میں اتنا تعارف کافی ہے لیکن میں آپ کو یہ بتاتی چلوں کہ میں ایک بدبخت لڑکی ہوں لیکن میں اپنی بدبختی کو خوش قسمتی میں بدلنا چاہتی ہوں۔ خدا نے چاہا تو بدل کر رہوں گی۔ اس کے لیے آپ کی مدد، خلوص اور سہارے کی ضرورت ہوگی اگر آپ نے میرا ساتھ دیا تو میں نہ صرف اپنی شکست کو فتح میں بدل دوں گی بلکہ آپ کو اس کا اتنا بڑا صلہ دوں گی کہ آپ اپنی ساری زندگی بڑے سکون، آرام اور اطمینان سے گزار سکیں گے۔“

اس کی باتیں خوش کن تھیں لیکن میرے لیے پُراسرار اور ناقابلِ فہم تھیں۔ وہ میرے لیے ایک معما بنتی جا رہی تھی۔ ایک طرف وہ مجھے پانچ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پر ملازم رکھ رہی تھی اور دوسری طرف اپنے آپ کو بدبخت بھی کہہ رہی تھی۔

”آپ کل فرسٹ کلاس کی دو ٹکٹیں لے لیں۔“ اس نے مجھے خاموش پا کر کہا۔ ”آپ کے پاس رقم تو ہوگی نا؟ میں کل آپ کو رقم ادا کر دوں گی۔“

”میرے پاس سات آٹھ سو کی رقم ہوگی۔“ میں بولا تو اس نے کہا۔ ”برتھ کے ساتھ ریزرویشن ہو۔ تیز گام میں ریزرویشن ہونا چاہیے۔“

”اگر فرسٹ کلاس میں ریزرویشن اور برتھ نہ ملے تو......؟“

”تو جس کلاس میں بھی مل جائے لے لیں۔“ وہ یک لخت اٹھ کھڑی ہوئی پھر دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھتی ہوئی بولی۔ ”میں کل آپ کو اسٹیشن پر ملوں گی۔ جس کلاس کی ریزرویشن ہو اس کے دروازے پر آپ کھڑے رہیں تاکہ آپ کو تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔“

”مگر میں آپ کو پہچانوں گا کیسے؟“ میں نے اس کا چہرہ دیکھنے کی غرض سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ اس کی آنکھوں میں حیرانی بھر گئی۔ ”آپ مجھے پہچان کیوں نہیں سکیں گے؟“

”اس لیے کہ میں نے آپ کا چہرہ ہی کہاں دیکھا ہے؟“ میں مسکرایا۔ ”میں نے کل آپ کا چہرہ دیکھ کے پہچاننے سے انکار کر دیا تو؟“

”اوہ......!“ وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ فضا میں نقرئی گھنٹیاں بج اٹھی تھیں۔ اس کی ہنسی بڑی پُرکشش تھی۔ ”اگر آپ مجھے پہچان نہیں پائیں گے تو میں تو آپ کو پہچان لوں گی۔ بہرکیف آپ بھی اس بدنصیب کو دیکھ لیں۔ دراصل مجھے یاد بھی نہیں رہا۔ خیال ہی نہیں آیا کہ چہرے سے نقاب اٹھا دوں۔“

اس نے توقف کر کے چہرے سے نقاب ہٹائی تو میرا دل ذرا دیر کے لیے دھڑکنا بھول گیا۔ وہ تصور سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش ایسے دل کش

ایسے چیکھے سے تھے کہ میرے دل کو برمانے لگے تھے۔ وہ اتنی حسین ہو گی میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ بے داغ تھا۔ اس نے ایک جھلک دکھانے کے بعد اپنے چہرے کو نقاب میں چھپالیا تھا۔

"اب آپ مجھے میرے گھر چھوڑ آئیں۔" وہ کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔ "بارہ بج کر چالیس منٹ ہو رہے ہیں۔"

اس کا گھر گلبرگ میں تھا۔ یہ ایک بنگلا تھا، رات کے اندھیرے اور سناٹے میں ڈوبا ہوا۔ گیٹ پر تالا پڑا ہوا تھا۔ چاروں طرف کا جائزہ لینے کے بعد وہ گیٹ پر چڑھ کے اندر اتر گئی۔ پھر اس نے بغلی دروازہ کھول کر اپنا سر باہر نکالا۔

"شوکت صاحب! انشاء اللہ اتوار کو منگنی پر ملاقات ہو گی۔ خدا حافظ۔ خدا آپ کو حفاظت سے گھر پہنچائے۔"

میں گھر پہنچ کر سونے کے لیے بستر پر دراز ہوا تو مجھے یہ سب کچھ کسی خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ اس چاند سے چہرے کے تیکھے تیکھے نقش و نگار اور اس کی بڑی بڑی چمک دار غلافی سیاہ آنکھیں، ملازمت کی پیش کش اور شاندار رقم کی تنخواہ نے مجھے بڑی دیر تک سونے نہیں دیا۔ میں چونکہ رات بڑی دیر سے سویا تھا اس لیے نیند سے جلد بیدار نہ ہو سکا۔ میری آنکھیں بیل بجنے سے کھل گئی۔ نیچے جا کر دروازہ کھولا تو بھائی جان، بھابی اور بچی کے ساتھ موجود تھے۔ میاں بیوی کے چہروں پر سخت ناگواری تھی۔ کچھ دیر بعد میں تیار ہو کر نیچے آیا تو بھائی جان اور شیریں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شیریں مجھے جلانے کی غرض سے ہنس رہی تھی اور چہک چہک کے باتیں کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ صنوبر کی دھوم دھام سے منگنی ہوئی ہے وہ ایسی یادگار اور مثالی ہے کہ شاید ہی کسی اور کی ہوئی ہو گی اور شاید ہی خاندان میں ہو سکتی ہے۔ مگر شیریں نے مجھے دیکھتے ہی مٹھائی کا ڈبا میری طرف بڑھایا۔

"لو منہ میٹھا کر لو۔ صنوبر کی منگنی کی مٹھائی ہے، جو خاص طور پر آرڈر دے کر بنوائی گئی ہے۔ تم نے بھی کھائی نہیں ہو گی؟"

اگر رات نغمہ سے میری ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو شیریں کے الفاظ ڈنک بن کر میرے وجود پر لگتے۔ میں ان کی باتیں شاید برداشت نہ کر پاتا اگر بھائی جان موجود نہ ہوتے اور تنہائی ہوتی تو میں شیریں سے پوچھتا۔ کیا اس مٹھائی میں اتنی مٹھاس ہے جتنی تمہارے ہونٹوں میں ہوا کرتی تھی۔ تم مجھے کتنی خود سپردگی سے من مانیاں کرنے دیتی تھیں۔

اسے ایسے بھلا دیا تھا کہ اس کا خیال اور کھو دینے کا کوئی صدمہ نہیں رہا تھا۔ میرے ہوش و حواس پر اب نغمہ کی حسین صورت چھائی تھی۔ اس نے صنوبر کی یاد اور صدمہ بھلا دیا تھا۔ شیریں نے اپنے تئیں میرے دل کے زخموں پر انگارہ رکھنے کے لیے یہ الفاظ کہے تھے۔ اس کا شاید یہ خیال تھا کہ میرے چہرے کا رنگ اڑ جائے گا اور میں اس کا کوئی جواب نہیں دوں گا اور نہ ہی اپنا منہ میٹھا کروں گا اس لیے وہ مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے گلاب جامن اٹھاتے ہوئے شیریں کی آنکھوں میں جھانکا اور پورے خلوص سے کہا۔ "اللہ! صنوبر کا دامن خوشیوں سے بھر دے۔ وہ سدا سکھی رہے۔"

شیریں کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اسے تو توقع نہیں تھی کہ میں اس کی بات کا کوئی اثر نہیں لوں گا۔ میرا چہرہ، بشرہ پڑھ کے میری بات سن کر وہ ششدر رہ گئی۔ اسے اندازہ تھا کہ میں صنوبر کو بہت پسند کرتا ہوں۔

"اگر ڈھنگ کے آدمی ہوتے تو صنوبر سے تمہارا رشتہ طے ہو چکا ہوتا۔" بھائی جان نے ناگواری سے کہا۔

"میں نے کبھی بھی صنوبر کو اپنی بیوی بنانے یا اس سے شادی کرنے کے بارے میں بھولے سے بھی سوچا نہیں تھا۔" میں نے شیریں کو جلانے کی غرض سے کہا۔

یہ بات میں نے دانستہ کہی تھی۔ لیکن اس بات نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ یہ بات بھائی جان پر چوٹ تھی جو ان کے دل پر لگی۔ کیونکہ انہوں نے جانتے بوجھتے شیریں سے شادی کی تھی کہ ہم دونوں میں رومانس چل رہا ہے۔ وہ ایک دم سے بھڑک اٹھے اور بولے۔ "تم بہت بدتمیز ہوتے جا رہے ہو۔ بہتر ہے تم اپنا کوئی ٹھکانا ڈھونڈ لو۔ آج سے دکان میں قدم رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شام کو دکان پر آ کر اپنا حساب کر لینا۔"

میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بھائی جان میری بات کا شدید اثر لیں گے۔ یہ بات انہیں اتنی بری اور ناگوار لگی تو مجھے دکھ بھی ہوا اور فوراً ہی سٹ گیا۔ انہیں شاید احساس ہوتا رہتا ہو گا کہ انہوں نے چھوٹے بھائی کی محبت پر ڈاکا مارا ہے۔ شیریں نے من مانیوں، بے شرمی اور خود سپردگی سے اپنے حسن و شباب کا جادو چلا کر اسیر کیا تھا۔ میں نے بڑے ضبط و تحمل سے جواب دیا۔

"میں آج سہ پہر کی گاڑی سے کراچی جا رہا ہوں۔

مجھے کراچی میں پانچ ہزار کی ملازمت کے علاوہ طعام و قیام کی سہولت بھی مل گئی ہے۔'' میں نے شیریں کے چہرے پر زرد لکیر کو ابھرتے دیکھا۔ بھائی جان بھی ایک دم سے اس طرح چونک پڑے جیسے انہیں کرنٹ لگا ہو۔ ان کے چہرے پر بھی زردی چھا گئی۔

''تمہیں اور پانچ ہزار روپے کی نوکری؟ کبھی تم نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہے؟''

''آپ میری بات کا یقین کریں یا نہیں۔'' میں نے بڑے مضبوط لہجے میں ذرا مبالغے سے کام لیا۔ ''اتفاق سے کل میرے ایک دوست کے ہاں ایک بیگم صاحبہ سے ملاقات ہوگئی جو کراچی سے زنانہ کام جاننے والے ٹیلر ماسٹر کی تلاش میں آئی تھیں۔ ان کی کراچی میں طارق روڈ پر خواتین کے ملبوسات کی ایک بہت بڑی دکان ہے۔ بوتیک ہے انہوں نے کل میرا ٹرائل لیا تھا۔ نہ صرف پانچ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ کی آفر کی بلکہ مفت رہائش اور طعام کا بندوبست بھی کریں گی۔ میں آج ہی ان کے ساتھ کراچی جارہا ہوں۔ انہوں نے ہر سال تنخواہ میں دو ہزار روپے کے اضافے کا اعلان کیا اور تنخواہ کے سادی بونس دیں گی۔ ہفتے میں دو دن کی چھٹی بھی دیں گی۔''

شیریں کے چہرے پر بارہ بجنے لگے۔ حسد جلن سے برا حال ہونے لگا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اچانک میری کایا پلٹ سکتی ہے۔ میں بھائی جان کو تحیر زدہ چھوڑ کے اپنے کمرے میں آیا۔ ایک دوست نے کوئٹہ جاتے ہوئے میرے پاس ہزار روپے رکھوائے تھے وہ بھی جیب میں رکھ لیے۔ سوچ لیا تھا کہ بعد میں اسے منی آرڈر کردوں گا۔ کچھ دیر بعد میں اپنا سوٹ کیس لے کر نیچے آیا تو انہیں پریشان سا پایا۔ شیریں اندر ہی اندر جل کر خاکستر ہوئی جارہی تھی۔

میں نے بچی کو بہت پیار کیا اور ان دونوں کو خدا حافظ کہہ کر جانے لگا تو بھائی جان بولے۔ ''اتنی جلدی کہاں جارہے ہو؟''

''ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل۔'' میں نے پھر جھوٹ بولا۔ ''وہ وہیں ٹھہری ہوئی ہیں۔ لنچ پر بلایا ہے۔''

میں نے ریلوے اسٹیشن پہنچ کر سوٹ کیس لاک روم میں رکھوایا۔ بڑی تگ و دو کے بعد دو برتھیں مل گئیں۔ پیسے میں کتنی قوت چھپی ہوئی ہے اس وقت احساس ہوا۔ بکنگ کاؤنٹر پر کلرک نے صاف کہہ دیا تھا کہ تین دن کے بعد کی

کروادی تھی۔

تیز گام وقت پر آگئی۔ میں اپنے ڈبے کے دروازے پر کھڑا لفافہ کی راہ دیکھ رہا تھا۔ اس کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ جیسے جیسے گاڑی کی روانگی کا وقت آتا جارہا تھا۔ میری بے قراری اور بے تابی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ کتنے ہی وسوسے اور اندیشے زہریلے پھنکارتے سانپوں کی طرح ڈس رہے تھے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بدمعاشوں کے ہتھے چڑھ گئی ہو۔

گاڑی کی روانگی میں چند لمحے رہ گئے تھے، میں مایوس ہوگیا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ اب اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ بدمعاشوں نے اسے اغوا کرلیا ہے۔ یا پھر بنگلے میں یرغمال بنا کے اس کے ساتھ زیادتی کی جارہی ہوگی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ مجھے دور سے بھیڑ کو چیرتی ہوئی نظر دکھائی دی۔ میری جان میں جان آئی اور کل رات کی طرح برقع میں ملبوس تھی۔ صرف اس کی آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ چرمی پرس تھا۔ قلی اس کا سوٹ کیس اور پلاسٹک کی ٹوکری اٹھائے ہوئے تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر فضا میں ہاتھ لہرا دیا۔ اس وقت خوشی سے میرا جو حال ہورہا تھا وہ الفاظ میں مشکل تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

گاڑی چل پڑی۔ ہم سفروں میں ایک عورت اور تین مرد تھے۔ وہ مرد ان کھڑکیوں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے جو دوسری طرف تھیں۔ ہم دونوں بھی کھڑکیوں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم سفر اپنا سامان ٹھیک اور درست کرنے لگے۔ نغمہ نے اپنے چرمی پرس کھول کے اس میں سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کر میری طرف بڑھایا تو میں نے حیرت سے دیکھا۔ وہ اپنا چہرہ میرے قریب لاکر سرگوشی میں بولی تو اس کی آواز بڑی دھیمی سی تھی کہ مسافر سن نہ لیں۔

''میں نے آپ سے جس بات کا وعدہ کیا تھا نا وہ ہے۔ یعنی پیشگی تنخواہ اور ٹکٹ کی رقم ہے۔''

''اس کی ایسی کیا جلدی تھی؟'' میں نے کہا۔ ''مجھے آپ کی زبان پر بھروسا ہے۔ میں کراچی پہنچ کے لے لوں گا۔''

''میں کسی سے اگر وعدہ کرتی ہوں اسے ہر قیمت پر پورا کرتی ہوں۔'' اس نے لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ ''آپ اپنے سوٹ کیس میں ابھی اور اسی وقت رکھ لیں۔ میرے سر سے ایک بوجھ تو اتر جائے گا۔ ورنہ رات بھر نیند

میں نے سیٹ کے نیچے سے سوٹ کیس کھینچ کے نکالا۔ وہ پانچ ہزار سے زائد رقم تھی۔ اس لفافے کو ہاتھ میں لیتے ہی میری حالت عجیب سی ہونے لگی تھی۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ میرے دن پھر گئے ہیں۔

میں سوٹ کیس میں لفافہ رکھ کر اسے مقفل کر کے اپنی جگہ بیٹھا تو نغمہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور برقع اتارنے لگی۔ جب اس نے برقع اتارا تو میں اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ ہلکے فیروزی رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس تھی۔ اب اس کا حسین چہرہ اور پرشکوہ سراپا میری نظروں کے سامنے تھا جو اس لباس میں عجیب بہار دے رہا تھا۔ اس کا بے مثل حسن جو پوری طرح اجاگر تھا میرے دل پر بجلی بن کر گرا تھا۔ میں نے جو اس کے چہرے کو اپنی نظروں کی گرفت میں لیا تو وہ دل فریب انداز میں مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ میرے وجود پر قیامت ڈھا گئی۔ میں نے سنبھل کر اسے جوابی مسکراہٹ سے دیکھا تو وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی اور میں اسے محویت سے تکنے لگا۔

ہم دونوں نے آپس میں گفتگو کرنے میں بڑی احتیاط برتی تھی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ مسافروں کو ہم پر کسی قسم کا شک و شبہ ہو۔ یوں بھی نغمہ پورے ڈبے کے مسافروں کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ کسی اسٹیشن پر گاڑی رکتی تو مسافر پلیٹ فارم پر اتر کے کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر اسے گرسنہ نگاہوں سے گھورنے لگتے تب میرے دل میں آتا کہ ان کی آنکھیں پھوڑ دوں۔ میں ساری دنیا کی آنکھیں پھوڑنے سے تو رہا۔ میں ان لوگوں کی طرف جوابی طور پر گھور کر دیکھتا تو وہ اپنی نظریں چرا لیتے۔ وہ جیسے ان نگاہوں کی عادی تھی۔ میں نے اس کی شہابی پیشانی پر ایک شکن تک نہیں دیکھی۔

میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن کچھ بھی نہ پوچھ سکا تھا اس لیے کہ موقع نہیں تھا۔ اگر کچھ پوچھتا تو شاید وہ بتاتی بھی نہیں۔ میں یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ میرے جانے کے بعد کیا ہوا۔ اس پر کیا گزری تھی؟ وہ اپنے ساتھ لائی ہوئی کتابیں پڑھنے لگی جو انگریزی زبان کی تھیں۔ کبھی وقفے وقفے سے باہر جھانکنے لگتی تھی۔۔۔۔ باتیں کرتی تاکہ مسافروں کو یہ گمان نہ گزرے کہ ہم اجنبی ہیں۔

وہ پلاسٹک کی ٹوکری میں کسی ہوٹل سے کھانا خرید کر لائی تھی جو پارسل کی شکل میں تھا۔ اس کے علاوہ موسمی پھل بھی تھے۔ رات کھانے کے وقت اس نے پارسل کھولا تو اس میں شامی کباب اور پراٹھے بھی تھے۔ چکن بروسٹ اور بریانی بھی تھی۔ کھانا بہت اچھا، لذیذ اور حرے دار تھا۔ اتنی مقدار میں تھا کہ چار پانچ آدمی پوری طرح سیر ہو کر کھا سکتے تھے پھر وہ مجھے غیر محسوس انداز سے اس طرح سے اصرار کر کے کھلاتی رہی کہ میں اس کا مہمان ہوں۔ مسافروں کو شک نہ ہو کہ ایک بیوی اپنے شوہر کو اس طرح سے کیوں اصرار کر کے کھلا رہی ہے۔"

رات سونے کا وقت آیا تو میں نے اسے سونے کے لیے اوپر والی برتھ دے دی اس لیے کہ اوپر سامنے والی برتھ ایک عورت کی تھی۔ وہ اس پر سونے کے لیے دراز ہو چکی تھی۔ ہمارے پاس سونے کے لیے بستر نہ تھا۔ ہمارے ہم سفروں کے پاس تھا۔ انہوں نے ہم دونوں کے لیے بھی بستر فراہم کر دیا تھا۔ نغمہ نے بستر پر دراز ہو کر اپنے بدن اور شانے تک چادر ڈال لی تھی۔ اس نے اپنے حسن و شباب کی حشر سامانیوں کو پس پردہ کر لیا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑتی اور شاید میں ایک لمحے کے لیے بھی سو نہ پاتا۔ پھر وہ ناول پڑھنے لگی۔

لیکن میں بستر پر لیٹا اسے پڑھ رہا تھا جو ایسی سنسنی خیز ناول تھی کہ ایک پل کے لیے اس کے سراپا اور چہرے سے نگاہ ہٹتی نہیں تھی۔ چادر میں چھپا سراپا ہونے کے باوجود نشیب و فراز اور خال و خد بجلیاں بن کر مجھے خاکستر کیے جا رہی تھیں۔ اس کا چاند سا چہرہ چونکہ بادلوں کی طرح اوٹ میں تھا۔ کتاب نے اس کے چہرے کو چھپا رکھا تھا اس لیے میں ایک لمحے کے لیے اپنی ضدی، سرکش اور بے لگام نظروں کو اس کے سراپے سے ایک لمحے کے لیے بھی ہٹا نہ سکا تھا۔

میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس شہر سے باہر جا رہا تھا۔ ایک حسین ہم سفر کی رفاقت میں۔ میرے دل کے کسی کونے میں یہ آرزو تھی کہ یہ سفر کبھی ختم نہ ہو، صدیوں تک جاری رہے۔

گاڑی بڑی تیز رفتاری سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ نغمہ ابھی تک سوئی نہیں تھی۔ وہ کتاب پڑھ رہی تھی کہ میں سو گیا۔ نیند نے مجھے اس سنسنی خیز اور دلکش نظارے سے محروم کر دیا تھا۔ سوتے سوتے بیدار ہوا تو میں نے دیکھا کہ نغمہ کتاب سینے پر رکھ کے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی ہے۔ اس کی آنکھوں پر لمبی لمبی پلکوں کی چلمن پڑی ہوئی تھی۔ کبھی اس کے چہرے پر چمک آ جاتی تو کسی لمحے اس کے شہابی چہرے پر اداسی تیرنے لگتی۔ جانے وہ کیا سوچ رہی تھی۔ وہ کراچی کس لیے جا رہی ہے؟ اگر میں اسے

نہ ملتا تو اس کے ساتھ کیا ہوتا؟ یہ شخص بھروسے کے قابل بھی ہے یا نہیں؟ وہ جو شکست کو فتح میں بدلنا چاہتی ہے اس کے لیے ممکن ہوگا بھی کہ نہیں؟ آخر وہ کب تک بدمعاشوں اور حادثات سے نبرد آزما ہو کے خود کو بچاتی رہے گی؟

پھر میری آنکھ لگ گئی۔ میں بیدار ہوا تو صبح ہو رہی تھی۔ میں نے نغمہ کی طرف دیکھا تو اس کی بھاری بھاری آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ رات ایک پل کے لیے بھی نہیں سوئی ہے۔ ساری رات اس نے آنکھوں میں کاٹی ہے۔ اس نے مجھے دل فریب انداز سے مسکرا کے دیکھا اور سر کے اشارے سے سلام کیا اور پوچھا۔ ''رات نیند آئی تھی؟ کیا سفر میں نیند آجاتی ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس سے کیسے کہتا کہ میں بھی آدھی رات تک سو نہیں سکا تھا۔ تمہارا چہرہ نشیب و فراز اور خدوخال کسی زہریلی ناگن کی طرح ڈستے رہے تھے۔

یہ حسین اور ناقابل فراموش سفر کسی حسین سپنے کی طرح بیت گیا۔ کینٹ اسٹیشن پر اتر کے میں نے اس سے پوچھا۔ ''اب ہم کہاں جائیں گے؟ کیا کراچی میں آپ کے والدین، بھائی بہن یا رشتہ دار وغیرہ رہتے ہیں؟''

''اس دنیا میں، میں بالکل اکیلی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میرا یہاں کوئی بھی نہیں۔''

''پھر ہم کہاں جائیں گے؟ کہاں ٹھہریں گے؟'' میں حیران اور پریشان سا ہو گیا۔

''ہوٹل میں۔'' وہ بڑے اطمینان سے بولی۔

''ہوٹل میں؟'' میں نے چونک کے حیرت سے اس کی شکل دیکھی۔ ''وہ کیوں؟''

''اس کیوں کا جواب میں ہوٹل پہنچ کر دے سکوں گی۔''

ہوٹل کا انتخاب نغمہ نے ہی کیا۔ یہ ایک اچھا ہوٹل تھا جو ریلوے اسٹیشن سے دو فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں نے استقبالیہ پر بات کی۔ کاؤنٹر پر ایک عورت تھی۔ ہم دونوں کا اندراج رجسٹری میں نغمہ نے ہی میاں بیوی کی حیثیت سے کروایا تھا۔ ڈبل بیڈ کا کمرا لیا تھا۔ یہ ساری باتیں نہ صرف تحیر خیز بلکہ سنسنی خیز بھی تھیں۔ میں جس وقت نغمہ کے ساتھ کمرے میں پہنچا ہوٹل کا ملازم کمرے میں سامان رکھ کے چلا گیا تھا۔

اس کمرے کی خاموش فضا، خواب ناک ماحول اور تنہائی کے احساس نے میرے سارے بدن میں ایک سنسنی بھر دی تھی۔ اس نے برقع نکال کر تہ کر کے تکیے پر رکھ دیا۔

اب وہ بغیر برقع کے تھی۔ وہ کسی شعلے کی طرح دکھائی دینے لگی جیسے لپک کے میرا وجود خاکستر کر دے گی۔ اس کمرے میں جیسے کوئی آتش فشاں دہکنے لگا تھا۔ سفر کی وجہ سے اس کے دہکتے ہوئے گلابی چہرے پر سندھ کے ریگستانی علاقے کی ریت کی مہین سی تہہ جمی ہوئی تھی۔ نیم پریشان سیاہ بالوں میں ریت کے ذرے تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ اس نے اپنا سوٹ کیس کھولتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں پہلے نہا لوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

''بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آپ ہی پہلے غسل کر لیں۔''

وہ اپنے سوٹ کیس میں سے ایک جوڑا اور زیر جامہ نکال کر ملحق غسل خانے میں گھس گئی۔ یہ کمرا ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ بے حد آرام دہ اور کشادہ، پُرسکون۔ خنکی نے سفر کی ساری تھکن اتار دی تھی۔ میں کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا کہ میں بھی کسی ایسے کمرے میں ٹھہرا نہیں تھا اور نہ ایسے ہوٹل میں قدم رکھا تھا۔ کمرے کا جائزہ لیتے لیتے میری نظر سوٹ کیس پر پڑی۔ وہ عجلت میں سوٹ کیس ٹھیک سے بند نہ کر سکی تھی۔ اس کی ایک قمیص آدھی اندر اور آدھی باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس کا سوٹ کیس باہر کا بنا تھا۔ بے حد شاندار اور بے حد قیمتی بھی تھا۔ میں نے اس کا ڈھکن اٹھایا تاکہ قمیص کو اندر کر کے ٹھیک سے بند کر سکوں۔ معاً میری نظر ان نوٹوں کی گڈیوں پر پڑی جو کپڑوں کی تہہ کے نیچے سے جھانک رہی تھیں۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی کپڑے ہٹا کے دیکھے تو نئے نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ یہ رقم میرے اندازے کے مطابق پانچ چھ لاکھ کی ہوگی۔ کپڑوں میں ایک شاپنگ بیگ بھی تھا جس میں گولیوں کے پتے اور دو ایک شیشیاں بھی تھیں۔ میں نے جلدی سے سوٹ کیس بند کیا اور بستر پر آ کر دراز ہو گیا۔

میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالوں کی یلغار ہو رہی تھی۔ نغمہ میرے لیے کسی معمے سے کم نہیں تھی۔ میرے پاس بہت سے سوالوں کا جواب نہیں تھا کہ اس کے دشمن کون لوگ ہیں؟ وہ بنگلا کس کا تھا؟ مقفل کیوں تھا؟ وہ مجھے لاہور سے کراچی کیوں لے کر آئی ہے؟ اس نے مجھے پانچ ہزار روپے ماہانہ کی تنخواہ پر کیوں رکھا ہے؟ اور وہ مجھ سے کیا کام لینا چاہتی ہے؟ اس کے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی؟ اور وہ یہ بات کیوں بھول رہی ہے کہ میں ایک جوان مرد ہوں۔ غیر ہوں۔ کسی بھی لمحے ناگ بن سکتا ہوں۔ مرد کی

ذات تنہائی میں ناگ بن جاتی ہے۔ اگر میں اپنے آپ میں نہیں رہا تو اس کے پاس آنسوؤں کا خزانہ رہ جائے گا۔ اس ہوٹل کے کمرے میں ہم کب تک اور کتنے دنوں رہیں گے؟

میں انہی خیالوں میں گم تھا کہ غسل خانے کا دروازہ کھلا۔ میں بستر پر لیٹا اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ میری نظروں کے سامنے یکا یک شعلہ سا لپکا تو میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ گہرے اودے رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس تھی۔ اس گہرے رنگ نے اس کی جلد کی دودھیا رنگت کو بھڑکا دیا تھا۔ بدن کی دلکش شان اور بڑھ گئی تھی۔ اس کا سراپا میری نظروں میں جذب ہونے لگا۔ وہ سنگھار میز کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھی تو حسن کی کرشمہ سازیاں اور واضح ہونے لگیں۔ وہ اپنے لمبے لمبے بالوں کو تولیے سے پونچھتی ہوئی بولی۔ ''آپ جلدی سے غسل کر کے آجائیں۔ میں کھانا منگواتی ہوں۔ مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔''

میں مرد تھا فرشتہ نہیں۔ اگر کوئی زاہد بھی میری جگہ ہوتا تو اس کا پیر بھی پھسل جاتا۔ معلوم نہیں اس کمزور لمحے پر کیسے قابو پایا۔ اپنے دل پر کیسے جبر کیا؟ میں دوسری مرتبہ اپنی زندگی میں ایسے سخت امتحان سے گزرا تھا۔ پھر مجھے شیریں یاد آئی۔ اس کی خودسپردگی، اس کی من مانیاں اور ڈورے کس کے باوجود میرا پیر پھسلا نہیں تھا۔ نغمہ تو اس سے کہیں حسین اور پرکشش اور بھرپور تھی۔ میں نغمہ کو دیکھتا ہوا غسل خانے میں گھس گیا۔ نہانے کا جو ٹب تھا اس کونے میں فرش پر نغمہ نے اپنے اتارے ہوئے کپڑے تہہ کر کے رکھے ہوئے تھے۔ اس کے نیچے سے ایک کالے رنگ کا چھوٹا سا پستول جھانک رہا تھا۔ نغمہ نے اس پستول کو چھپانے کی غرض سے کپڑے تہہ کر کے اس کے اوپر رکھ دیئے تھے۔ گویا وہ اپنے ساتھ پستول بھی لیے پھر رہی تھی تاکہ کسی آڑے وقت میں وہ اس سے اپنی جان و آبرو کی حفاظت کر سکے۔ میں نے آگے بڑھ کر کپڑے سے پستول کو ڈھک دیا۔

جب میں نہا کر نکلا تو میز پر کھانا چنا ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ غسل خانے میں جانے کے لیے بے چین ہے اور میرے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں جیسے ہی سنگھار میز کے آئینے میں کھڑے ہو کر بالوں میں تیل لگانے لگا تو وہ غیر محسوس انداز سے غسل خانے میں گھس گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ باہر آئی تو اس کے ہاتھ خالی تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے کپڑے لے کر آئے گی۔ میں تو یہ غسل خانے میں ٹانگنے کے بہانے گیا تو اس کے کپڑے جوں کے توں ٹب کے کونے ہی میں رکھے ہوئے تھے۔ میں سمجھا کہ وہ کپڑے لینے گئی تھی دوبارہ لیکن وہ پستول کو اچھی طرح سے چھپا کے آگئی تھی۔

کھانے سے فراغت پانے کے بعد ہم دونوں چائے پینے لگے۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہوٹل میں قیام کرنے کے بارے میں اور اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں ضرور بتائے گی۔ اس نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ اچھے گزرے ہوئے سفر کے بارے میں گفتگو کرنے لگی۔ میں نے کچھ دیر کے بعد اس سے پوچھا۔ ''آپ نے تو کہا تھا کہ میں ہوٹل میں.....''

وہ درمیان میں شوخی سے بولی۔ ''ایسی بھی کیا جلدی ہے جناب! اتنے لمبے سفر سے تو لوٹے ہیں۔ ابھی تو پوری طرح تھکن بھی نہیں اتری ہے۔ ہم نے کمر سیدھی نہیں کی ہے۔''

''پھر بھی.....!'' میں نے اپنی چائے ختم کر کے پیالی میز پر رکھ دی۔ ''کچھ پروگرام کا پتا چلے۔ ہوٹل میں کب تک ٹھہریں گے؟''

''ہوٹل میں اس وقت تک ٹھہریں گے جب تک شادی نہیں ہو جاتی؟'' وہ سابقہ لہجے میں بولی۔

''کس کی شادی؟'' اس کے سرخ و گداز ہونٹوں پر دل فریب مسکراہٹ ابھر آئی۔ چہرے پر حیا لہر بن کے دوڑ گئی۔

''آپ کی شادی؟'' میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''میں یہاں شادی کرنے کی غرض سے تو آئی ہوں۔'' اس نے اپنی لمبی لمبی پلکیں جھپکائیں۔

''کس سے؟'' میرے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

''مرد سے؟'' اس کے ہونٹوں کے ساتھ ساتھ اس کی بڑی بڑی آنکھیں مسکرانے لگیں۔ ''میں ایک عورت ہوں۔ شادی کروں گی تو ظاہر ہے کسی مرد سے ہی کروں گی۔ یہ امریکا یورپ تو ہے نہیں جہاں عورتیں عورتوں سے اور مرد مردوں سے شادی کر لیتے ہیں۔ وہ شخص کراچی میں ہے۔ اس سے بات کرنی ہے اور معاملات بھی طے کرنے ہیں۔''

''ابھی اس سے آپ کا رشتہ طے نہیں ہوا؟'' میں نے بجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ اس کی شادی کی بات سن کر میرے دل پر ایک چابک سی لگی تھی جیسے کوئی میری عزیز ترین شے چھین رہا ہو۔ میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ نغمہ کسی اور کی امانت ہے اور پھر میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ میں ایک معمولی سا آدمی ہوں۔

"آپ رشتہ طے کیے بغیر شادی کرنے چلی آئیں؟"

"میں لاہور میں رہ کر اس سے رشتہ کیسے طے کرتی؟" وہ کہنے لگی۔ "اصل بات یہ کہ آپ سے کیا چھپانا۔ میں اسے بے حد پسند کرنے لگی ہوں۔ مجھے کچھ پتا نہیں کہ وہ مجھے بھی پسند کرتا ہے کہ نہیں؟ اگر اس نے میرا رشتہ منظور کرلیا تو اس نیک کام میں دیر بالکل بھی نہیں کروں گی۔ دو ایک دن میں شادی کرلوں گی۔"

"آپ کو ناپسند کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؟" میں نے دل گرفتہ انداز میں کہا۔ "آپ لاکھوں میں ایک ہیں۔"

"اچھا۔" وہ ایک دم سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی پورے کمرے میں کھنک گئی۔ "کیا میں واقعی اتنی حسین ہوں؟ اگر میں واقعی اتنی حسین ہوں تو پھر وہ میرے حسن سے متاثر کیوں نہیں ہوتا؟ اسے میری ذات سے دلچسپی کیوں نہیں؟"

"وہ آدمی نہیں پتھر ہوگا یا پھر کسی دوسری عورت نے اس کے دل میں جگہ بنائی ہوگی۔ وہ اس عورت کو چاہتا ہوگا۔"

"ہاں یہ ممکن ہے۔" وہ سنجیدہ ہو کر سوچنے لگی۔ اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ وہ متفکر اور پریشان سی ہوگئی۔ "حیرت کی بات ہے کہ میرے دل میں خیال کیوں نہیں آیا۔ عجیب سی بات ہے۔ کل اس سے جا کر ملوں گی اور صاف صاف بات کر آؤں گی۔ آج ہم کیوں نہ کچھ دیر کراچی شہر کی سیر کرلیں اور رات کا کھانا باہر کھالیں۔"

کچھ دیر کے بعد ہم ایک کار میں سیر کر رہے تھے۔ اس نے ہوٹل سے کرائے کی کار لے لی تھی۔ اسے کار چلانی آتی تھی۔ وہ کراچی شہر سے اس طرح واقف تھی جیسے یہیں پلی بڑھی ہو۔ گلستان جوہر، عزیز بھٹی پارک اور سفاری پارک سے ہوتے ہوئے زیب النساء اسٹریٹ پر آگئے۔ اس نے وہاں ایک ریڈی میڈ کپڑوں کی بہت بڑی دکان پر گاڑی پارک کی اور مجھے لے کر اس دکان میں داخل ہوگئی۔ پھر اس نے میرے لیے بے حد قیمتی چار جوڑے اور کرتیاں خریدیں۔ اس کے علاوہ ایک سفاری سوٹ بھی ان میں شامل تھا۔ اس کے اصرار پر مجھے دکان کے ڈریسنگ روم میں جا کر شلوار قمیص کا جوڑا پہننا پڑا۔ پھر اس نے باہر آ کر سامنے جوتوں کی دکان تھی اس میں دو جوڑی بوٹ، چپلیں اور جرابیں خریدیں۔ وہاں بھی مجھے ایک نئے جوتے پہننے

اس نے ملبوسات اور جوتوں کی خریداری پر پیسا پانی کی طرح بہایا تھا۔ تقریباً بائیس ہزار ان کی مالیت تھی۔ وہ مجھے ایک نیا انسان بنا کر اس کھلے ہوئے ریستوران میں لے آئی جو سپر ہائی وے پر واقع تھا۔ اس ریستوران کے احاطے میں جو ایک میدان کی طرح بڑا اور کشادہ تھا اس میں کاروں کی قطاریں تھیں۔ اس ریستوران میں جو لڑکے لڑکیاں، عورتیں اور جوڑے تھے وہ اپنی وضع قطع سے بڑے گھرانوں کے لگ رہے تھے۔ کار والے ہی اتنی دور آسکتے تھے۔ یہ لوگ رات کی رنگینی کا لطف لینے کے لیے کھا پی رہے تھے۔ لڑکیاں اور عورتوں کے قہقہے اور ہنسی فضا میں رس گھول رہی تھی۔ بھینی بھینی خوشبوؤں سے فضا معطر تھی۔ ماحول پر رنگینی چھائی ہوئی تھی۔ یہاں جو لڑکیاں عورتیں تھیں وہ میک اپ اور بے حجابی کی حالت میں تھیں۔ اپنے جسموں کی نمائش کر رہی تھیں۔ نغمہ ان کے برعکس بغیر میک اپ اور بڑی سادگی اور حجاب سے تھی۔ اس کے سامنے وہ سب ماند پڑ گئی تھیں۔

اس نے مٹن کڑاہی اور دو ایک اور ڈشوں کا آرڈر دیا۔ میں اسے بے حد قریب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ رات کی رانی کی طرح مہک رہی تھی۔ میں حسرت زدہ سا ہوگیا تھا۔ اس لیے کہ وہ دو ایک دن میں کسی اور کی ہونے والی تھی۔ وہ شخص دنیا کا خوش نصیب ترین تھا جسے اس کی رفاقت ملنے والی تھی۔ نغمہ ایک بت طناز تھی۔ معلوم نہیں کیوں وہ میری کمزوری بن گئی تھی۔ حالانکہ اس نے نہ مجھ سے محبت کا اظہار کیا تھا اور نہ اس نے مجھے اسیر بنانے کی کوئی کوشش کی تھی۔ اس کے اور میرے درمیان زمین آسمان کا فاصلہ تھا۔ میں ذرہ تھا اور وہ ماہتاب۔ ایک حادثے نے ہم دونوں کو ملا دیا تھا۔ زندگی کے اس سفر میں ہم دونوں کی راہیں اور منزلیں جدا جدا تھیں۔ جانے کیا بات تھی جسے میں نے چاہا وہ مجھے نہیں ملی۔ شیریں سے میں نے محبت کی لیکن وہ بھائی جان کی دولت پر مر مٹی اور اس نے میری محبت کا گلا گھونٹ کے ان سے شادی کر لی..... میں نے صنوبر کو چاہا تو اس کا رشتہ کسی اور جگہ طے کر دیا گیا۔ پھر نغمہ آئی وہ کسی اور کی دیوانی تھی۔ اس کی چاہت میں وہ پاگل ہو کر کراچی آئی تھی۔ اس کے اور میرے درمیان بڑا فاصلہ تھا۔ ایسا ہی فاصلہ جیسے ندی کے کنارے..... دولت، قابلیت اور حیثیت کے فاصلے۔ اس کے مقابلے میں میری حیثیت ہی کیا تھی۔ میں جو ایک ٹیلر ماسٹر تھا۔ پانچ سو روپے ماہانہ تنخواہ پانے والا۔ اس کا قد اتنا

میرے بدن کا ہر مسام جیسے آنکھ بن گیا تھا۔ کھانے کے لوازمات آنے تک جانے کن خیالوں میں کھوئی کھوئی سی رہی تھی۔ شاید وہ اپنے چاہنے والے کے تصور میں ڈوبی رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شادمانی کی لہریں تھیں جس نے اسے اور حسین بنا دیا تھا۔

ہوٹل پہنچے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے مجھ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہم چائے ہوٹل پہنچ کر پئیں گے۔ وہ ٹیلی فون پر چائے کا کہہ کے کپڑے بدلنے غسل خانے میں چلی گئی۔ جب ویٹر چائے رکھ کے گیا تب وہ غسل خانے سے نکلی۔ پھر میں بھی کپڑے بدلنے غسل خانے میں گھس گیا۔ جب میں کپڑے بدل کے غسل خانے سے آیا تو وہ چائے بنا کے میرے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں چائے پینے کے دوران اس کے دہکتے عارضوں اور سراپا کی آن وشان کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ کیا میں ساری رات سو سکوں گا؟ کیا یہ حسن وشباب کی حشر سامانیاں اپنے جذبات کے امتحان میں کامیاب ہونے دیں گی؟ یہ کیسی بہادر اور بے پروا جوان لڑکی ہے جسے تنہائی میں ایک جوان مرد سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا ہے۔ اسے کچھ احساس نہیں کہ یہ دراز قامت مرد اسے دبوچ کے بے بس کر دے تو بازوؤں کے شکنجے سے نکل نہ سکے گی۔ کیا وہ اس بات کو بھی محسوس کر رہی ہے کہ جوان مرد کے دل اور جذبات پر کیا بیت رہی ہوگی۔ اس کا حسن اور شاداب رات کے نفسوں میں تنہائی میں ایک زہریلی ناگن کا روپ دھارتا جا رہا ہے۔ ایک غریب کے دل پر قیامت گزر رہی ہے۔ گو وہ زاہد نہیں ہے اگر زاہد بھی ہو تو عورت کے کشش کے خزانے لوٹے بغیر رہنے سے رہا۔

کچھ دیر بعد ویٹر آ کر برتن لے گیا۔ پھر اس نے زیرو واٹ کا بلب جلا کے تیز روشنی کے بلب بجھا دیئے، بستر پر دراز ہو کر اپنے بدن پر چادر ڈال لی۔ اس ملگجی دودھیا روشنی میں اس کا حسن وشباب کسی ناگن کی طرح غضب ناک ہو گیا۔ اس نے تکیے پر گردن گھما کے سر سے اشارہ کرتی ہوئی بولی۔ ''سو جایئے رات کے بارہ بج چکے ہیں۔ میں گاڑی میں ساری رات شور کی وجہ سے سو نہیں سکی تھی اور پھر یہ جو لمبی ڈرائیونگ کی اس سے بڑی تھکن بھی ہو رہی ہے۔ بڑے زور کی نیند آ رہی ہے۔''

میں نے سوچا کہ اس سے کہوں کہ محترمہ مجھے نیند بالکل نہیں آ رہی ہے۔ آپ کے حسن وشباب نے میری نیند

> ''ستم تو یہ ہے کہ آدم جیسے بندے کی خطا پر ان کے خدا نے اتنا شور نہ کیا ہوگا، جتنا ہم جیسے مجازی خدا کی بھول پر ہماری ہی بندی کر رہی ہیں اور یہ نہیں سوچتیں کہ جو شخص ان سے شادی جیسی فاش غلطی کر سکتا ہے اس سے چھوٹی موٹی دوسری غلطیاں سرزد ہو جانا تو نہ صرف قرین قیاس ہے بلکہ ہر وقت قابل معافی بھی۔'' ایک صاحب نے دوسری شادی کی وجہ یہ لکھی تھی: ''میری پہلی بیوی سب ہمسائیوں سے زیادہ خوب صورت ہے اور میری سب ہمسائیوں کے خاوند مجھ سے بہت زیادہ خوب صورت ہیں، جس سے کچھ بدصورت حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔''
>
> اقتباس: غلطی۔ از مسعود مفتی

اڑا دی ہے لیکن یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

پھر میں پلنگ کے پاس پہنچ کے تکیہ اور چادر اٹھانے لگا تاکہ بڑے صوفے پر سو جاؤں۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''یہ آپ کہاں جا رہے ہیں سونے کے لیے؟''

''اتنا بڑا پلنگ ہے کہ تین آدمی آرام سے سو سکیں۔ پھر بھی آپ صوفے پر سوئیں گے۔ پلنگ پر سو جائیں۔''

''کیا؟'' میں اچھل پڑا۔ میں نے شدید حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''پلنگ پر سو جاؤں..... آپ جانتی ہیں.....؟''

''مجھے آپ پر بھروسا ہے جبھی تو میں کہہ رہی ہوں۔'' وہ پورے اعتماد سے بولی۔ ''اگر اعتماد اور بھروسا نہ ہوتا تو آپ کے ساتھ کمرے میں نہیں ٹھہرتی۔ آپ کو الگ کمرا لے کر دیتی۔ ایک کمرے میں ایک ساتھ ٹھہرنے کا خطرہ مول نہیں لیتی۔''

میں پلنگ پر لیٹ گیا اور یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ میرا پیر پھسل گیا تو اس میں میرا کوئی قصور نہ ہوگا۔ اس نے جس اعتماد کا ثبوت دیا تھا وہ پارہ پارہ بھی ہو سکتا تھا۔ میں کوئی ضمانت نہیں دے سکتا تھا اس لیے کہ مرد تھا گو کہ میں کئی مرتبہ کڑے امتحان سے گزر چکا تھا۔ شیریں اور صنوبر پر آنچ آنے نہیں دی تھی لیکن اس وقت صورت حال نازک تھی۔

نغمہ نے دوسری طرف کروٹ لے لی اور میں نے دوسری طرف۔ اب ہم دونوں کی پشت مقابل تھیں لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے قریب ایک آتش فشاں دہک رہا ہے جس کی تپش میرے وجود میں خون کی حرارت تیز کر رہی ہے۔ میں نغمہ کے بارے میں سوچنے لگا کہ کتنی عجیب و غریب ہے لیکن اس سے کہیں پُراسرار اور گہری ہے۔ جتنی حسین ہے اتنی ہی ناقابل فہم بھی۔ میں سوچتے سوچتے سو گیا۔ سفر اور سیر و تفریح کی وجہ سے خوب گہری نیند آئی تھی۔

صبح میں نیند سے بیدار ہوا تو آنکھوں میں نیند کا غلبہ تھا۔ بستر چھوڑنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ آنکھیں تھیں کہ بار بار بند ہوئی جا رہی تھیں۔ کمرا چونکہ ایئر کنڈیشنڈ تھا اس وجہ سے مجھ پر نشہ سا طاری تھا۔ میں نے نغمہ کو سنگھار میز کے بڑے آئینے کے سامنے کھڑے دیکھا۔ وہ باہر جانے کے ارادے سے تیار ہو رہی تھی۔ وہ آئینے میں اپنے چہرے اور سراپا کا ناقدانہ نظروں سے جائزہ لے رہی تھی۔ مجھے بیدار دیکھ کے میرے پاس آ کر بولی۔ ''میں اس سنگ دل سے ملنے اور بات کرنے جا رہی ہوں۔ ایک بجے واپس آؤں گی۔ میں نے ناشتا کر لیا ہے۔ دوپہر کا کھانا ہم ساتھ ہی کھائیں گے۔ لگتا ہے کہ آپ کی نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔ ایسا کریں کچھ دیر اور سو جائیں۔''

وہ اپنا پرس لے کر نکل گئی اور میں بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر میں نیند نے دبوچ لیا۔ آنکھ کھلی تو گیارہ بج رہے تھے۔ شیو کیا، نہایا، پھر ناشتا منگوا کر کیا تو بارہ بج رہے تھے۔ ناشتے سے فراغت پا کے اخبار پڑھتا رہا۔ وہ ٹھیک ایک بجے لوٹی۔ اس کے چہرے پر افسردگی سی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اکیلی ہی تھی۔ اس نے خود کو دھم سے صوفے پر گرا لیا۔

''اس نے مجھ سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔'' اس نے ایک گہری سرد سانس لی۔ ''آپ کی رائے درست ثابت ہوئی۔ وہ کسی اور سے محبت کرتا ہے۔ آئندہ ہفتے اس کی شادی اس عورت سے ہونے والی ہے۔''

نہ جانے کیوں اس کی بات سن کر میرے دل کو انجانی سی خوشی ہوئی۔ ''کیا وہ عورت آپ سے زیادہ حسین ہے؟''

''معلوم نہیں۔'' اس نے بڑے دکھ سے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے اس عورت کو نہیں دیکھا۔ کوئی ضروری نہیں کہ ایک حسین عورت ہی ایک مرد کا دل جیت لے اگر گدھی پر دل آ جائے تو پھر پری کی بھی کیا حیثیت۔''

''اب کیا واپس چلا جائے؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''نہیں..... واپس نہیں جانا ہے۔'' وہ سرد اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''اگر وہ شادی کر رہا ہے تو کیا ہوا، میں بھی شادی کروں گی۔ اس سے پہلے ہی شادی کر لوں گی۔''

''کیا اور بھی کوئی نظر میں ہے؟'' میرے دل پر ایک تازیانہ سا لگا۔

''ہاں۔'' وہ سنبھل کے بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر دمک ابھر آئی۔ اس کی آنکھوں میں برقی قمقمے جل اٹھے۔

''وہ کون ہے؟'' میں نے مردہ لہجے میں پوچھا۔

''وہ.....؟'' اس نے متبسم ہو کر مجھے دیکھا۔ سرخ ہو کر اس نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ ''وہ آپ ہیں۔''

''کون؟ میں.....!!'' میں ایک دم سے اچھل پڑا۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

''جی ہاں، آپ!'' اس نے اپنی جھکی جھکی نظریں اوپر اٹھائیں۔ اس کا چہرہ حیا آلود ہو رہا تھا۔ حیا نے اسے اس قدر حسین بنا دیا تھا کہ حجاب مانع نہ ہوتا تو شاید میں اپنے ہونٹوں میں جذب کر لیتا۔ پھر وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ ''میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں اگر آپ پسند کریں اور مجھے قابل سمجھیں تو۔''

''لیکن میں.....'' میں اس سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں کسی بھی لحاظ سے آپ کے قابل نہیں ہوں۔ اس اعزاز کا مستحق نہیں ہوں۔ میں ایک بے حد معمولی آدمی ہوں۔ میں باوجود کوشش کے دل کی بات زبان پر نہ لا سکا۔

''کیا آپ بھی کسی سے محبت کرتے ہیں؟ کوئی اور آپ کے دل میں بسا ہوا ہے؟'' اس کے چہرے پر کرب سا چھا گیا۔

''نہیں..... یہ بات نہیں ہے..... میں.....''

وہ درمیان میں جلدی سے بولی۔ ''شاید آپ مجھے اس قابل نہیں سمجھتے ہیں اسی لیے آپ مجھے اپنانے سے ہچکچا رہے ہیں۔ میں راستے میں کسی پڑی ہوئی چیز کی طرح ہوں۔'' وہ توقف کر کے اپنی جگہ سے اٹھی اور پلنگ کے پاس آ کر زمین پر دو زانو ہو کر بیٹھ گئی اور اپنا سر بستر پر میرے پیروں کے پاس رکھ دیا۔ ''شاید اس لیے بھی آپ مجھے پسند نہیں کر رہے ہیں کہ میں کسی اور کی محبت میں گرفتار ہوں، اس کے ٹھکرائے جانے پر آپ سے شادی کرنے پر مجبور ہو رہی ہوں۔ آپ یقین کیجیے ایسے کسی شخص کا کوئی وجود نہیں ہے۔ میں نے محض آپ کی آزمائش کے لیے یہ افسانہ گھڑا

تھا۔ میری زندگی میں آپ پہلے مرد اور میری پہلی محبت ہیں۔ یقین نہ آئے تو جو قسم چاہیں آپ مجھ سے لے سکتے ہیں۔"

"مگر میں تو آپ کے مقابلے میں ایک بے حد معمولی سا آدمی ہوں...... ایک ٹیلر ماسٹر جس کے پاس نہ دولت ہے اور نہ کوئی تعلیمی قابلیت...... اور نہ ہی اس کی کوئی اپنی حیثیت ہے۔ معلوم نہیں آپ میری کون سی بات سے متاثر ہو کے مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہیں؟"

"آپ کے پاس شرافت ہے، محبت ہے، ایک عورت کو انہی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کی انہی باتوں نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ مجھے بے مول خرید لیا ہے۔ میرے دل میں جگہ بنالی ہے۔"

"آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ کل یہ جذباتی فیصلہ پچھتاوے کا سبب نہ بن جائے۔"

"یہ تو میں اسی لمحے سے سوچ رہی ہوں جس لمحے آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔ اب آپ مجھے اپنا فیصلہ سنادیں۔"

"اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔" میں نے اس کا بازو پکڑ کے اپنے ساتھ بٹھالیا اور اس کے حسین چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے کہا۔ "ایک مرد کو کیا چاہیے؟ حسین اور محبت کرنے والی بیوی۔ آپ بلاشبہ بہت حسین ہیں۔ جنت کی کسی حور کی طرح...... لیکن کیا آپ ایک قلاش مفلس شخص سے محبت کر سکیں گی؟"

"جب میں آپ کو اپنی مرضی اور خوشی سے اپنا رہی ہوں تو کیا آپ سے محبت نہیں کروں گی؟" اس نے اپنا خوشنما سر میرے شانے پر رکھ دیا۔ "مجھے زندگی میں اب تک جتنے مردوں سے بھی واسطہ پڑا انہیں میں نے خود غرض پایا۔ وہ میرے حسن و شباب اور میری دولت کے بھوکے تھے۔ وہ بے غرض نہیں تھے۔ ان میں خود غرضی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مجھے ایک بے غرض اور شریف آدمی کی ضرورت تھی۔ قدرت نے میری سن لی۔ آپ سے سادھاتی طور پر ملادیا۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ میں نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ خوش قسمتی کے ساتوں در اچانک کھل جائیں گے۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔"

"اس شہر میں آپ کے جاننے والے، رشتہ دار، دوست احباب موجود ہیں۔"

"وہ کس لیے؟"

"اس لیے کہ ہمیں شادی کرنی ہے۔ آج نہیں تو کل۔" وہ سرخ ہو کر بولی۔ "نیک کام میں دیر نہیں کرنی ہے۔"

"میرے بچپن کا ایک دوست حمزہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ اس شہر میں رہتا ہے۔ میں اس کا پتا ساتھ لے کر آیا ہوں۔"

"تو پھر کیا تھا؟ کہ اس کے پاس جائیں اور اس سے بات کریں۔" وہ بولی۔ "اس سے کہیں کہ وہ ایک سادہ سی تقریب میں ہماری شادی کا بندوبست کردے۔ کل مغرب کے فوراً بعد ایک فوٹو گرافر سے بھی کہہ دیں کہ وہ آکر ہماری شادی کی تصویریں بنادے۔ ویڈیو نہیں بنانا۔ ہم دونوں نکاح کے بعد ہوٹل آجائیں گے۔ ہوٹل میں کچھ دن رہیں گے اور مستقبل کا پروگرام بنائیں گے۔"

میں دو بجے ہوٹل سے نکلا۔ فیڈرل بی ایریا سات نمبر پہنچا جہاں اس کی پرچون کی دکان تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی مارے خوشی کے لپٹ گیا۔ اپنے گھر لے گیا جو دکان کے قریب اور اس محلے میں تھا۔ بھابی صبیحہ مجھے اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اس نے میرے سامان کے بارے میں پوچھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ ہوٹل میں ٹھہرا ہوں تو بری طرح بگڑ گئی۔

بھابی کچھ دیر بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی، پھر میرے لیے چائے ناشتے کا اہتمام کرنے چلی گئی تو میں نے سارا قصہ من و عن سنایا۔ وہ میری کہانی بڑی غور اور حیرت سے سنتا رہا۔ جب میں اپنی کہانی سنا چکا تو وہ بولا۔ "یہ تم نے فلم اسٹوری کب لکھی......؟"

"یار حمزہ! یہ فلمی کہانی نہیں بلکہ حقیقی کہانی ہے۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اتنی دلچسپ، تحیر انگیز اور سنسنی خیز تو فلمی کہانی ہی ہو سکتی ہے۔ تو کہتا ہے تو یقین کیے لیتا ہوں لیکن تو مجھے سچ سچ بتا دے میں تیرے بچپن کا دوست ہوں۔ پولیس والا نہیں ہوں۔ کہیں تم کسی معصوم لڑکی کو بہلا کے تو نہیں لائے ہو؟"

"کیا تم مجھے ایسا سمجھتے ہو؟" میں نے سرگوشی کی۔ "یہ کیوں نہیں کہتے ہو کہ لڑکی مجھے بھگا کر لائی ہے۔"

"آج کا دور ایسا ہے کہ کسی پر بھی بھروسا نہیں رہا ہے۔ میں تیری بات کا آنکھ بند کر کے یقین کیے لیتا ہوں اس لیے کہ بچپن سے تیری سچ بولنے کی عادت ہے۔ تیرے سچ بولنے پر تو ماسٹر صاحب، مولوی صاحب اور گھر والوں سے خوب مار کھائی ہے لیکن تو پھر بھی اس سچ پر پکا رہتا تھا۔

خیر جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔"

ہم دونوں کے درمیان یہ طے پایا کہ کل مغرب کی نماز کے فوراً بعد نکاح کی تقریب ہو جائے گی۔ رات کے کھانے کا بندوبست اس کی طرف سے ہوگا۔ وہ پڑوس کی کچھ لڑکیوں، عورتوں اور مردوں کو جمع کرے گا۔ میں نے یہ بات نغمہ کو بتائی تو وہ بہت خوش ہوئی۔ چونکہ سہ پہر ڈھل کر شام ہو چکی تھی۔ ہم دونوں تیار ہو کر نکلے۔ نغمہ نے ہوٹل سے کار کرائے پر لی اور کلفٹن چلے گئے۔ رات کا کھانا ہوٹل میں کھایا جو سی ویو میں تھا۔ ہوٹل سے نکل کر ہم سیدھے فیڈرل بی ایریا اس محلے میں پہنچے جس میں حمزہ رہتا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے گاڑی روک کر بولی۔ "اب آپ براہ مہربانی نیچے اتریں۔"

"وہ کس لیے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لیے کہ کل شام ہم دونوں کی شادی ہونے والی ہے۔ لہٰذا آپ آج کی رات اپنے دوست کے ہاں گزاریں گے۔ کل دوپہر کے وقت ہوٹل تشریف لائیں گے۔"

"ہوٹل میں ٹھہرنے میں کیا حرج ہے؟ رات تو میں ہوٹل ہی میں ٹھہرا تھا۔"

"مگر اب آپ کی ذات سے خطرہ نقص امن پیدا ہو چلا ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔

"کل رات تک تو کوئی خطرہ نہیں تھا مگر آج کیسے پیدا ہو گیا ہے؟"

"کل رات تو آپ سے کوئی رشتہ ناتا نہیں تھا اس لیے آپ بہکے نہیں تھے۔ اب جب کہ دل کا رشتہ قائم ہو چکا ہے تو خطرہ پیدا ہونے کا سخت ترین اندیشہ ہے۔ ہمارے معاشرے میں دولہا دلہن ایک جگہ نہیں رہتے۔"

"جو مرضی میرے صیاد کی۔" میں نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے ایک سرد آہ بھری۔ "آج کی رات کسی صدی کی طرح بھاری ہو جائے گی۔ میں نہیں جانتا کہ کیسے کٹے گی؟"

"شادی کرنے کے تصور میں۔" اس کا لہجہ کھنک گیا۔ "مجھے بھی تو نیند نہیں آئے گی۔ اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" میں نے گاڑی سے اتر کے دروازہ بند کیا۔

میں اس وقت تک کھڑا رہا جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ میں حمزہ کے گھر پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ جب میں نے اسے اصل بات بتائی تو وہ ہنسنے لگا اور بولا۔ "یار! تمہاری بیوی جو ہونے والی ہے وہ بڑی ذہین اور خوب صورت معلوم ہوتی ہے۔ تمہارے نصیب جاگ گئے میرے یار۔ تم واقعی بڑے خوش نصیب ہو۔"

میں نے رات حمزہ کے ہاں گزاری۔ نغمہ کو پانے کی خوشی میں مجھے نیند نہیں آئی۔ چشم تصور میں نغمہ کا چہرہ اور سراپا نظروں میں لہراتا رہا۔ یہ سب کچھ مجھے کسی سہانے سپنے کی طرح لگ رہا تھا۔ میں بہت خوش تھا کہ میرے مقدر نے میرے لیے خوش قسمتی کے در کھول دیے تھے۔ میں اپنی خوش قسمتی پر رشک کر رہا تھا۔

دوسرے دن میں دوپہر کا کھانا کھا کر نغمہ کو لینے ہوٹل پہنچا تو تین بج رہے تھے۔ نغمہ میرے انتظار میں بے تاب ہو رہی تھی اور وہ خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ شادی کے خیال نے اسے حیا آلود کر دیا تھا اور وہ بہت ہی حسین دکھائی دے رہی تھی۔ وہ مجھ سے شادی کرتے ہوئے اتنی خوش اور سرشار ہو گی اندازہ نہ تھا۔ اسے اتنا خوش دیکھ کر میری نس نس میں خون رقص کرنے لگا۔ میں نے کئی بار سوچا کہیں یہ خواب تو نہیں۔

کچھ دیر بعد ہم کرائے کی کار میں زیب النساء اسٹریٹ پہنچے۔ چلتے وقت میں نے سفاری سوٹ لے لیا تھا۔ نغمہ نے ساڑی کی ایک بڑی دکان سے نکاح کے لیے ایک سرخ ساڑی خریدی۔ یہ ساڑی تین ہزار کی مالیت کی تھی۔ اس کے ساتھ پیٹی کوٹ اور زیر جامے بھی تھے۔ اس نے کچھ اور ضرورت کی چیزیں بھی خریدیں۔ ہم دونوں حمزہ کے ہاں پہنچے تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ حمزہ اور بھابی نے جو نغمہ کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔ اس کے مثالی حسن و جمال نے میاں بیوی کو اتنا متاثر کیا کہ بھابی نے اسے میرے اور حمزہ کے سامنے ہی بے تحاشا چوما اور پھر اسے اندر عورتوں میں لے گئیں۔ پڑوس اور گلی کی کچھ لڑکیوں اور عورتوں کو شادی میں مدعو کیا گیا تھا وہ نغمہ کو تیار کرنے لگیں۔ مغرب کی نماز کے بعد نغمہ سے میرا نکاح ایک سادہ سی تقریب میں ہو گیا۔ بھابی نے لڑکیوں اور عورتوں کو نغمہ کے بارے میں یہ بتایا کہ وہ اس کی کزن ہے۔ وہ لندن میں تھی۔ اس کی والدہ حیات تھی۔ وہ اسے یہاں لا کر شادی کرنے والی تھیں کہ تین ماہ پہلے زندگی نے وفا نہیں کی۔ اس کا رشتہ طے ہو چکا تھا اس لیے وہ کراچی آ گئی۔ لہٰذا اس کی شادی کر دی گئی۔ اس شادی کی تقریب میں چھ سات مرد، لڑکیاں اور عورتیں دس بارہ تھیں۔ حمزہ نے مہمانوں کی خاطر

تواضع بریانی، قورمہ اور نان سے کی۔

رخصتی کے وقت نغمہ میرے سامنے آئی تو میں اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اس کے حسن کے ان گنت روپ تھے۔ اس کا یہ روپ بہت حسین تھا۔ عروسی جوڑے نے اس کے حسن کو اور قیامت بنا دیا تھا۔ تو تو گرافر نکاح کی تقریب میں شرکت کے لیے آیا ہوا تھا۔ اس نے رخصتی کے وقت ہم دونوں کی متعدد تصویریں اتاریں۔ بھابی اور عورتوں نے بڑی محبت اور بہت ساری دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا اور اسے بہت پیار بھی کیا تھا۔ وہ دلہن کے روپ میں اتنی حسین لگ رہی تھی کہ نظریں نہیں ٹھہرتی تھیں۔

دلہن کار چلائے کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ حمزہ نے محلے کے ایک صاحب کو ساتھ کر دیا تھا۔ وہ کار چلاتے ہوئے ہوٹل کی طرف لے چلے۔ انہیں ہمیں ہوٹل چھوڑ کر واپس آنا تھا۔ سارا راستہ میں عقبی آئینے میں نغمہ ہی کو دیکھتا رہا جو پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی تھی۔ نغمہ اب جو میری زندگی کا نغمہ بن گئی تھی۔ وہ سر جھکائے انجانے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی اور ہیرے کی سی دمک تھی۔

ہوٹل پہنچ کے ان صاحب کو ہم نے شکریے اور ممنونیت کے ساتھ رخصت کیا۔ ہم ہوٹل کی عمارت میں داخل ہوئے۔ نغمہ کو جو بھی دیکھ رہا تھا اپنی آنکھوں سے داد دے رہا تھا۔ لفٹ میں دو امریکی سیاح لڑکیوں نے اسے آغوش میں لے کر اس کے رخساروں پر بوسے ثبت کیے۔ موبائل میں اس کے عکس کو قید کر لیا۔ سیلفی بھی لی تھی۔ کمرے میں پہنچتے ہی اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار پیدا ہوئے تو میں اسے اپنے بازوؤں میں لینے سے باز رہا۔ وہ بولی۔ ”سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔ اسپرین اور چائے کے لیے کہہ دو۔“

میں ٹیلی فون پر چائے کے لیے کہہ کر بستر پر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بستر پر دراز ہو گئی تھی اور اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے ایک ہاتھ سے اپنا سر دبانے لگی۔ میں اس کا ہاتھ ہٹا کے اس کا سر دبانے لگا۔ اس نے آنکھیں کھول کر فوراً میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ پھر بولی۔ ”نہیں...... میرے سرتاج نہیں۔“ وہ مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ”ہاں گرمی اور گھٹن تھی اس وجہ سے میرے سر میں درد ہو گیا تھا۔ اسپرین اور چائے سے سر کا درد دور ہو جائے گا۔“ پھر وہ اٹھ کے بیٹھ گئی۔ ”یہ خدمت کرنا میرا فرض ہے۔ آپ کا نہیں۔“ اس نے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا۔

چند لمحوں کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ ویٹر چائے لے کر آیا تھا۔ جب وہ چائے رکھ کے چلا گیا تو وہ بولی۔ ”آپ کپڑے تو بدل لیں تاکہ ایزی ہو جائیں۔“

جب میں کپڑے بدل کر آیا تو وہ میرے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی۔ پھر اسپرین کی گولی کھا کر چائے پینے لگی۔ چائے پینے کے تھوڑی دیر بعد ویٹر برتن آ کر لے گیا۔ نغمہ نے سوٹ کیس میں سے شب خوابی کا لباس نکالا۔ غسل خانے میں داخل ہو کے فوراً ہی باہر آ گئی۔ سنگھار میز کے سامنے اسٹول پر بیٹھ کے اس نے ایک ایک کر کے سارے زیورات اتارے۔ یہ تمام زیورات بھابی کے تھے۔ ان میں بندے، چوڑیاں اور کڑے بھی تھے۔ بھابی نے ولیمے تک کے لیے دیئے تھے۔ میں تین دن بعد حمزہ کے گھر پر ولیمہ کرنے والا تھا۔ میں بستر پر آ کر دراز ہو گیا۔

میں آنکھیں بند کیے انجانے خیالوں میں کھو گیا۔ نغمہ اب میری بیوی ہو چکی تھی۔ میری قانونی ملکیت بن چکی تھی۔ اب ہم دونوں کے درمیان کوئی دیوار نہیں رہی تھی۔ رکاوٹ نہیں رہی تھی۔ میں اسے چھو سکتا تھا۔ اپنے دل کی ہر آرزو اور ارمان پورے کر سکتا تھا۔ ایک ایسی نئی زندگی میں قدم رکھنے والا تھا جس میں ہر سمت حسن ہی حسن اور رنگینیاں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ میری شرافت اور صبر کا شیریں پھل تھا جو مل رہا تھا۔ اس میں اب کوئی دیر نہیں رہی تھی۔ پیچھے سے بہاریں آنے والی تھیں۔ کلی کھلنے والی تھی۔ پھول میرے وجود میں مہکنے والا تھا۔

سوچتے سوچتے میری ذہنی رو بھٹک گئی۔ میرے تصور میں شیریں کا نفرت سے بھرا چہرہ ابھر آیا۔ میں دل میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ شیریں! میں ایک دن ضرور نغمہ کو لے کر تمہارے پاس آؤں گا۔ تم نے مجھ سے بے وفائی کی۔ تم نے محض دولت کی خاطر اپنی محبت کو قربان کر دیا۔ تم نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ صنوبر کو بھی مجھ سے جدا کر دیا۔ ایسا کر کے تم نے کیا پایا؟ کیا تم نے کبھی سوچنے کی کوئی کوشش بھی کی؟ تم نے پایا کچھ نہیں صرف کھویا ہی کھویا ہے۔ کل تم مجھ پر ہنس رہی تھیں۔ میں آج تم پر ہنس رہا ہوں۔ آج میں نے اتنا کچھ پایا ہے کہ تم نے اس کا عشر عشیر بھی نہیں پایا ہے اور تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔ تم نغمہ کو دیکھو گی تو تمہارے دل پر کوئی بجلی سی آ گرے گی اور میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ آنکھ کب لگی کچھ ہوش اور خیال نہیں رہا۔

گہری نیند سے بیدار ہوا تو ذہن کسی کورے کاغذ کی طرح تھا اور آنکھوں میں ایسی نیند بھری ہوئی تھیں کہ پلکیں سوں بھاری ہو رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے کوئی پرانی شراب پی لی ہو۔ دوسرے لمحے میں اک دم سے ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا اور سر کو جھٹک دیا۔ صبح ہو چکی تھی۔ دیوار گیر گھڑی میں صبح کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں بستر سے اس طرح نکل آیا جیسے کرنٹ لگا ہو۔ نغمہ کمرے میں تھی اور نہ ہی بستر پر۔ اس کی جگہ چادر پر شکنیں تک نہ تھیں۔ نہ ہی اس کے بدن کی مہک۔ میں نے غسل خانے میں جھانکا شاید وہ ٹب میں بیٹھی نہا رہی ہو گی۔ اب تو میں اسے ہر حالت میں دیکھ سکتا تھا لیکن وہ غسل خانے میں بھی نہیں تھی۔ میں نے الماری میں اس کا سوٹ کیس دیکھا وہ بھی نہیں تھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ نغمہ کہاں گئی؟ میں نے احمقوں کی طرح نہ صرف پلنگ کے نیچے اور پھر غسل خانے میں گھس کر باتھ ٹب بھی دیکھا۔ اس کا وجود تو کیا اس کی مہک تک نہ تھی۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بدمعاش اس کی تلاش میں کراچی آ گئے ہوں۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح پتا چلا لیا۔ وہ کمرے میں گھس آئے ہوں، گن پوائنٹ پر اسے سوٹ کیس سمیت لے گئے ہوں؟ اس امکان کو خارج نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں سن سا ہو کے رہ گیا۔ میری رگوں میں لہو برف کی طرح منجمد ہو گیا۔ میں بے جان سا ہو کر بستر پر کسی کٹے درخت کی طرح گر پڑا تو معاً میری نگاہ سرہانے کی میز پر پڑی۔ اس پر ایک پرزہ گلاس کے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں نے فوراً ہی اسے اٹھا کے پڑھا۔ ایک مختصر سی تحریر تھی۔

"میرے سرتاج!

میں جا رہی ہوں۔ میری تلاش نہ کرنا اگر قسمت مہربان رہی تو پھر ملوں گی۔ آپ کی بھابی کے زیورات آپ کے سوٹ کیس میں رکھ دیئے ہیں۔"

آپ کی صرف آپ کی

نغمہ

مجھ پر کوئی بجلی سی آ گری۔ میں نے اس عبارت کو سینکڑوں بار پڑھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ کیا اسرار ہے؟ آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ اس نے میرے ساتھ ایسا عجیب و غریب کھیل کیوں اور کس لیے کھیلا۔ کون سا جذبہ کارفرما تھا؟ میرے ساتھ شادی کیوں کی؟ اسے یہ حرکت کر کے کیا ملا؟ آخر اس کے ساتھ ایسی کیا مجبوری پیش آئی تھی کہ جو مجھے بیچ منجدھار میں چھوڑ کے چلی گئی۔ اس نے خود ہی شادی کی پیشکش کی میں نے جبر اور اصرار تو نہیں کیا تھا۔ جاتے جاتے میرے سارے ارمان اور خواب چکنا چور کر گئی۔ میرے جذبات اور خواہشات کو بے رحمی سے کچل کے چلی گئی۔ میرے دل میں جو حسرتیں آرزوئیں ہوئی تھیں۔ طوفان کی طرح انہیں تاخت و تاراج کر گئی۔ میں حسرت زدہ اور تشنہ کام رہ گیا۔ میں کچھ دیر تک وحشت سے اپنا سر پیٹتا رہ گیا۔ کر بھی کیا سکتا تھا۔

میں نغمہ اور اس واقعے کے بارے میں جتنا سوچتا اتنا ہی الجھتا گیا۔ میرا دماغ ماؤف سا ہو گیا تھا۔ مجھے پچھتاوا سا ہونے لگا کہ زندگی کی سب سے حسین رات کو سونے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ رات تو جاگنے کی ہوتی ہے لیکن مجھے نیند کیسے آ گئی؟ سوچتے سوچتے میں اچھل پڑا۔ نیند کا معاملہ ہو گیا تھا۔ نغمہ نے اس رات جب ہم کھانا کھا کر ہوٹل آئے تھے اس نے چائے منگوائی تھی۔ مجھے کپڑے بدلنے کے لیے بھیج دیا تھا اور اس نے چائے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی تھی۔ مجھے نیند فوراً ہی آ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مجھے چند لمحوں میں نیند آ جائے گی اس لیے اس نے بڑے اعتماد سے بستر پر ساتھ سونے کے لیے اصرار کیا تھا۔ صبح بیدار ہوا تو مجھ پر غنودگی طاری تھی۔ رات بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ سر درد کا بہانہ کر کے چائے منگوائی اور مجھ سے کپڑے بدلنے کے لیے کہا۔ اس سے فائدہ اٹھا کے میری چائے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی۔ اس نے یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا تھا۔ کیوں اور کس لیے کیا تھا یہ میرے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے۔

جس وقت میں نیچے گیا تب مجھے استقبالیہ کاؤنٹر پر بتایا گیا کہ نغمہ بل ادا کر کے گئی ہے اور تین دن قیام کی رقم بھی پیشگی جمع کر کے گئی ہے۔ گویا اس نے تین دن ہوٹل میں قیام کرنے کا بندوبست کر دیا تھا۔ استقبالیہ کلرک نے مجھ سے کہا کہ اگر میں سنگل بیڈ لے لوں تو ماہ دن تک قیام کر سکتا ہوں۔ میں نے ہامی بھر لی تھی کہ واپس آ کر سنگل بیڈ لے لوں گا یا پھر اگر اس کی ضرورت پیش نہ آئی اور بقایا دنوں کی رقم واپس مل سکتی ہے تو لے لوں گا۔ پھر میں بھابی کے زیورات لینے بیڈ روم میں پہنچا۔ تمام زیورات ایک چرمی تھیلی میں تھے۔ اس کے ساتھ ایک لفافہ تھا جس میں دس ہزار کی رقم میری ضرورت اور اخراجات کے لیے وہ چھوڑ گئی تھی۔ میں بھابی کے زیورات لے کر حمزہ کی دکان پر پہنچا۔

جب اسے سارا واقعہ سنایا تو وہ ششدر رہ گیا۔ ہم دونوں نے مل کر گھنٹوں اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کی لیکن یہ معما حل نہ ہو سکا۔ وہ ابتداء سے ہی ایک پُراسرار لڑکی تھی۔ انتہائی پُراسرار اور عجیب حالت میں ملی تھی۔

میں نے حمزہ کے مشورے پر ہوٹل چھوڑ کے حمزہ کے ہاں سکونت اختیار کر لی۔ نغمہ کی تلاش میں کچھ ایسا پاگل ہوا کہ تین مہینوں تک اسے تلاش کرتا رہا۔ کراچی کا کونا کونا چھان مارا۔ وہ نہ ملنا تھی نہ ملی۔ حمزہ نے مجھے بہت سمجھایا کہ میں اسے ایک خواب سمجھ کے بھول جاؤں لیکن اسے بھولنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

ایک روز میں کریم آباد کے مینا بازار کی عمارت کے پاس ایک گوشے میں کھڑا برقع پوش لڑکیوں اور عورتوں کو دیکھ رہا تھا کہ برقع پہننے والی ہر عورت پر مجھے نغمہ کا دھوکا ہوتا تھا۔ میری یہ کیفیت گزشتہ تین مہینے سے تھی۔ آج بھی میں اس کیفیت اور اذیت کا شکار تھا۔ میرے کانوں میں ایک ریشمی آواز کا زیر و بم گونجا۔ ''میرے..... سرتاج!''

میں ایک دم سے اچھل پڑا۔ اس آواز کو سننے کے لیے تو میں پورے تین ماہ سے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ میں نے سرعت سے گھوم کر دیکھا تو مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ پہلے تو یہ سمجھا کہ شاید جاگتے میں خواب دیکھ رہا ہوں لیکن یہ خواب نہیں تھا حقیقت تھی۔ میری نغمہ، میری زندگی، میرا خواب، میرا وجود، سامنے کھڑا تھا۔ اگر وہ تنہائی میں ملتی میں اسے اپنے سینے میں جذب کر لیتا۔ پھر بھی میں نے دنیا کی کوئی پروا نہیں کی۔ اس کی طرف بڑھا لیکن ٹھٹک کے رک گیا۔ اس کی حالت دیکھ کے میرے دل پر چوٹ لگی۔ وہ ایک پرانے اور میلے کچیلے برقع میں ملبوس تھی۔ وہ کسی افلاس زدہ عورت کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اس کی کھلی آنکھوں میں سارے جہاں کا دکھ تھا۔ میں نے اس کی آواز میں بھی بڑا دکھ محسوس کیا۔

میں اس کے ساتھ ایک رکشا میں اورنگی ٹاؤن جا رہا تھا۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ وہ اورنگی ٹاؤن میں رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت ہے وہ وہیں چل کر سارا قصہ بتائے گی۔ میں سارا راستہ اسے اور وہ مجھے دیکھتی رہی۔ میں اسے پا کر بہت خوش تھا۔ میری منزل جو مجھے مل گئی تھی لیکن میں اس بات پر حیران تھا کہ اسے کن حالات نے اس مقام پر پہنچایا۔ اورنگی ٹاؤن میں دو کمروں کا ایک مکان تھا جس میں وہ ایک بوڑھی عورت کے ساتھ رہ رہی تھی۔ یہ ایک عام سا مکان تھا۔ دونوں کمروں میں پلنگ اور بستر تھے۔ میز اور کرسیاں تھیں۔ ضروریات کی مختصر چیزیں تھیں۔ جب وہ بوڑھی عورت چائے بنانے باورچی خانے میں چلی گئی تو پھر وہ بتانے لگی۔

میں ایک کروڑ پتی باپ کی بیٹی ہوں۔ ماں بچپن میں داغ مفارقت دے گئی۔ والد کی وفات کے بعد میں ساری جایداد اور دولت کی مالک بن گئی۔ میرے رشتے دار مجھے دنیا میں تنہا اور بے سہارا سمجھ کے میرے پیچھے پڑ گئے۔ ہر شخص دولت اور میرے حسن و شباب کے باعث مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں کسی اجنبی یا بے حد معمولی آدمی سے شادی کروں گی لیکن تم میں سے کسی سے بھی نہیں۔ میرے چچازاد نے قسم کھائی کہ وہ نہ صرف میری عزت کو تباہ کر دے گا بلکہ ساری دولت بھی حاصل کر کے رہے گا۔ اس رات اس نے اسی لیے میرا تعاقب کیا تھا۔ آپ مل گئے۔ آپ کی وجہ سے میری عزت بچ گئی۔ میں نے آپ کے ہاں بیٹھ کے سوچا کہ کیوں نہ آپ سے شادی کر لوں۔ آپ ایک شریف اور نیک آدمی ہیں۔ مخلص اور بے غرض بھی ہیں۔ مجھے ایک مرد کے سہارے کی ضرورت ہے۔ آپ سے بہتر آدمی برسوں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ میں نے یہ سوچ کر آپ کو ملازمت کی پیش کش کی اور کراچی لے آئی۔ جایداد اور دولت میرے نام اس وقت ہو سکتی تھی جب میں شادی کر لوں، اس لیے میں نے آپ سے شادی کر لی لیکن مجھے ایک خیال آیا کہ اگر میں آپ کو ساتھ لے گئی تو میرے رشتے دار آپ کو راستے سے ہٹا دیں گے۔ یعنی آپ کی جان لے لیں گے۔ لہٰذا میں دولت اور جایداد اپنے نام کروانے تک آپ سے الگ رہوں۔ الگ اس صورت میں رہا جا سکتا ہے کہ چپ چاپ غائب ہو جاؤں اور اگر آپ کو صورتِ حال بتا کے الگ رہنا چاہوں تو بھی آپ الگ نہیں رہ سکیں گے اس لیے اس رات آپ کی چائے میں بے ہوشی کی دوا ملا کر آپ کو سلا دیا۔ پھر میں ہوٹل سے غائب ہو گئی..... لاہور گئی۔ لاہور جانے سے پہلے میں نکاح نامہ قاضی صاحب اور شادی کی تصویریں فوٹو گرافر کی دکان سے لے گئی۔ قانونی کارروائی کے بعد میں اپنے والد کی تمام دولت اور جایداد کی مالک بن گئی۔ ایک روز جب کہ میں آپ کو لینے کے لیے کراچی آنے والی تھی میرے چچازاد بھائی نے مجھے اغوا کر لیا۔ اس نے میرے سامنے دو باتیں رکھیں۔ عزت یا دولت۔ میں نے

عزت کو ترجیح دی اس لیے کہ میں آپ کی امانت تھی۔ اس نے اس وقت تک مجھے جس بے جا میں رکھا جب تک دولت اور جایداد اپنے نام نہیں کروا لیے۔ اس نے مجھے دس ہزار کی رقم دی تو میں کراچی آ گئی۔ یہ بوڑھی عورت شادو میری بہت پرانی ملازمہ ہے اس لیے اسے بھی ساتھ لے آئی۔ یہاں آ کر یہ مکان کرائے پر لیا۔ آپ کی تلاش میں نکلی۔ آپ کے دوست کی دکان پر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ کیا منہ لے کر جاتی۔ جب سے یہاں آئی ہوں اس روز سے آپ کو چھپ چھپ کر دیکھ رہی ہوں۔ آپ کی حالت دیکھ کے میرے دل پر چوٹ لگتی تھی۔ آپ کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی مگر مجھے آپ کے سامنے آنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں جانتی تھی کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ میں نے آپ کے ساتھ جو کچھ کیا اس لیے آپ مجھے معاف نہیں کریں گے۔ جانے کیسی سزا دیں گے۔ اس خوف نے مجھے آپ کا سامنا کرنے سے باز رکھا تھا لیکن آج ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ میں اپنے آپ کو سامنے آنے سے روک نہ سکی۔ یہ ہے میری کہانی۔"

"مجھے دولت کی نہیں صرف اور صرف تمہاری ضرورت ہے نفو۔" میں جذباتی ہو گیا۔ "تم میرے لیے دنیا کی سب سے بڑی دولت ہو۔ میرا محبت بھرا آشیانہ ہو۔ اب تم مجھے چھوڑ کے مت جانا۔ تمہاری جدائی کی مار سہہ نہ سکوں گا۔ مر جاؤں گا۔ اگر تم چلی گئی تو۔" میری آواز بھرا گئی۔ میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"سچ!" اس نے بھی جذباتی ہو کر اپنا سر میرے قدموں میں رکھا تو میں نے اپنے فوراً اپنے پاؤں سمیٹ لیے۔ "تمہاری جگہ قدموں میں نہیں میرے دل میں ہے۔" میں نے کہا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"کیا آپ نے مجھے معاف کر دیا؟"

"ہاں۔" میں نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "اگر تم پھر چلی گئیں تو میں کبھی تمہیں معاف نہیں کروں گا۔"

"اب تو موت ہی مجھے آپ سے جدا کر سکتی ہے۔" اس کی آواز گلے میں رندھ گئی۔ "اب میں ساری زندگی آپ کے قدموں کی دھول بنی رہوں گی۔ آپ میری جنت ہیں، میری زندگی ہیں۔"

"کیا تم میرے ساتھ خوش رہ سکو گی؟"

"میں خوش کیوں نہیں رہ سکوں گی؟" اس کے چہرے پر استعجاب چھا گیا۔

"اس لیے کہ تم نے ایک شاہانہ زندگی گزاری ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں تمہیں وہ زندگی نہیں دے سکتا اس لیے کہ میں ایک معمولی سا آدمی ہوں۔ میری آمدنی کیا ہو گی؟ زیادہ سے زیادہ دو ہزار روپے۔"

وہ تیزی سے درمیان میں بولی۔ "آپ مجھے محبت تو دے سکتے ہیں؟"

"کیا تم محبت سے خوش اور مطمئن رہ سکو گی؟ کیا تم جذباتی نہیں ہو رہی ہو نفو۔ تمہارے لیے ایک عام سی زندگی اتنی آسان اور قابل برداشت نہیں ہو سکے گی۔ سوچ لو۔"

"ایک عورت کے لیے اس کے شوہر کی محبت ہی سب سے بڑی دولت ہوتی ہے۔ میں روکھی سوکھی کھا کر خوش رہوں گی۔ میں کبھی بھی زبان پر حرف شکایت نہیں لاؤں گی۔"

میں جذباتی ہو کر اس کے چہرے پر جھکنے لگا تاکہ اس کے لبوں کی مٹھاس اپنے ہونٹوں میں جذب کر لوں۔ شادو کے قدموں کی چاپ سنائی دی تو وہ میری آغوش سے سرعت سے نکل گئی۔ شادو ایک ٹرے میں چائے اور پکوڑے لے کر آئی تھی۔ جب وہ ٹرے رکھ کے کمرے سے نکل گئی تو میں نے اس سے کہا۔ میں کل ہی سے اپنا کام شروع کر دوں گا۔ اس کام کا آغاز اس محلے اور گھر سے بھی کیا جا سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے خوشی سے میری تائید کی۔ "میں نہ صرف گھر گھر جا کے سلائی کا کام لاؤں گی بلکہ سلائی بھی کیا کروں گی مجھے سلائی کرنی آتی ہے۔ میں نے باقاعدہ اس کا کورس کیا ہوا ہے۔ آپ کٹنگ کریں گے۔ آپ صرف ٹیلر ماسٹر ہی نہیں بلکہ میرے بھی ماسٹر ہیں۔"

"یہ خوب صورت اور پھول سے نازک ہاتھ سلائی کریں گے؟" میں نے اس کے ہاتھ تھام کر ان کی پشت پر بوسہ ثبت کر دیا۔

"ہاتھ کام کرتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔" اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

میں نے آغوش میں لیا تو وہ کسمساتی ہوئی سرگوشی میں بولی۔

"خالہ آ سکتی ہیں۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ میں کہاں بھاگی جا رہی ہوں۔ چائے اور پکوڑے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔"

چائے پینے کے بعد وہ بولی۔ "آپ میرے ساتھ کچھ دیر کے لیے میری ایک سہیلی کے ہاں چلیں گے جو کے ڈی اے اسکیم نمبر ایک کارساز میں رہتی ہے میں جا کر اسے

خوش خبری سنانا چاہتی ہوں اور آپ سے ملوانا بھی چاہتی ہوں۔ آپ کو اس سے مل کے خوشی ہوگی۔"

میں نے اس علاقے کے بارے میں حمزہ سے سنا ہوا تھا کہ اس میں کروڑ پتی، ارب پتی بڑے بڑے سرمایہ دار اور صنعت کار رہتے ہیں۔ کراچی کا سب سے بڑا پوش علاقہ ہے لیکن میں کبھی اس علاقے میں گیا نہیں تھا۔ ضرورت بھی کیا تھی۔ ہم دونوں ایک رکشا میں اس علاقے میں پہنچے۔ اس نے رکشا ایک وسیع و عریض کوٹھی کے سامنے رکوایا جو دو ہزار گز کے رقبے پر بنی ہوئی تھی۔ دربان نے بڑے مؤدبانہ انداز میں سلام کر کے اندر جانے دیا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر نشست گاہ میں پہنچی۔ مجھے بٹھا کے اندر چلی گئی۔ دس پندرہ منٹ اور آدھا گھنٹا گزر گیا۔ وہ آئی اور نہ ہی اس کی بھنک۔ مجھے تشویش ہونے لگی۔ ایک خیال آیا کہ کہیں وہ فرار تو نہیں ہوگئی؟ چکمہ تو نہیں دے گئی۔ میں آخر اس کے جھانسے میں آ گیا۔ اس نے کتنی خوب صورتی، چالاکی اور عیاری سے مجھے بے وقوف بنا دیا۔ اس سوچ اور پریشانی کشمکش میں مبتلا تھا کہ اندر سے ایک ملازمہ نمودار ہو کر بولی۔ "آپ کو بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔"

وہ مجھے ساتھ لے کر ایک کمرے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کمرے کی دہلیز پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے اندر جانے کا اشارہ کیا اور دوسری جانب اندر کی طرف چلی گئی۔ میں پردہ ہٹا کے اندر داخل ہوا تو دم بخود کھڑا رہ گیا۔ مجھ پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ نغمہ دلہن بنی میری نظروں کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے وہی لباس پہنا ہوا تھا جو شادی کے وقت پہنا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ میرے سینے سے آ لگی۔

پھر ہم دونوں جذباتی ہو کر دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گئے۔ بہت دیر بعد میں نے اس سے پوچھا۔ "نغمہ! آخر یہ سب کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" وہ سرشاری سے بولی۔ "آپ کی آزمائش مقصود تھی۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ اس آزمائش پر پورے اترے۔"

"تو کیا وہ کہانی من گھڑت تھی؟"

"پوری نہیں بلکہ اس کا کچھ حصہ۔"

"کون سا حصہ؟"

"حبس بے جا رکھنے کا۔" وہ دلکش انداز سے

مسکرائی۔ "میرے اس چچا زاد نے میری عزت اور زندگی سے کھیلنے کی کوشش کی تھی مگر قدرت نے اسے بڑی عبرت ناک سزا دی۔ وہ مجھ سے انتقام لینے آ رہا تھا کہ المناک حادثے کی نذر ہو گیا۔ اس کی کار ٹریلر سے ٹکرا گئی۔ اب ہماری راہ میں کوئی کانٹا نہیں رہا۔"

دوسرے دن میں اور نغمہ مری اور سوات کے لیے روانہ ہو گئے۔ سب سے پہلے مری، پھر سوات، وادی کاغان اور کالام۔ ہم دونوں نے مہینے بھر تک جی بھر کے سیر و تفریح کی۔ ایک ایک لمحہ ایک دوسرے کی معیت میں گزارا۔ دھوم مچاتے رہے۔ پہاڑوں پر چڑھتے رہے۔ غرض کہ زندگی کی تمام لذتوں سے محظوظ ہوتے رہے۔ یہ یادگار اور ناقابل فراموش ہنی مون تھا۔ زندگی اتنی حسین اور قابل رشک ہو جائے گی یقین نہیں آتا تھا۔ واپسی میں بھائی اور بھابی جان سے بھی ملتا آیا تھا۔ بھابی نے نغمہ کو جو دیکھا تو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ ایک روز میں اتنی بلندیوں کو چھولوں گا۔

سیر و تفریح کے دوران میں نے اور نغمہ نے مل کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ کراچی میں مستقل رہائش اختیار کریں گے۔ اس کی ایک جائیداد لاہور کے علاوہ کراچی میں بھی تھی۔ کراچی واپس آ کر کلفٹن کے علاقے میں نغمہ نے ایک بہت بڑی دکان لے کر ایک زنانہ فینسی ملبوسات کی فروخت کا کام شروع کر دیا۔ سلائی کا ایک کارخانہ بھی قائم کر دیا۔ ٹی وی اور اخبارات میں پبلسٹی کی وجہ سے دکان چل پڑی۔ ہر ماہ ٹی وی پر اس کے کمرشل دکھائے جاتے تھے۔ اس دکان میں صرف سیلز گرلز تھیں۔ ایک چپڑاسی اور میرے سوا کوئی مرد نہ تھا۔

نغمہ اُمید سے ہوگئی تو اس نے دکان پر آنا کم کر دیا۔ اس نے یوں بھی مجھے سیاہ سفید کا مالک بنا دیا تھا۔ اس نے کبھی بھی مجھ سے ایک روپے کا بھی حساب نہیں لیا تھا۔ بھائی جان کے پاس تھا تو مجھے ماہانہ پانچ سو روپے کی تنخواہ ملتی تھی اور اس تنخواہ سے ایک طرح سے خوش بھی تھا۔ قدرت جو کچھ کرتی ہے وہ ٹھیک ہی کرتی ہے۔ وہ بڑا کارساز اور مسبب الاسباب ہے۔ میں پانچ لاکھ بھی خرچ کر سکتا تھا۔ مجھے پوچھنے اور ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔ بینک سے چاہے کتنی ہی بڑی رقم نکال لوں۔ مجھے اس بات کا اختیار تھا۔

نغمہ ایک بہت پیاری اور بے حد خوب صورت بچی کی ماں بن گئی۔ اب وہ اپنا زیادہ تر وقت بچی کو دینے لگی۔ اس نے دکان پر آنا تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ اس کاروبار کو میں اچھی

پوری توجہ اور محنت سے چلا رہا تھا لیکن اس کاروبار کے چلانے میں نجمہ شیخ کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ تیس برس کی عورت تھی۔ وہ ایک ایسی پُرشباب گداز بدن کی بے حد پُرکشش عورت تھی کہ دکان میں جو جوڑے آتے تھے مرد اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ اس کی ذہنت قیامت خیز تھی۔ اس نے جو کام سنبھالا ہوا تھا اسے بڑی ذمے داری سے انجام دے رہی تھی۔

ہم دونوں اکثر دوپہر کا کھانا ساتھ ہی کھاتے تھے۔ اس روز چائنیز کھانے کا موڈ ہوا تو لنچ کے لیے چائنیز ریستوران میں آگئے۔ کھانے کا آرڈر دینے کے بعد میں نے اسے پہلی مرتبہ بہ حیثیت ایک عورت کے ناقدانہ انداز سے دیکھا۔ جو دیکھا اور محسوس کیا اس نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں اسے اپنے دل میں جگہ دیے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اب نغمہ بچی کی دیکھ بھال اور گھر کے کام کاج کی وجہ سے اتنا تھک جاتی تھی کہ اس میں پہلی جیسی رغبت اور گرم جوشی نہیں رہی تھی۔ میں آج بہت تھکی ہوئی ہوں، کمر میں درد رہنے لگا ہے، آج سارا دن سو نہیں سکی ہوں، کمر بھی سیدھی نہیں کی۔ میں زبردستی کرتا تو خود کو سرد لاش کی طرح حوالے کر دیتی اس لیے اس دل اور جذبات نے اتنا ہنگامہ کیا کہ دوسرے دن ہم دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ، دیوار اور حجاب نہ رہا۔ وہ بڑی خوش اخلاق اور ملنسار اور اسمارٹ بھی تھی۔ وہ بھی مجھے بے حد پسند کرتی تھی۔ اس کے دل میں بھی آگ لگی ہوئی تھی۔

میں نے اس علاقے میں ایک فلیٹ خفیہ طور پر کرائے پر لے کر اسے خوب آراستہ کیا۔ اس کا ماحول خواب ناک اور سحر انگیز بنا دیا۔ ہم دونوں اس فلیٹ میں ملتے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھے غیر محسوس انداز سے نغمہ سے چھٹکارا دلانے اس کی تمام دولت کاروبار اور جایداد پر قبضہ جمانے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ اس کی خود سپردگی، فیاضی اور وارفتگی کا ایسا جادو چل گیا تھا کہ میں اس کے منصوبے پر سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میں نغمہ کے تمام اثاثے اور نجمہ شیخ کا مالک بن سکتا تھا۔

ایک روز میں نغمہ سے ایک دوست کے ہاں جانے کا کہہ کے فلیٹ پر آیا تو نجمہ شیخ بے چینی سے میری منتظر تھی تاکہ اس منصوبے کو آخری شکل دی جا سکے۔ اس روز ہفتہ وار چھٹی تھی ہم دونوں محبت اور جذبات میں گم نغمہ کے خلاف منصوبے بنا رہے تھے کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔ میں حیران ہوا کہ یہ بے موقع کون آ گیا ہے۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا تو میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میری نظروں کے سامنے نغمہ بچی کو لیے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے۔

نغمہ نے اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو مجھے ایسا لگا کہ میری زبان پر فالج گر گیا ہو۔ میری آنکھیں خوف سے منجمد ہو گئیں۔ مجھے اس کی شعلے اگلتی آنکھوں سے خوف آنے لگا۔ میں سرتاپا لرزنے لگا۔ نجمہ شیخ ایسی حالت میں تھی کہ اس نے بستر سے نکل کے دروازہ بند کر لیا۔ وہ بچی کو صوفے پر لٹا کر اپنا سر پیٹنے لگی۔

"یہ آپ ہیں میرے سرتاج! میری محبت پر ایک بہتان۔ شرافت اور جذبے پر اتنا بڑا بدنما داغ۔" وہ وحشت سے لڑکھڑانے لگی۔ "تم اتنی دور نکل جاؤ گے۔ میری محبت اور وجود کو میلا کر دو گے میں نے سوچا نہ تھا۔ تم نے اس معصوم بچی کا خیال تک نہیں کیا؟" وہ کرب سے چیخنے لگی۔ "کیا میں نے تمہیں اس لیے اپنایا تھا۔ اپنا سب کچھ اس لیے تمہاری نذر کر دیا تھا کہ یہ صلہ دو گے۔ تم اتنا گر جاؤ گے۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

اسی اثناء میں نجمہ شیخ کپڑے پہن کر خواب گاہ سے نکلی اور کمان سے نکلے تیر کی مانند فلیٹ سے باہر چلی گئی۔ نغمہ نے تو اس سے کچھ نہیں کہا اور نہ ہی اسے روکنے کی کوشش کی۔ وہ چلی گئی تو میں نے اپنا سر کسی مجرم کی طرح جھکا لیا۔ بڑی ندامت سے کہا۔ "مجھے معاف کر دو نغمہ۔ میں بھٹک گیا تھا۔ مجھ سے بڑی بھول ہو گئی۔"

"تم سے نہیں مجھ سے بڑی بھول ہو گئی۔" وہ زہر خند لہجے میں بولی۔ "اس بھول میں، میں بھی برابر کی شریک ہوں اس لیے تمہیں معاف کر رہی ہوں۔ یہ عورت ہی ہوتی ہے جو مرد کی ہر بھول کو معاف کر دیتی ہے۔ مگر مرد عورت کی بھول کو معاف نہیں کرتا اسے ساری زندگی کے لیے سزا دیتا ہے۔"

"مجھے ایسی کوئی سزا دو کہ میں یہ کفارہ ادا کر سکوں اور پھر ساری زندگی کوئی بھول نہ کر سکوں۔"

"سزا؟" وہ ایک لمحے تک سوچتی رہی۔ "تمہاری یہ سزا ہے کہ کل سے تم پانچ سو روپے تنخواہ پانے والے صرف ٹیلر ماسٹر ہو گے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

میں نے اس کی سزا کو قبول کر لیا اور اس کے سامنے سر جھکا دیا۔